خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہایت مفصل و مبسوط تذکرہ
حالات و سوانح، دینی و سیاسی خدمات، کارناموں اور اخلاق و مکارم پر جامع و تحقیقی کتاب

مرتبہ

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے فاضل دیوبند
پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی

ادارہ اسلامیات
لاہور — کراچی

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہایت مفصل و مبسوط تذکرہ
حالات و سوانح، دینی و سیاسی خدمات، کارناموں اور اخلاق و مکارم پر جامع اور تحقیقی کتاب

مرتبہ

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے فاضل دیوبند
پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی

ادارۂ اسلامیات
۱۹۰-انارکلی ○ لاہور

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہایت مفصل و مبسوط تذکرہ

حالات و سوانح، دینی و سیاسی خدمات، کارناموں اور اخلاق و مکارم پر جامع اور تحقیقی کتاب

مرتبہ

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے فاضل دیوبند
پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی

ادارۂ اسلامیات
۱۹۰- انارکلی ○ لاہور

بار اوّل : جمادی الثانی سنہ ۱۴۱۰ھ
باہتمام : اشرف برادران سلّمہم الرحمٰن
ناشر : ادارۂ اسلامیات، لاہور
مطبع :
قیمت مجلد :

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

ملنے کے پتے
ادارۂ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی، لاہور
دار الاشاعت، اُردو بازار، کراچی ۱
ادارۃ المعارف، کورنگی کراچی ۱۴
مکتبہ دار العلوم، کورنگی کراچی ۱۴

فہرست مضامین صدیق اکبرؓ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

اسلام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مرتبہ ومقام کیا ہے؟ اُس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے اس قول سے ہو سکتا ہے کہ۔

لقد قمنا بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاماً کدنا نھلک فیہ لولا ان اللہ مَنَّ علینا بابی بکرٍ	ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایسے حالات میں گھر گئے تھے کہ اگر اللہ نے ابوبکر کے ذریعہ ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہم ہلاک ہوجاتے۔

خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروق کو زیادہ شہرت حاصل ہے لیکن حق یہ ہے کہ اگر خلیفۂ اوّل پورے عرب کو ایک اسلام کے علم کے نیچے لاکر جمع نہ کر دیتے تو حضرت عمر نے جو عظیم کارنامے انجام دیئے ان کے لیے راہ ہموار نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت ابوبکر کی مدتِ خلافت دو برس اور تین مہینے کے قریب ہے لیکن اس قلیل مدت میں بھی آپ نے جو کام کئے ہیں وہ نوعیت کے اعتبار سے نہایت عظیم الشان ہونے کے ساتھ اس قدر چند در چند اور گوناگوں ہیں کہ مؤرخین متقدمین نے اُن پر ضخیم مجلدات لکھی ہیں چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں (جلد ۲ ص ۳۳۵) ابن عساکر کی نسبت لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضہ کے تذکرہ میں ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ میں جہاں عہدِ صدیقی کے واقعات لکھے ہیں اس موضوع پر خود اپنی ایک مستقل کتاب کا بھی ذکر کیا ہے۔

متقدمین نے اس سلسلہ میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ دو قسم کی ہیں:۔

۱۔ وہ کتابیں جو حضرت ابوبکر صدیق کے تذکرہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی آپ کے تمام حالات و سوانح پر مشتمل ہیں۔

۲۔ وہ کتابیں جو عہدِ صدیقی کے بعض خاص خاص اور اہم واقعات مثلاً فتنۂ ارتداد۔ مالک بن نویرہ کا واقعہ وغیرہ پر لکھی گئی ہیں۔

ابن ندیم کی الفہرست، خطیب بغدادی اور ابن خلکان وغیرہما کے بیانات سے عہدِ صدیقی سے متعلق جن تالیفات کا سراغ ملتا ہے۔ ہم ذیل میں اس کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔

مصنف کا نام	سال وفات	تالیفات
ابو مخنف لوط بن یحییٰ	سنہ ۱۷۰ھ	کتاب الردۃ (الفہرست ص ۱۳۶ مصری)
سیف بن عمر الاسدی التمیمی	خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں وفات ہوئی	کتاب الردہ (الفہرست ص ۱۳۷)
اسحٰق بن بشر	سنہ ۲۰۶ھ	ابن الندیم نے اس کی کتاب الردہ کا ذکر کیا ہے (الفہرست ص ۱۳۶) اس کے علاوہ اس کی ایک کتاب کا نام کتاب المبتدا بھی ہے۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۲۶ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۸۶)
ابو عبد اللہ محمد بن عمر الواقدی	سنہ ۲۰۷ھ	ابن الندیم نے عہدِ صدیقی سے متعلق ان کی کئی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام یہ ہیں (۱) کتاب الردہ (۲) کتاب السقیفہ و بیعۃ ابی بکر (۳) کتاب سیرۃ ابی بکر و وفاتہ۔ (الفہرست ص ۱۴۴)
ابو الحسن علی بن محمد المدائنی	سنہ ۲۱۵ھ	انہوں نے اس موضوع پر دو کتابیں لکھی تھیں، ایک کا نام "کتاب الردہ" اور دوسری کا "کتاب حج ابی بکر الصدیق" تھا (الفہرست ص ۱۴۸)
ابو اسحٰق اسماعیل بن عیسیٰ العطار	سنہ ۲۳۲ھ	اسحٰق بن بشر کا شاگرد اور اس کی کتابوں کا راوی تھا (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۶۲) ابن الندیم نے اس کی کتاب الردہ کا ذکر کیا ہے۔ (الفہرست ص ۱۵۹)
ابو زید وثیمہ بن موسیٰ ابن الفرات (ابو وثیمہ)	سنہ ۲۳۷ھ	ابن خلکان نے اس کی کتاب الردہ کا طویل اقتباس مالک بن

مصنف کا نام	سال وفات	تالیفات
		نویرہ کے واقعہ کے ذیل میں درج کیا ہے (ج ۵ ص ۶۳ رقم ۷۶۴ مطبوعہ مصر ۱۹۴۹ء) یہی اقتباس ابن شاکر کی فوات الوفیات میں بعینہٖ منقول ہے (ج ۲ ص ۶۲۵ رقم ۴۷۹ مطبوعہ مصر ۱۹۵۱ء) حافظ ابن حجر نے کتاب الاصابہ میں اس کتاب کے اقتباسات جگہ جگہ دیئے ہیں، انھیں اقتباسات کو ایک جرمن مستشرق نے کتاب کی شکل میں ایک جا مرتب کر دیا ہے۔
ابو محمد احمد بن اعثم الکوفی	تاریخ وفات صحیح معلوم نہیں مقتدر باللہ کے آخری عہد تک زندہ تھا	اس کتاب کا نام "کتاب الفتوح" ہے۔ اس کے ابتدائی حصہ میں ارتداد عرب کی تاریخ پر مفصل بحث ہے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ اصل عربی کی بہ نسبت زیادہ مشہور ہے۔
ابو ریاش احمد بن ابی ہاشم القیسی۔	سنہ ۳۳۹ھ	اس نے حضرت خالد بن الولید اور مالک بن نویرہ کے واقعہ پر ایک مستقل رسالہ لکھا تھا (خزانۃ الادب ج ۲ ص ۲۳۶) خطیب بغدادی نے بھی اس سے ایک طویل عبارت نقل کی ہے یاقوت نے معجم الادباء ج ۲ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

واقدی کی کتاب الردۃ کا نسخہ پٹنہ میں

واقدی کو مورخین میں جو شہرت و اہمیت حاصل ہے اس کے پیش نظر نامناسب نہ ہوگا اگر ہم اس کی کتاب الردہ کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کریں۔ اس کتاب کی نسبت ارباب علم کے حلقہ میں مشہور ہے کہ اس کا واحد نسخہ کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور پٹنہ جو عام طور پر خدا بخش لائبریری کے نام سے معروف ہے اس میں محفوظ ہے۔ چنانچہ خان بہادر عبد المقتدر خان مرحوم کی فہرست میں زیر شمارہ ۱۰۴۲ (ج ۱۵ ص ۱۰۱) اس نسخہ کا مفصل حال مذکور ہے اور لوگوں نے اسی کو واقدی کی کتاب الردہ کا نسخہ سمجھ رکھا ہے۔ لیکن اندرون کتاب صفحہ کے اوپر کتاب الردۃ کی بجائے ذیل کی سرخی ملتی ہے۔

هذا ما كان من اخبار اهل الردة من مسيلمة الكذّاب وطليحة و كندة وبني بكر بن وائل وغيرهم من القبائل ۔

اس سرخی سے قیاس ہوتا ہے کہ زیر بحث نسخہ مستقل کتاب ہونے کی بجائے کسی بڑی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ پھر کتاب کی سند پر غور کیا جائے تو اس قیاس کی مزید تائید ہوتی ہے اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ کتاب دراصل واقدی کی کتاب الردہ کا نسخہ نہیں ہے اگرچہ اس میں واقدی کی روایات کا حصہ بھی ضرور شامل رہا ہے۔ یہ سند جس کا ہم نے ذکر کیا حسب ذیل ہے۔

روی ابوالقسم عبداللہ بن حفص بن مهران البردعی اعزہ اللہ تعالٰی قال حدثنی ابومحمد احمد بن اعثم الکوفی قراءۃً علیہ قال حدثنی ابوجعفر بن عبد العزیز بن المبارک قال حدثنی نعیم بن مزاحم النقری قال حدثنی محمد بن عمر بن الواقد الواقدی السلمی وحدثنی ابراهیم ابن عبداللہ بن العلاء القرشی المدنی قال حدثنی احمد بن الحسین الکندی ونصر بن خالد الضوی وابی حمزۃ القرشی من محمد بن اسحٰق بن یسار المطلبی قال حدثنی الزهری زید بن رومان وصالح بن کیسان ویحیی بن عروۃ عن الزبیر بن العوام ومعوذ بن لبید وعاصم بن عمر بن قتادۃ کل هذا یذکر انه لما قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم شمتت الیهود والنصاری باهل الاسلام الخ

اس سند سے جن امور کا انکشاف ہوتا ہے وہ یہ ہیں:-

ا۔ کتاب کا راوی ابوالقسم عبداللہ البردعی ہے۔

۲۔ راوی کو اس کتاب کی باقاعدہ اجازت احمد بن اعثم الکوفی سے حاصل ہے۔

۳۔ اس کتاب میں جو روایتیں درج ہیں وہ احمد بن اعثم کو دو سلسلوں سے پہونچی ہیں۔ پہلا سلسلہ ابوجعفر عبد العزیز بن المبارک کا ہے جو ایک واسطے سے محمد بن عمر الواقدی کا شاگرد ہے اور دوسرا سلسلہ ابراہیم بن عبداللہ القرشی المدنی کا ہے جس میں واقدی کا کہیں ذکر نہیں۔ خان بہادر عبد المقتدر مرحوم نے اس سند کو ناقص نقل کیا ہے اور واقدی کے بعد کے سلسلہ کو حذف کر دیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف فہرست پر اعتماد کرنے والوں کو اس کتاب کے اصل مصنف کے بارہ میں غور کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ حالانکہ پوری سند جب سامنے آتی ہے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کتاب سے واقدی کا تعلق مؤلف ہونے کی حیثیت سے ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کا مؤلف

کذا فی الاصل ۱۲

جس شخص کو قرار دیا جا سکتا ہے وہ دراصل ابومحمد احمد بن اعثم الکوفی ہے جس نے واقدی اور دوسرے متقدمین کی روایات کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے اور اپنے روایتی سلسلوں کو یکجا کتاب میں درج کر دیا ہے۔

افسوس ہے کہ کتاب الفتوح کا عربی نسخہ ہمارے علم میں کہیں نہیں ہے۔ اور اب اس کا فارسی ترجمہ ہی ملتا ہے جو کسی زمانہ میں بمبئی سے شائع ہوا تھا اور اب وہ بھی نایاب ہے البتہ اس کے قلمی نسخے عام طور پر کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ اس وقت ایشیاٹک سوسائٹی کے دو قلمی نسخے ہمارے پیش نظر ہیں۔ ان دونوں نسخوں کی مدد سے ابن اعثم کی کتاب اور واقدی کی طرف منسوب کتاب الردہ دونوں کے سیاق و سباق کا مقابلہ کیجئے تو ان میں اصل اور ترجمہ کے ناگزیر فرق کے علاوہ کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آئیگا۔ ہم ذیل میں کتاب الردہ کی فصول کے متوازی کتاب الفتوح کی سرخیاں درج کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا دعویٰ ثابت ہوگا۔

فصول کتاب الردہ للواقدی نسخۂ پٹنہ	اوراق	فصول کتاب الفتوح لابن اعثم فارسی نسخۂ کلکتہ	اوراق
۱۔ اخبار سقیفۂ بنی ساعدہ	2 ب	۱۔ اخبار سقیفۂ بنی ساعدہ	۲ ب
۲۔ ذکر اخبار الردہ	6 ب	۲۔ ذکر اخبار اھل ردہ	۷ ب
۳۔ ذکر خروج اسامہ بن زید	7 ب	۳۔ قصۂ رفتن اسامہ بشام	۸ ب
۴۔ ذکر فجاءۃ بن عبد یالیل	10 ب	۴۔ ذکر فجاءۃ عبد یالیل اسلمی	۱۱ ب
۵۔ خبر مالک بن النویرہ ومسلمۃ الکذاب	16 ب	۵۔ الف۔ ذکر رفتن خالد بن الولید بجنگ ملک (ب) قصۂ مسیلمہ و جنگہائے کہ خالد ابن الولید با او داد	۱۵ا
۶۔ ذکر ارتداد اھل البحرین	25 ب	۶۔ ذکر مرتد شدن اہل بحرین	۱۸ا
۷۔ ذکر ارتداد ارض حضرموت من کندہ وغیرھا	26 ب	۷۔ قصۂ مرتد شدن حضرموت و کندہ	۲۵ا
۸۔ بندۃ فی ذکر المثنی بن حارثۃ الشیبانی وھو اول الفتوح بعد قتال اھل الردۃ	[illegible]	۸۔ ذکر لشکر بعد از مرتد شدن اہل جماعت در بلاد روم و ذکر مسلمانان را بہر تقدیم	۳۵ا - ۳۹ا

کتاب الردہ کی آخری فصل خان بہادر مرحوم کی مرتبہ فہرست میں اسی طرح ہے لیکن اصل نسخہ میں پوری عبارت یہ ہے:۔

نبذۃ فی ذکر المثنی بن حارثۃ الشیبانی وھو اول الفتوح بعد قتال اھل الردۃ وھو ایضاً من روایۃ الاعثم الکوفی۔

جیسا کہ گزر چکا ہے شروع سند سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ واقدی کی کتاب دراصل ابن اعثم کی روایات کا مجموعہ ہے جو واقدی کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی ابن اعثم کو پہونچی تھیں اب کتاب کی آخری فصل کے کشیدہ الفاظ سے بھی اس کی تائید ہو جاتی ہے کہ یہ نسخہ واقدی کی کتاب الردہ یا تنہا اس کی روایات کا مجموعہ نہیں ہے۔ البتہ اس قدر ضرور مسلّم ہے کہ اس نسخہ میں واقدی کی ان روایات کا ضروری حصہ بھی شامل ہے جس سے واقدی کی اصل کتاب الردہ خالی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس امر واقعی کی بنیاد پر زیر بحث نسخہ کو واقدی کی کتاب الردہ کا نسخہ سمجھ لینا قطعاً درست نہیں۔

واقدی کی کتاب الردہ اور کتاب الفتوح لابن اعثم کی عبارتوں کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ لیکن بہر حال اصل اور ترجمہ میں ناگزیر فرق ہوتا ہے اس کے علاوہ قلمی نسخوں کے جملہ اختلافی اسباب وعلل کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ بدقسمتی سے کتاب الردہ کا یہ واحد نسخہ جدید الخط ہونے کے ساتھ نقص وفتور سے بھی پُر ہے اور دوسری طرف ابن اعثم کی کتاب الفتوح کے پیش نظر نسخے بھی کچھ اسی قسم کے ہیں۔ اب آپ عبارتوں کا تقابلی مطالعہ کیجئے۔

(نسخہ کتاب الردہ کی عبارتیں)	(فتوح ابن اعثم کی فارسی عبارتیں)
۱۔ لما قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بے دیناں وضعیف یقیناں
شمتت الیہود والنصاریٰ باھل	از ہر طرف در گفتگو و جستجو
الاسلام وظہر النفاق فی المدینۃ	آمدند و فرصت جویاں از کمین
ممن کان یخفیہ قبل ذالک وماج	حسد بجائے غرض بیروں جستند
الناس واضطربوا واقبل مالک	و بہر جائے مجلسے و بہر گوشہ
بن التیہان الانصاری متی وقف	محفلے پدید آمد۔ در مجمعے کہ وجوہ
علی قومہ فقال یا معشر الانصار	مہاجر و انصار حاضر بود

انصتوا واسمعوا مقالتی وتفہموا	ابوالہیثم التیہان برخاست
ما القیہ الیکم اعلموا انہ قد شمت	و برحسب ایں فتور حادثہ
الیہود والنصاریٰ بموت نبینا	شعرے فصیح برخواند کہ ترجمۂ
محمد صلی اللہ علیہ وسلم	آن اینست . . . .
وقد ظہرت حسیکۃ اھل	و در حوادث با علیہ الصلوٰۃ
الردۃ وعظم المصائب علینا	والسلام کفار کہ گردن
ان مسیلمۃ الکذاب بارض	فرو شکستہ بودند امروز
الیمامۃ یرعد ویبرق و	سر برآوردند و سینہا پُر کینہ
قد تعلمون انہ یدعی النبوۃ	کردند خصوصاً ایں سہ طائفہ
فی حیاۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ	یکے جہودان دوم ترسایان
وسلم۔ والآن قد بلغنی ان	سوئم منافقان و ازیں جماعت
طلیحۃ بن خویلد الاسدی	مسیلمۂ کذاب می جوشد و جوشن
ایضاً قد ادعی النبوۃ ببلاد	محاربت و مقاتلت می پوشد و
نجد (اس کے بعد ابن التیہان کے بارہ	بقدر امکان بدست و زبان
شعر درج ہیں جو فتوح ابن اعثم میں بھی	می کوشد و طلیحہ بن خویلد
موجود ہیں۔)	کاسہ او می لیسد۔

۲۔ حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھ پر حضرت علی کی بیعت کی بحث میں آخری الفاظ یہ ہیں۔

قال فانصرف علی الی منزلہ فلم	علی بیعت ناکردہ از مجلس بازگشت
یبایع حتی توفیت فاطمۃ ثم بایع	جماعتے گویند کہ از وفاتِ فاطمہ
بعد خمس وسبعین لیلۃ من	بدو نیم ماہ بیعت کرد و از عائشہ
وفاتہا وقیل الی بعد ستۃ	روایت کنند کہ بعد از شش ماہ
اشہر واللہ اعلم ای ذالک کان	بیعت کرد۔ باقی واللہ اعلم
فہذا اکرمک اللہ ما کان من	وازیں جا سخن بیارست کہ روافض

سقیفة بنی ساعدة وھذا روایة
العلماء ولما اردان اکتب ھھُنا
شیئاً من زیادات الرافضة فیقع
ھذا الکتاب فی ید غیرك فتنسب
انت الی امرٍ من الامور واللّٰہ یقیك
(ورق ۲ ظ)

وغیر آنہا بر سبیل غلو و مبالغہ گویند
وا نا یرا د آں جز تعـــرض
تہمت فائدہ نہ بینــد
خدائے تعالیٰ نویسندہ و خوانندہ
را از آنچہ خلاف رضائے
اوست نگاہ دارد ۔

۳۔ کتاب الردہ کے آخری الفاظ یہ ہیں :۔

قال کان خالد بن الولیــد
کلما افتتح موضعاً من
العراق اخرج من غنائمہ
الخمس فیوجہ بہ الی المدینة
الی ابی بکر الصدیق ویقسم
باقی المغنم فی اصحابــہ
قال الی ان تحرکت الروم
بارض الشام فنرجع الاٰن الی
ذکر فتوح الشام بعون اللّٰہ
وکرمہ انشاء اللّٰہ تعالیٰ ۔
(ورق ۳۴ ب)

وہر موضعے کہ مسلم شدے
خمس از غنائم آن بیرون
کردے و نزدیک صدیق
فرستادے و باقی بر لشکر
برقضیت شرع غنیمت
کردے و ہم بریں روزگارے
گزشت و لشکر
بر ہر طرف مے گماشت
ذکر در حرکت آمدن
لشکر روم در ولایت
شام الخ

احادیث سیرت الصدیقؓ کے مآخذ کی حیثیت سے

عہد نبوت یا عہد صدیقی کے لیے مآخذ اصولاً دو[۲] ہیں۔ ایک کتب حدیث اور دوسرے تاریخ و سیر کی کتابیں۔ ان میں ظاہر ہے اوّل نمبر کتب حدیث کا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی کو مقدم رکھا ہے اور جہاں تک ہم احادیث صحیحہ سے مدد حاصل کر سکتے تھے اس میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ لیکن اس موقع پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جن احادیث میں کوئی تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے ان کی

نوعیت اور حیثیت ان احادیث سے کسی قدر مختلف ہے جن میں کوئی شرعی حکم یا اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا عمل بیان کیا گیا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام صحابہ اپنے طبائع، رجحانات اور مزاج کے اعتبار سے یکساں نہیں تھے، اس بنا پر بعض معاملات میں ان کا باہم دگر مختلف الرائے ہونا ضروری تھا۔ اور اس اختلاف کے باعث کبھی لب و لہجہ میں تلخی یا شکوہ و شکایت کا موقع بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ اس قسم کی احادیث کو دیکھ کر ایک نکتہ رس محقق محسوس کر سکتا ہے کہ روایت میں کتنی بات درست ہے اور کتنی بات محض باہمی اختلاف کے باعث روایت میں جگہ پا گئی ہے۔

اس بنا پر اس نوع کی احادیث سے استدلال کرتے وقت ایک صاحب تحقیق کا فرض ہے کہ اصول روایت کے علاوہ درایت کے ان اصول کو بھی پیش نظر رکھے۔

۱۔ واقعہ کا جو اصل راوی ہے اس کے تعلقات صاحب واقعہ یعنی جس کے متعلق وہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اُس کے ساتھ کس قسم کے تھے۔

۲۔ جو واقعہ اُس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کیا اُس کے مسلّم اوصاف و کمالات کے پیش نظر اس واقعہ کا صدور اُس سے ہو سکتا تھا۔

۳۔ نفس واقعہ کی نوعیت کیا ہے؟ صاحب واقعہ کی شخصیت سے قطع نظر کیا وہ واقعہ اس ماحول میں پیش بھی آ سکتا تھا۔

۴۔ اگر واقعہ کو صحیح مان لیا جائے تو طبعاً اس پر جو نتائج مرتب ہونے چاہئیں وہ ہوئے یا نہیں بہر حال ایک تاریخی واقعہ کے نقد و جرح کے جو اصول ہیں ان کا اطلاق اس واقعہ پر بھی ہونا چاہئے جو کسی صحیح حدیث میں مذکور ہو۔ اگرچہ وہ روایت صحیحین میں ہی ہو۔ کیونکہ راوی یا رواۃ کے بہر وجوہ ثقہ اور معتبر ہونے کے باوجود یہ ممکن ہے کہ راوی کو اس کے متعلق اشتباہ پیش آ گیا ہو اور اس لیے اس واقعہ کو اپنی دانست میں سچا سمجھ کر ہی نقل کر دیا ہو۔ مورخ کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی واقعہ کو محض اس بنا پر قبول نہ کرے کہ حدیث کی کتاب میں وہ مندرج ہے بلکہ اُسے اصول نقد و جرح کی کسوٹی پر پرکھے، اس سلسلہ کی جملہ روایات کو پیش نظر رکھے اور پھر اس باب میں کسی قطعی فیصلہ تک پہونچنے کی کوشش کرے۔

ہم نے کسی واقعہ کے لیے حدیث سے استدلال کرتے وقت انہیں اصول کو پیش نظر رکھا ہے مثلاً حضرت ابوبکر صدیق سے حضرت علی کی بیعت کے سلسلہ میں محدثین اور مورخین سب میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ حضرت علی نے حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد جب کہ حضرت ابوبکر کی خلافت پر چھ ماہ گزر چکے تھے، بیعت کی، اس خیال کی اصل بنیاد صحیح بخاری کی وہ روایت ہے جو حضرت عائشہ سے منقول ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کہ یہ روایت صحیح بخاری میں ہے۔ اس روایت کو دیکھ کر ایک محقق کے ذہن میں قدرتی طور پر حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ حضرت عائشہ اور حضرت علی کے تعلقات کس قسم کے تھے ؟

۲۔ کیا حضرت ابوبکر کی بیعت عامہ کے وقت حضرت عائشہ خود موجود تھیں ؟

۳۔ حضرت علی کا بیعت نہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کا چرچا اور شہرہ عام ہونا چاہیئے تھا۔ تو پھر کیا حضرت عائشہ کے علاوہ چند اور صحابہ سے بھی یہ روایت منقول ہے ؟

۴۔ تاخیر بیعت کا جو سبب روایت میں بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ خلافت کے معاملہ میں اُن سے مشورہ نہیں لیا گیا۔ کیا یہ چیز حضرت علی کی بے نفس اور پاکباز و پاک طینت شخصیت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے !

۵۔ حضرت علی کا بیعت نہ کرنا مسلمانوں کی اجتماعیت کے لیے سب سے بڑا حادثہ ہو سکتا تھا تو کیا اُس وقت جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی فوراً اسلام کی مخالفت کا طوفان امنڈ پڑا تھا۔ حضرت علی جیسی عظیم المرتبت شخصیت یہ کبھی گوارا کر سکتی تھی کہ ان کے کسی فعل سے مسلمانوں کی اجتماعی وحدت میں کسی قسم کا کوئی رخنہ پیدا ہو۔

۶۔ حضرت ابوبکر صدیق کا اسلام میں جو مرتبہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ پر جو اعتماد و اعتقاد تھا جس کے باعث آپ نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کی طرف قولاً و عملاً اپنا رجحان ظاہر فرمایا تھا۔ حضرت علی سے زیادہ ان سب سے اور کون واقف ہو سکتا تھا اس بنا پر کیا حضرت علی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بایں ہمہ وہ بیعت عامہ کے وقت سب مسلمانوں سے الگ رہیں۔ حضرت ابوبکر تو ابوبکر! حضرت علی کا کیرکٹر تو یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت

عثمان کی بیعت خلافت کے وقت بھی عام مسلمانوں سے الگ نہیں رہے اور اپنے لیے کوئی دعویٰ یا مطالبہ نہیں کیا رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

۷۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت علی نے واقعی چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس مدت میں جو اہم واقعات و حوادثات پیش آئے اور جو در حقیقت اسلام کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھے حضرت علی ان سب سے بے تعلق رہے اور انہوں نے حضرت ابوبکر کے ساتھ کوئی تعاون اور اشتراک عمل نہیں کیا تو کیا واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے ؟

۸۔ اچھا اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت علی نے بیعت نہیں کی تو کیا حضرت ابوبکر اس گومگو کی صورت کو برداشت کر کے اسلامی وحدت کی دیوار میں یہ ایک رخنہ کھلا رہنے دے سکتے تھے؟ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت علی کا بیعت نہ کرنا ان کو کم از کم بنو ہاشم کی حمایت و نصرت سے محروم کر دیتا ہے۔

۹۔ کیا صحیح بخاری کی اس روایت کے بالمقابل کچھ اور روایات ایسی ہیں جو اگرچہ صحیح بخاری میں نہ ہوں لیکن اور کتب حدیث میں ہوں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت علی نے بیعت عامہ کے دن ہی حضرت ابوبکر سے بیعت کی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ صحیحین کا مرتبہ کتب حدیث میں سب سے اونچا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ حکم بحیثیت مجموعی اور اکثر کے اعتبار سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صحیحین کی ہر روایت دوسری کتب حدیث کی ہر روایت سے زیادہ صحیح ہے۔ وجوہ قبول اگر غیر صحیحین کی روایت کے ساتھ زیادہ ہوں تو بیشک اس کو ترجیح ہونی چاہیئے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی صحیحین کی اُن چند احادیث کا جن پر بعض ائمہ حدیث نے کلام کیا ہے۔ تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

فان هذه المواضع متنازع في صحتها فلم يحصل لها من التلقي ما حصل لمعظم الكتاب وقد تعرض لذالك ابن الصلاح في قوله الا مواضع

پس یہ مقامات ایسے ہیں کہ ان کی صحت میں اختلاف ہے، کیونکہ کتاب (صحیح بخاری) کے اکثر حصہ کو امت نے جس طرح قبول کیا ہے اور اس کی صحت پر اتفاق کیا ہے ان مقامات کو قبول نہیں کیا اور ابن صلاح نے بھی یہ کہہ کر بخاری کے ان

يسيرة انتقدها عليه الدارقطني وغيره وقال في مقدمة شرح مسلم له ما اخذ عليهما يعني على البخاري ومسلم وقدح فيه معتمد من الحفاظ فهو مستثنى مما ذكرناه لعدم الاجماع على تلقيه بالقبول۔
(مقدمہ فتح الباری مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۰۱ھ ص ۳۴۴)

چند مقامات کو چھوڑ کر جن پر دارقطنی وغیرہ نے تنقید کی ہے“ اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے اور انہوں نے اپنی شرح مسلم کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ہم نے جو دعویٰ کیا ہے کہ صحیحین کو تلقی بالقبول حاصل ہے تو اس سے بخاری اور مسلم کی وہ روایات مستثنیٰ ہیں جن پر گرفت کی گئی ہے اور جن میں کسی لائق اعتماد حافظ حدیث نے قدح کی ہے کیونکہ ان روایات کے تلقی بالقبول پر اجماع نہیں ہے۔

اگر ہمارے مؤرخین روایات کا ان اصول کے ماتحت جائزہ لیں تو غالب یہ ہے کہ بعض کبار صحابہ سے تاریخ میں جو چند ایسی باتیں منسوب ہو گئی ہیں جو اُن کی شایان شان نہیں ہیں ان سب کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ حضرت علی کی بیعت کی بحث میں قارئین دیکھیں گے کہ صحیح بخاری کی روایت کو ہم نے ساقط الاعتبار یا موضوع نہیں کہا ہے بلکہ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اس کی جو تاویل کی ہے اور اس طرح انہوں نے اس روایت میں اور اس کی مخالف دوسری روایات میں جو تطبیق دی ہے ہم نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور ہمارے نزدیک اس قسم کے مواقع پر محتاط طریقہ یہی ہے۔ البتہ جہاں تاویل کی گنجائش ہی نہ ہو وہاں نقد و جرح کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

احادیث کے بعد دوسرا نمبر کتب تاریخ کا ہے۔ ہم نے اس سلسلہ میں کسی روایت کو صرف اس بنا پر قبول نہیں کیا کہ وہ کسی متقدم مورخ کی روایت ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی مؤرخ متقدم ہونے کے باوجود کسی خاص معاملہ میں کوئی عصبیت رکھتا ہو یا وہ روایات کو نقد و جرح کے بغیر یوں ہی جمع کر دینے کا عادی ہو۔ اور اس کے برخلاف دوسرا مؤرخ جو اگرچہ عہد کے اعتبار سے پہلے سے متاخر ہو لیکن اس کی بہ نسبت زیادہ نقاد اور محتاط ہو۔ تو ظاہر ہے اس صورت میں اس کی روایت زیادہ معتبر اور لائق اعتماد ہوگی۔ قارئین کتاب میں جابجا اس کی مثالیں دیکھیں گے۔

اردو زبان میں مولانا شبلی کی کتاب ”الفاروق“ جو خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق کے سوانح حیات اور آپ کے کارناموں کا محققانہ تذکرہ ہے۔ اردو زبان کے ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور جب تک یہ کتاب موجود ہے مولانا کا نام روشن رہے گا۔ اگرچہ ترتیب اور اہمیت کے

اعتبار سے مولانا کو پہلے حضرت ابوبکر صدیق کا تذکرہ لکھنا چاہئے تھا لیکن حضرت عمر کے دور میں جو عظیم الشان فتوحات حاصل ہوئیں اور پھر دس سالہ مدت خلافت میں آپ نے سیاسی نظم و نسق، اجتماعی و تمدنی، اقتصادی اور سماجی مسائل کے حل کے سلسلہ میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ان سب کے پیش نظر مولانا نے ہیروز آف اسلام کی تاریخ کا جو پروگرام بنایا تھا اس کے لیے سب سے زیادہ کشش حضرت عمر کے تذکرہ میں ہی تھی اور مولانا نئی نسل کو اسلام کی تاریخ سے متاثر کرنے کا جو جذبہ رکھتے تھے خلفائے راشدین میں اس جذبہ کی تکمیل کا سامان غالباً سب سے زیادہ الفاروق سے ہی ہو سکتا تھا۔

مولانا کی وفات کے بعد اردو میں متعدد اہل علم نے حضرت ابوبکر صدیق کا بھی تذکرہ لکھا۔ چنانچہ حاجی معین الدین احمد صاحب ندوی مرحوم نے ”خلفائے راشدین“ میں اور پھر انہیں کے ہم نام مولانا شاہ معین احمد صاحب ندوی نے تاریخ اسلام کی جلد اول میں خلیفۂ اول کے حالات و سوانح اور آپ کے کارنامے لکھے یہ دونوں کتابیں دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تذکرہ ضمنی تھا اس لیے مکمل اور مفصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بعض حضرات نے خاص حضرت ابوبکر پر ہی جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے جو کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ”سیرت الصدیق“ از مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم
اصل کتاب اردو میں تھی۔ بعد میں ڈاکٹر سید معین الحق نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کر دیا تھا جس کو شیخ محمد اشرف لاہوری نے شائع کیا۔
۲۔ ”العتیق“ کے نام سے بھی ایک بزرگ نے ایک کتاب لکھی تھی۔
۳۔ چند سال ہوئے عطا محی الدین صاحب ملک نے انگریزی زبان میں ”ابوبکر“ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔
۴۔ ابھی حال میں مصر کے مشہور فاضل محمد حسین ہیکل کے قلم سے بھی ایک کتاب ..... ”الصدیق ابوبکر“ کے نام سے نکلی ہے اور اردو میں اس کا ترجمہ بھی

چھپ چکا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "الفضل للمتقدم" کے مطابق ان سب حضرات کو خاکسار راقم الحروف پر شرفِ تقدم و فضیلتِ سبقت حاصل ہے لیکن بایں ہمہ سیرتِ صدیق اکبرؓ پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت باقی تھی جس میں تمام حالات و واقعات مستند حوالوں کے ساتھ درج ہوں۔ جن میں روایات کو یوں ہی جوں کا توں قبول نہ کر لیا گیا ہو بلکہ علمی اصول تنقید کی روشنی میں ان پر بحث و گفتگو ہو۔ جس میں حضرت ابوبکر کے روحانی اور مادی دونوں قسم کے فضائل و کمالات یکساں طور پر اُجاگر کئے گئے ہوں سیرتِ صدیق رضؓ کے سلسلہ میں جو بعض روایات مشہور چلی آ رہی ہیں ان کی تحقیق و تنقیح کی گئی ہو۔ اور اس ذیل میں جو بعض اہم مسائل پیدا ہوئے ان کا صحیح حل پیش کیا گیا ہو اور جس میں حضرت ابوبکر سے متعلق جزئی واقعات کا حتی الوسع استقصا ر کیا گیا ہو۔ یہ کتاب جو آپ کے پیش نظر ہے اسی ضرورت کی تکمیل کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ لیکن یہ ضرورت کس حد تک پوری ہوئی؟ اس کا فیصلہ قارئین کرام ہی کریں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

سعید احمد اکبر آبادی

کلکتہ ۲۴ ستمبر ۱۹۵۷ء

مقدمہ طبع دوم

صدیق اکبرؓ کا پہلا اڈیشن شائع ہوا تو خدا کا شکر ہے انڈو پاک کے علمی اور اسلامی حلقوں میں اُس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اخبارات و رسائل میں اُس پر طویل تبصرے ہوئے۔ اہل علم نے خطوط کے ذریعہ اور زبانی بھی مصنف کی حوصلہ افزائی کی۔ بعض اکابر مشائخ نے اپنی خاص مجلسوں میں اسے حرفاً حرفاً پڑھوا کر سنا اور دعائیں دیں۔ علاوہ ازیں یورپ کے بعض اسلامیات کے اساتذہ نے اس کا مطالعہ کر کے داد لکھی اور بعض مباحث سے خاص طور پر استفادہ کا اعتراف کیا۔ لیکن کچھ مصنف کے سبقتِ قلم سے اور کچھ تصحیح کا پورا اہتمام نہ ہو سکنے کے باعث کتاب میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں راقم الحروف کو جب ان کا علم ہوا تو سخت ندامت ہوئی اور ان کو نوٹ کر لیا کہ دوسرے اڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی۔ پھر میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو جن سے بڑھ کر فنِ حدیث و اسماء الرجال کا محقق و مبصر میرے نزدیک آج تک انڈو پاک میں کوئی عالم نہیں ہے۔ دیرینہ نیازمندی کی بنا پر خط لکھا کہ وہ اگر آپ صدیق اکبر کو ایک مرتبہ ملاحظہ فرما لیں اور اس میں جو غلطیاں ہیں ان کی نشاندہی فرما دیں تو مجھے اطمینان ہو جائے۔ مولانا نے ازراہِ شفقتِ بزرگانہ اس درخواست کو بڑی خوشی سے قبول فرمایا اور کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھ کر غلطیوں سے مطلع فرمایا میں نے نظرثانی میں مولانا کے خط سے مکمل استفادہ کیا ہے اور اس غیر معمولی توجہ اور زحمت فرمائی کے لیے صمیم قلب سے شکرگزار ہوں۔

اس کے علاوہ مولانا سید فضل اللہ شاہ صاحب سابق صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن اور مولانا سجاد حسین صاحب کرتپوری صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی ۔ ان دونوں حضرات کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے بہ طور خود صدیق اکبر کا باستیعاب مطالعہ کیا اور غلطیوں کی نشاندہی کر کے مجھے اُن سے مطلع کیا ۔ ان میں سے اکثر و بیشتر غلطیاں وہ تھیں جنھیں میں خود نظر ثانی کے وقت اپنی یادداشت میں لکھ چکا تھا ۔ پھر بعض مقامات ایسے بھی تھے جن میں مَیں ان حضرات کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکا ۔ تاہم تھوڑا بہت استفادہ میں نے ان حضرات کی تحریروں سے بھی کیا ہے اس لیے یہ حضرات بھی میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں فجزاھم اللّٰہ عنی احسن الجزاء ۔

کوئی انسانی کام نہ مکمل ہوتا ہے اور نہ احتمالِ خطا و نسیان سے بالکل محفوظ اس لیے یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ کتاب کے اس دوسرے اڈیشن میں اب کوئی غلطی باقی نہیں رہی ہے ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پہلے اڈیشن میں جن غلطیوں کا علم ہوا، ان کی تصحیح اس دوسرے اڈیشن میں خاص اہتمام اور توجہ سے کر دی گئی ہے ۔

وَاللّٰہُ ھُوَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْہِ التُّکْلَانُ ۔

سعید احمد اکبرآبادی

علی گڑھ - ۱۹ر اپریل ۱۹۶۱ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام عبداللہ نام ۔ ابوبکر کنیت اور عتیق و صدیق لقب تھا ۔ والد کا نام عثمان اور کنیت ابو قحافہ تھی، والدہ ماجدہ کا نام سلمیٰ اور کنیت ام الخیر تھی ۔ خاندانی رشتہ سے اپنے شوہر کی چچازاد بہن بھی تھیں[1]

نسب حضرت ابوبکر قریش کی ایک شاخ تیم سے تعلق رکھتے تھے ۔ والد کی طرف سے شجرۂ نسب یہ ہے عبداللہ بن عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرۃ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ اور والدہ کا نسب نامہ یہ ہے ۔ سلمیٰ بنت صخر بن عمرو بن کعب[2]

ابو قحافہ حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ مکہ کے معزز لوگوں میں سے تھے اور کافی عمر رسیدہ تھے ان کی تین اولادیں تھیں، ایک ابوبکر ۔ اور دو لڑکیاں جن کے نام ام فروۃ اور قُریبہ ہیں ۔ ام فروہ کا نکاح پہلے قبیلہ ازد کے ایک شخص سے ہوا تھا جس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی ۔ پھر ان کا نکاح تمیم الداری سے ہوا ۔ جو پہلے عیسائی تھا ۔ پھر ۹ھ میں مدینہ آکر مسلمان ہوا ۔ حضرت ام فروہ نے جب اسلام قبول کر لیا تو میاں بیوی میں تفریق ہوگئی اور اس کے بعد ان کا نکاح اشعث بن قیس سے ہوگیا ۔ جن کا ذکر آگے آئے گا ۔ حضرت ابوبکر کی دوسری بہن قریبہ کی شادی حضرت قیس بن سعد بن عبادۃ الانصاری سے ہوئی تھی جو بلند پایہ صحابی اور اپنے عہد کے بڑے مدبر اور شجاع تھے ۔ صحیح بخاری میں ان کا تذکرہ ہے ۔ اسلام کی دعوت کا چرچا ہوا اور حضرت ابوبکر نے اس کو لبیک کہا تو ابو قحافہ اس کو جوانی کی ایک اپج سمجھتے تھے چنانچہ عبداللہ (غالباً عبداللہ بن مسعود) کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے ارادہ سے جب غار ثور چلے گئے تو میں آپ کی خبر معلوم کرنے کی غرض سے ابوبکر کے گھر آیا ابو قحافہ موجود تھے ۔ مجھ کو دیکھتے ہی غصہ میں بھرے ہوئے عصا بدست باہر نکل آئے اور بگڑ کر بولے "یہ بھی انہیں لونڈوں میں سے ہے ۔ جنہوں نے میرے بیٹے (ابوبکر) کو بگاڑ دیا ہے"[3]

---

[1] طبقات ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکر [2] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۶۱۵
[3] الاصابہ ج ۴ حرف عین ص ۴۵۳

فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکر اپنے والد ابو قحافہ کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اس وقت تک ان کے سر اور داڑھی کے بال بگلے کی طرح بالکل سپید ہو چکے تھے۔ رحمت عالم نے دیکھا تو حضرت ابوبکر سے فرمایا "تم نے ان کو کیوں تکلیف دی میں خود اُن کے پاس جاتا" آپ نے عرض کیا "یا رسول اللہ ان کو خود چل کر آپ کے پاس آنے یہاں کے لیے اس سے بہتر تھا کہ آپ ان کے پاس تشریف لے جاتے" اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینہ پر ہاتھ پھیرا اور ان کو مشرف باسلام کیا۔ انہوں نے بڑی طویل عمر پائی ۱۴ھ میں ۹۷ برس کی عمر میں وفات ہوئی اس طرح ابو قحافہ پہلے شخص ہیں جو ایک خلیفہ کے وارث ہوئے [۱]۔

حضرت ابوبکر کی والدہ حضرت ام الخیر سلمیٰ بنت صخر اپنے شوہر سے بھی پہلے اسلام لے آئی تھیں ان کے اسلام کا پورا واقعہ آگے آتا ہے۔ انہوں نے بھی طویل عمر پائی۔ حضرت ابوبکر کے بعد لیکن ابو قحافہ سے پہلے وفات ہوئی [۲]

ولادت حضرت ابوبکر کی ولادت عام فیل کے ڈھائی برس بعد ہوئی۔ یعنی سن ہجری کے آغاز سے پچاس برس چھ مہینے قبل۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کم و بیش تین برس چھوٹے تھے اس حساب سے ۵۷۳ء آپ کا سن پیدائش قرار پاتا ہے۔

عتیق کہلانے کی وجہ طبری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر تین بھائی تھے اور ان کے نام عتیق، معتق اور عتیق تھے لیکن اصل یہ ہے کہ عتیق نام نہیں بلکہ لقب تھا ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دیکھا تو فرمایا "انت عتیق اللّٰہ من النار" (تم اللہ کی طرف سے دوزخ سے آزاد ہو") اسی وقت سے ان کا لقب عتیق پڑ گیا۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہ سے بھی صاف تصریح ہے کہ عتیق آپ کا لقب ہی تھا [۳]

صدیق کہلانے کی وجہ آپ کا دوسرا لقب صدیق تھا۔ بعض لوگ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے اسلام سب سے پہلے قبول کیا تھا لیکن جیسا کہ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے

[۱] الاصابہ ج ۴ ص ۲۵۴ [۲] الاصابہ ج ۴ حرف الخاء المعجمہ ص ۴۴۹ [۳] ترمذی ج ۲ ص ۲۹۳

[۴] طبری ج ۲ ص ۶۱۵ ۔

اس کی زیادہ صحیح وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں جبریل امین سے پوچھا کہ میری قوم میں اس واقعہ کی تصدیق کون کرے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ "ابوبکر" آپ کی تصدیق کریں گے وہ صدیق ہیں [۱]

تجارت قریش اگرچہ عزت و منصب اور مرتبہ و مقام کے اعتبار سے نہایت سربلند و سرفراز تھے۔ لیکن آزاد ذریعہ معاش اختیار کرنے کو برا نہیں جانتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی ان کو عار نہیں آتی تھی۔ چنانچہ حضرت عمر سوداگری کرتے تھے۔ سعد بن ابی وقاص تیر بناتے تھے۔ عثمان بن عفان بزازی کا پیشہ کرتے تھے۔ عمرو بن العاص قصاب تھے اور حدیث ہے کہ حضرت علی دوسروں کے لیے کنویں سے پانی بھر کر اپنی معاش پیدا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر عہد جاہلیت میں بڑے پیمانہ پر کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں شام اور یمن کے متعدد سفر بھی کئے تھے۔ پہلا سفر اٹھارہ برس کی عمر میں کیا جس کا تذکرہ الاصابہ اور اسد الغابہ میں ہے۔

عہد جاہلیت میں بلند مرتبہ عرب قبائل میں باقاعدہ کوئی بادشاہ نہیں ہوتا تھا قریش سب سے ممتاز تھے اس لیے اس قبیلہ کی مختلف شاخوں نے مختلف خدمات اپنے ذمہ لے رکھی تھیں حضرت ابوبکر عقل و فہم۔ اصابت رائے اور حلم و بردباری میں مشہور تھے اس لیے اشناق کی خدمت ان کے سپرد تھی یعنی اگر کوئی واقعہ قتل ہو جاتا تھا تو قاتل سے دیت یا خون بہا لینے کا معاملہ حضرت ابوبکر سے متعلق ہوتا تھا۔ اگر آپ قاتل کی طرف سے ضامن ہو جاتے تو اس کا اعتبار ہوتا تھا۔ کسی اور کی ضمانت معتبر نہیں تھی۔ علم الانساب والاخبار کے ماہر تھے۔ ایک روایت ہے کہ شعر بھی کہتے تھے مگر اسلام کے بعد شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ ابن سعد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرثیہ میں آپ کے کچھ شعر نقل کئے ہیں۔

سلامت فطرت حضرت ابوبکر کی فطرت شروع سے ہی سلیم تھی چنانچہ آپ کو اسلام سے پہلے بھی بت پرستی سے نفرت تھی اور شراب نوشی کو برا جانتے تھے۔ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں ابو نعیم کے حوالے سے حضرت عائشہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ۔

لقد حرّم ابوبکر الخمر — ابوبکر نے عہد جاہلیت میں بھی شراب

[۱] طبقات ابن سعد تذکرہ ابوبکر

علیٰ نفسہ فی الجاھلیۃ اپنے اوپر حرام کر رکھی تھی۔

آپ کا مزاج اور افتادِ طبع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم سے کس درجہ مشابہ اور قرین تھا؟ اس کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔ ایک موقعہ پر ابن الدغنہ نے آپ کے وہی اوصاف و کمالات بیان کئے ہیں جو حضرت خدیجہؓ نے پہلی وحی کے نزول کے موقعہ پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کئے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی ہم عمری کے ساتھ اسی ہم طبعی اور مزاجی توافق کا نتیجہ تھا کہ آپ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں دوستی تھی۔ حافظ ابن حجرؒ نے میمون بن مہران کا قول نقل کیا ہے کہ ابو بکر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیرا راہب کے واقعہ کے بعد سے ہی ایمان لے آئے تھے اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً حضرت ابو بکر بھی سفر شام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ میں نکاح کی جو گفتگو ہوئی تھی اس میں بھی حضرت ابو بکر واسطہ تھے[1]۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر دونوں کے دوستانہ تعلقات دیرینہ تھے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ نبوت سے صرف ایک سال پہلے دونوں میں دوستی ہوئی۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلام کے بعد یہ تعلق اس قدر گہرا ہو گیا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "ہم پر کوئی دن ایسا نہیں گزرا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر صبح و شام نہ آئے ہوں"[2]

قبول اسلام حضرت ابو بکر کے قبول اسلام سے متعلق اسد الغابہ میں مختلف روایات نقل کی گئی ہیں جن میں سے بعض دور از کار اور بعید از قیاس ہیں۔ صحیح بات اس قدر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی تو حضرت ابو بکر اس وقت تجارت کی غرض سے یمن گئے ہوئے تھے جب واپس آئے تو سردارانِ قریش ملنے گئے۔ حضرت ابو بکر نے پوچھا "کوئی نئی بات؟" ان لوگوں نے کہا "ہاں ایک نئی بات یہ ہے کہ ابو طالب کا یتیم بچہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔" یہ سن کر حضرت ابو بکر کا دل تڑپ اٹھا، سردارانِ قریش رخصت ہو گئے تو سیدھے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعثت کے بارے میں سوال کیا اور اسی جلسہ

[1] الاصابہ ج ۲ حرف العین ص ۳۳۵ [2] صحیح بخاری مطبوعہ مطبع مجتبائی ج ۱ ص ۵۵۲

میں مشرف باسلام ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے جس کسی کے سامنے اسلام پیش کیا اس نے تھوڑی بہت جھجک ضرور محسوس کی لیکن جب ابو بکر کے سامنے اسلام پیش کیا تو انھوں نے جھجک کے بغیر اس کو قبول کر لیا۔

پہلے مسلمان کی بحث سب سے پہلا مسلمان کون ہے؟ اس میں مختلف روایتیں ہیں۔ بعض میں حضرت علی اور بعض میں زید بن حارثہ کو یہ شرف دیا گیا ہے۔ محدثین نے تطبیق اس طرح دی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر، عورتوں میں حضرت خدیجہ، بچوں میں حضرت علی اور غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ سب سے پہلے اسلام لائے چنانچہ عمار بن یاسر کا بیان ہے کہ میں نے پہلی مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو اس وقت آپ کے ساتھ صرف پانچ غلام دو عورتیں اور ایک ابو بکر تھے[1] حافظ ابن حجرؒ نے مقدمہ فتح الباری میں ان پانچ غلاموں اور دو عورتوں کے نام یہ بتائے ہیں۔

بلالؓ۔ زید بن حارثہ۔ عامر بن فہیرہ۔ ابو فکیہہ۔ یاسر۔ خدیجہؓ اور سمیہؓ والدہ عمار بن یاسر لیکن ابھی ایک اشکال یہ باقی رہتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کا دعویٰ اپنے متعلق یہ ہے کہ جس روز میں نے اسلام قبول کیا اس روز کوئی بھی اسلام نہیں لایا تھا اور میں سات دن اس طرح رہا کہ میں تین مسلمانوں میں سے ایک تھا[2] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد کا اسلام حضرت ابو بکر کے اسلام پر بھی مقدم ہے۔

علامہ کرمانی نے اس اشکال کا جواب اس طرح دیا ہے کہ ممکن ہے حضرت ابو بکر اسی دن صبح کو اسلام لائے ہوں اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے شام کو اسلام قبول کیا ہو اور ان کو حضرت ابو بکر کے اسلام لانے کی اطلاع نہ ہو[3]

بہر حال ہمارے نزدیک صبح و شام کا فرق کوئی چیز نہیں ہے ممکن ہے کہ اس اعتبار سے حضرت سعد کو یا کسی اور کو بھی حضرت ابو بکر پر تقدم حاصل ہو۔[4] تاہم حضرت ابو بکر کے فخر کے لیے یہی کیا کم ہے کہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بے چون و چرا اسلام قبول کر لینے کی داد دی

[1] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۵۱۷ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۴ [3] حاشیہ نمبر ۵ صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۴ [4] لیکن یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ خود سعد بن ابی وقاص حضرت ابو بکر کی ترغیب و تحریک پر اسلام لائے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں میں کسی بات پر ان بن ہو گئی ہے اور اس سے حضرت ابوبکرؓ کو رنج پہونچا ہے تو آپ نے غصہ کے لب ولہجہ میں فرمایا "اللہ نے مجھ کو تم لوگوں کی طرف مبعوث کیا مگر تم نے مجھ کو جھٹلایا اور ابوبکر نے تصدیق کی اور اپنے نفس اور مال کے ساتھ میری غمگساری کی تو کیا تم پھر بھی میرے ساتھی (ابوبکر) کو میری خاطر نہ چھوڑ دو گے؟ یعنی ان کو کوئی تکلیف نہ پہونچاؤ گے راوی کا بیان ہے کہ حضور نے یہ جملہ دو مرتبہ فرمایا[1]

ابتلاء و آزمائش | حضرت ابوبکر نے اسلام کی پہلی صدائے توحید پر ہی لبیک کہا تھا جبکہ مکہ کی پوری سرزمین اس دعوت ربانی کی مخالفت اور اس کے داعی وحامی کی دشمنی کے نعروں سے گونج اٹھی تھی چند غلاموں اور عورتوں کے مسلمان ہو جانے سے دشمنوں کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا حضرت ابوبکر ایسی باثر اور ذی وجاہت شخصیت بھی جب اس دین حق اور اس کے داعی کی حمایت و نصرت کے لیے سامنے آگئی تو اب مخالفوں اور دشمنوں کا جتنا بھی غیظ و غضب حضرت ابوبکر پر ہوتا کم تھا۔

شیخ المحب الطبری نے حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جب (ابتدائے اسلام میں) مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ۳۹ مسلمان ہو گئے تو ابوبکر نے اصرار کیا کہ اپنے آپ کو ظاہر کیا جائے مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم ابھی تھوڑے ہیں۔ حضرت ابوبکر نے پھر اصرار کیا اور آنحضرتؐ نے پھر انکار فرمایا یہاں تک کہ آنحضرت آمادہ ہو گئے اب جتنے مسلمان تھے مسجد میں آکر بیٹھ گئے۔ ابوبکر خطبہ دینے کھڑے ہوئے۔ آنحضرتؐ بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں مشرکوں کو خبر ہو گئی انہوں نے مسجد میں گھس کر حملہ کر دیا اور مسلمانوں کو نہایت ظالمانہ طریقہ پر زد و کوب کرنا شروع کیا عتبۃ بن ربیعۃ ایک نہایت ظالم و شقی شخص تھا وہ حضرت ابوبکر کی طرف متوجہ ہوا اور آپ کو اس بیدردی کے ساتھ مارنا شروع کیا کہ ناک چپٹی ہو کر چہرہ سے مل گئی۔ بنو تیم کو جو حضرت ابوبکر کا قبیلہ تھا خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے مسجد میں آئے اور مشرکوں کو وہاں سے ہٹا کر حضرت ابوبکر کو ان کے گھر لے گئے۔ ان لوگوں کو اب حضرت ابوبکر کی موت میں کوئی شک نہیں تھا۔ ابوبکر بے ہوش پڑے ہوئے تھے تھوڑی دیر میں ان کو ہوش آیا اور بنو تیم اور ان کے والد ابو قحافہ نے ان سے بات کرنی

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۷

چاہی تو انہوں نے پوچھا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ بنو تیم کو اس پر غصہ آگیا اور وہ ان کو ملامت کرتے ہوئے چل دیئے اب حضرت ابوبکر نے اپنی والدہ ام الخیر سے یہی سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ مگر ان کو بھی پتہ نہیں تھا۔ آخر حضرت عمر کی بہن ام جمیل آئیں اور ان سے یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بخیر و عافیت ہیں اور دار ارقم میں ہیں تو اطمینان ہوا لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ میں اس وقت تک کچھ کھاؤں گا پیوں گا نہیں جب تک خود چل کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ لوں گا میں نے اس کی قسم کھالی ہے چنانچہ اسی حالت میں حضرت ابوبکر ام جمیل اور اپنی والدہ ام الخیر کے سہارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے چہرۂ انور دیکھتے ہی گر پڑے اور اسے بوسہ دیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کی یہ حالت دیکھی تو آپ کا بھی دل بھر آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ اور حضرت ابوبکر کی والدہ ام الخیر نے بھی اسی دن اسلام قبول کیا[1]

ہجرت حبشہ کا ارادہ | کفار قریش کے ظلم و ستم کا پارۂ حرارت جب بجائے گھٹنے کے بڑھتا ہی گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ جاں نثاران اسلام برملا خدا کا نام بھی نہیں لے سکتے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ کی ہجرت کا حکم دیا[2] حضرت ابوبکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی گوارا نہیں کر سکتے تھے لیکن چونکہ یہ ہجرت مصائب و شدائد سے بچنے کے لئے نہیں بلکہ آزادی

[1] الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ ج ۱ ص ۴۶ [2] یاد رکھنا چاہئے کہ ہجرت کا یہ حکم اس لیے نہیں تھا کہ سرفروشان اسلام میں قریش کے مظالم سہنے کی طاقت نہیں رہی تھی بلکہ اس میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس بہانہ اسلام کی دعوت دوسرے ملکوں میں پھیلے گی اور غالباً اسی وجہ سے مہاجرین کی فہرست میں ان نامورانِ قریش کے نام نظر آتے ہیں جو اپنی شخصیت، طرز گفتگو اور عقل و فہم سے اسلام کی تبلیغ کا حق ادا کر سکتے تھے۔ دوسری حکمت یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سبق دینا تھا کہ مسلمانوں پر اگر کہیں اس قدر ظلم کیا جائے کہ ان کو خدا کا نام لینے تک کی اجازت نہ ہو تو پھر بھی مسلمانوں کو وہیں نہ پڑا رہنا چاہئے بلکہ وہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسری محفوظ جگہ میں اپنی تنظیم کرنی اور قوت بڑھانی چاہئے۔

کے ساتھ عبادت الٰہی کرنے کی غرض سے تھی اس بنا پر حضرت ابوبکر نے بھی حبش کی ہجرت کا ارادہ کر لیا لیکن ابھی برک الغماد جو مکہ سے یمن کی جانب پانچ دن کی مسافت پر ہے وہاں پہنچے ہی تھے کہ ابن الدغنہ سے جو قبیلہ قارہ[1] کا سردار تھا ملاقات ہو گئی۔ ابن الدغنہ نے پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے؟" حضرت ابوبکر نے کہا "میری قوم نے مجھ کو نکال دیا ہے تو اب چاہتا ہوں کہ سیاحت کروں اور اپنے رب کی عبادت کروں" ابن الدغنہ بولا "تمہارے جیسے شخص کو کیسے شہر بدر کیا جا سکتا ہے۔ تم غریبوں کی مالی امداد کرتے ہو صلہ رحمی کرتے ہو۔ اپاہجوں کا سہارا ہو اور حق کی طرف سے حوادث کا مقابلہ کرتے ہو۔ چلو میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں وہاں تم خدا کی عبادت کرنا چنانچہ ابن الدغنہ حضرت ابوبکر کو اپنے ساتھ مکہ لایا اور حضرت ابوبکر کے جو اوصاف اوپر بیان کئے ہیں انہیں کا حوالہ دیکر کہا کہ کیا غضب ہے تم ایسے شخص کو شہر میں رہنے نہیں دیتے۔ قریش نے کہا کہ اگر وہ چھپ کر عبادت کریں تو ہم ان سے تعرض نہیں کریں گے۔ وہ یہاں رہیں تم نے جو ان کو پناہ دی ہے وہ ہمیں اس شرط پر منظور ہے۔ اس عہد کے مطابق حضرت ابوبکر کچھ دنوں تک تو پوشیدہ طور پر ہی عبادت کرتے رہے لیکن آخر نہ رہا گیا۔ اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنائی یہاں نماز پڑھتے تھے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور روتے تھے ایک تو کلام الٰہی اور پھر حضرت ابوبکر کی درد آفریں و اثر انگیز آواز جب قرآن کی تلاوت کرتے تو قریش کی عورتیں اور نوجوان ارد گرد جمع ہو جاتے اور اثر پذیر ہوتے، قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی کہ ابوبکر معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں ان سے کہو کہ اگر ان کو تمہاری پناہ میں رہنا ہے تو معاہدہ کے مطابق عبادت اور تلاوت چھپ کر کریں اور اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوں تو تمہاری پناہ سے دست کش ہو جائیں ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر سے یہی بات کہی تو آپ نے فرمایا[2] "مجھ کو تمہاری پناہ کی ضرورت نہیں اب میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔"

اسلام کیلئے ایثار و فداکاری یہ دور پیروانِ اسلام کے لیے نہایت پُرآشوب اور جد

[1] یہ بنو الہون بن خزیمہ بن کنانہ کا قبیلہ ہے تیراندازی میں ضرب المثل تھا کہتے ہیں انصف القارة من راماها یعنی جس نے قبیلہ قارہ کے ساتھ تیراندازی میں مقابلہ کیا اس نے اس کے ساتھ انصاف کیا۔ النہایہ لابن الاثیر و تاج العروس ج ۳ ص ۵۱۰۔

[2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۵۲ - ۵۵۴

وجہد صبر آزما تھا۔ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ آپ کے جاں نثاروں کو اس قدر شدید تکلیفیں پہونچائی جاتی تھیں کہ آج ان کے تصور سے بھی جسم پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ لیکن اسلام وہ نشہ نہیں تھا جس کو جسمانی تکلیفوں کی ترشی اتار سکتی۔ حضرت ابوبکر کو اپنی تو چنداں فکر نہیں تھی اس بات کا البتہ برابر دھیان رکھتے تھے کہ حضور سرور عالم کو کوئی تکلیف نہ پہونچنے پائے۔ جب کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش آیا فوراً موقع پر پہنچ جاتے اور آپ کی مدد کرتے چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں تقریر کر رہے تھے کہ مشرکین آپ پر پل پڑے اور اس قدر گستاخی کی کہ آپ بیہوش ہو گئے۔ حضرت ابوبکر نے بڑھ کر کہا "کم بختو! کیا تم صرف اس لیے ان کو قتل کر دوگے کہ یہ ایک خدا کا نام لیتے ہیں"[1]

ایک دفعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط ادھر آنکلا۔ اس نے اپنی چادر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں ڈال کر اس کو اس طرح بل دیا کہ سردار دو عالم کا دم گھٹنے لگا۔ اتنے میں حضرت ابوبکر بھی پہونچ گئے عقبہ کو کاندھوں کے بل دھکا دیکر وہاں سے ہٹایا اور بولے "ارے ظالمو! کیا تم اس کو قتل کرنا چاہتے ہو۔ جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے"[2]

مسند بزار میں حضرت علی سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ قریش نے آپ کو گھیر رکھا تھا کوئی آپ کو پکڑ کر کھینچتا کوئی دھکا دیتا اور سب یہ کہتے جاتے تھے کہ تو وہی ہے جس نے سب خداؤں کو ملا کر ایک کر دیا ہے حضرت علی کا بیان ہے کہ یہ منظر اس قدر بھیانک تھا کہ ہم میں سے کسی کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ البتہ ہاں ابوبکر آگے بڑھے اور انہوں نے قریشیوں میں سے کسی کو مارا نہیں کسی کو دھکا دیا کسی کو پیچھے ہٹایا یہ سب کچھ کرتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔ "بد بختو کیا تم اس کو قتل کر دوگے جو اللہ کو اپنا رب کہتا ہے" راوی کا بیان ہے کہ یہ کہکر حضرت علی نے اپنی چادر اٹھائی اور رونے لگے۔ یہاں تک کہ داڑھی تر ہو گئی۔ اسی حالت میں لوگوں سے پوچھا "اچھا بتاؤ آل فرعون کا مومن اچھا تھا یا ابوبکر؟" لوگ خاموش رہے آپ نے دریافت

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۱۲۹

[2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۴۔

فرمایا کیا تم مجھ کو جواب نہیں دو گے؟ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ بخدا! ابوبکر کا ایک لمحہ آل فرعون کے مومن جیسے شخص کے ہزاروں لمحوں سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہ شخص ایمان پوشیدہ رکھتا تھا اور ابوبکر اپنے ایمان کا اعلان کرتے تھے۔

غلاموں پر قریش کے مظالم اور حضرت ابوبکر کی داد رسی۔ دعوت اسلام کے اس پُر آشوب دور میں حضرت ابوبکر صدیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ راست اور قوتِ بازو تھے جنہوں نے زندگی کا ہر سانس دعوتِ ربانی کی نشر و اشاعت اور اس کے استحکام و تقویت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ایک طرف وہ نامورانِ قریش کو، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کھینچ کھینچ کر اسلام کی طرف لاتے تھے اور دوسری جانب اُن غریب دبے کس غلاموں کی دادرسی اور گلو خلاصی اپنے مال سے کرتے تھے جو دعوتِ حق کو قبول کر لینے کے جرم میں قریش کے ظلم و ستم کا سب سے بڑا نشانہ تھے۔ ہم نے ان غلاموں کے حالات "غلامانِ اسلام" میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ ذیل میں ان کے نام مع مختصر تعارف کے لکھتے ہیں۔

حضرت بلال حبشی اسلام کے سب سے پہلے موذن ہیں اور کیا عجب بات ہے کہ اربابِ سیر انہیں کے متعلق لکھتے ہیں اول من اظہر الاسلام یعنی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا، نسلاً حبشی اور اُمیہ بن خلف کے غلام تھے۔ اُمیہ ٹھیک دوپہر کے وقت جبکہ عرب کی زمین آگ کا توا بن جاتی تھی۔ حضرت بلال کو اسی توے پر لٹا دیتا اور پھر پتھر کی ایک چٹان سینہ پر رکھتا کہ جنبش نہ کر سکیں۔ اور ان سے کہتا کہ اسلام سے توبہ کرو ورنہ اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائے گا لیکن باایں ہمہ حضرت بلال فرماتے "احد احد" خدا ایک ہے ایک ہے اب یہ شقی آپ کے گلے میں ایک رسی باندھ کر چھوکروں کے حوالہ کرتا جو اس حالت میں ان کو شہر میں گشت کراتے پھرتے لیکن اس عالم درد و کرب میں بھی زبان پر نعرہ تھا تو یہی "احد احد" حضرت ابوبکر صدیق نے جب یہ مظالم دیکھے تو امیہ بن خلف سے حضرت بلال کو خرید کر اللہ کے لیے آزاد کر دیا۔ حضرت عمر فاروق فرمایا کرتے تھے "ابوبکر سیدنا و اعتق سیدنا" ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار کو آزاد کیا۔

عامر بن فہیرہ طفیل بن عبداللہ جو حضرت عائشہ کے اخیافی (ماں شریک) بھائی تھے ان کے غلام تھے۔ حضرت بلال، حضرت عمار اور حضرت مصعب بن عمیر کے ساتھ عامر بن فہیرہ نے بھی اسلام قبول کیا اور ان کو بھی سخت شدائد و مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ اسلام پر مضبوطی اور استقلال کے ساتھ جمے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق کو ان حالات کا علم ہوا تو ان کو بھی خرید کر آزاد کیا اُن کا ذکر آگے ہجرت مدینہ کے سلسلہ میں بھی آئے گا[1]

حضرت ابوفکیہ قبیلۂ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اسلام کی صدائے کفر شکن مکہ میں بلند ہی ہوئی تھی کہ حضرت بلال اور حضرت صہیب کی طرح فوراً مسلمان ہو گئے ان پر سخت مظالم کیے جاتے تھے۔ صفوان آتش خیز دوپہر میں تپتے ہوئے ریت پر منہ کے بل اوندھا لٹا دیتا اور پھر کمر پر ایک بھاری پتھر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کر سکیں۔ حضرت ابوفکیہ تاب نہ لاکر بیہوش ہو جاتے۔ اس بدبخت کو پھر بھی رحم نہ آتا۔ اسی حالت میں پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ان کو گھسیٹا پھرتا ایک دن صفوان نے حضرت ابوفکیہ کو گرم ریت پر ڈال کر اُن کو اس بے رحمی و بے دردی سے مارا کہ ان کے مر جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی۔ اتنے میں حضرت ابوبکر کا اُدھر سے گزر ہوا حضرت ابوفکیہ کو اس حالت میں دیکھ کر بے ساختہ جی امڈ آیا۔ فوراً اُن کو خریدا اور آزاد کر دیا[2]

حضرت لُبینہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گھرانے کی باندی تھیں۔ ابھی حضرت عمر اسلام نہیں لائے تھے کہ یہ مشرف باسلام ہو چکی تھیں حضرت عمر کی درشت مزاجی مشہور ہے۔ اس غریب کو اس بیدردی سے مارتے تھے کہ مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے "میں ذرا دم لے لوں تو پھر ماروں گا" لیکن حضرت لبینہ نہایت استقلال و پامردی سے جواب دیتیں "اگر تم نے اسلام قبول نہیں کیا تو اللہ اس کا بدلہ لے گا"[3]

حضرت زنیرہ یہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھرانے کی باندی تھیں۔ اسلام سے قبل حضرت عمر ان کو بھی بہت ستاتے اور پریشان کرتے تھے۔ ابوجہل نے ایک مرتبہ ان کو ایسا مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

حضرت لُبینہ اور حضرت زنیرہ کے لیے کیا یہ شرف کچھ کم ہے کہ ان کو حضرت عمر فاروقؓ

---

۱ اسد الغابہ ج ۳ ص ۹۰ ۲ اصابہ تذکرہ حضرت ابوفکیہ ۳ استیعاب تذکرہ عمر بن الخطاب۔

ایسے لیے آقا پر بھی قبولِ اسلام کے معاملہ میں تقدم حاصل ہے۔ حضرت ابوبکر کو ان غریبوں کے مصائب و شدائد کا علم ہوا تو ان کو بھی خرید کر آزاد کر دیا۔

حضرت نہدیہ اور ام عبیس یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں قبولِ اسلام کے جرم میں ان پر بھی سخت جبر و تشدد کیا جاتا تھا۔ آخر صدیقی جود و کرم کے دستِ غریب نواز نے ان ستم رسیدوں کو بھی غلامی سے نجات دلائی۔

طبرانی نے حضرت عروہ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکر نے جن غلاموں اور کنیزوں کو اپنے روپیہ سے خرید کر آزاد کیا ان کی تعداد سات ہے لیکن ہمارے خیال میں اس خاص معاملہ میں حضرت ابوبکر کو عام شہرت حاصل تھی وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اصل تعداد سات سے کہیں زیادہ ہوگی لیکن چونکہ اور دوسرے غلاموں اور باندیوں کو یہ شہرت حاصل نہیں ہو سکی اس بنا پر وہ شمار میں نہیں آسکے[1]

حضرت ابوبکر کی یہ فیاضیاں خالصۃً لوجہ اللہ تھیں ایک مرتبہ ان کے والد ابوقحافہ نے کہا "ابوبکر تم زیادہ تر عورتوں اور ان میں بھی بوڑھیوں کو خرید کر آزاد کرتے ہو۔ بھلا یہ تمہارے کس کام آئیں گی۔ اگر ان کے بجائے تم تندرست و توانا غلام مردوں کو خرید کر آزاد کرو تو کبھی وقت پڑنے پر وہ تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں۔"

حضرت ابوبکر نے کہا "ابا! میں تو یہ سب کچھ انعام خداوندی حاصل کرنے کے لئے کرتا ہوں[2]

اسلام جس نے آگے چل کر اقوام عالم کی تاریخ کے دفتر الٹ دیئے اس کے سب سے پہلے علمبردار حامی اور جاں نثار کون تھے یہی چند غلام اور کنیزیں جن میں سے کئی ایک پروردہ احسانِ صدیقی تھے۔ رحمتِ عالم کو ان کی دل جوئی اس حد تک منظور تھی کہ

[1] اصابہ اور اسد الغابہ دونوں میں حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد تو سات ہی لکھی ہے لیکن ایک تو ان سات غلاموں کا وصف یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کو عذاب دیا جاتا تھا اور دوسرے یہ کہ دونوں کتابوں میں تعداد کے ایک ہونے کے باوجود ناموں میں اختلاف ہے یہ دونوں باتیں بھی اس امر کا قرینہ ہیں کہ حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد سات سے زیادہ ہوگی۔ [2] ابن جریر طبری ۱۲

اگر حضرت ابوبکر کی زبان سے بھی ان کے حق میں کوئی بات ایسی نکل جاتی جو ان کے لیے آزردگی کا باعث ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کو فوراً متنبہ فرما دیتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ابوسفیان (مسلمان ہونے سے پہلے) حضرت سلمان فارسی، حضرت بلال حبشی اور حضرت صہیب رومی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ان تینوں نے اس کو دیکھ کر کہا "اللہ کی تلوار نے اس دشمنِ خدا کی گردن نہیں اڑائی" اس وقت حضرت ابوبکر بھی کہیں پاس ہی تھے۔ یہ سن کر بولے "تم لوگ قریش کے بزرگ کی نسبت ایسا کہتے ہو؟" پھر جب ابوبکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کا ذکر فرمایا تو آپ نے فرمایا "ابوبکر" تم نے شاید ان (غلاموں) کو خفا کر دیا۔ اگر ایسا ہے تو گویا تم نے خدا کو ناراض کر دیا۔ حضرت ابوبکر یہ سن کر فوراً پلٹے اور ان تینوں سے آکر کہا "میرے پیارے بھائیو! کیا میں نے تم کو ناراض کر دیا ہے انہوں نے جواب دیا نہیں! ہم خفا نہیں ہیں۔" اے بھائی اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے[1]

حضرت ابوبکر کے انفاقِ مال کی اہمیت اسلام اس وقت صد درجہ غریب اور بے برگ و نوا تھا ایک طرف ان غلاموں کے استقلال اور ان کی پامردی نے مکہ کی سرزمین میں اسلام کے قدم جمائے تو دوسری جانب حضرت ابوبکر نے اللہ کی راہ میں دولت خرچ کر کے ان قدموں میں توانائی اور مضبوطی پیدا کی چنانچہ جیسا کہ تم نے ابھی دیکھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں ان غلاموں کی دل جوئی اور دل دہی فرماتے تھے حضرت ابوبکر کے انفاقِ مال کی اہمیت کا بھی سپاس گزارانہ اعتراف کرتے تھے حدیث اور تاریخ و سیر کی کتابوں میں اس قسم کے متعدد مواقع کا ذکر ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔

ما نفعنی مال احد قط ما	ابوبکر کے مال نے مجھ کو جو نفع پہونچایا
نفعنی مال ابی بکر[2]	کسی اور کے مال نے اتنا نہیں پہنچایا

ایک دوسرے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زیادہ امتنان و تشکر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

[1] الاتحاف (؟) الجامع الاصول ج ۳ ص ۲۲۴ [2] جامع ترمذی مناقب ابی بکر الصدیق

انہ لیس من الناس احدٌ امنّ علیٰ فی نفسہ ومالہ من ابی بکر .	بے شبہ جان ومال کے لحاظ سے ابوبکر سے زیادہ مجھ پر کسی اور کا احسان نہیں ہے ۔"

تو حضرت ابوبکر رونے لگے اور عرض کیا "یا رسول اللہ! یہ جان اور مال کیا کسی اور کے لیے بھی ہے ۔ [1]

قرآن مجید کا اعتراف اسی بنا پر خود قرآن نے ان مخلصوں کو جو فتح مکہ سے قبل اپنے جان و مال سے اسلام کی مدد کرتے تھے (اور) کوئی شبہ نہیں کہ ان میں حضرت ابوبکر کا نام سر فہرست ہے) اُن لوگوں کے مقابلہ میں خاص عظمت و برتری کا مستحق قرار دیا ہے جو فتح مکہ کے بعد ایسا کرتے تھے ۔ چنانچہ ارشاد ہے ۔

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا . (سورۃ الحدید)	تم میں سے وہ لوگ جو فتح مکہ سے پہلے خرچ کرتے تھے اور قتال کرتے تھے وہ درجہ کے اعتبار سے بہت بڑے ہیں ان لوگوں سے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا اور قتال کیا ۔

حضرت ابوبکر جب اسلام لائے تھے ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے لیکن جب مدینہ پہنچے ہیں تو صرف پانچ ہزار درہم رہ گئے تھے [2] باقی سب کی سب اللہ کے راستہ میں خرچ کر دی ۔

حضرت عائشہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح قریش آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جن جن طریقوں سے ستا رہے تھے اُن سب کے باوجود آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ جو قریش کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ابوطالب جو آپ کے چچا تھے اور قریش میں بڑی باا ثر شخصیت رکھتے تھے ان دونوں کے وجود سے آپ کو بڑی قوت اور دل جمعی تھی لیکن سنہ ۱۰ نبوی میں چند روز کے آگے پیچھے سے دونوں کی وفات ہو گئی طبعی طور پہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حادثہ کا اس قدر ملال ہوا کہ آپ اس سال کو عام الحزن یعنی غم کا سال کہتے تھے اور اکثر اداس اور غمگین نظر آتے تھے۔ اسی اثنا میں خولہ بنت حکیم نے

[1] کنز العمال ج ۶ ص ۳۱۶ [2] اصابہ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ج ۲ ص ۸۳۱

حضرت عائشہ کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کی تحریک کی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خواب کے ذریعہ اس قران السعدین کی اطلاع پہلے ہی دی جا چکی تھی [1] اس لیے آپ راضی ہو گئے ۔ اب خولہ نے حضرت عائشہ کی والدہ ام رومان سے اس کا ذکر چھیڑا انہوں نے حضرت ابوبکر سے تذکرہ کیا ۔ وہ بولے کہ میں جبیر بن مطعم کو زبان دے چکا ہوں ۔ لیکن جب جبیر بن مطعم سے اس معاملہ میں بات چیت کی گئی تو اس نے انکار کر دیا ۔ اب حضرت ابوبکر آزاد تھے ۔ چنانچہ آپ نے چار سو درہم پر حضرت عائشہ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا ۔ اس وقت صرف نکاح ہوا تھا اور حضرت عائشہ کی عمر چھ برس کی تھی ۔ غرض کہ اس رشتہ مصاہرت کے قائم ہو جانے سے حضرت ابوبکر صدیق کی قبائے شرف و مجد میں ایک اور تکمۂ زریں کا اضافہ ہوا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک ایسی رفیقۂ حیات کا انتظام ہو گیا جو آگے چل کر اسلامی احکام و مسائل کی تشریح و توضیح اور دین حق کی تبلیغ و اشاعت میں آپ کی دست و بازو ثابت ہوئیں ۔

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۱

ہجرت مدینہ

مدینہ میں اسلام کی مقبولیت اسلام کا جو آفتاب جہاں تاب مکہ کے افق سے طلوع ہوا تھا اس کی کرنیں مدینہ کو منور کرنے لگی تھیں۔ یہاں سے مختلف قبیلوں کے لوگ جو ہر سال حج کرنے کے لیے مکہ معظمہ آتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچکر قرآن مجید کی آیتیں سناتے اور دین حق کی دعوت دیتے۔ اکثر موقعوں پر حضرت ابوبکر بھی ہمراہ ہوتے۔ یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ اختلاط وارتباط رکھنے کی وجہ سے دین الٰہی کے تصور سے بے بہرہ نہیں تھے اور ساتھ ہی توراۃ کی پیش گوئی کے باعث ایک پیغمبر موعود کی بعثت کے منتظر تھے۔ اس بنا پر اب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ کی زبان حق ترجمان سے قرآن مجید سُنا تو ان کو اسلام کی دعوت قبول کرنے میں زیادہ پس وپیش نہیں ہوا بلکہ انہوں نے جلدی اس لیے کی کہ کہیں مدینہ کے یہودی اس سعادت اندوزی میں ان پر سبقت نہ لے جائیں۔ یہ حجاج خود مسلمان ہوتے تھے اور پھر چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خواہش کے مطابق اپنے مبلغین بھی مدینہ میں بھیجنے شروع کر دیئے تھے جو وہاں رہ کر دین حق کی نشر واشاعت کا فرض انجام دے رہے تھے اس بنا پر اسلام جو خود اپنے وطن میں غریب الوطن تھا مدینہ کی سرزمین میں سرسبز وشاداب ہو رہا تھا اور وہاں روز بروز اس کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی۔

قریش کا ناپاک منصوبہ قریش نے جب دیکھا کہ اب تک انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جان نثاروں کو ستانے۔ ڈرانے اور پریشان کرنے کی جتنی بھی تدبیریں کی ہیں ان میں سے ایک تدبیر بھی کارگر نہیں ہوئی یہاں تک کہ تین برس تک آل ہاشم شعب ابی طالب

میں محصور رہے اور اس مدت میں بھوک اور پیاس کی کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو انہوں نے اٹھائی نہ ہو مگر اس کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلا۔ بلکہ اور الٹا اثر یہ ہو رہا ہے کہ اسلام مدینہ میں پھیل رہا ہے اور اپنی جڑیں مضبوط کرتا جا رہا ہے تو اب ان لوگوں نے دار الندوہ میں جو ان کا دار الشورہ تھا ایک اجتماع کیا اور باہم مشاورت کی کہ اب انہیں کیا کرنا چاہئے۔ اس اجتماع میں نامور زعمائے قریش شریک تھے۔ مختلف رائیں پیش ہوئیں آخر ابوجہل نے کہا "ہر قبیلہ سے ایک ایک آدمی چنا جائے اور سب لوگ ایک ساتھ مل کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تلواروں سے حملہ کر کے ان کا کام تمام کر دیں، اس صورت میں ان کا خون تمام قبیلوں میں بٹ جائے گا اور آلِ ہاشم کے لیے ان کا اکیلے مقابلہ کرنا آسان نہ ہوگا۔"

اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا۔

ہجرت نبوی کے لیے حکم ربانی کا انتظار ادھر مدینہ میں اسلام کی پذیرائی کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اکثر جان نثاروں کو پہلے ہی مدینہ کی ہجرت کا حکم دے دیا تھا۔ اور اکثر صحابہ وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق بھی مدینہ پہنچنے کی جلدی کر رہے تھے لیکن ان کی قسمت میں رفیق غار ثور ہونے کی سعادت لکھی تھی اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ٹال رہے تھے اور خود اپنے لیے حکم خداوندی کے منتظر تھے۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا۔ ادھر دار الندوہ میں یہ قرارداد منظور ہو رہی تھی کہ رحمتِ عالم کے وجودِ مسعود سے عالم کو محروم کر دیا جائے اور ادھر رب السمٰوٰت والارض نے اپنے حبیب پاک کو یہاں سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا اور اعلان کر دیا "اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ" "اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد نہیں کرتے تو نہ کرو اللہ ان کی مدد کرے گا۔" امام بخاری نے حضرت عائشہؓ کی زبانی یہ پوری داستان بڑی تفصیل سے سنائی ہے۔ چونکہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ عظمت وتوکل علی اللہ، اور حضرت ابوبکر صدیق کی ذات اقدس کے ساتھ غیر معمولی محبت اور شیفتگی اور ساتھ ہی حسن انتظام۔ نفاست پسندی اور لطافت طبع پر روشنی پڑتی ہے اس لیے ہم اس کو بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔ اصل روایت میں کہیں کہیں دوسری روایات سے مدد لے کر اضافہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ پورا واقعہ ایک ہی جگہ آ جائے۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت عائشہؓ اگرچہ

اس وقت کم سن تھیں لیکن ظاہر ہے ان کی یہ روایت گویا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت ابوبکر صدیق کی روایت ہے [1]۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

حضرت ابوبکر کی ہجرت کی نیت سے تیاری

"جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ مجھ کو تم لوگوں کا مقام ہجرت دکھا دیا گیا ہے اور وہ ایسا اور ایسا ہے تو بہت سے لوگوں نے مدینہ جانا شروع کر دیا یہاں تک کہ جو مسلمان حبش چلے گئے تھے انہوں نے بھی وہاں سے واپس آکر مدینہ کا رخ کیا۔ حضرت ابوبکر نے بھی تیاری کر لی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔ ابھی ذرا ٹھہرو، میں امید کرتا ہوں کہ مجھ کو عنقریب اجازت ملے گی۔ ابوبکر بولے "میرا باپ آپ پر قربان! کیا آپ کو اس کی امید ہے؟" ارشاد ہوا "ہاں" یہ سن کر حضرت ابوبکر نے طے کر لیا کہ بس اب وہ حضور پر نور کے ساتھ ہی چلیں گے، اُن کے پاس دو اونٹنیاں تھیں ان کو چار مہینے پہلے سے ببول کی پتیاں کھلانا شروع کر دیں تاکہ سفر ہجرت میں کام آئیں

ہجرت کے لیے روانگی چار مہینے اسی طرح گزر گئے ایک دن دوپہر کا وقت تھا ہم سب لوگ اپنے گھر میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر سے کہا "وہ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر ڈھانکے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔" "یہ وقت تو حضور کے یہاں آنے کا نہیں ہے" حضرت ابوبکر نے سرکار دو عالم کو دیکھا تو بولے "میرے ماں باپ آپ پر قربان! اس ناوقت آپ ضرور کسی اہم کام کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔" اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہونچ ہی گئے دروازہ پر کھڑے ہو کر اجازت مانگی اجازت دی گئی تو آپ گھر میں داخل ہوئے اور حضرت ابوبکر سے فرمایا "جو لوگ اس وقت تمہارے پاس ہیں ان کو ہٹا دو۔" حضرت ابوبکر نے جواب دیا "حضور! یہاں آپ کا غیر کون ہے" اب آپ نے فرمایا "مجھ کو ہجرت کا حکم مل گیا ہے۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا "تو میں بھی ساتھ چلوں گا؟" ارشاد ہوا "ہاں" اب حضرت ابوبکر نے کہا "تو آپ میری ان دو اونٹنیوں میں سے کوئی ایک اونٹنی لے لیجیے۔" ارشاد ہوا۔ اچھا! مگر قیمت

[1] چنانچہ امام بخاری نے باب مناقب المہاجرین وفضلہم کے ماتحت واقعات ہجرت سے متعلق خود حضرت ابوبکر کی بیان کی ایک طویل روایت نقل کی ہے ہم نے یہ روایت اور حضرت عائشہ کی بیان کردہ روایت جو امام بخاری نے باب ہجرۃ النبی واصحابہ الی المدینہ کے ماتحت بیان کی ہے ان دونوں کو ملا کر ہجرت کی روداد مرتب کی ہے۔

کے ساتھ" [1]

اب جلدی جلدی سفر کی تیاری ہونے لگی۔ کئی دن کی راہ تھی اس کے لیے کھانا پکا کر ناشتہ دان (سُفرہ) میں رکھا گیا۔ ناشتہ دان کے منہ پر باندھنے کے لیے کچھ نہیں تھا حضرت ابوبکر کے حکم سے ان کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماء نے اپنے نطاق یعنی کمر بند (پٹکا) [2] کے دو ٹکڑے کئے اور اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا۔ اسی بنا پر اُن کو ذات النطاقین کہا جاتا ہے۔

غارِ ثور میں پوشیدگی اُدھر دار الندوہ کی قرارداد کے مطابق قریش کے لوگوں نے جو قتل کے ارادے سے آئے تھے سرِ شام ہی ہو چکا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ قریش زنان خانہ میں گھسنا بہت معیوب سمجھتے تھے اس لیے اس تاک میں تھے کہ حضورؐ باہر تشریف لائیں گے تو یہ اپنا منصوبہ پورا کریں گے حضورؐ کے پاس بہت سے لوگوں کی امانتیں تھیں ان کی واپسی کا انتظام کرنا ضروری تھا۔ اس لیے وہ سب حضرت علی کے سپرد کیں [3] اور رات کا ایک حصہ گزر جانے کے بعد جب ان محاصرین کی پلک جھپک گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر حضرت ابوبکر کے گھر پہونچے [4] اور وہاں سے دونوں نے مکہ کو الوداع کہا اور روانہ ہو گئے۔ مکہ سے تین میل بجانب جنوب ایک پہاڑ ہے جس کا نام ثور ہے یہاں پہونچے اور ایک غار میں روپوش ہو کر بیٹھ گئے۔ غار میں تین شب قیام رہا۔ حضرت ابوبکر کے صاحبزادے عبداللہ جو نوجوان مگر نہایت فہیم اور سمجھدار تھے وہ شب غار میں بسر کرتے تھے اور علی الصباح منہ اندھیرے

[1] غور کرو حسن معاملہ کی انتہا ہے کہ اس نازک وقت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر ایسے جاں نثار کی اونٹنی کو مفت میں قبول کر لینے کے لیے تیار نہیں اور ادھر حسن ادب و اطاعت کی صد ہے کہ حضرت ابوبکر کو قیمت لینے میں انکار نہیں۔ چنانچہ واقدی کے بیان کے مطابق اونٹنی کی قیمت آٹھ سو درہم تھی [2] نطاق کے معنی پٹکا ہیں اور عرب میں عام دستور تھا کہ عورتیں پٹکا باندھتی تھیں تعجب ہے کہ مولانا عبداللہ العمادی نے کیونکر نطاق کا ترجمہ دوپٹہ لکھ دیا ہے (دیکھو ترجمہ طبقات ابن سعد جزو ثامن حصہ اول ص ۵) حالانکہ دوپٹہ کے لیے عربی میں خمار کا لفظ بولا جاتا ہے [3] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت علی [4] بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے خروج من مکہ کا ذکر ہے لیکن واقدی کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر کے مکان کی پشت میں جو کھڑکی تھی یہ خروج اس سے ہوا تھا۔ ہم نے دونوں بیانات کو جمع کر دیا ہے

مگر اکثر قریش سے گھل مل جاتے تھے یہاں قریش میں باہم جو مشورہ یا منصوبہ ہوتا اسے محفوظ کر لیتے اور جب اندھیرا ہو جاتا پھر غارِ ثور پہونچکر دونوں کو اس سے باخبر کر دیتے تھے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن ابی بکر گھر سے کھانا بھی لاتے تھے۔ عامر بن فہیرہ حضرت ابو بکر صدیق کے آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ رات گئے بکری چرا کر لاتے اور رفیقانِ غارِ ثور دونوں اس پر گزارہ کرتے۔ منہ اندھیرے عامر بن فہیرہ نکل جاتے اور شام ہونے پر واپس آجاتے تینوں دن یہی معمول رہا۔

ادھر صبح کے وقت قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچ نکلنے کی خبر ہوئی تو انہیں اپنے منصوبے کی ناکامی کا بے حد افسوس ہوا اور بڑے جز بز ہوئے چاروں طرف آپ کی تلاش میں آدمی دوڑائے یہاں تک کہ ایک مرتبہ غار کے دہانہ تک پہونچ گئے ان کی آہٹ پاکر حضرت ابو بکر کو بڑی تشویش ہوئی اور عرض کیا حضور! یہ لوگ اپنے قدموں کی طرف دیکھیں تو ہم انکو نظر آجائیں گے۔ سرکارِ دو عالم نے فرمایا۔

ماظنك يا ابابكر باثنين الله ثالثهما[1] اے ابو بکر ان دو کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے جنکا تیسرا ساتھی اللہ ہو۔

عبداللہ بن اریقط جو عبد بن عدی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور مسلمان نہیں ہوا تھا۔ مگر اس کی امانت و دیانت پر اعتماد تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی رہنمائی کے لیئے اس کو اجرت پر مقرر کر لیا تھا اور دونوں اونٹنیاں اس کے حوالہ کر دینے کے بعد اس سے یہ بات طے کر لی تھی کہ وہ تین شب گزارنے کے بعد صبح کو اونٹنیاں لے کر غارِ ثور میں پہونچ جائیگا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر اور عامر بن فہیرہ۔ عبداللہ بن اریقط کی رہنمائی میں روانہ ہوئے۔

ایک دن اور ایک رات مسلسل چلنے کے بعد دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ بہت تیز ہو گئی تو حضرت ابو بکر نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کہیں کوئی سایہ ملے تو وہاں ٹھہریں اتفاق سے ایک چٹان نظر آئی اس کے نیچے سایہ تھا حضرت ابو بکر نے اس جگہ کو ہموار کیا۔ فرش بچھایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استراحت فرمانے کی درخواست کی حضور لیٹ گئے اب حضرت ابو بکر یہ دیکھنے نکلے کہ کہیں کوئی شخص تعاقب میں تو نہیں آرہا ہے یہ تلاش میں

[1] بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ (باب مناقب المہاجرین)

ادھر اُدھر پھر رہے تھے کہ ایک چرواہا نظر آیا جو سایہ کی جستجو میں اسی چٹان کی طرف اپنی بکریاں ہانکے چلا آرہا تھا۔ حضرت ابو بکر نے پوچھا "تم کون ہو" اس نے قریش کے ایک آدمی کا نام لیا جس کو حضرت ابو بکر پہچانتے تھے اور کہا کہ میں اس کا نوکر ہوں حضرت ابو بکر نے پوچھا "تیری بکریوں میں دودھ ہے؟" وہ بولا "ہاں" پھر دریافت کیا "کیا تو ہمارے لیئے دودھ دوھ دے گا؟" اُس نے کہا "جی ہاں"

اب لڑکے نے حضرت ابو بکر کی فرمائش پر دودھ دوہنے کے لیئے ایک بکری کو اپنے قابو میں کیا تو حضرت ابو بکر نے ازراہِ نفاست پسندی (ادب نبوی ﷺ) کہا کہ پہلے ان تھنوں کو غبار سے تو پاک و صاف کر لے اُس کے بعد خود اس سے کہا کہ تیرے ہاتھ غبار آلود ہیں ان کو بھی جھاڑ اور ساتھ ہی اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مار کر بتایا کہ اس طرح۔ لڑکے نے جب ایسا کر لیا تو اس نے دودھ دوھا۔ حضرت ابو بکر خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلیئے ایک چمڑہ کا برتن لیکر آئے تھے۔ دودھ اس میں انڈیلا برتن پر کپڑا باندھا اور اُسے لیکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ اسوقت آپ کچھ نیند لیکر بیدار ہو چکے تھے۔ عرض کیا حضور دودھ پی لیں آپ نے درخواست قبول فرمائی تو حضرت ابو بکر کے دل کی باچھیں کھل گئیں اب حضرت ابو بکر نے کہا "یا رسول اللہ ﷺ چلنے کا وقت ہو گیا ہے" ارشاد ہوا "بہت بہتر" اچھا تو اب یہاں سے روانگی شروع ہو گئی۔

سراقہ بن جعشم کا واقعہ

ادھر اُدھر تلاش کے بعد جب آنحضرت ﷺ اور حضرت ابو بکر کا کہیں پتہ نہیں چلا تو قریش نے چاروں طرف قاصد روانہ کر کے اعلان کرا دیا کہ جو کوئی شخص آنحضرت ﷺ یا حضرت ابو بکر کو قتل کریگا یا زندہ گرفتار کرے گا اس کو فی کس ایک خون بہا (سو اونٹ) کے برابر انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن جعشم جو بنو مدلج سے تعلق رکھتا تھا اس نے یہ اعلان سنا تو ایک شخص سے ان کا پتہ بتانے پر وہ گھوڑے پر بیٹھا اور نیزہ ہاتھ میں لیے ان دونوں کی تلاش میں نکل پڑا۔ گھوڑا دوڑاتا ہوا چلا آرہا تھا کہ گھوڑے کی ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔ اب اس نے ترکش سے فال کے طور پر تیر نکالے کہ مجھ کو تعاقب کرنا چاہیئے یا نہیں جواب مرضی کے مطابق نہیں نکلا۔ مگر لالچ بری بلا ہے وہ پھر دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور بالکل ہی قریب

پہونچ گیا حضرت ابوبکر نے اُسے دیکھا تو گھبرا کر بولے یا رسول اللہ صلعم! یہ ہماری طلب میں آگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (ترجمہ گھبراؤ نہیں! اللہ بےشک ہمارے ساتھ ہے۔

خود سراقہ کا جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ بیان ہے کہ میں ان دونوں کے اسقدر قریب پہونچ گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ پڑھنے کی آواز سُن رہا تھا اور یہ بھی کہتا ہے کہ میں نے اس وقت دیکھا کہ آنحضرت صلعم التفات نہیں کر رہے تھے لیکن حضرت ابوبکر از حد اضطراب میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چلتے تھے اب گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ نیچے گر پڑا۔ گھوڑے پر چابک چلایا۔ گھوڑا چاہتا تھا کہ اٹھے مگر وہ زمین سے اپنے پاؤں نہیں نکال سکا۔ اس مرتبہ سراقہ نے پھر فال لی اور وہی جواب ملا تو سمجھ گیا یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے اب اُس نے امان طلب کی۔ نبی و صدیق کا یہ قافلہ ٹھہر گیا۔ امان پا کر سراقہ پھر سوار ہوا اور یہاں پہنچکر اس نے قریش کے اعلان اور انکی جستجو کی روئیداد سنائی کھانے پینے کا جو سامان اپنے ساتھ لایا تھا وہ پیش کیا اور اپنے لیئے ایک پروانہ امن کا خواستگار ہوا۔ عامر بن فہیرہ نے چمڑہ کے ایک ٹکڑے پر یہ پروانہ لکھ کر اُسکے حوالے کیا۔

اتفاق سے حضرت زبیر مسلمان تاجروں کے ایک قافلہ کے ساتھ شام سے آ رہے تھے یہاں انکی ملاقات آں حضرت صلعم سے ہوئی حضرت زبیر نے چند بیش قیمت سفید کپڑے آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکر کی خدمت میں پیش کیئے۔ یہ پیش کش اس بے سروسامانی کے عالم میں بہت غنیمت تھی۔ ابن سعد نے حضرت زبیر کی بجائے طلحہ بن عبید اللہ کا نام لکھا ہے ممکن ہے یہ دونوں واقعے الگ الگ ہوں یا طلحہ بن عبید اللہ خود حضرت زبیر کے شریک تجارت ہوں۔ اب قافلہ پھر روانہ ہوا۔ آنحضرت صلعم اگرچہ عمر میں حضرت ابوبکر

لہ یہ الفاظ آنحضرت صلعم نے غار ثور میں بھی کہے تھے جیسا کہ قرآن میں صاف طور پر مذکور ہے اس لیئے روایات میں ان دونوں موقعوں کیلئے یہ الفاظ ملتے ہیں البتہ قرآن نے صرف واقعہ غار ثور کا ذکر کیا ہے اور سراقہ کے واقعہ سے ساکت ہے۔

سے بڑے تھے۔ لیکن صورت شکل سے نسبتہً کم عمر اور جوان اور حضرت ابوبکر بوڑھے نظر آتے تھے۔ تجارت کی تقریب سے چونکہ حضرت ابوبکر کا باہر آنا جانا رہتا تھا۔ اسلیئے راستہ میں اُن کے شناسا ملتے جاتے تھے۔ ان میں سے جو کوئی ان سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھتا کہ یہ کون ہے؟ وہ توریہ وایہام کی زبان میں جواب دیتے۔ " یہ میرے راہنما ہیں " لہ

لہ صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۶

مدینہ طیبہ میں ابتدائی زندگی

کوکبۂ نبوی کا مدینہ میں داخلہ مکہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کی خبر مدینہ میں پہنچ چکی تھی اور یہاں آپ کی آمد آمد کا غلغلہ بلند تھا۔ انصار کا بچہ بچہ ہمہ تن چشم شوق بنا ہوا تھا۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک بالائی آبادی ہے جس کو حرۃ یا قبا کہتے ہیں دیوان گان جمال محمدی صبح سویرے یہاں پہونچ جاتے اور گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے کہ کوکبۂ نبوی کے راستہ کی اڑتی ہوئی گرد نظر آجائے تو چشم انتظار کے لئے اسکو توتیا بنا کر رکھ لیں۔ دوپہر کو جب دھوپ تیز ہوجاتی تو حسرت و افسوس کے ساتھ گھر واپس لوٹ جاتے، روز کا یہی معمول تھا، ایک دن اسی طرح گھر واپس آچکے تھے کہ ایک یہودی کہ نیچے ٹیلہ پر سے دیکھ رہا تھا اچانک اس کی نگاہ آنحضرت ؐ اور آپ کے رفقاء پر پڑی جو سفید لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ اس سے ضبط نہ ہوسکا اور بے ساختہ پکارا "او اے عرب کے لوگو! جن کا تم کو انتظار تھا وہ آگئے۔ انصار نے سنا تو جوش مسرت میں قابو سے باہر ہوگئے اور ہتھیار سج سجا استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ حرۃ کی پشت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی۔ یہاں عمرو بن عوف کا ایک ممتاز خاندان آباد تھا۔ شہنشاہِ دو عالم نے سب سے پہلے اس کو ہی میزبانی کا شرف عطا فرمایا۔ آنحضرت ؐ تو سواری سے اتر کر خاموش بیٹھ گئے حضرت ابوبکر لوگوں سے بات چیت کیلئے کھڑے رہے انصار کے جن لوگوں نے اب تک آں حضرت ؐ کو نہیں دیکھا تھا وہ آتے تھے تو حضرت ابوبکر کو ہی پیغمبر آخر الزمان سمجھ کر سلام کرتے تھے۔ اتنے میں دھوپ ذرا تیز ...... ہوگئی تو حضرت ابوبکر صدیق

آنحضرت ؐ پر اپنی چادر کا سایہ کر کے کھڑے ہوگئے اس سے ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ دراصل ان کا گوہرِ مقصود کون ہے۔ [1]

امام بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت ؐ کا قبا میں قیام چودہ دن رہا یہیں آپ نے وہ مسجد تعمیر کی جس کا ذکر قرآن مجید میں "لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ" کے عنوان سے ہے۔

ورودِ مدینہ کی تاریخ حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق آنحضرت ؐ دوشنبہ کے دن مکہ سے روانہ ہو کر تین دن غارِ ثور میں رہے اور پنجشنبہ کو یہاں سے روانہ ہوئے امام بخاری نے ورودِ قبا کا دن دوشنبہ اور مہینہ ربیع الاول کا بتایا ہے لیکن تاریخ میں اختلاف ہے کسی نے پہلی یا دوسری کسی نے سات کسی نے بارہ کسی نے تیرہ اور کسی نے پندرہ تاریخ لکھی ہے [3] لیکن یہ ظاہر ہے کہ امام بخاری کی روایت کے مطابق اگر دن دوشنبہ کا متعین ہوجائے جیسا کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ جدید حساب سے بھی یہی دن ٹھیک آتا ہے [4] تو ان مذکورہ بالا تاریخوں میں سے کوئی ایک تاریخ بھی درست نہیں ہوسکتی۔ پروفیسر فلپ ہٹی نے سن عیسوی کے لحاظ سے ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء تاریخ لکھی ہے [5]

قبا میں دو ہفتہ قیام کے بعد آپ اور حضرت ابوبکر شہر مدینہ کے لئے روانہ ہوئے اور حضرت ابو ایوب انصاری کو شرفِ میزبانی عطا فرمایا لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے مدینہ کے قرب و جوار میں سنح نام ایک جگہ ہے وہاں خارجہ بن زید بن ابی زہیر کے پاس قیام کیا اور یہیں تجارت کا کاروبار پھر شروع کر دیا۔ بعد میں خارجہ کی بیٹی حبیبہ سے نکاح بھی کر لیا اور ایک مستقل مکان میں رہنے لگے۔ چند روز کے بعد حضرت ابوبکر کی بیوی ام رومان، انکے صاحبزادہ حضرت عبداللہ اور صاحبزادیاں حضرت اسماء اور حضرت عائشہ بھی مدینہ پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر آنحضرت ؐ کی وفات کے بعد

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۵۵۹ [2] حاشیہ [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۵ [4] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۷۷ حاشیہ نمبر ۱ [5] عربوں کی تاریخ چوتھا ایڈیشن ص ۱۱۶

چھ ماہ تک اسی جگہ رہتے رہے [1]

مدینہ کی آب و ہوا کی عدم موافقت اور دعاء نبوی ﷺ یہاں پہونچنے کے کچھ دنوں کے بعد حضرت ابوبکرؓ شدید تپ و لرزہ میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت عائشہؓ اس حالت میں باپ کی مزاج پرسی کرنے آئیں تو یہ شعر وردِ زبان تھا۔

کُلُّ امْرِئٍ مُصَبَّحٌ فِی اَهْلِهٖ وَالْمَوْتُ اَدْنٰی مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهٖ

ہر شخص اپنے بال بچوں میں دادِ عیش و طرب دیتا ہے حالانکہ موت اسکے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے

حضرت عائشہؓ گھبرا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور آپ کا حال عرض کیا۔ آپ نے بارگاہِ ایزدی میں دعا کی کہ "اے اللہ تو مدینہ کو بھی ہمارے نزدیک ایسا ہی محبوب بنا دے جیسا کہ مکہ تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ یہاں کی آب و ہوا کو صحت بخش کر دے اور یہاں کے ناپ تول میں برکت عطا فرما اور بخار کو یہاں سے منتقل فرما [2]

انہیں دنوں میں ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کو بخار آ گیا تو حضرت ابوبکرؓ بڑے پریشان ہوئے گھر میں آتے بیمار بیٹی کو پیار کرتے اور پوچھتے "بیٹا! تم اب کیسی ہو"! [3]

حضرت ابوبکرؓ حضرت عائشہؓ کے علاوہ اور مہاجرین کو بھی مدینہ کی آب و ہوا موافق نہیں آئی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی دعاء کا اثر یہ ہوا کہ آج مدینہ طیبہ پورے حجاز میں آب و ہوا کے لحاظ سے بہترین جگہ ہے۔

عقدِ مواخات مہاجرین جو محض اللہ کے راستہ میں اپنا وطن گھر بار سب کچھ چھوڑ کر گئے تھے مدینہ میں بے خانماں تھے۔ ٹھہرنے کا ٹھکانا تو کسی کا بھی نہ تھا۔ بہت سے تہیدست و بے سروسامان بھی تھے اہلِ مدینہ جو بعد میں انصار کہلائے انہوں نے ان راہِ حق کے پردیسیوں کی مہمانداری جس فیاضی اور عالی حوصلگی کے ساتھ کی ہے وہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے آں حضرت ﷺ نے مدینہ پہونچکر مہاجرین اور انصار دونوں میں باہمی مواخات کا رشتہ قائم کیا۔ یعنی ایک کو دوسرے کا بھائی بنا دیا یہ بھائی سگے بھائیوں سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے۔ انصار نے یہاں تک کیا کہ ایک انصاری اپنے

[1] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکرؓ [2] بخاری ص ۱۲۵۵ [3] بخاری ج ۱ ص ۵۵

بھائی مہاجر کو اپنے گھر لے آئے اور اپنی تمام جائداد و املاک کا جائزہ دینے کے بعد بولے "اب میری ہر چیز آدھی میری ہے اور آدھی تمہاری۔ یہاں تک کہ دو بیویاں تھیں تو بولے کہ ایک کو طلاق دیتا ہوں تم اس سے عدت کے بعد نکاح کر لینا۔ مہاجر بھائی نے جواب دیا۔ "آپ کی جائداد و املاک اور بیویاں آپ کو مبارک! مجھ کو ان میں سے کچھ مدد کا نہیں غرض کہ اس عقدِ مواخات کے ماتحت مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو گیا۔

عقدِ مواخات قائم کراتے وقت آنحضرت ﷺ طرفین کی حیثیت کا لحاظ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کو عتبان بن مالک جو قبیلہ بنو سالم کے سردار تھے۔ ان کا بھائی قرار دیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضرت خارجہ بن زید انصاری جو مدینہ سے قریب ایک مقام سنح میں قیام رکھتے تھے اور تجارت پیشہ تھے ان کا بھائی بنایا [1]

تعمیر مسجد مدینہ طیبہ پہونچنے کے بعد ضروری تھا کہ ایک مسجد تعمیر کی جاتی تاکہ سب مسلمان ایک ساتھ جمع ہو کر عبادت خداوندی بجا لاتے اور یہاں اور دوسرے اہم دینی اور اجتماعی امور کا بھی فیصلہ ہوتا۔ اس مقصد کیلئے آنحضرت ﷺ نے زمین کا جو ٹکڑا منتخب کیا وہ سہل اور سہیل نام کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھا۔ یہ بچے سعد بن زرارہ کی سرپرستی میں تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اس قطعۂ زمین کا معاملہ کیا تو دونوں نے کہا "یہ آپ کی نذر ہے۔ اے اللہ کے رسول ﷺ لیکن آپ نے نذر قبول کرنے سے انکار فرمایا اور آخر قیمتاً اس کو خرید لیا [2] قطعۂ زمین کی یہ قیمت جو بعض روایات کے مطابق دس دینار تھی۔ اس کے ادا کرنے کی سعادت بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حاصل ہوئی۔ آپ نے صرف قیمت ہی ادا نہیں کی بلکہ جب سرورِ دو عالم خود مزدوروں کی طرح تعمیر مسجد کے کام میں شریک تھے۔ اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر دے رہے تھے تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ رفیق غار ثور اس میں آپ کا شریک نہ ہوتا [3]

حضرت عائشہؓ کی رخصتی پہلے گذر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا نکاح حضرت عائشہؓ کے ساتھ مکہ میں ہو چکا تھا۔ اب مدینہ پہونچنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت ﷺ سے خود رخصتی کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا "میرے پاس مہر ادا کرنے کو نہیں ہے" حضرت ابوبکرؓ نے

[1] [illegible] ص ۲۲۱ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۵ [3] فتح الباری ج ۷ ص ۱۹۲

مہر کی رقم خدمت اقدس میں حاضر کر دی [1] اور ادھر حضرت ام رومان نے حضرت عائشہؓ کو نہلا دھلا اور نہایت سادہ طریقہ پر دلہن بنا کر حرم نبوی میں داخل کر دیا۔ اس وقت حضرت عائشہ کی عمر خوردان کے بیان کے مطابق نو سال تھی [2]

---

[1] مستدرک حاکم و استیعاب بحوالہ ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۱۰ [2] بخاری باب تزویج عائشہ

غزوات میں شرکت اور دوسرے کارنامے قبل از خلافت

مکی زندگی مصائب و آلام کا مرقع تھی حلقہ بگوشان اسلام عبادتِ خداوندی کھلے بندوں کیا بجا لا سکتے انہیں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ قسم قسم کے بھیانک اور درد انگیز مظالم کیئے جاتے تھے لیکن بہرحال آنحضرت صلعم کو انہیں مصائب و آلام کی بھٹی سے گذار کر کندن بنانا تھا۔ اور ان سے تزکیۂ نفس۔ تطہیرِ قلب اور مسلمانوں کو ایمان میں مستحکم اور عمل میں پختہ کار بنانے کا کام لینا تھا۔ اس بنا پر اس دور میں صرف کامل انقیاد و اطاعت۔ صبر و تسلیم اور ضبطِ نفس جیسے اوصاف و کمالات درکار تھے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جتنی مکی سورتیں ہیں ان میں جگہ جگہ استعانت بالصبر والصلوٰۃ اور مصائب کے وقت رجوع الی اللہ کی تعلیم دی گئی ہے۔

لیکن اب مدینہ طیبہ پہنچ کر وہ وقت آیا جب اسلام کی پہلی اسٹیٹ قائم ہو رہی تھی اس اسٹیٹ کے ماتحت مسلمانوں کو دشمنوں سے جنگ کرنی تھی اپنی منتشر طاقتوں کی شیرازہ بندی کرنی تھی۔ غیر قوموں کے ساتھ معاہدے کرنے تھے اور خود اپنی اجتماعی اور قومی تنظیم کا ایک دستور مرتب کرنا تھا اور چونکہ حضرت ابوبکر تمام معاملات میں آنحضرتؐ کے دستِ راست تھے اس بنا پر اب موقع تھا کہ حضرت ابوبکر کے دوسرے اوصاف و کمالات یعنی اصابت رائے، حسن تدبیر، دور بینی اور دانش مندی بھی بروئے کار آئیں۔

چنانچہ ہجرت مدینہ کے بعد سے آنحضرت صلعم کی وفات تک جتنے غزوات ہوئے جتنے پیش آئیں اور اہم معاملات و مسائل سامنے آئے ان سب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضرتؐ کے ساتھ برابر شریک رہے۔ گو حیثیتیں مختلف تھیں۔ مثلاً میدانِ رزم میں وہ ایک

نہایت دلیر سپاہی نظر آتے ہیں اور مشورہ کے وقت ایک اعلیٰ درجہ کے مشیر اور وزیر باتدبیر، ناموافق حالات میں پتھر کی چٹان کی طرح مضبوط اور سازگار حالات میں نہایت حلیم و باوقار۔ یہی دو گرنادو صاف و کمالات ہیں جن کے اجتماع کے باعث مسٹر ڈبلیو منٹگمری واٹ کے بیان کے مطابق حضرت ابوبکرؓ جہاں ایک طرف اونچے درجہ کے فرماں بردار و مطیع تھے ساتھ ہی ایک بلند پایہ لیڈر اور قائد بھی [1]

غزوۂ بدر | آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کی ہجرت نے قریش کی آتش غیظ و غضب کو اور مشتعل کر دیا تھا وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ مدینہ طیبہ میں ایک ایسی طاقت پیدا ہو رہی ہے جو سارے عرب پر مستولی ہو جائیگی۔ اور ان کا اقتدار ختم کر دیگی۔ اس بنا پر اس طاقت کو ختم کرنے کے لیے جو کچھ بھی وہ کر سکتے تھے اس کے کرنے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مدینہ کے ان لوگوں کو جو ان کے زیر اثر تھے برابر اکساتے رہتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کو وہاں سے نکال دیں۔ مدینہ کے قرب وجوار میں جو آبادیاں تھیں وہاں اپنی ٹولیاں بھیجتے رہتے تھے کہ اسلام کی دعوت سے جو لوگ متاثر ہو رہے ہیں وہ پریشان ہوں۔ آنحضرت ﷺ بھی ان کے توڑ میں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بھیجتے رہتے تھے۔ جن کو ارباب سیر کی اصطلاح میں سرایا کہا جاتا ہے۔

لیکن قریش کو جلد ہی یقین ہو گیا کہ اس طرح کی چھچھوری حرکتوں سے کام نہیں چلے گا اس بنا پر اب انہوں نے بڑے ساز و سامان کے ساتھ مدینہ طیبہ پر حملے کرنے کا منصوبہ باندھا۔ لیکن اس منصوبہ کو عمل میں لانے کے لیے سب سے مقدم ضرورت سرمایہ کی فراہمی کی تھی۔ اسلیئے انہوں نے ترکیب یہ کی کہ ابوسفیان (حضرت امیر معاویہ کے والد جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان تجارتی قافلہ شام بھیجا تاکہ اس سے جو آمدنی ہو اس سے دین حق کے مٹانے کا کام کیا جائے۔ ادھر سرمایہ کے فراہمی کی یہ تدبیر کی گئی تھی اور ادھر مکہ میں جوانان و فرد آزمایان قریش مدینہ پر حملہ کرنے کے جوش میں فوجی تیاریاں کر رہے تھے۔

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جدید ایڈیشن ج ۱ ص ۱۱۰

ابوسفیان شام میں اپنا مقصد حاصل کر لینے کے بعد جب مکہ کیلئے واپس روانہ ہوا ہے تو اس نرکی واقعہ شام کے ساتھ کہ حسب روایات اس کے جلو میں ایک ہزار اونٹ تھے جن پر پچاس ہزار دینار لدے ہوئے تھے اور قافلہ چالیس یا ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ عظیم منافع تجارت درحقیقت گولہ بارود کا ایک میگزین تھا جو صرف اس غرض کے لئے فراہم کیا گیا تھا کہ اس سے اسلام اور اس کے جان نثاروں کو برباد و ہلاک کیا جائیگا اس بنا پر اس وقت آنحضرت ﷺ کیلئے صرف جائز ہی نہیں بلکہ سیاسی اعتبار سے نہایت ضروری تھا کہ اس وقت سامان کو مکہ تک نہ پہونچنے دیا جائے [1]

چنانچہ صحیح بخاری میں ہے۔

انما خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرید عیر قریش (باب قصہ غزوۂ بدر)	آنحضرت ﷺ قریش کے قافلہ کے ارادے سے نکلے۔

قریش کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ ... ساز و سامان کیساتھ لیس تو پہلے ہی تھے فوراً مکہ سے روانہ ہو گئے۔ ادھر آنحضرت ﷺ اپنے تین سو تیرہ جانبازوں کے ساتھ ۱۲ رمضان سنہ ۲ھ کو مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۱۷ رمضان کو مقام بدر کے قریب پہونچکر خیمہ زن ہو گئے۔

[1] سخت تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ اتنی سادہ حقیقت مولانا شبلی کی سمجھ میں نہیں آئی اور انہوں نے سیرت النبی جلد اول میں غزوۂ بدر پر ایک نہایت مبسوط و مفصل گفتگو کر کے تمام محدثین و ارباب سیر کے خلاف اس واقعہ کی تغلیط کی ہے۔ آج کل کی مہذب دنیا میں کیا نہیں ہوتا؟ فریق محارب کے لیے رسل و رسائل اور رسد کے ذرائع بند کر دیئے جاتے ہیں، اقتصادی ناکہ بندی کی جاتی ہے۔ تجارتی منڈیوں پر بمباری کر کے انہیں برباد کیا جاتا ہے۔ مال سے لدے ہوئے جہاز جہاں کہیں مل جاتے ہیں ان کو لوٹ لیا جاتا ہے۔ قریش نے جب ہجرت کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑا اور وہ ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری پوری قوت اور بڑے زور و شور سے کر رہے تھے اور یہ قافلہ تجارت اسی کا مقدمۃ الجیش تھا تو ان حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اقدام بین الاقوامی قانون جنگ کی رو سے بالکل درست اور حق بجانب تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ آپ کی سیاسی بیدار مغزی اور دور اندیشی کی روشن دلیل ہے۔

یوں تو قریش اور دوسرے قبائل کے ساتھ اس سے پہلے بھی متعدد جھڑپیں ہو چکی تھیں لیکن حق و باطل اور اسلام و کفر کا یہ سب سے پہلا معرکہ تھا جس کے فیصلہ پر تاریخ عالم میں ایک نئے انقلاب کا دار و مدار تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ایک طرف قریش کی تعداد ان کے سازو سامان اور ان کی جنگی تیاریوں کا جائزہ لیا اور دوسری طرف اسلام کے ان سرفروش مجاہدوں کو دیکھا جن کے گھوڑوں کو رکابیں بھی نصیب نہیں تھیں اور جو تعداد کے لحاظ سے دشمن کے ⅓ حصہ تھے تو بے ساختہ جی بھر آیا اور بارگاہِ ایزدی میں قبلہ رخ ہو کر ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعا کی۔ کہ

"اے خدا تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر۔ اے خدا اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو تیرا پوچھنے والا کوئی نہیں رہے گا۔"

آپ ہاتھ پھیلا کر یہ دعا کرتے جاتے تھے اور فرطِ بیقراری میں چادر بار بار شانۂ مبارک سے گر گر پڑتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے چادر اٹھائی آپ کے کندھے پر ڈال دی اور اس کے بعد سرکار دوجہاں کی پشت سے لپٹ کر کہنے لگے حضور اب بس کیجئے اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔[1] فوراً وحی آئی اور اِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ۔ کا مژدۂ جاں فزا سنا گئی۔ بخاری میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے یہ کہنے کے بعد ہی آں حضرت ﷺ نے سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ کفار کی فوج جلد شکست کھا جائے گی اور یہ اُلٹے پاؤں واپس جائیں گے فرمایا اور باہر تشریف لے آئے موقع کی نزاکت دیکھ کر صحابہ کرام نے آنحضرت ﷺ کے لیے ایک سائبان بنا دیا تھا کہ آپ وہاں تشریف رکھیں اور مسلمانوں کو وہاں سے ہدایات دیتے رہیں اس سائبان میں رفاقت اور آنحضرت ﷺ کی نگرانی اور حفاظت کا شرف بھی حضرت ابوبکرؓ کو ہی حاصل ہوا۔

---

[1] میں نے یہ واقعہ صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر سے لیا ہے۔ امام بخاری نے بھی اس کو کتاب الجہاد میں اور پھر باب غزوۂ بدر میں اس کو نقل کیا ہے لیکن اس میں فاخذ ابوبکر بیدہ " یعنی ابوبکرؓ نے آنحضرت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ " کے الفاظ ہیں۔

مسند بزار میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ اس دن حضرت ابوبکرؓ تلوار نیام سے باہر نکالے آنحضرت ﷺ کا پہرہ دے رہے تھے جو کوئی حضورؐ کی طرف بڑھتا حضرت ابوبکرؓ اس پر پل پڑتے تھے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

فھو اشجع الناس۔ تو ابوبکرؓ سب سے زیادہ بہادر انسان ہیں۔[1]

کفر و اسلام کا یہ پہلا معرکہ اس اعتبار سے بڑا صبر طلب اور درد انگیز تھا کہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوئیں تو اچانک نظر آیا کہ باپ بیٹے کے ساتھ نبرد آزما تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کے بڑے بیٹے عبد الرحمٰن اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اس وجہ سے مکہ میں ہی رہ گئے تھے۔ بدر میں قریش کی فوج کے ایک سپاہی وہ بھی تھے انہوں نے میدانِ جنگ میں بڑھ کر پکارا کہ میرے مقابلہ میں کون آتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ خود تلوار کھینچ کر مقابلہ کو نکلے۔ لیکن رحمتِ عالم ﷺ کو یہ گوارا نہ ہوا۔ فوراً حضرت ابوبکرؓ کو روک لیا اور فرمایا۔

متعني بنفسك تم مجھ کو اپنی ذات سے متمتع ہونے دو۔[2]

ایک اور روایت میں لا تفجعنا بنفسك کے الفاظ ہیں۔ ان کا مطلب بھی یہی ہے جنگ ختم ہوئی تو مالِ غنیمت کے علاوہ ستر قیدی ہاتھ آئے جن میں حضرت عباسؓ اور آنحضرت ﷺ کے داماد (حضرت زینبؓ کے شوہر) ابو العاص بھی تھے آنحضرت ﷺ نے مشورہ کیا اور ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ حضرت عمرؓ بولے کہ قیدیوں کو

---

[1] اسد الغابہ قسم اول جزء ثالث ص ۲۱۲ [2] اسد الغابہ جزء ثالث ص ۲۰۸ ذرا لطف مبارک کی بلاغت پر غور کرو۔ آنحضرت ﷺ کا اصل مقصد حضرت ابوبکرؓ کو بیٹے کے مقابلہ میں جانے سے روکنا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اسلام کے جوش حمایت میں جا رہے تھے۔ اس لیے ممکن تھا کہ اگر صرف سادہ طریقہ پر حضور روکتے اور یہ فرماتے کہ نہیں تم نہیں ہو تو ابوبکرؓ خوشی رک جاتے مگر وہ بددلی محسوس کرتے اس لیے آپ نے ایک ایسی بات کا ذکر کیا جو حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک خود بہت اہم تھی یعنی حضورؐ کے پاس ہی رہ کر آپ کی حفاظت کرنا اسی لیے آپ نے متعني بنفسك فرمایا جس کے لفظی معنی ہیں تم اپنی ذات سے مجھ کو فائدہ پہنچانے دو۔

قتل کر دینا چاہیئے لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ یہ سب اپنے ہی عزیز و قریب ہیں ان کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ ہونا چاہئے اس بنا پر زر فدیہ لیکر ان کو رہا کر دیا جائے۔ آنحضرتؐ نے رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔[1]

اس موقعہ پر یہ جتا دینا بھی ضروری ہے کہ عام تاریخوں میں اور بعض روایات میں بھی مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے کے مطابق آنحضرتؐ کا اسیران بدر کو زر فدیہ لے کر آزاد کر دینا اور انہیں قتل نہ کرنا بارگاہ ایزدی میں پسندیدہ نہیں ہوا اور اس پر یہ آیت بطور عتاب نازل ہوئی۔

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (انفال)

"اگر خدا کا لکھا پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا اس پر تم کو بڑا عذاب ہوتا"

اس میں شک نہیں کہ یہ آیت عتاب الٰہی پر دلالت کرتی ہے لیکن عتاب کا اصل سبب قیدیوں کو قتل نہ کرنا اور زر فدیہ لیکر ان کو رہا کر دینا نہیں بلکہ مال غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو جانا ہے۔ درانحالیکہ ابتک مال غنیمت سے متعلق احکام نہیں آئے تھے۔ چنانچہ امام مسلم نے اس واقعہ سے متعلق حضرت عمر فاروقؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ صاف الفاظ ہیں۔

فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ إِلَىٰ قَوْلِهِ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا فَأَحَلَّ اللّٰهُ الْغَنِيمَةَ لَهُمْ (باب الامداد بالملائکۃ فی بدر)

پھر جب اللہ تعالیٰ نے آیت مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ سے کر فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا نازل کی تو اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت ان لوگوں کے لیے حلال کر دیا۔

غزوۂ احد ۳ھ بدر کی شکست نے قریش کو اور برافروختہ کر دیا۔ اور اب انہوں نے اس شکست کا بدلہ لینے کی تیاریاں بہت بڑے پیمانہ پر شروع کیں شاعروں نے اپنی آتش بیانی سے آس پاس کے تمام قبیلوں میں آگ لگا دی اور ادھر عورتوں

[1] صحیح مسلم باب الامداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر واباحۃ الغنائم۔ [2] مدینہ منورہ کے شمال جانب تقریباً تین میل (ایک فرسخ) کی مسافت پر ایک پہاڑ کا نام ہے۔

نے مقتولین بدر کا نوحہ کر کر کے قریش کے ایک ایک نوجوان کو جوش انتقام سے اسطرح بھرپور کر دیا کہ ہر شخص کی زبان پر الثار الثار تھا۔ ابوسفیان کی سرکردگی میں جو کاروان تجارت شام سے واپس آیا تھا اس کا عظیم منافع اگرچہ تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن بطور امانت محفوظ تھا۔ عورتوں کی ایک بڑی جمعیت کا ساتھ ہونا اس کی دلیل تھا کہ اس مرتبہ قریش یہ طے کر کے چلے تھے کہ یا وہ اپنے مقتولین بدر کا انتقام لیں گے اور یا وہیں میدان جنگ میں لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں گے۔ حضرت عباسؓ جو اگرچہ اسلام لے آئے تھے لیکن حالات کے خیال میں مکہ ہی واپس آ گئے تھے انہوں نے ایک تیز رو قاصد کے ذریعہ آنحضرتؐ کو قریش کی ان تیاریوں کی اطلاع کر دی آپؐ نے اس خبر کی تصدیق اور مفصل حالات سے آگاہی حاصل کرنے کی غرض سے انس اور مونس دو آدمیوں کو بھیجا تو انہوں نے خبر دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے اس قدر قریب آ گیا ہے کہ انکے گھوڑوں نے عریض چراگاہ کو صاف کر دیا۔ قریش جبل احد[2] پر خیمہ ڈالے پڑے تھے۔ آنحضرتؐ سات سو جاں نثاروں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے اور احد کی پشت پر پہنچ کر صفیں آراستہ کیں جب عام جنگ شروع ہوئی تو حضرت حمزہؓ حضرت علیؓ اور حضرت ابودجانہؓ اس بے جگری سے لڑے کہ دشمن کی فوج میں گھس کر انکی صفیں الٹ دیں۔ قریش کے علمدار ایک ایک بڑھتے تھے اور سرمستان بادۂ توحید کی ضرب کاری سے خاک کا ڈھیر ہو جاتے تھے۔ آخر فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمان یہ دیکھ کر مال غنیمت کے جمع کرنے میں لگ گئے قریش کا ایک دستہ جو کوہ احد پر تھا اس نے میدان خالی دیکھ کر عقب سے اس زور کا حملہ کیا کہ اب جنگ کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ یہ وقت اسلام کیلئے بے حد نازک تھا اسلامی فوج کے بڑے بڑے نبرد آزماؤں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ عام افراتفری میں خود مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں پر پڑ رہی تھیں دشمنوں نے خبر اڑا دی کہ سرور عالمؐ شہید ہو گئے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ جیسے شیر بیشۂ شجاعت کا دل چھوٹ گیا۔ لیکن آنحضرتؐ میدان جنگ سے ایک گوشہ میں اپنے چند جاں بازوں کے ساتھ کھڑے تھے جن میں ایک حضرت ابوبکرؓ بھی تھے۔ قریش

کا دستہ تیر برسا رہا تھا۔ آنحضرتؐ گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے تو حضرت ابو طلحہؓ فرماتے "آپ پر میرے ماں باپ قربان! آپ گردن نہ اٹھائیں۔ دشمن تیر برسا رہے ہیں۔ میرا سینہ ان کا نشانہ بننے کیلئے حاضر ہے۔"[1] اسی حالت میں آپ مجروح ہو گئے، تو آپ کے جانثار پہاڑ پر لے آئے۔ یہاں ابو سفیان بھی پہنچ گیا اور اس نے پکار کر پوچھا "لوگو! کیا تم میں محمدؐ ہیں؟" کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے پھر دریافت کیا "ابوبکرؓ ہیں؟" اُس کا بھی جواب نہ ملا تو اس نے حضرت عمرؓ کا نام لیا۔[2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قریش بھی آنحضرتؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو ہی مسلمانوں کا لیڈر تسلیم کرتے تھے۔

مسلمانوں کو جب معلوم ہو گیا کہ آنحضرتؐ زندہ ہیں۔ تو ان کا حوصلہ بندھا اور انہوں نے اپنی منتشر طاقتوں کو سمیٹ کر پھر اسی جوش و خروش کے ساتھ جنگ کی کہ بہادران قریش کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ میدان جنگ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے دریافت کیا ان کا تعاقب کون کرے گا؟" ستر صحابہ نے اپنے نام پیش کئے۔ امام بخاری نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زبیرؓ کے ناموں کی تصریح کی ہے[3]۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آنحضرتؐ نے جو جنگیں کی ہیں ارباب سیر کی اصطلاح میں وہ دو قسم کی ہیں ایک کو غزوہ کہتے ہیں اور دوسری کا نام سریہ ہے عام طور پر ان میں فرق یہ ہے کہ غزوہ اسے کہتے ہیں جس میں آنحضرتؐ نے بذات خود شرکت فرمائی ہو اور سریہ جس کے معنی ٹولی یا گروہ کے ہیں، اسے کہتے ہیں، جس میں آپ بنفس نفیس شریک نہ ہوئے ہوں۔

حضرت ابوبکرؓ چونکہ آنحضرتؐ کے دست راست اور مشیر خاص تھے اس بنا پر آپ عموماً سرایا کی مہم پر نہیں بھیجے جاتے تھے اور مدینہ میں آنحضرتؐ کے پاس رہ کر ہی ان کا بندوبست اور انتظام کرتے تھے چنانچہ حضرت حذیفہؓ

---

[1] صحیح بخاری باب غزوہ احد

[2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۸۲

سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ اطراف و اکناف میں لوگوں کے فرائض و سنن کی تعلیم دینے کی غرض سے اپنے آدمی بھیجوں جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں کو بھیجا کرتے تھے کسی نے عرض کیا" آپ ابوبکرؓ اور عمرؓ کو کیوں نہیں بھیجتے۔ ارشاد ہوا "میں ان دونوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا یہ دین کے کان اور آنکھیں ہیں[1]

غزوۂ خندق | یہود مدینہ کا ایک قافلہ بنو نضیر جو مدینہ سے نکل کر خیبر آ گیا تھا اس کے رؤسا نے قریش۔ بنو غطفان۔ بنو سلیم اور بنو اسد وغیرہ قبائل میں گھوم پھر کر اسلام کے خلاف ایک عظیم جنگ پر ان کو آمادہ کر دیا اور دس ہزار کا ایک لشکر جرار مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ آنحضرتؐ نے تین ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے نکل کر خندق کھود دی اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ واقعہ ماہ ذوالقعدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ میں بھی ایک دستہ فوج کی کمان حضرت ابوبکرؓ کے سپرد تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں کہ جس مقام پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دستہ کو لے کر پڑاؤ ڈالا تھا وہاں مسجد صدیقؓ کے نام سے اب تک ایک مسجد ہے جو اسی واقعہ کی یادگار ہے۔[2]

غزوۂ بنی مصطلق | اسی سنہ میں غزوۂ بنی مصطلق جس کو غزوۂ المریسیع بھی کہتے ہیں پیش آیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حارث بن ضرار جو بنو مصطلق کا سردار تھا۔ اس نے اپنے قبیلہ میں گھوم پھر کر آنحضرتؐ کے ساتھ جنگ کرنے کا بڑا شدید جذبہ پیدا کر دیا تھا اور اپنے ساتھ جو عرب اس کو مل سکتے تھے ان کو بھی ملا لیا تھا آنحضرتؐ کو ان حالات کا علم ہوا تو بریدہ بن الحصیب الاسلمی کو تفتیش کے لیئے روانہ فرمایا۔ بریدہ خود حارث سے ملے اور گفتگو کی اور حارث جنگ کی جو تیاریاں کر رہا تھا اس کی اطلاع دی۔ آنحضرتؐ یہ سن کر مسلمانوں کا ایک لشکر اپنے ساتھ

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۷۴، [2] ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۳ [3] مریسیع مسعودی اور طبری کے بیان کے مطابق کسی تالاب یا کنوئیں کا نام تھا۔ اور چونکہ یہ غزوہ یہاں ہوا تھا اس لیئے اسکو غزوۃ المریسیع بھی کہتے ہیں۔

لے کر روانہ ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ اس غزوہ میں بھی آپ کے ہمرکاب تھے اور مہاجرین کا علم آپ کے ہی ہاتھ میں تھا مقام مریسیع پہونچکر جنگ ہوئی کچھ دیر تک دونوں جانب سے تیر اندازی ہوتی رہی آخر آنحضرتؐ کے حکم سے مسلمانوں نے اپنی تمام طاقت یکجا جمع کرکے اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگئے [1]

یہی وہ غزوہ ہے جس سے واپسی پر وہ واقعہ پیش آیا جو حدیث افک کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ البتہ اس واقعہ کی یہ خصوصیت لائق ذکر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں۔
اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْکِ عُصْبَۃٌ مِّنْکُمْ (الآیۃ) تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے بہتان طرازی کی فرما کر ان لوگوں کی پردہ دری کی ہے جو خود یا بالواسطہ اس واقعہ میں ملوث ہوگئے تھے اور جیسا کہ خود اسی آیت میں ہے یہ شر غالباً اسی لیئے پیدا کیا گیا تھا کہ اس بہانے کتاب الٰہی کو جگر گوشہ حضرت ابوبکر صدیق کی عصمت و عفت پر مہر تصدیق ثبت کرنے کا موقع میسر آجائے وکفیٰ بہ فخراً۔

اس کے علاوہ حدیث افک میں جو لوگ ملوث تھے اُن میں ایک شخص مسطح بن اثاثہ بھی تھا حضرت ابوبکرؓ اس شخص کی مالی امداد کرتے رہتے تھے۔ لیکن جب یہ افک کا واقعہ پیش آیا تو آپ نے اس کی امداد سے دست کشی اختیار کرلی۔ پروردگار عالم کو صدیق اکبرؓ کی ادا پسند نہیں آئی اور وَلَا یَاْتَلِ اُولُو الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَۃِ فرما کر انکو تنبیہ کی گئی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر کو بڑی ندامت ہوئی اور آپ نے مسطح کی مالی سرپرستی پھر شروع کردی۔

نزول آیت تیمم کے متعلق ایک اہم بحث | اس موقع پر تنبیہ کردینا ضروری ہے کہ حدیث افک میں جس طرح حضرت عائشہؓ کے ہار کے گم ہونے اور اسکی تلاش کا تذکرہ ہے ٹھیک اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی ہے جسکو امام بخاری نے اولاً کتاب التیمم میں اور پھر باب مناقب

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۱۴

المہاجرین و فضائلہم میں روایت کیا ہے یہ واقعہ خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں گئے ہوئے تھے جب ہم مقام بیدا (یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام کا نام ہے) یا ذات الجیش (یہ بھی ایک مقام کا نام ہے) میں پہونچے تو میرا ہار گم ہوگیا۔ اس کو تلاش کرنے کے لیئے رسول اللہؐ نے پڑاؤ ڈال دیا۔ اور آپ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ بھی وہاں ٹھہر گئے اس جگہ پانی نہیں تھا اور نہ ہمارے قافلے میں کسی کے پاس تھا اس بنا پر ابوبکرؓ آئے اور اس وقت رسول اللہؐ اپنا سر میری ران میں رکھے ہوئے سو رہے تھے ابوبکر نے آتے ہی مجھ سے کہا کہ تو نے رسول اللہؐ کو اور لوگوں کو ایسے مقام پر رکوا دیا ہے جہاں پانی نہیں ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ابوبکر غصہ میں بھرے ہوئے تھے اسلیئے جو ان کی زبان پر آیا مجھے کہتے رہے اور ساتھ ہی اپنے ہاتھ سے میری کمر پر کچوکے بھی مارتے رہے لیکن میں نے رسول اللہ کی نیند کے اُچٹ جانے کے ڈر سے ذرا حرکت نہیں کی اور چپ چاپ بیٹھی رہی آخر صبح کے وقت جب رسول اللہؐ بیدار ہوئے اور پانی نہیں ملا تو تیمم کی آیت نازل ہوئی اور سب لوگوں نے تیمم کیا اس پر اُسید بن الحضیر نے کہا "اے آل ابی بکر یہ تمہاری پہلی ہی برکت نہیں ہے" حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اب ہم نے اونٹ کو اٹھایا جس پر میں سوار ہوئی تھی تو دیکھا کہ ہار اسکے ہی نیچے پڑا ہوا تھا [1]

حافظ ابن حجر نے ابن سعد، ابن حبان اور ابن عبد البر سے نقل کیا ہے کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی ہیں اور تیمم کا حکم غزوۂ بنی مصطلق میں نازل ہوا تھا۔ یہ حال تو محدثین کا ہے [2] انکے علاوہ یاقوت حموی نے بھی ذات الجیش کے جغرافیہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں غزوۂ بنی مصطلق سے واپس ہوتے ہوئے آنحضرتؐ نے صحابہ کے ساتھ حضرت عائشہ کے گم شدہ ہار کی تلاش میں قیام فرمایا تھا اور یہیں آیت تیمم نازل ہوئی تھی [3]

[1] صحیح البخاری ج ۱ ص ۴۸ و ۵۱۸ [2] فتح الباری ج ۱ ص ۳۶۵ کتاب التیمم [3] معجم البلدان ج ۳ ص ۵۱۵

لیکن اگر دونوں واقعوں کو ایک مان لیا جائے تو بڑا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہار تلاش کرنے کیلئے حضرت عائشہؓ تنہا رہ گئی تھیں اور پورا قافلہ بہت آگے چلا گیا تھا چنانچہ اسی وجہ سے بدزبانوں کو تہمت طرازی کا بہانہ ملا۔ اسکے برخلاف آیت تیمم والے واقعہ کی روئداد سے ثابت ہوتا ہے کہ ہار کی تلاش کیلئے حضرت عائشہؓ تنہا نہیں رہی تھیں بلکہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھ صحابہ بھی اسی مقام پر فروکش ہو گئے تھے اور اسکے علاوہ غزوۂ بنی مصطلق کے واقعہ میں کسی بے آب مقام کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور تیمم والی آیت میں ایسے مقام کا تذکرہ موجود ہے جہاں پانی دور دور تک نہیں تھا۔ پس اگر دونوں واقعے ایک ہی تھے تو پھر روایتوں کے اس اختلاف کو رفع کرنے کی صورت کیا ہوگی؟ اسکے علاوہ یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ طبری کے ہاں حدیث افک کا ذکر مفصل ملتا ہے لیکن اسکے ضمن میں آیت تیمم کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا گیا۔ پھر صحیحین کی روایات سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ تیمم کا حکم غزوۃ المریسیع میں نازل ہوا۔

اس سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دراصل حضرت عائشہؓ کے ہار گم ہونے کا واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہے اور مذکورۂ بالا دونوں واقعات ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں جو مختلف اوقات میں پیش آئے۔ اسکی تائید آیت تیمم والے واقعہ میں حضرت اسید بن الحضیرؓ کے اس فقرہ سے بھی ہوتی ہے کہ "اے آل ابی بکر یہ تمہاری پہلی ہی برکت نہیں ہے کہ تمہاری شان میں یا تمہاری وجہ سے قرآن کا کوئی حکم نازل ہوا"۔ علاوہ ازیں حافظ ابن قیم نے معجم طبرانی کے حوالہ سے خود عائشہؓ کی جو ایک روایت نقل کی ہے اس سے بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ روایت یہ ہے۔

عن عائشة قالت ولما كان من امر عقدي ما كان قال اهل الافك ما قالوا فخرجت مع النبي صلى الله عليه وسلم في غزوة اخرى فسقط ايضاً	حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ پہلے میرے ہار کا جو معاملہ ہوا اور اس پر اہل افک نے جو کچھ کہا وہ تو کہا ہی تھا ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ میں ایک اور غزوہ میں آنحضرت ﷺ کے

عقدي حتى حبس التماسه الناس ولقيت من ابي بكر ما شاء الله وقال يا بنية في كل سفر تكونين عناءً و بلاءً وليس مع الناس ماء فانزل الله الرخصة في التيمم [1]	ہمراہ گئی اور اس سفر میں بھی میرا ہار گر پڑا جس کو تلاش کرنے کی وجہ سے لوگوں کو رکنا پڑا۔ اور اس وجہ سے ابوبکرؓ کے جی میں جو کچھ آیا میں اس سے دوچار ہوئی اور ابوبکرؓ نے کہا۔

اس روایت میں حضرت ابوبکرؓ کا بگڑ کر حضرت عائشہؓ سے یہ فرمانا کہ بیٹی! تم ہر سفر میں مصیبت بن جاتی ہو۔ اس بات کا کھلا قرینہ ہے کہ یہ سفر جس میں آیت تیمم کا نزول ہوا غزوۂ بنی مصطلق جس میں واقعہ افک پیش آیا اسکے علاوہ ہے چنانچہ علامہ ابن قیم معجم طبرانی کی یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وهذا يدل على ان قصة العقد التي نزل التيمم لاجلها بعد هذه الغزوة وهو الظاهر ولكن فيها كانت قصة الافك بسبب فقد العقد والتماسه فالتبس على بعضهم احدى القصتين بالاخرى [2]	اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہار کا واقعہ جس کی وجہ سے تیمم کا حکم نازل ہوا اس غزوہ (بنی مصطلق) کے بعد پیش آیا ہے اور یہی ظاہر ہے لیکن چونکہ اس غزوہ میں ہار کی گمشدگی اور اسکی تلاش کی وجہ سے افک کا واقعہ پیش آیا تھا اسلئے بعض کے نزدیک دونوں واقعے خلط ملط ہوگئے

حافظ ابن حجر۔ ابن سعد۔ ابن حبان اور ابن عبدالبر کا مذکورۂ بالا قول نقل کرنیکے بعد لکھتے ہیں کہ "ہمارے بعض شیوخ نے اس کو مستبعد جانا ہے کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی ہوں کیونکہ مریسیع قدید اور ساحل کے درمیان مکہ کے نواح میں ہے اور یہ واقعہ خیبر کے اطراف میں پیش آیا ہے کیونکہ اس واقعہ میں بیدا یا ذات الجیش کا ذکر ہے اور یہ دونوں مقامات جیسا کہ امام نوویؒ نے یقین کیساتھ لکھا ہے مدینہ اور خیبر کے درمیان میں واقع ہے۔" [3]

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۱۳ [2] ایضاً [3] فتح الباری ج ۱ ص ۳۶۵

پھر اس بحث کے آخر میں امام بخاری کے متعلق یوں ہی لکھتے ہیں کہ ان کا رجحان
بھی تعدد واقعہ کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

لیکن تعجب ہے کہ ان سب وجوہ کے باوجود حافظ ابن حجر کی اپنی رائے اسکے
خلاف ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

وما تقدم من اتحاد القصة فهو اظهر[1] اور قصہ کے ایک ہونے کا جو ذکر اوپر ہو چکا وہ زیادہ ظاہر ہے

صلح حدیبیہ

صلح حدیبیہ کا جو واقعہ ماہ ذی قعدہ ۶ھ میں پیش آیا ماسلام کی
تاریخ کا نہایت اہم اور عظیم الشان واقعہ ہے جس پر آگے چل کر بڑے دوررس
نتائج مرتب ہوئے، چنانچہ قرآن مجید میں اس کو فتح مبین (اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا)
فرمایا گیا ہے اس بنا پر یہ کیونکر ممکن تھا کہ صدیق اکبر اس میں شریک نہ ہوتے۔

اصل میں یہ ہے کہ آنحضرت ؐ چودہ سو اور بروایت دیگر پندرہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ
کے ارادہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے، مقام ذوالحلیفہ میں پہنچکر جو اہل مدینہ کا میقات
یعنی احرام باندھنے کی جگہ ہے۔ آپنے احرام باندھا۔ اور ایک خزاعی شخص کو جاسوسی
کی غرض سے پہلے سے روانہ کر دیا۔ غدیر الاشطاط جو حدیبیہ کے سامنے ہے[2] آپ وہاں
پہنچے ہی تھے کہ جاسوس مل گیا۔ اس نے بتایا کہ قریش آپکو زیارت بیت اللہ نہیں
کرنے دیں گے اور انہوں نے آپکے ساتھ جنگ کرنے کی پوری تیاری کر لی ہے۔ آنحضرت ؐ
نے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! آپ
تو بیت اللہ کی زیارت کے لیے نکلے ہیں آپ نہ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور نہ کسی سے
جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لیے آپ بیت اللہ کا رخ کیجیے۔ اگر ان لوگوں میں
سے کسی نے ہم کو روکا اور مزاحم ہوا تو ہم اس سے جنگ کریں گے۔ آں حضرت ؐ نے یہ
سن کر فرمایا "تو بسم اللہ چلو"[3]

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۳۶۹ [2] مکہ معظمہ سے بیس کیلو میٹر کی مسافت پر ایک گڑھا ہے جس کا نام
حدیبیہ ہے۔ چونکہ صلح نامہ یہیں لکھا گیا تھا اسی لیے اس کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔ [3] صحیح بخاری ج ۲ باب غزوۃ الحدیبیہ

اب آنحضرت ؐ روانہ ہوئے اور مقام حدیبیہ میں فروکش ہو کر بدیل بن ورقاء
الخزاعی کی معرفت قریش کو کہلا بھیجا کہ ہم جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے ہیں بلکہ
مقصد صرف عمرہ کرنا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ مصالحت کر لو ورنہ خدا کی قسم
جسکے ہاتھ میں میری جان ہے اس وقت تک لڑونگا جب تک کہ میری گردن تن سے
جدا ہو جائے۔

مسلسل جنگوں اور ان میں پیہم شکستوں کے باعث قریش کے دم خم پہلے ہی
ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ کچھ حیص بیص کے بعد انہوں نے منظور کر لیا اور مصالحت کی گفتگو
کرنے کیلیے عروہ بن مسعود کو جو قریش کا تجربہ کار اور نہایت چالاک شخص تھا اپنا نمائندہ
بنا کر روانہ کیا۔ آنحضرت ؐ نے عروہ سے بھی وہی فرمایا جو بدیل کے ذریعہ پہلے کہلا بھیجا تھا
عروہ بولا "اے محمد (صلعم) اگر آپ نے جنگ کی اور قریش کا خاتمہ کر دیا تو آپ نے
کیا اپنے سے پہلے بھی کسی ایسے شخص کا نام سنا ہے جس نے خود اپنی قوم کا قلع قمع
کر دیا ہو۔ اگر جنگ کا نتیجہ دوسرا ہوا (یعنی آپ کو شکست ہوئی) تو میں آپکے ساتھیوں
میں ایسے ملے جلے آدمی دیکھتا ہوں جو آپکو تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہونگے۔ حضرت
ابوبکرؓ بڑے حلیم اور بردبار تھے۔ لیکن عروہ کی زبان سے یہ سن کر برہم ہو گئے اور
بولے "بدمعاش! کیا ہم لوگ رسول اللہ ؐ کو چھوڑ کر بھاگ سکتے ہیں"! عروہ نے یہ تیور
دیکھ کر پوچھا "یہ کون ہیں؟" لوگوں نے کہا "ابوبکرؓ!" اب عروہ نے حضرت ابوبکرؓ سے
مخاطب ہو کر کہا "قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تمہارا مجھ
پر احسان نہ ہوتا جس کا بدلہ میں اب تک نہیں چکا سکا ہوں تو میں تم کو جواب دیتا"[1]

آخر معاہدہ کی بات چیت شروع ہوئی۔ اور جب عہد نامہ لکھا جانے لگا تو اسکی
بعض دفعات جو قریش کی طرف سے پیش کی گئی تھیں مسلمانوں کے لیے بڑی ہی صبر آزما
تھیں چنانچہ فاروق اعظم سے نہ رہا گیا اور انہوں نے آنحضرت ؐ سے شدت جذبات
میں ایسے لب و لہجہ میں گفتگو کی جس کا ملال آخر دم تک ان کے دل سے نہیں نکلا۔

[1] صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب ج ۱ ص ۳۷۸

اسی حالت میں وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور بولے کہ بھلا قریش سے دب کر صلح کیوں کر ہو سکتی ہے۔ لیکن صدیق اکبرؓ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ کرتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔ یقیناً اسی میں بھلائی ہو گی اللہ انکو کبھی ہلاک نہ کرے گا۔ اسکے بعد آیت فتح نازل ہوئی اور حضرت عمرؓ کو بھی تسکین و طمانیت ہو گئی [1]

غزوۂ خیبر | ۶ھ کے اواخر یا ۷ھ کے شروع میں غزوۂ خیبر کا اہم معرکہ پیش آیا۔ خیبر عرب میں یہودیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا جو متعدد مضبوط قلعوں پر مشتمل تھا۔ ایک قلعہ جسکا نام قموص تھا عرب کے مشہور پہلوان مرحب کے زیر سرکردگی تھا۔ آنحضرت ﷺ نے جب مختلف قلعوں کی فتح کرنے کی غرض سے متعدد دستے متعین کیے۔ اور ہر دستہ کا جدا جدا ایک امیر مقرر کیا تو قلعہ قموص کی سرانجام دہی حضرت ابوبکرؓ کے سپرد ہوئی لیکن اسکو فتح کرنے کی سعادت حضرت شیر خدا حضرت علی مرتضیٰؓ کے لیے مقدر ہو چکی تھی اسلیئے اولاً حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ دونوں اس مہم میں کامیاب نہ ہو سکے [2]

فتح مکہ | ۸ھ میں فتح مکہ کی مہم پیش آئی یہ اسلامی تاریخ کا نہایت عظیم الشان واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ صلح حدیبیہ کے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے کے بعد جب ابوسفیان قریش کے نمائندہ کی حیثیت سے مدینہ منورہ آیا اور تجدید معاہدہ کی درخواست پیش کی تو اس معاملہ میں اس نے پہلے ابوبکرؓ کو اپنا سفارشی بنانا چاہا لیکن جب انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا تو پھر وہ حضرت عمرؓ کے پاس گیا بہرحال معاہدہ کی تجدید نہیں ہو سکی اور آنحضرت ﷺ نے دس ہزار جانثاروں کے ساتھ قریش پر چڑھائی کر کے مکہ فتح کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مکہ میں داخل ہو کر عورتوں کو دیکھا کہ دوپٹوں سے گھوڑوں کے منہ پر طمانچے مار رہی ہیں تو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف دیکھ کر تبسم فرمایا اور پوچھا "ابوبکر تم کو حسان بن ثابت کے وہ شعر یاد ہیں جنمیں انہوں نے اس منظر کو ذکر کیا ہے" حضرت ابوبکرؓ کو یہ شعر یاد تھے فوراً پڑھ کر سنا دیئے [3]

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۶ باب صلح الحدیبیہ [2] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۷ [3] ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۳۶ ۔

غزوۂ حنین | حنین مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ عرب کا مشہور بازار ذوالمجاز اسی کے پاس لگتا ہے۔

مکہ مکرمہ کی فتح اور قریش کے مغلوب ہونے کے باعث دوسرے قبائل کا بھی زور ٹوٹ گیا اور انہوں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ہوازن اور ثقیف یہ دو قبیلے جو فنون سپہ گری و جنگ جوئی کے میدان کے شہسوار تھے۔ اسلام کی عداوت میں اور سخت ہو گئے اور انہوں نے بڑے زور سے دوبارہ حملہ کی تیاری شروع کر دی۔ آں حضرت ﷺ کو اسکی اطلاع ہوئی اور بعد میں اپنا جاسوس بھیجکر آپ نے اسکی تصدیق بھی کر لی تو صحابہ کرام کو اطلاع ہوئی جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ چنانچہ ماہ شوال ۸ھ میں یعنی فتح مکہ کے فوراً بعد ہی اسلامی فوج نے جس کی تعداد بارہ ہزار تھی حنین کی طرف پیش قدمی کی۔ جنگ شروع ہوئی تو پہلے معرکہ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ لیکن وہ مال غنیمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہوازن جو نامور قدر انداز تھے انہوں نے تیر برسانے شروع کر دیئے [1] جس سے اسلامی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور آنحضرت ﷺ چند جانثاروں کے ساتھ تنہا رہ گئے۔ ان میں سے طبری نے بتصریح جن کا نام لیا ہے۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام سر فہرست ہے [2]

آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر انصار اور مہاجرین جو منتشر ہو گئے تھے پھر جمع ہوئے اور اس مرتبہ انہوں نے جم کر اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کی صفیں الٹ گئیں اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

اب مال غنیمت جمع ہونا شروع ہوا تو آنحضرت ﷺ نے اعلان کیا کہ مَنْ قَتَلَ قَتِيلًا فَلَهُ سَلَبُهُ (جو شخص کسی کا قاتل ہوگا مقتول کا سامان اسلحہ وغیرہ جو جنگ کے وقت اسکے ساتھ ہوں) اسی کو ملے گا۔ حضرت ابو قتادہؓ نے ایک مشرک کو جو بڑا بہادر اور طاقتور تھا قتل کیا۔ اب شہادت کی ضرورت ہوئی لیکن کوئی شاہد نہیں ملا تو انہوں نے اصل واقعہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔ ایک شخص بولا "ہاں"

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۷ [2] طبری ج ۳ ص ۷۴

یہ ابوقتادہ) سچ کہتے ہیں اور جس شخص کو انہوں نے قتل کیا ہے اس کا متروکہ (سلب) میرے پاس ہے۔ اب یہ آپ مجھ کو ہی دے دیجئے۔ حضرت ابوبکر صدیق پاس ہی بیٹھے تھے۔ یہ سن کر بولے "نہیں قسم اللہ کی یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت ﷺ قریش کے ایک بجو کو (یعنی ایسے بزدل آدمی کو جس نے جنگ میں حصہ نہیں لیا ہے) مقتول کا سامان دیدیں اور اللہ کے اس شیر کو نہ دیں جس نے اللہ اور رسول کی خاطر جنگ کی ہے۔ (اور اس شخص کو قتل کیا ہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا" ابوبکر سچ کہتے ہیں" چنانچہ وہ سامان ابوقتادہ کو ہی دیدیا گیا [1]

غزوۂ طائف حنین کی شکست خوردہ فوج طائف میں جو ایک نہایت محفوظ مقام تھا۔ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ آنحضرت ﷺ حنین کے اموال غنیمت وغیرہ کو مقام جعرانہ میں چھوڑ کر طائف کیلئے روانہ ہوئے اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اہل قلعہ بڑے ساز و سامان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے قلعہ سے اس زور کی تیر باری کی کہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا اور قلعہ سر نہ ہو سکا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا" میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ کسی نے مجھ کو ایک لبالب پیالہ نذر کیا ہے لیکن ایک مرغے نے اس میں ٹھونگ ماردی اور جو کچھ پیالہ میں تھا گر پڑا۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا" اس خواب سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس محاصرہ میں کامیابی نہیں ہوگی۔ ارشاد ہوا" ہاں! میں بھی یہی سمجھتا ہوں [2] چنانچہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

اسی محاصرہ میں حضرت ابوبکر صدیق کے صاحبزادے حضرت عبداللہ ایسے زخمی ہوئے کہ حضرت ابوبکر کے عہدِ خلافت کے ابتدائی دنوں میں یہی زخم ان کی موت کا سبب ہوا [3]

غزوۂ موتہ موتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے جو بلقاء سے قریب ہے۔ یہاں کی

[1] صحیح بخاری باب غزوۂ حنین، محمد طبری ج ۲ ص ۵۵۹ مطبوعہ مطبعۃ الاستقامۃ بالقاہرہ ۱۳۵۷ھ کتب میں غلطی سے آنحضرت ﷺ کا جواب "وانا لاادری ذالک" چھپ گیا ہے جس کے معنی "میں ایسا نہیں سمجھتا" ہیں حالانکہ در حقیقت یہ لاادری نہیں بلکہ لا اری ہے جس کے معنی تاکید کے ساتھ اثبات کے ہیں چنانچہ سیاق سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی اسکو اسی طرح پڑھا ہے۔ دیکھو ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۱۶

[3] اصابہ تذکرہ عبداللہ ابن ابی بکر الصدیق

تلواریں مشہور ہیں بلقاء کا رئیس ایک عرب شرحبیل بن عمرو تھا جو مذہباً عیسائی اور قیصر روم (ہرقل) کے ماتحت تھا۔ اس نے آنحضرت ﷺ کے ایک نامہ بر حضرت حارث بن عمیر کو قتل کر دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے قصاص لینے کے لئے ایک فوج روانہ کی جس میں اکابر مہاجرین و انصار شامل تھے لیکن اس لشکر کا امیر آپ نے حضرت زید بن حارثہ کو مقرر کیا جو آزاد کردہ غلام تھے۔ بعض لوگوں نے اس پر نکتہ چینی کی۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو سخت ناراض ہوئے۔ انہیں اکابر مہاجرین میں حضرت ابوبکر بھی تھے لیکن کیا مجال کہ ان کے تیور پر ایک شکن بھی پڑی ہو بلکہ اطاعت و انقیاد کا یہ عالم تھا جیسا کہ اپنے موقع پر بیان ہوگا کہ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد آپ نے پہلا کام یہی کیا کہ حضرت زید کے صاحبزادہ حضرت اسامہ کو جو غلام زادہ بھی تھے اور کم عمر بھی۔ امیر لشکر بنا کر شام کی مہم پر روانہ کیا۔ اسلام کی مساوات کا یہ بھی ایک عجیب روح پرور منظر ہے کہ حضرت سلمہ بن الاکوع نے ایک مرتبہ فرمایا۔ میں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ سات غزوات میں شرکت کی ہے علاوہ ان کے نو اور مہموں میں شریک ہوا ہوں۔ ان میں ہمارا امیر لشکر کبھی حضرت ابوبکر ہوتے تھے اور کبھی حضرت اسامہ [1] یہ غزوہ موتہ بھی ۸ھ میں ہوا تھا لیکن فتح مکہ حنین اور طائف سے پہلے۔ لیکن چونکہ اس غزوہ کا رشتہ غزوۂ تبوک سے ملتا ہے جو ۹ھ میں ہوا تھا اس بنا پر ہم نے اس کا ذکر مؤخر کر دیا ہے۔

غزوۂ ذات السلاسل ذات السلاسل شام کا ایک علاقہ ہے جہاں قبیلہ قضاعہ کے لوگ رہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے عمرو بن کعب الغفاری کی زیر سرکردگی پندرہ آدمیوں کا ایک دستہ ان لوگوں کو دعوت اسلام دینے کے لئے بھیجا تھا انہوں نے سب لوگوں کو قتل کر دیا تھا عمرو بن کعب سلامت بچے۔ اور مدینہ پہنچ سکے آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کی سرزنش کیلئے ماہ جمادی الآخر ۸ھ میں تین سو صحابہ کی ایک جماعت حضرت عمرو بن العاص کی امارت میں روانہ کی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ تین سو آدمی کم ہیں تو آپ نے دو سو مہاجرین و انصار کا ایک دستہ

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۲

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ اس دستہ میں حضرت ابوبکر بھی شامل تھے (طبری ج ۲ ص ۳۱۵)

غزوۂ تبوک: غزوۂ موتہ میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا تھا یہاں تک کہ آنحضرت صلعم کے محبوب ترین غلام حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر طیار جو حضرت علی مرتضیٰ کے سگے بھائی اور آنحضرت صلعم کے محبوب تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ جو مشہور انصاری تھے یہ سب یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب اسلامی لشکر واپس آیا ہے تو مدینہ منورہ پورا ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اس بنا پر عرب اور شام کی درمیانی سرحد پر جو عرب قبائل آباد تھے اور جو عیسائی ہونے کے ساتھ قیصر روم کے زیر اثر تھے انکا حوصلہ بڑھا اور قیصر روم نے مزید حوصلہ افزائی کر کے ان میں اور جرأت پیدا کر دی۔

آنحضرت صلعم کو یہ اطلاعات پہونچیں تو آپ نے ایک فوج گراں ترتیب دی اور ماہ رجب ۹ھ میں اسکو خود لیکر تبوک پہونچے جو مدینہ اور دمشق کے درمیان مدینہ سے چودہ منزل کی مسافت پر ایک مشہور مقام ہے۔

اکابر مہاجرین و انصار کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق بھی اس غزوہ میں شریک تھے لیکن آپ کی شرکت کا نمایاں اور امتیازی وصف یہ تھا کہ چونکہ یہ سال خشک سالی اور عام مالی تنگدستی و بدحالی کا تھا۔ جس کی وجہ سے جیسا کہ فتح الباری میں ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری اس لشکر کو جیش العسرۃ اور ابن عقیل اس کو غزوۃ العسرۃ کہتے ہیں۔ اس بنا پر آنحضرت صلعم نے صحابۂ کرام سے چندہ کی پُر زور اپیل کی۔ اس کے جواب میں حضرت عثمان غنی نے اس فیاضی سے کام لیا کہ سب سے آگے نکل گئے [1] لیکن اس کے باوجود جو شرف حضرت ابوبکر صدیق کو حاصل ہوا وہ کسی کو نہ ہو سکا۔ حضرت عمر بن الخطاب کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۱۰۔ ابن عساکر کا بیان ہے کہ اس لشکر جرار کی تیاری اور اس کے ساز و سامان پر جتنا خرچ ہوا تھا حضرت عثمان نے اس کا ایک تہائی خرچ اپنے ذمہ لیا تھا۔ اس کے بعد کوئی ضرورت لشکر کی ایسی نہیں تھی جو پوری نہ ہو گئی ہو۔ آنحضرت صلعم نے فرط مسرت میں ارشاد فرمایا کہ اب اس کے بعد عثمان جو بھی کریں ان کو نقصان نہیں پہونچے گا۔ ما یضر عثمان ما فعل بعد۔

نے جب چندہ کی اپیل کی تو اس وقت میرے پاس کافی مال تھا میں اس کا نصف لیکر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور اپنے دل میں کہا کہ اگر میں کسی دن ابوبکر پر بازی لیجا سکتا ہوں تو وہ دن آج کا ہی ہے لیکن جب ابوبکر آئے تو جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب اٹھا لائے حضور صلعم نے پوچھا "ابوبکر! تم نے اپنے گھر والوں کیلئے کیا چھوڑا؟" انہوں نے عرض کیا "بس! میں نے ان کیلئے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے" حضرت عمر فرماتے ہیں "اب مجھ کو یقین ہو گیا کہ میں حضرت ابوبکر سے کبھی سبقت نہیں لیجا سکتا [1]

ابن عساکر نے حضرت ابوبکر کے اس چندہ کی مقدار چار ہزار درہم بتائی ہے [2]

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں کہ اس غزوہ میں حضرت ابوبکر کی شرکت کی مندرجہ ذیل خصوصیات بھی ہیں۔

(۱) اسلامی فوج کا جائزہ لینے اور اس کی امامت کی خدمت آپ کے سپرد تھی۔

(۲) اثناء سفر میں آنحضرت صلعم نے چند لوگوں کے ساتھ ایک جگہ شب باشی کی اور لشکر سے دور ہو گئے اس حالت میں زبان مبارک سے ارشاد فرمایا "اگر لشکر صدیق اور فاروق کی پیروی کریگا تو راہ یاب ہوگا"

اخرجہ مسلم رح در قصۂ آں طویلے وارد [3]

سریۂ بنو فزارہ: جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں عام طور پر سرایا جو بھیجے جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق ان میں شریک نہیں ہوتے تھے اور آنحضرت صلعم کے پاس ہی مدینہ میں قیام فرماتے تھے۔ لیکن یہ کلیہ نہیں ہے بعض سرایا جو کسی حیثیت سے اہم ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکر کی سرکردگی میں جاتے تھے۔ چنانچہ ۷ھ میں بنو فزارہ قبیلہ کی طرف جو سریہ گیا تھا عام روایت تو یہ ہے کہ حضرت [illegible] بن حارثہ کی امارت میں گیا تھا لیکن سلمہ بن الاکوع سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر اس کے امیر تھے اور کامیاب واپس آئے تھے۔ قیدیوں میں فزارہ قبیلہ کی ایک عورت بھی تھی جو بہت

[1] جامع ترمذی باب مناقب ابی بکر الصدیق و ابو داؤد و کتاب الزکوٰۃ

[2] تاریخ ابن عساکر جلد اول ص ۱۱۰ [3] ازالۃ الخفاء مقصد دوم ص ۱۸۱

خوبصورت تھی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کو سلمہ بن الاکوعؓ کو دے دیا تھا لیکن مدینہ پہونچے پر آنحضرت ؐ نے اس عورت کو سلمہ سے مانگ لیا تھا۔ اور جو مسلمان مکہ میں قیدی تھے انکے فدیہ میں ان کو مکہ مکرمہ بھیجدیا۔ بنو فزارہ نہایت سرکش تھے اس سے پہلے حضرت زید بن حارثہؓ اور انکے ساتھیوں کے ساتھ نہایت بُرا معاملہ کر چکے تھے۔ یہ سریہ ان کی سرکوبی کرنے کے لیے گیا تھا [1]

اسی سال شعبان کے مہینہ میں بنو کلاب کی سرزنش کیلئے ایک سریہ بھیجا گیا حضرت ابوبکر صدیقؓ اس کے بھی امیر تھے۔ [2]

امارتِ حج | مکہ مکرمہ ۸ھ میں فتح ہوا لیکن چونکہ اس کے بعد ہی غزوہ حنین و طائف کی مہم پیش آگئی تھی اس بنا پر اس سال حج خالص اسلامی طریقہ پر ادا نہیں ہو سکا تھا ۹ھ میں سب سے پہلا موقع تھا کہ کعبۃ اللہ کو کفر و شرک کی ظلمتوں سے بالکل پاک صاف کر دیا جائے اور ارکان حج سنت ابراہیمیؑ کے مطابق ادا ہوں چنانچہ اس سال ذی قعدہ کے آخر یا ذی الحجہ کے اوائل میں آنحضرت ؐ نے تین سو (۳۰۰) مسلمانوں کا ایک کارواں حج کیلئے روانہ فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ اس کے امیر کارواں یا امیر حج تھے۔ کارواں کے ساتھ بیس اونٹ اور خود حضرت ابوبکرؓ کے اپنے پانچ اونٹ بھی قربانی کے لیے ساتھ تھے۔

حضرت ابوبکرؓ ابھی مقام عرج تک پہونچے تھے کہ انہیں پیچھے سے آنحضرت ؐ کی ناقہ جدعا کے بلبلانے کی آواز آئی۔ کان تو اس مرکب حبیب کی آواز سے آشنا تھے ہی فوراً پہچان گئے۔ مڑ کر دیکھا تو حضرت علیؓ ناقہ پر سوار چلے آ رہے ہیں حضرت ابوبکرؓ کو خیال گذرا کہ شاید مدینہ منورہ سے اُن کی روانگی کے بعد کوئی وحی آئی ہو اور اُسکی وجہ سے آنحضرت ؐ نے امارتِ حج سے متعلق اپنا پہلا فیصلہ بدل دیا ہو۔ اسلیے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ امیر ہو کر آئے ہیں یا قاصد بن کر؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ قاصد ہو کر، سورۂ برأت کی چالیس آیتیں مجمع حج کے ساتھ

[1] طبری ج ۲ ص ۸۸ و صحیح مسلم باب تنفیل و فداء المسلمین [2] الاساری سلمہ نے قاتی ج ۲ ص ۲۸۹

آنحضرت ؐ نے مجھ کو بھیجا ہے تاکہ میں حج کے موقع پر ان کا اعلان کردوں"۔ [1]

اب سب لوگ روانہ ہوئے۔ حج کا زمانہ آیا تو حضرت ابوبکرؓ نے یوم ترویہ (۸ ذی الحجہ) یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) اور یوم نحر (۱۰ ذی الحجہ) تینوں دن امیر حج کی حیثیت سے خطبہ پڑھا اور حضرت علیؓ نے سورۂ براءۃ کی آیتوں کا اعلان عام کیا۔ منادی کرنیوالوں میں حضرت ابوہریرہؓ بھی تھے۔ جو اس زور سے منادی کرتے پھرتے تھے کہ گلا بیٹھ بیٹھ جاتا تھا۔ اعلان عام کے الفاظ یہ تھے۔

اس سال کے بعد نہ تو کوئی مشرک حج کرے گا اور نہ کوئی برہنہ ہو کر طواف کریگا [2]

حجۃ الوداع ۱۰ ہجری | ماہ ذی قعدہ ۱۰ھ میں آنحضرت ؐ حج کیلئے تشریف لے گئے جس کو حجۃ الوداع بھی کہتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی اس سفر میں ہمرکاب تھے اور خصوصیت یہ تھی کہ آنحضرت ؐ کا سامان سفر حضرت ابوبکرؓ کی اونٹنی پر ہی بار تھا۔ حضرت اسماءؓ اس سفر کا تذکرہ کرتی ہوئی فرماتی ہیں کہ ہم سب آنحضرت ؐ کے ساتھ حج کرنے جا رہے تھے اور ایک ہی اونٹ تھا جس پر حضور ؐ اور ہم سب کا سامان لدا ہوا تھا۔ مقام عرج میں پہونچے تو حضور ؐ سواری سے اُتر کر بیٹھ گئے۔ حضرت عائشہؓ آنحضرت ؐ کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھیں اور میں اپنے والد کے پہلو میں تھی جس اونٹ پر سامان بار تھا وہ حضرت ابوبکرؓ کے ایک ملازم کی تحویل میں تھا۔ کافی انتظار کے بعد جب یہ ملازم منزل پر پہنچا تو حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا "اونٹ کیا ہوا" وہ بولا۔

[1] طبری ج ۲ ص ۳۸۲ پر ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ مقام ذوالحلیفہ سے خود واپس ہو کر آنحضرت ؐ کی خدمت میں پہونچے اور دریافت کیا کہ کیا میرے متعلق کوئی وحی آئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ نہیں لیکن جس چیز (سورۂ برأت کی وہ ابتدائی آیات جن میں فرمایا گیا ہے کہ جن مشرکوں کے ساتھ معاہدہ ہے اور انہوں نے نقض عہد بھی نہیں کیا ہے ان کو چار مہینے کی مہلت دیجاتی ہے اسکے بعد اگر کہ میں رہتے اور طواف کرنے کی اجازت نہیں دیجائیگی) کی تبلیغ ضروری ہو تو یا تو میں خود اسکی تبلیغ کرونگا یا میرا ہی کوئی اپنا کریگا۔ اے ابوبکر کیا تم اس پر راضی نہیں ہو وہ دن کہ تم میرے رفیق غار رہو اور حوض کوثر پر ساتھی ہو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا الحمد للہ۔ [2] ارشاد ہوا کہ اور حضرت ابوبکرؓ ... جمعہ ... نقیب ...

گذشتہ شب میں گم ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "ایک ہی اونٹ تھا وہ بھی تو نے گم کر دیا" اور یہ کہہ کر اسے مارنا شروع کر دیا۔ آنحضرت ﷺ یہ دیکھ کر مسکراتے جاتے اور فرماتے جاتے تھے کہ ذرا اس محرم (حج کا احرام باندھنے والا) کو تو دیکھو کیا کر رہا ہے۔[1] آنحضرت ﷺ نے صرف اسی قدر فرمایا اور وہ بھی مسکراتے ہوئے اور حضرت ابوبکرؓ کو مارنے سے منع نہیں فرمایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضرب شدید نہیں تھی اور حضرت ابوبکرؓ نے یوں ہی معمولی طریقہ پر دو چار طمانچے لگا دیئے ہوں گے۔

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۶ ص ۳۴۴

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ

تکمیل فرض کا اعلان | حجۃ الوداع کے موقعہ پر آنحضرت ﷺ نے ایک نہایت عظیم الشان خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اسلامی دستورِ حیات کے نہایت اہم امور پر روشنی ڈالی تھی اور ان پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی تاکید کی تھی یہ گویا نبوت کے فرض کی تکمیل کا اعلان تھا۔ چنانچہ خطبہ کے آخر میں آپ نے دریافت فرمایا۔

"کیا میں نے خدا کے احکام تم تک پہونچا دیئے ہیں؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا "بیشک" آپ نے فرمایا "اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ" اے اللہ تو گواہ رہ[1] اسی دن عرفات میں یہ آیت اتری[2]

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ)	آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے اوپر پوری کر دی اور تمہارے دین کے اعتبار سے اسلام کو پسند کیا ہے

حضرت ابوبکرؓ کا اندیشہ | مدینہ طیبہ واپس آ کر آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ دیا جس میں یہ بھی ارشاد فرمایا "اللہ نے ایک بندہ کو دنیا میں اور اس چیز میں جو اللہ کے پاس ہے اختیار دیا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کر لے۔ اس بندہ نے مَا عِنْدَ اللّٰهِ یعنی قرب خداوندی کو اختیار کر لیا۔

[1] البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۹۶ (مناقب ابی بکر عبداللہ بن ابی قحافہ

[2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۶۳ -

حضرت ابوبکرؓ یہ سنتے ہی رونے لگے۔ صحابۂ کرام کو سخت حیرت ہوئی کہ اس میں رونے کی کیا بات تھی! لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ جو کہ محرمِ اسرارِ نبوت اور رمز شناسِ کلامِ رسالت تھے فوراً سمجھ گئے تھے کہ یہ بندہ خود آنحضرت صلعم کی ذاتِ مبارک ہے اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کی دنیا سے رحلت کا وقت قریب آپہونچا ہے۔

آغازِ مرض چنانچہ اس واقعہ کے چند روز بعد ہی ایک دن آنحضرت صلعم جنت البقیع سے تشریف لائے تو آپ کے سر میں شدید درد تھا۔ گھر میں داخل ہو کر حضرت عائشہؓ کو دیکھا کہ اتفاق سے وہ بھی درد سر کے مارے کراہ رہی ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی آپ ہر بیوی کے ہاں باری باری سے جاتے رہے۔ آخر حضرت میمونہؓ کی باری کے دن تکلیف زیادہ شدید ہو گئی تو ازواجِ مطہرات نے حضور صلعم کا ایما پاکر آپ کو حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں ہی قیام فرمانے کی اجازت دیدی۔ لیکن اس وقت تک ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ آپ یہاں تشریف لائے تو اس طرح کہ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چلا جاتا نہیں تھا۔ اور دو شخص حضرت فضل بن عباس اور حضرت علیؓ آپ کو تھامے ہوئے تھے۔ [1]

حضرت ابوبکرؓ کو امامتِ صلوٰۃ کا حکم جب تک آمد و رفت کی طاقت رہی آپ مسجد میں نماز پڑھانے تشریف لاتے رہے۔ لیکن جب اس سے بھی معذوری ہو گئی تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا "ابوبکرؓ سے کہو نماز پڑھائیں" حضرت عائشہؓ نے عرض کیا "ابوبکرؓ رقیق القلب ہیں جب وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو فرطِ گریہ سے ان کی آواز کسی کو سنائی نہ دے گی۔ اس لیے عمرؓ کو حکم کیجئے کہ وہ نماز پڑھائیں۔ ساتھ ہی حضرت عائشہؓ کے کہنے پر حضرت حفصہؓ نے بھی اپنے والد حضرت عمرؓ کی سفارش کی لیکن آنحضرت صلعم نے کوئی عذر قبول نہیں فرمایا اور پھر اصرار کے ساتھ حکم دیا کہ ابوبکرؓ سے ہی کہو نماز پڑھائیں اور حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ سے بگڑ کر فرمایا "تم انہیں عورتوں میں سے ہو جنہوں نے یوسفؑ کو تنگ کر دیا تھا!" حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے یہ سن کر کہا "بھلا مجھ کو تمہاری طرف سے کوئی خیر کیوں پہونچنے لگا؟" [2]

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۱۶۱، [2] البدایۃ والنہایۃ جز ۵ ص ۲۲۴، [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۳

اس حکم کے مطابق حضرت ابوبکرؓ تین دن تک نماز پڑھاتے رہے۔ آخر ایک دن آنحضرت صلعم کو کچھ افاقہ محسوس ہوا۔ حجرہ سے باہر نکل کر خود تشریف لائے۔ حضرت ابوبکرؓ نماز شروع کر چکے تھے حضور کو دیکھ پیچھے ہٹنے لگے۔ آنحضرت صلعم نے اشارہ سے منع فرمایا اور خود حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اب حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلعم کی اور دوسرے نمازی حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کر رہے تھے۔

ایک روز حسبِ معمول نماز پڑھانے کے لیے حضرت ابوبکرؓ آگے بڑھ رہے تھے کہ دفعۃً حجرۂ نبوی کا پردہ اٹھا اور حضور پرنور کا روئے مبارک دفعۃً ظاہر ہوا۔ شمعِ رسالت کے پروانوں کی خوشی کی حد نہ رہی۔ حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹنے لگے۔ حضور نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور انہوں نے نماز پڑھانی شروع کر دی۔ حضور باہر تشریف لانا چاہتے تھے لیکن ایسا کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ پھر واپس اندر چلے گئے اور پردہ گرا لیا۔ [1] حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ یہ آخری نماز جو حضرت ابوبکرؓ نے پڑھائی نمازِ فجر تھی [2]

وصالِ نبوی صلعم صحابۂ کرام جن کے دل محبوبِ انس و جاں کی شدید علالت کے باعث مرجھائے ہوئے تھے۔ روئے منور کی جھلک دیکھ کر خوشی سے شگفتہ ہو گئے لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ یہ آخری جلوۂ عام اور آفتابِ لبِ بام تھا [3]

حضرت ابوبکرؓ نماز سے فارغ ہو کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں آئے۔ چونکہ حضور کو قدرے افاقہ تھا اور درد کی شدت میں کمی محسوس ہوتی تھی اس لیے حضرت عائشہؓ سے اجازت لیکر مقام سنح چلے گئے جہاں ان کی بیوی حبیبہ بنت خارجہ رہتی تھیں

---

[1] یہ صحیح بخاری کی روایت ہے ابن سعد نے فضیل بن عمرو الفقیمی سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلعم کی حیات میں تین مرتبہ نماز پڑھائی۔ لیکن اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن سعد خود ہی فرماتے ہیں کہ ان تین نمازوں سے وہ نمازیں مراد ہیں جن میں آنحضرت صلعم نے خود حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کی تھی ورنہ یوں تو انہوں نے سترہ مرتبہ نماز پڑھائی ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکرؓ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۳ [3] البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۴۴

یہاں جب چاشت چڑھی تو سرورِ کائنات ؐ رحلت کر گئے عالم جاودانی ہو کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے سالم بن جبید کے ذریعہ حضرت ابوبکر کو اس حادثۂ فاجعہ کی خبر پہنچی تو فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ آ گئے۔ یہاں مسجد نبوی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ آپ نے کسی سے کوئی بات نہیں کی سیدھے گھر میں تشریف لائے جہاں آنحضرت ؐ ایک یمنی نقش و نگار کی چادر اوڑھے استراحت فرما تھے جسد اطہر کے قریب کھڑے ہو کر رخ روشن سے چادر اٹھائی اس پر جھکے بوسہ دیا اور پھر آپ ؐ کو خطاب کر کے اس طرح گویا ہوئے۔

بابی انت وامی طبت حیا ومیتا	میرے ماں اور باپ دونوں آپ پر فدا ہوں
والذی نفسی بیدہ لا یذیقک	آپ زندگی میں بھی پاک و صاف رہے اور
اللہ الموتتین ابدا اما	اب موت کے بعد بھی پاک و صاف ہیں۔
الموتۃ التی کتب اللہ	جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس کی قسم کہ
علیک فقد متہا	اللہ آپ کو ہرگز دو موتیں نہیں دیگا۔ بہرحال
	جو اللہ نے آپ کیلئے مقدر کی تھی وہ تو آپ کو آ ہی گئی۔

اس کے بعد مسجد میں تشریف لائے تو یہاں عجیب کہرام مچا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ غصہ ہوئے قسم کھا کھا کر کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات نہیں ہوئی ہے جیسا کہ خود اُن کا بیان ہے انہیں یہ بات یاد ہی نہیں رہی تھی کہ حضور کی وفات ہو بھی سکتی ہے حضرت ابوبکر نے انہیں سمجھایا اور کہا کہ بیٹھ جاؤ مگر وہ نہ مانے پھر کہا مگر وہ اب بھی نہیں مانے۔ آخر حضرت ابوبکر نے فرمایا "سنو قسم کھانے والے ذرا ٹھہر اور جلدی نہ کر" حضرت عمرؓ اب بیٹھ گئے تو آپ نے تقریر شروع کی پہلے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا۔

اَلَا مَنْ کَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا	جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پوجا کرتا تھا وہ سن
فَاِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ	لے کہ بے شک محمد ؐ کی موت واقع ہو گئی۔ مگر ہاں
وَسَلَّمَ قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ	جو شخص اللہ کی بندگی کرتا ہے

یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ	تو بے شک اللہ زندہ ہے اور اس کیلئے موت نہیں ہے۔

اس کے بعد آپ نے حسب ذیل آیات تلاوت کیں۔

(۱) اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ	اے محمد آپ کو بھی موت آنی ہے اور بے شبہ وہ بھی مرنے والے ہیں۔
(۲) وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ	اور محمد نہیں مگر اللہ کے ایک رسول جن سے پہلے بھی اور
قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ	رسول گزر چکے ہیں پس اگر ان کو موت آ جائے یا قتل کر دیئے
انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ	جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے کو لوٹ جاؤ گے
عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا	اور جو شخص ایسا کریگا تو وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں
وَسَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ ۔	پہنچا سکتا اور اللہ شکر گزاروں کو عنقریب جزا دیگا۔

یہ سن کر لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے مگر ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا کہ گویا یہ آخری آیت انہیں معلوم ہی نہیں تھی۔ اب حضرت ابوبکر نے اس کی تلاوت کی تو ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور اس قدر موثر و دلنشین ثابت ہوئی کہ ہر شخص اسکو ہی پڑھ رہا تھا [1]

سقیفۂ بنی ساعدہ: یہاں آنحضرت ؐ کی تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور ادھر منافقین کی ریشہ دوانی نے یہ گل کھلایا کہ انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں جو ان کا دار الشوریٰ یا دار الندوۃ تھا جمع ہوئے اور آنحضرت ؐ کے جانشین کی بحث چھڑ گئی۔ سعد بن عبادہ مشہور انصاری ہیں، غزوات میں انصار کا علم انہیں کے ہاتھ میں رہتا تھا انصار کا خیال تھا کہ خلیفۂ رسول ؐ ان کو ہونا چاہیئے۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ تھے جو کہتے تھے کہ بجائے ایک امیر کے دو امیر ہوں۔ ایک انصار سے اور دوسرے مہاجرین سے ظاہر ہے کہ یہ دوسری شکل تو کسی طرح بھی قابل عمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اسکے قبول کر لینے

[1] امام بخاری نے اس روایت کو جو حضرت عائشہ سے مروی ہے کچھ لفظوں کے رد و بدل اور کمی بیشی کے ساتھ اپنی صحیح میں دو جگہ نقل کیا ہے۔ ایک باب الدخول علی المیت بعد الموت اذا ادرج فی اکفانہ کے تحت اور دوسرے باب مناقب المہاجرین وفضلہم کے زیر عنوان۔ ہم نے دونوں کو جمع کر دیا ہے۔

سے اسلامی وحدت کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے منتشر ہو جاتا۔ اب رہی پہلی صورت تو اس میں
اشکال یہ تھا کہ قریش جو عرب میں سب سے زیادہ با اقتدار تھے اور جن میں سرداری طور پر
امارت و ریاست کے اوصاف و کمالات بہ نسبت دوسروں کے زیادہ پائے جاتے
تھے یہاں تک کہ خود آں حضرت ﷺ نے الائمۃ من قریش۔ امام تو قریش میں ہی پیدا
ہوتے ہیں فرما کر قریش کی اس خصوصیت و امتیاز پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ وہ
امارت سے محروم ہو جاتے اور اس کا نقصان یقیناً اسلامی معاشرہ کو پہنچتا۔ لیکن اس
میں شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اور اسلام کی انصار نے جو خدمات انجام دی تھیں وہ بھی
بہت عظیم الشان تھیں اور ان کے فضائل و مناقب کا باب بہت وسیع تھا۔ پھر
مہاجرین میں بھی قریش کا ایک گروہ جس میں ابو سفیان تھے اپنے سامنے کسی کو نظر میں
نہیں لاتا تھا جہاں تک انصار کا تعلق ہے ان میں بھی دو قبیلے تھے اوس اور خزرج ان
میں باہمی رقابت اور منافست مدت سے چلی آ رہی تھی اسلام قبول کرنے کے بعد یہ کم
ضرور ہوئی تھی لیکن معدوم نہیں ہوئی اس بنا پر اسلام کی وحدتِ اجتماعی کیلئے یہ
انتہائی نازک وقت تھا اور خلافت کے معاملہ کو کامیابی کے ساتھ حل کر لینے پر ہی اسکی
بقاء کا دار و مدار تھا۔ آخر اس عقدۂ لاینحل کی گرہ کشائی بھی حضرت ابوبکر صدیق کے ناخن
تدبیر سے ہوئی اور اسلام میں جو رخنہ اور فتنہ پیدا ہو رہا تھا اس کا سدِّ باب ہو گیا۔

چنانچہ حضرت[1] ابوبکر صدیق کو اس ہنگامہ آرائی کی اطلاع ہوئی تو سب کو چھوڑ
چھاڑ حضرت عمر اور حضرت ابو عبیدۃ بن الجراح جو امین ہذہ الامۃ کے لقب سے سرفراز

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۲۴ پر مسند ابو یعلیٰ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور سب آل بیت آنحضرت ﷺ کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے کہ ایک شخص نے دیوار کے پیچھے سے حضرت عمر کو آواز دے کر کہا کہ ذرا باہر تو آیئے فاروق اعظم نے جواب دیا "چلو ہٹو" ہم آنحضرت ﷺ کے کام میں لگے ہوئے ہیں ہم کو فرصت نہیں۔ اب یہ شخص بولا" ادھر دیکھئے بڑا غضب ہو گیا۔ انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہیں آپ ذرا چل کر ان کی خبر لیجئے۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی ایسی چیز کھڑی کر دیں جو جنگ کا باعث ہو" یہ سن کر حضرت عمر نے صدیق اکبر سے کہا چلئے اور وہ روانہ ہو گئے۔

تھے ان کو ساتھ لیکر سقیفۂ بنی ساعدہ پہونچے یہاں دیکھا کہ عجیب ہنگامہ اور شور و غل
برپا ہے جب یہ تینوں بیٹھ گئے تو انصار کا ایک خطیب کھڑا ہوا اور اس نے کہنا شروع کیا

"ہم اللہ کے انصار اور اسلام کے لشکر ہیں اور اے مہاجرین تم ہمارے نبی
کے ساتھی (رھط) ہو۔ لیکن اب تم ہم سے برگشتہ ہو گئے ہو اور جو ہمارا
مقام ہے اس سے ہم کو الگ کرنا چاہتے ہو۔"

یہ تقریر ختم ہوئی تو حضرت عمر نے بولنا چاہا لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے انہیں روک دیا
اور خود کھڑے ہو کر ایک تقریر کی جس کا ہر ہر لفظ فصاحت و بلاغت کی جان تھا۔ خود
حضرت عمر کا بیان ہے کہ میں اس موقعہ کیلئے ایک بہت اچھی تقریر سوچ سانچ کے اور
پہلے سے اس کو اپنے دماغ میں تیار کر کے گیا تھا اور خیال تھا کہ ابوبکر ایسی تقریر
نہیں کر سکیں گے۔ لیکن جب ابوبکر خود کھڑے ہوئے تو انہوں نے وہ باتیں فی البدیہہ اور
انتہائی بلاغت کے ساتھ کہہ ڈالیں جنکو میں غور و فکر کے بعد اپنے دماغ میں جما کر لے گیا تھا[1]

حضرت ابوبکر کی تقریر حضرت ابوبکر صدیق نے حمد و صلوٰۃ کے بعد اپنی تقریر میں پہلے تو مہاجرین
کے فضائل اسلام کے لیئے ان کی غیر معمولی قربانی اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ رشتہ و قرابت کا
ذکر کیا اور اس کے بعد فرمایا "اے انصار تم جو کچھ اپنے متعلق کہتے ہو بے شک تم اس کے
اہل ہو اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ بھی تم کو بڑا گہرا تعلق تھا۔ آپ
کی بعض معزز ازواج مطہرات تم ہی میں سے تھیں[2] لیکن عرب اس معاملہ میں سوائے
قبیلہ قریش کے ساتھ اور کسی کی اطاعت قبول نہیں کریں گے۔ اس کے بعد حضرت
عمر اور حضرت ابو عبیدۃ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ لو ان میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کر لو

---

[1] ابن جریر طبری ج ۳ ص ۲۰۴۔ طبری نے سقیفۂ بنی ساعدہ کے اس جلسہ کی اور اس میں جو تقریریں ہوئیں ان سب کی تفصیل روداد قلمبند کی ہے لیکن ہم نے غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر دیا ہے۔

[2] صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۰۹ امام بخاری نے یہ ساری داستان خود حضرت عمر فاروق کی زبانی سنائی ہے حضرت ابوبکر نے خلافت کے لئے جب حضرت عمر کا نام پیش کیا تو خود حضرت عمر کا بیان ہے کہ میرے لئے یہ حد درجہ ناگوار بات تھی خدا کی قسم! بغیر کسی گناہ کے میری گردن اڑا دی جاتی یہ بات میرے لئے (باقی برصفحہ ۸۶)

اس پر شور و شغب زیادہ بڑھنے لگا اور انصار کی طرف سے حباب بن منذر نے سخت کلامی کی تو حضرت عمرؓ نے پیش قدمی کر کے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ نہیں! ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے کیونکہ آپ ہم سب سے بہتر ہیں ہمارے سردار ہیں اور آنحضرتؐ سب سے زیادہ آپ سے محبت کرتے تھے۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بیعت کی حضرت عمرؓ کا بیعت کرنا تھا کہ مہاجرین اور انصار سب نے ہاتھ بڑھا دیئے ۱؎

ابن اسحاق کی ایک روایت ہے کہ بشیر بن الانصاری نے حضرت عمرؓ سے بھی پہلے بیعت کی تھی ۲؎ لیکن دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ اس قدر ہجوم کے موقع پر اول تو اس کا ٹھیک پتہ چلنا مشکل ہے کہ کس نے سبقت کی اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ مہاجرین میں سب سے پہلے بیعت کرنے والے ہوں اور حضرت بشیر بن سعد نے انصار میں سب سے پہلے بیعت کی ہو۔

سقیفۂ بنی ساعدہ کے ہنگامہ سے فارغ ہو کر کاشانۂ قدس پر حاضر ہوئے اور آنحضرتؐ کی تدفین میں شریک ہوئے۔ یہاں صحابہ کرامؓ میں اختلاف تھا کہ کہاں دفن کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "میں نے رسول اللہؐ سے ایک حدیث سنی ہے جس کو میں نہیں بھولا ہوں اور وہ یہ ہے کہ

ما قبض اللّٰہ نبیاً الا فی الموضع الذی	اللہ کسی نبی کی روح اسی جگہ قبض کرتا ہے جہاں
یحب ان یدفن فیہ	اس کو دفن ہونا محبوب ہوتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا" ادفنوہ فی موضع فراشہ" تم لوگ بھی رسول اللہؐ ۳؎

(بقیہ صفحہ ۸۵) بہت آسان تھی بہ نسبت اسکے کہ میں ایک ایسی قوم کا امیر بنتا جسمیں کہ ابوبکرؓ موجود ہوں حضرت ابوبکرؓ نے دوسرا نام حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح کا پیش کیا تھا۔ ان کے متعلق ابن سعد نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب بعض لوگوں نے ان سے بیعت کرنی چاہی تو انہوں نے فرمایا ـــــ تم لوگ میرے پاس آتے ہو حالانکہ تم میں ثالث ثلاثہ (ثانی اثنین غار ثور کی طرف اشارہ ہے) یعنی حضرت ابوبکرؓ موجود ہیں۔ (ابن سعد تذکرۃ حضرت ابوبکرؓ) ۱؎ صحیح بخاری ج۱ ص ۵۱۸ باب مناقب المہاجرین) ۲؎ صحیح بخاری ج۱ ص ۵۱۸ وجلد مقدم ص ۹۰۵ باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت ۳؎ البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۴۸

کو آپ کی اسی خواب گاہ میں دفن کرو" چنانچہ ایسا ہی ہوا ۱؎

بیعتِ عامہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں تو چند لوگوں نے بیعت کی تھی۔ آنحضرتؐ کی وفات کے دوسرے دن یعنی بروز سہ شنبہ ۱۳ ربیع الاول ۱۱ھ مطابق ۲۸ مئی ۶۳۲ء مسجد نبوی میں بیعت عامہ کا انتظام کیا گیا۔ سب مسلمان جمع ہوئے پہلے حضرت عمر فاروقؓ نے منبر پر بیٹھ کر خطبہ دیا۔ اس میں فرمایا کہ "میں امید کرتا تھا کہ رسول اللہؐ ہم لوگوں کے بعد تک زندہ رہیں گے۔ لیکن اب اگر محمدؐ وفات پا گئے ہیں تو خیر اللہ نے تمہارے سامنے ایک ایسا نور رکھ دیا ہے جس سے تم وہی ہدایت حاصل کر سکتے ہو جو رسول اللہؐ سے حاصل کرتے تھے بے شبہ ابوبکرؓ رسول اللہؐ کے ساتھی اور غار کے رفیق ہیں۔ مسلمانوں میں سب سے زیادہ بہتر تم لوگوں کے معاملات کی سربراہی کیلئے وہ ہی ہیں۔ پس کھڑے ہو اور ان سے بیعت کرو۔" حضرت عمرؓ تقریر سے فارغ ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ جو خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے "آپ منبر پر تشریف لائیے" لیکن صدیق اکبرؓ کو جنبش نہ ہوئی آخر جب کئی مرتبہ کہا تو آپ منبر پر چڑھے اور مسلمانوں نے آپ سے بیعت کی ۲؎۔ یہ بیعت عامہ تھی۔

پہلا خطبہ اس کے بعد آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کی نسبت ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ ایسا خطبہ پھر کبھی کسی کی زبان سے سننے میں نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور درود و سلام کے بعد فرمایا۔

اما بعد ایہا الناس فانی قد ولیت علیکم	لوگو! میں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں حالانکہ میں
ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی	تم سے بہتر نہیں ہوں بس اگر میں اچھا کروں تو تم
وان اساءت فقومونی۔ الصدق	میری مدد کرو۔ اور اگر برا کروں تو مجھ کو سیدھا
امانۃ والکذب خیانۃ۔ والضعیف	کرو۔ سچائی ایک امانت ہے۔ اور جھوٹ
منکم قوی عندی حتی اریح علتہ	خیانت ہے۔ تم میں جو کمزور ہے وہ میرے
ان شاء اللّٰہ والقوی فیکم ضعیف	نزدیک قوی ہے چنانچہ میں اس کا شکوہ دور
حتی آخذ منہ الحق ان شاء اللّٰہ	کروں گا۔ اور تم میں جو قوی ہے وہ میرے

۱؎ شمائل ترمذی مطبوعہ کانپور ص ۲۸ ۲؎ صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۲ باب الاستخلاف

لایدع قوم الجهاد فی سبیل اللہ الا ضربهم اللہ بالذل ولا یشیع قوم قط الفاحشة الا عمهم اللہ بالبلاء ۔ اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعة لی علیکم قوموا الی صلوتکم ۔ رحمکم اللہ ۔

نزدیک کمزور ہے ۔ چنانچہ اس سے حق لوں گا جو قوم جہاد کو چھوڑ دیتی ہے ۔ اللہ اس پر ذلت کو مسلط کر دیتا ہے ۔ اور جس قوم میں بری باتیں عام ہو جاتی ہیں اللہ ان پر مصیبت کو مسلط کر دیتا ہے جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری کوئی اطاعت فرض نہیں ہے ۔ اچھا اب جاؤ نماز پڑھو ۔ اللہ تم پر رحم فرمائے ۔

متخلّفین

سیر و تاریخ کی کتابوں میں بعض ایسی شخصیتوں کے نام بھی ملتے ہیں جن کی نسبت مورخین عام طور پر لکھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابوبکر سے اس دن بیعت نہیں کی تھی ان میں سب سے اہم نام حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا ہے[1] ان کے بعد دوسرے نمبر پر حضرت زبیر بن العوام اور مشہور انصاری حضرت سعد بن عبادہ کے نام ہیں ۔ اگرچہ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جو دین کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے ۔ لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ مورخین نے اس کو چنداں اہمیت نہیں دی اور وہ اس پر سرسری کلام کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں ۔ ہم ان تینوں بزرگوں میں سے ہر ایک کی نسبت الگ الگ کلام کرتے ہیں

---

[1] البدایة والنہایة ج ۵ ص ۲۴۸ ۔

حضرت علی کی بیعت

حضرت علی کی نسبت عام خیال یہ ہے کہ آپ نے چھ ماہ یعنی حضرت فاطمہ کی وفات تک خلیفۂ اول سے بیعت نہیں کی اور ناراض ہو کے گھر میں بیٹھے رہے ۔ آخر جب حضرت فاطمہ بھی رہ گزائے عالم آخرت ہو گئیں تو آپ نے اور آپ کے ساتھ بنی ہاشم نے جو حضرت علی کے مکان میں مقیم تھے حضرت ابوبکر کو مکان میں بلایا ۔ یہاں حضرت علی اور حضرت ابوبکر دونوں میں گفتگو ہوئی ۔ شکوے شکایت ہوئے اور آخر جب صلح صفائی ہو گئی تو حضرت علی نے بیعت کی ۔ مسلمانوں کو جب یہ خبر ملی تو بڑے خوش ہوئے ۔

عام مورخین اور ارباب سیر کی اس روایت کا سرچشمہ دراصل صحیح بخاری کی روایت ذیل ہے ۔

عن عائشة ان فاطمة بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ارسلت الی ابی بکر تسئلہ میراثها من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما افاء اللہ علیہ بالمدینة وفدک وما بقی من خمس خیبر فقال ابوبکر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ۔ لا نورث ما ترکنا صدقة انما یاکل آل محمد فی هذا المال وانی واللہ لا اغیر شیئا من صدقة

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ فاطمہ نے ابوبکر کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ چیزیں جو اللہ نے رسول اللہ صلعم کو مدینہ میں دی تھیں اور فدک اور خیبر کے خمس کا جو کچھ بچا ہوا ہے ان میں سے جو میری میراث ہے وہ مجھ کو دے دیجئے ۔ حضرت ابوبکر نے جواب دیا کہ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہے جو کچھ ہم چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا ۔ اور آل محمد بھی اسی میں سے کھائیں گے قسم ہے اللہ کی آنحضرت صلعم کا صدقہ آپ کی زندگی میں جس حالت پر تھا ۔

رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
عن حالہا التی کان علیہا فی عہد
رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
ولا عملن فیہا بما عمل بہ رسول
رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
فابی ابو بکر ان یدفع الی فاطمۃ
منہا شیئاً فوجدت فاطمۃ علی
ابی بکر فی ذالک فہجرتہ فلم تکلمہ
حتی توفیت وعاشت بعد النبی
صلی اللّٰہ علیہ وسلم ستۃ اشہر
فلما توفیت دفنہا زوجہا علی لیلاً
ولم یؤذن بہا ابا بکر وصلی علیہا
وکان لعلی وجہ حیاۃ فاطمۃ فلما
توفیت استنکر علی وجوہ الناس
مصالحۃ ابی بکر ومبایعتہ ولم
یکن یبایع تلک الاشہر فارسل
الی ابی بکر ان ائتنا ولا یاتنا احد
معک کراھیۃ لیحضر عمر فقال
عمر لا واللّٰہ لا تدخل علیہم وحدک
فقال ابو بکر وما عسیتہم ان
یفعلوا بی واللّٰہ لآتینہم فدخل
علیہم ابو بکر فتشہد علی فقال
انا قد عرفنا فضلک وما اعطاک

میں اس میں کوئی تغیر نہیں کروں گا۔ اور میں
اُس سے متعلق وہی عمل کروں گا جو آنحضرتؐ
نے کیا تھا۔ یہ کہہ کر ابو بکر نے فاطمہ کو ان چیزوں
میں سے کوئی بھی چیز دینے سے انکار کر دیا۔ بس
یہ فاطمہ ابو بکر سے ناراض ہو گئیں یا انہوں نے ان کو
چھوڑ دیا اور وفات پانے تک ان سے کلام
نہیں کیا۔ فاطمہ آنحضرتؐ کے بعد چھ مہینے
زندہ رہیں جب ان کی وفات ہوئی۔ تو
ان کے شوہر علی نے رات ہی کو انہیں دفن کر
دیا اور ابو بکر کو اس کی خبر نہیں کی اور علی نے
ان کی نماز پڑھی۔ فاطمہ کی زندگی میں علی کا
بڑا وقار تھا لیکن جب فاطمہ کی وفات ہو گئی
تو علی نے محسوس کیا کہ اب لوگوں کے دلوں میں
وہ پہلی سی بات نہیں رہی اس لیے انہوں نے
ابو بکر سے صلح کر لینی اور ان سے بیعت کرنی
چاہی اور انہوں نے ان مہینوں میں بیعت
نہیں کی تھی چنانچہ علی نے ابو بکر کو گھر بلایا اور
ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا کہ آپ کے ساتھ
کوئی اور نہ آئے۔ کیونکہ وہ اس بات کو پسند
نہیں کرتے تھے کہ ان کے ساتھ عمر آئیں۔ عمر نے
ابو بکر کو مشورہ دیا کہ وہ تنہا نہ جائیں۔ ابو بکر
نے کہا کہ مجھ کو ان (بنو ہاشم) سے یہ امید
نہیں کہ وہ میرے ساتھ ایسا ویسا معاملہ

اللّٰہ ولم ننفس علیک خیراً ساقہ
اللّٰہ الیک ولکنک استبددت
علینا بالامر وکنا نری لقرابتنا
من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
نصیباً حتی فاضت عینا ابی بکر
فلما تکلم ابو بکر قال والذی نفسی
بیدہ لقرابۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ
علیہ وسلم احب الی ان اصل من
قرابتی واما الذی شجر بینی وبینکم
من ھذہ الاموال فانی لم آل فیہا
عن الخیر ولم اترک امراً رأیت
رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
یصنعہ فیہا الا صنعتہ فقال
علی لابی بکر موعدک العشیۃ
للبیعۃ۔ فلما صلی ابو بکر الظہر
رقی علی المنبر فتشہد وذکر شان
علی وتخلفہ عن البیعۃ وعذرہ
بالذی اعتذر الیہ ثم استغفر و
تشہد علی فعظم حق ابی بکر وحدث
انہ لم یحملہ علی الذی صنع
نفاسۃ علی ابی بکر ولا انکاراً
للذی فضلہ اللّٰہ بہ ولکنا
کنا نری لنا فی ھذا الا نصیباً

کریں گے۔ بخدا میں اُن کے پاس ضرور جاؤں
گا۔ چنانچہ ابو بکر اُن کے پاس آئے تو علی نے
کلمۂ تشہد پڑھا اور پھر کہا کہ ہم آپ کے فضل کو
اور جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے اُس کو پہچانتے
ہیں اور جو چیز (خلافت) اللہ نے آپ کو بخشی ہے
ہم اس میں آپ کی ریس نہیں کرتے لیکن ہاں آپ نے
خلافت کا معاملہ خود ہی طے کر لیا۔ حالانکہ
آنحضرتؐ کے ساتھ قرابت کی وجہ سے ہم بھی
اس میں اپنا حصہ سمجھتے تھے ابو بکر یہ سن کر آ
آبدیدہ ہو گئے پھر جب انہوں نے بولنا شروع
کیا تو کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ
میں میری جان ہے رسول اللہ صلعم کی قرابت
مجھ کو اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اپنے
اعزہ کے ساتھ صلہ رحمی کروں رہا وہ اختلاف
جو میرے اور تمہارے درمیان اُن اموال کے
بارے میں رونما ہو گیا ہے تو میں نے خیر کے کرنے
میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور میں نے کوئی
ایسا کام جس کو رسول اللہ صلعم نے کیا ہو اس کو کئے
بغیر نہیں چھوڑا۔ یہ سن کر علی نے ابو بکر سے کہا
کہ اچھا آپ بیعت کیلئے دوپہر بعد کیجئے پھر
جب ابو بکر نے ظہر کی نماز ادا کر لی تو انہوں
نے کلمۂ تشہد پڑھا اور علی کا حال اور بیعت سے
انکی علیحدگی اور اسکا جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا

واستبد علينا فوجدنا في انفسنا فسر بذلك المسلمون وقالوا أصبت وكان المسلمون الى علي قريباً حين راجع الامر بالمعروف [1]

وہ سب بیان کیا پھر استغفار پڑھا پھر اس کے بعد علی نے تشہد پڑھا ابوبکر کے حق کی بڑائی بیان کی اور انہوں نے کہا کہ میں نے جو کیا تھا اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ابوبکر پر حسد کرتا تھا اور اللہ نے ان پر جو انعامات کئے ہیں میں ان کا منکر تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ ہم لوگ بھی خلافت کے معاملہ میں اپنا کچھ حق سمجھتے تھے ابوبکر نے اس میں ہماری بات ہی نہیں پوچھی اسلئے ہمارے دل میں اسکا ملال تھا یہ سنکر سب مسلمان بہت خوش ہوئے اور انہوں نے کہا" آپ نے درست فرمایا" اور مسلمان علی سے قریب ہوگئے جب وہ امر بالمعروف کی طرف لوٹ آئے۔

اس کے علاوہ صحیح مسلم میں بھی امام زہری سے روایت ہے کہ کسی شخص نے ان سے بیان کیا کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے حضرت فاطمہ کی وفات کے وقت بیعت نہیں کی تو انہوں نے کہا کہ نہیں! حضرت علی ہی نے نہیں بلکہ بنو ہاشم میں سے کسی نے بھی نہیں کی لیکن حافظ ابن حجر نے بیہقی سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ زہری نے اسکی سند بیان نہیں کی [2] بیہقی نے اس روایت کی جو وجہ ضعف بیان کی ہے اس کے علاوہ اس روایت کا یہ جزء بھی تمام روایات کے خلاف ہے کہ بنو ہاشم میں سے کسی نے بھی بیعت نہیں کی۔

اب رہ گئی صحیح بخاری کی روایت تو اس پر اشکال یہ ہے کہ حضرت علی کا چھ ماہ تک بیعت نہ کرنا ایسی ایک بات ہے جو حضرت علی کی شان سے بھی بعید ہے اور حضرت ابوبکر کا اتنے دنوں تک اس پر صبر کرنا خود ابوبکر سے مستبعد ہے

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۰۹، ۶۱۰ باب غزوہ خیبر [2] فتح الباری جلد ۷ ص ۴۷۹

اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابوبکر کو صحابہ کرام میں جو بلند مرتبہ و مقام حاصل تھا آنحضرت ﷺ کو ان پر جو خصوصی اعتماد و اعتبار تھا اور جس کی وجہ آپ نے صراحۃً و اشارۃً (جس کا ذکر آگے آئے گا) حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی طرف ایما فرمایا تھا حضرت علی اس سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے، علاوہ بریں خود حضرت علی درویشی و بے نفسی اور ولایت و انابت الی اللہ کے جس مرتبہ اعلیٰ و ارفع پر متمکن تھے وہ بھی کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں ہے اس بنا پر یہ قطعی ناممکن ہے کہ حضرت علی حضرت ابوبکر کو مستحق خلافت یا خلیفہ برحق نہ سمجھتے ہوں چنانچہ صحیح بخاری کی اسی روایت میں حضرت علی صاف لفظوں میں حضرت ابوبکر کے فضائل و مناقب اور ان کے استحقاق خلافت کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ بھی بصراحت فرماتے ہیں کہ خلافت کے معاملہ میں حضرت ابوبکر کے ساتھ نہ کچھ اختلاف تھا اور نہ وہ اس پر ان کے ساتھ کوئی منافست رکھتے تھے۔

بعض لوگوں نے اپنی پرانی عصبیت کی بنا پر اس وقت غیر ذمہ دارانہ گفتگو کر کے حضرت علی کو مشتعل کرنا بھی چاہا تو آپ نے سختی کے ساتھ ان کو ڈانٹ دیا چنانچہ ایک مرتبہ ابوسفیان نے جو حضرت امیر معاویہ کے والد تھے حضرت علی کو عار دلائی اور ان کو حضرت ابوبکر کی مخالفت پر برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہا" یہ دیکھئے! جو قریش میں گھٹیا درجہ کا قبیلہ ہے خلافت اس میں چلی گئی بخدا کی قسم اگر آپ اس کے خواہاں ہوں تو میں مدینہ کو سوار اور پیادہ فوج سے بھر دوں گا۔ حضرت علی یہ سنتے ہی برہم ہوگئے۔ اور بگڑ کر فرمایا۔ اے ابوسفیان تم اسلام اور مسلمانوں سے پرانے دشمن ہو تم ایسی باتوں سے اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے ہم نے ابوبکر کو خلافت کا اہل پایا ہے [1]

---

[1] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۴۴۹ یہ روایت طبری کی ہے جبکہ کنز العمال میں یہ واقعہ دو سندوں سے مذکور ہے جن میں سے ایک سند کے آخری راوی سوید بن غفلہ ہیں جو کہ اس وقت مدینہ میں حاضر ہوئے جب لوگ دفن نبوی سے فارغ ہو کر ہاتھ جھاڑ رہے تھے اور وہ حضرت علی کے اصحاب خاص میں سے ہیں۔ دوسری سند کے آخری راوی حضرت علی کے پوتے زین العابدین ہیں۔ ان دونوں روایتوں میں ابوسفیان کے الفاظ تو وہی ہیں جو طبری میں ہیں لیکن حضرت علی کے جواب کے الفاظ بدلے ہوئے ہیں یادو وہ یہ ہیں والله ما اريد ان تملأها عليه خيلاً ورجالاً ولولا انا رأينا ابابكر لذالك اهلاً ما خليناه واياها يا ابا سفيان ان المومنين قوم نصحة بعضهم لبعض متوادون وان بعدت ديارهم وابدانهم وان المنافقين غششة بعضهم لبعض. کنز العمال مطبوعہ حیدرآباد جلد ۳ ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

[2] تاریخ یعقوبی جلد دوم ص ۱۲۴۔

ایک روایت میں تو یہاں تک ہے کہ ابوسفیان نے حضرت علی سے کہا "ابسط یدک حتی ابایعک"
اپنا ہاتھ پھیلائیے تاکہ میں آپ سے بیعت کرلوں لیکن حضرت علیؓ نے شدت کے ساتھ
انکار فرمایا، اور ابوسفیان کو جھڑک دیا۔[1]

حضرت ابوبکر تو ابوبکر تھے، حضرت علی کی شان تو یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان
کے مقابلہ میں بھی اپنے لئے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا اور کبھی جمہور امت سے اس معاملہ
میں الگ نہیں ہوئے چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت علی سے دریافت کیا کہ
یہ کیا بات ہے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت پر مسلمانوں میں اختلاف نہیں
ہوا لیکن آپ کی خلافت پر وہ متفق نہیں ہیں، تو حضرت علی نے جواب دیا کہ ابوبکر و عمر
میرے جیسے مسلمانوں پر والی تھے اور میں تم جیسے مسلمانوں کا والی ہوں"۔[2]

ان بیانات سے صاف ظاہر اور ثابت ہے کہ حضرت علی کو حضرت ابوبکر کی خلافت
پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ اس معاملہ میں ان کے مخالف نہیں تھے البتہ ہاں
جیسا کہ بخاری کی اسی روایت اور دوسری روایات میں ہے حضرت علی کو حضرت
ابوبکر کی طرف سے ملال ضرور تھا جسکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عین اس وقت جب کہ
حضرت علی اور دوسرے آل بیت نبوی آنحضرت ﷺ کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے
حضرت ابوبکر سقیفۂ بنو ساعدہ کی خبر سنتے ہی حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح
کو ساتھ لیکر وہاں پہنچ گئے اور خلافت کا معاملہ طے کر آئے اور حضرت علی سے اس
بارے میں کوئی مشاورت نہیں کی اس کے علاوہ دوسری وجہ حضرت فاطمہ کا حضرت
ابوبکر کی طرف سے تکدر خاطر تھا جو بربنائے بشریت پیدا ہو گیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ حضرت
علی کے ملال کی یہ دونوں وجہیں محض ذاتی اور شخصی تھیں۔ اس بنا پر ان کا اثر تو
ہو سکتا تھا کہ حضرت علی اور حضرت ابوبکر کے تعلق باہمی میں وہ شگفتگی نہ ہو جو
معاشرتی زندگی میں ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن چونکہ خلافت ایک قومی اور اجتماعی مسئلہ تھا
اس بنا پر اس ذاتی رنجش کا نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ حضرت علی سرے سے بیعت

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۲۲۰
[2] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۱۶۶

ہی نہ کرتے اور تفرق بین المسلمین کا سبب بنتے۔ حضرت علی کی جمہوریت پسندی اور رائے عامہ کے احترام کی کیفیت
تو یہ تھی کہ حضرت ابوبکر نے اپنے مرض الموت میں حضرت عمر کا نام اپنی جانشینی کیلئے تجویز کیا تو اگرچہ حضرت علی
ذاتی طور پر اس سے متفق نہیں تھے چنانچہ انہوں نے اپنی اس رائے کا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن آخر جب حضرت عمر
نامزد ہو ہی گئے تو پھر کوئی مخالفت نہیں کی اور سب مسلمانوں کے ساتھ انہوں نے بھی بیعت کر
لی۔ پس جب انکی یہ فطرت تھی تو پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ بیعت عامہ ہو جانے کے باوجود
حضرت علی سب مسلمانوں سے الگ رہتے اور بیعت نہ کرتے۔

مازری اور اشعری نے حضرت علی کے تخلف عن البیعۃ کا ایک عذر یہ بھی بیان کیا ہے کہ
خلیفہ سے فرداً فرداً ہر مسلمان کا بیعت کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہزاروں مسلمان بیعت
کر ہی چکے تھے اسلئے اگر حضرت علی نے بیعت نہیں کی تو اس کو مخالفت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔[1]
لیکن ہمارے نزدیک یہ عذر صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت علی اپنی ذات سے تنہا ایک شخص
نہیں تھے بلکہ پوری ایک جماعت، ایک قوم اور ایک گروہ تھے۔ انکا بیعت نہ کرنا اعلیٰ
وحدت کیلئے عظیم ترین رخنہ کا باعث ہو سکتا تھا اور اپنی اس حیثیت سے یقیناً وہ
خود بھی بے خبر نہیں تھے۔[2]

صحیح بخاری کی روایت پر ہم نے اشکال کی جو تقریر سطور بالا میں کی ہے وہ درایت کے
اعتبار سے تھی روایتی حیثیت سے تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس روایت کے مقابلہ
میں چند ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے چھ مہینے تک بیعت نہ کرنے کی تردید ہوتی ہے
اس سلسلہ میں سب سے اہم وہ بات ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے لیکن ان
دونوں کی شرط پر ہے اور اس لیے صحیح ہے۔ روایت یہ ہے۔

ان عبدالرحمٰن بن عوف کان مع — عبدالرحمن بن عوف بھی عمر بن الخطاب کے ساتھ

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۳۹۸ و فیض الباری ج ۴ ص ۱۳۹ [2] جلال الدین سیوطی نے اتقان میں ایک روایت نقل کی ہے جس کی
انہوں نے تصحیح بھی کی ہے کہ حضرت علی نے آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد ایک خطبہ دیا اور فرمایا کہ میں جب تک قرآن کو جمع نہیں
کرلوں گا گھر سے نہیں نکلوں گا۔ بعض حضرات نے اس جمع قرآن کو حضرت علی کی طرف سے بیعت نہ کرنیکا عذر بتایا ہے لیکن
اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ اگر یہ کوئی عذر ہے تو صرف بارہ تیرہ دن تک بیعت نہ کرنے کیلئے ہو سکتا ہے [illegible]

عمر بن الخطاب وان محمد بن مسلمة كسر سيف الزبير ثم قام ابو بكر فخطب الناس واعتذر اليهم وقال والله ما كنت حريصاً على الامارة يوماً ولا ليلة قط ولا كنت فيها راغباً ولا سألتها الله في سر وعلانية ولكني اشفقت من الفتنة وما لي في الامارة من راحة ولكن قلدت امراً عظيماً ما لي به من طاقة ولا يد الا بتقوية الله عز وجل ولوددت ان اقوى الناس عليها مكاني اليوم فقبل المهاجرون منه ما قال وما اعتذر به قال علي والزبير ما غضبنا الا لانا قد اخرنا عن المشاورة وانا نرى ابا بكر احق الناس بها بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم انه لصاحب الغار وثاني اثنين وانا لنعلم بشرفه وكبره ولقد امره رسول الله صلى الله عليه وسلم بالصلاة بالناس وهو حي۔

تھے اور محمد بن مسلمہ نے زبیر کی تلوار توڑ دی تھی پھر ابوبکر کھڑے ہوئے انہوں نے خطبہ دیا اور معذرت چاہتے ہوئے کہا: "اللہ کی قسم مجھ کو امارت کا لالچ کسی دن یا کسی رات بالکل بھی نہیں تھا اور نہ مجھ کو اس کی کوئی رغبت تھی اور نہ میں نے پوشیدہ طور پر یا علانیہ طور پر اس کا اللہ سے سوال کیا تھا لیکن میں ایک فتنہ سے ڈر گیا تھا، اور امارت میں میرے لیے کوئی راحت نہیں ہے۔ بلکہ میرے گلے میں ایک اتنے بڑے کام کا طوق ڈال دیا گیا ہے جس کی بغیر توفیق الٰہی کے مجھ میں طاقت نہیں ہے میں چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے زیادہ قوی آدمی آج میری جگہ ہوتا۔ ابوبکر نے جو کچھ کہا تھا مہاجرین نے اس کو قبول کر لیا۔ علی رضی اللہ عنہ اور زبیر نے کہا ہم کو صرف اس بات پر غصہ تھا کہ مشورہ کے وقت ہمیں پس پشت ڈال دیا گیا، ورنہ ہم بے شبہ رسول اللہ ﷺ کے بعد امارت کا سب سے زیادہ مستحق ابوبکر ہی کو سمجھتے تھے۔ وہ صاحب غار اور ثانی اثنین ہیں اور ہم ان کے شرف اور عظمت کو جانتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو نماز پڑھانے کا حکم اپنی حیات میں ہی دیا تھا۔

(المستدرک جلد ۳ ص ۶۶)

اب ایک اور پہلو سے غور کرو تو معلوم ہوگا کہ بالفرض حضرت علی بیعت نہ کرتے تو حضرت ابوبکر ان معاملات میں جس قدر سخت تھے اس کے پیش نظر ان سے یہ بالکل

بعید بات تھی کہ وہ صبر کر کے خاموش بیٹھے رہتے اور فتنے کے اس دروازہ کو کھلا چھوڑ دیتے۔ چنانچہ اس ذیل میں ہم ایک اور روایت نقل کرتے ہیں جس سے بیعت کے معاملہ میں حضرات ابوبکر اور حضرت علی دونوں کے طرز عمل پر ایک ساتھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ روایت حضرت ابو سعید الخدری کی ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعہ کے ابتدائی اجزاء بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

فلما قعد ابو بكر على المنبر نظر في وجوه القوم فلم ير علياً فسأل عنه فقام ناس من الانصار فاتوا به فقال ابو بكر ابن عم رسول الله صلى الله عليه وسلم وختنه اردت ان تشق عصا المسلمين فقال لا تثريب يا خليفة رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعه۔ هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه [1]

جب ابوبکر منبر پر بیٹھ گئے تو انہوں نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور جب علی کو نہیں دیکھا تو ان کی نسبت پوچھا اس پر کچھ انصاری کھڑے ہوئے اور جا کر علی کو لے آئے۔ اب ابوبکر نے ان سے کہا کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد بھی ہیں کیا آپ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں علی نے کہا اے خلیفہ رسول اللہ ﷺ ملامت نہ کیجئے اس کے بعد علی نے ابوبکر سے بیعت کر لی امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ شرط شیخین پر ہے اور انہوں نے صحیحین میں اس کو درج نہیں کیا ہے۔

ابن سعد میں حضرت حسن سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی نے فرمایا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم نے خلافت کے معاملہ میں غور و خوض کیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو نماز میں آگے کر دیا تھا۔ اس بنا پر ہم اپنی دنیا کے واسطے اس شخص سے راضی ہو گئے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین

---

[1] المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۷۶

کے لئے راضی ہوسکتے تھے۔ اب ہم نے بھی ابوبکر کو آگے کر دیا یعنی بالاتفاق انہیں خلیفہ بنا دیا۔[1]

اب ان تمام روایات کو سامنے رکھو ان سب پر یکجائی نگاہ ڈالو حضرت ابوبکر اور حضرت علی دونوں کی جلالتِ شان اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ ان کا قرب و اختصاص، پھر نفسِ خلافت کی اہمیت اور آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد اس وقت تبلیغ و اشاعت اور استحکام اسلام کے لئے باہمی اتفاق و اتحاد کی سخت ضرورت تو ان سب کو بھی پیش نظر رکھو اور بتاؤ کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ صاف نظر آتا ہے کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ بیعت کی ہے۔ پہلی بیعت بیعتِ خلافت ہے جو آنحضرت ﷺ کی وفات کے دوسرے ہی دن مسجد نبوی میں بیعتِ عامہ کے موقع پر کی گئی، اور دوسری بیعت بیعتِ رضا ہے جو آپ نے حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد کی ہے۔ اس بیعت کا مقصد آپس میں صلح صفائی کرنا اور باہمی تعلقات کو پھر از سرِ نو خوشگوار کر لینا تھا۔

چنانچہ حافظ ابن حجر حضرت ابو سعید الخدری کی روایت جو مستدرک کے حوالہ سے اوپر گذر چکی ہے اور جس سے حضرت علی کا پہلے ہی موقع پر بیعت کر لینا ثابت ہوتا ہے اس کو اصح بتاتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں۔

وجمع غیرہ بانہ بایعہ بیعۃً ثانیۃً مؤکدۃ للاولیٰ لازالۃ ما کان وقع بسبب المیراث کما تقدم وعلیٰ ھٰذا قول الزھری لم یبایعہ علی فی تلک الایام علیٰ ارادۃ الملازمۃ لہ والحضور عندہ وما اشبہ ذالک فان فی انقطاع مثلہ عن مثلہ ما یوھم من لا یعرف باطن الامر انہ بسبب عدم الرضا بخلافتہ فاطلق من اطلق ذالک وبسبب ذالک اظھر علی المبایعۃ التی بعد موت فاطمۃ علیہا السلام لازالۃ ھذہ الشبھۃ[1]

اور دوسرے لوگوں نے دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح دی ہے کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے پہلی ہی بیعت کو مؤکد کرنے کی غرض سے دوسری بیعت کی تھی تاکہ میراث کی وجہ سے جو کشیدگی پیدا ہوگئی تھی وہ جاتا رہے۔ اس قول کی بنا پر زہری جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی نے بیعت نہیں کی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت علی حضرت ابوبکر کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور ان کے پاس آتے جاتے نہیں تھے، کیونکہ جو شخص حقیقت حال سے واقف نہیں تھا وہ حضرت علی جیسے شخص کو حضرت ابوبکر جیسی شخصیت سے کنارہ کش دیکھ کر یہی سمجھتا تھا کہ حضرت علی کا یہ طرز عمل اس بنا پر ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کی خلافت سے راضی نہیں ہیں۔ بس جس نے بیعت کی نفی کی ہے اسی وہم اور غلط فہمی کی وجہ سے کی ہے اور حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد حضرت علی نے جو بیعت کی تھی وہ درحقیقت اسی غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے کی تھی۔

[1] ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکر

تاریخ اسلام کے نہایت مشہور محقق اور نقاد حافظ عماد الدین ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ حضرت ابو سعید الخدری کی مذکورۂ بالا روایت اور اسی مضمون کی دوسری روایات کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وھذا اللائق بعلی رضی اللہ عنہ والذی یدل علیہ الآثار من شھودہ معہ الصلوٰۃ وخروجہ معہ الی ذی القصۃ بعد موت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما سنوردہ وبذلہ لہ النصیحۃ والمشورۃ بین یدیہ[2]

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شایان شان یہی تھا اور اسی پر دوسرے آثار بھی دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت علی کا حضرت ابوبکر کے ساتھ نمازوں میں شریک ہونا، ذو القصہ کے معرکہ میں جس کا بیان آگے آئیگا، اور جو آنحضرت ﷺ کی وفات کے فوراً بعد پیش آیا تھا حضرت علی کا حضرت ابوبکر کے ساتھ ہونا اور ان کو مشورہ دینا اور نصیحت کرنا۔

اس کے بعد حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد بیعت کرنے کی روایت کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۳۹۵ [2] البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۰۲۔ اس عبارت میں حضرت علی کا جس ذو القصہ کی مہم میں حضرت ابوبکر کیساتھ شرکت کا ذکر ہے اس کا تذکرہ اپنے موقع پر آئندہ آئے گا۔ اسے وہاں دیکھنا چاہیئے

واما ما يأتي من مبايعته اياه بعد موت فاطمة، وقد ماتت بعد ابيها عليه السلام بستة اشهر، فذالك محمول على انها بيعة ثانية ازالت ما كان قد وقع من وحشة بسبب الكلام في الميراث۔[1]	اور رہی وہ روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی نے فاطمہ کی وفات کے بعد بیعت کی تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دوسری بیعت تھی جس نے باہمی تکدر اور شکر رنجی کا ازالہ کر دیا جو میراث کے بارے میں گفتگو سے پیدا ہو گئی تھی۔

حضرت علی کا تکدر طبع جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے اپنی جگہ مسلم! لیکن اس کا اثر یہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ خالص دین کے معاملہ میں حضرت علی کی طرف سے کسی طرح کی مداہنت صادر ہوتی۔ امام قرطبی فرماتے ہیں "حضرت علی اور حضرت ابوبکر کے درمیان جو شکر رنجی ہوئی اور بعد میں حضرت علی نے اس سبب سے جو معذرت خواہی کی جو شخص بھی اس پوری داستان پر غور و خوض کرے گا اس کو اس میں کوئی شبہ نہیں رہے گا کہ دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف تھا اور دونوں میں ایک دوسرے کی محبت اور احترام تھا۔ اگرچہ بشری طبیعت کبھی کبھی غالب آجاتی تھی لیکن دیانت اسکو رد کر دیتی تھی"[2]

جہاں تک حضرت عائشہ کی روایت کا تعلق ہے جو صحیح بخاری میں ہے یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت عائشہ نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جبکہ حضرت فاطمہ نے میراث کا مطالبہ کیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ ٹھیک آنحضرت ﷺ کی وفات کے یا بیعتِ عامہ کے دن نہیں ہوا ہوگا۔ بلکہ چند روز کے بعد جبکہ حضرت ابوبکر بحیثیت خلیفۂ اول کے معاملات و امور خلافت کو باقاعدہ انجام دینے لگے ہوں گے۔ اس بنا پر عین بیعت عامہ کے دن حضرت فاطمہ کی رنجش کے باعث حضرت علی کا بیعت سے الگ رہنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا، کیونکہ وجہ رنجش ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علی حضرت ابوبکر کے ساتھ گفتگو کے وقت اپنی رنجش کی وجہ میراث کے معاملہ کو نہیں بتاتے بلکہ اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۰۲
[2] بحوالہ فتح الباری ج ۷ ص ۳۷۹

آنحضرت ﷺ کے ساتھ تعلق خصوصی کے باعث اس کو اپنا حق سمجھتے تھے کہ خلافت کا معاملہ طے کرتے وقت حضرت ابوبکر حضرت علی کو بھی اپنے اعتماد میں لیتے اور جس طرح انہوں نے حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ کو اس موقع پر اپنے ساتھ رکھا تھا حضرت علی کو بھی اپنے ساتھ رکھتے۔ اور ان کی غیر موجودگی میں بالا ہی بالا سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ کے انتخاب کا مرحلہ طے نہ کرتے۔ اس سے آپ کو پتہ چل سکتا ہے کہ اس میں حضرت ابوبکر کا کتنا قصور تھا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ حضرت علی کی کشیدگی کی اصل وجہ حضرت فاطمہ کا ہی تکدر طبع تھا۔ لیکن جب حضرت ابوبکر نے میراث کے متعلق آنحضرت کا ارشاد گرامی پڑھ کر سنا دیا تو اب حضرت علی کے لیے گنجائش نہ تھی کہ وہ میراث کے معاملہ کو اپنی رنجش کا سبب قرار دیں۔ اس بنا پر جب صلح صفائی کا وقت آیا تو حضرت علی نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ صرف امر خلافت کے بارہ میں ان کی بات نہ پوچھنے کا گلہ کیا۔ یہ وہی بات ہے جس کو ارباب معانی کی زبان میں نکتہ بعد الوقوع کہتے ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھو کہ حضرت عائشہ حضرت علی کے بیعت نہ کرنے کو "وما کان بایعہ" وغیرہ صاف لفظوں سے بیان نہیں فرماتیں جیسا کہ امام زہری کی روایت میں ہے بلکہ "ولم یکن بایع تلک الاشہر" جیسے غیر واضح لفظوں میں بیان فرماتی ہیں تو گویا اس کا مطلب یہی ہے کہ حضرت عائشہ دراصل فرمانا یہ چاہتی ہیں کہ حضرت علی نے بیعت تو کر لی تھی۔ لیکن چونکہ اس کے بعد ہی رنجش پیدا ہو گئی اور اسکی وجہ سے وہ کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے، اسلئے ان کا بیعت کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔ انہوں نے رسمی طور پر اگرچہ بیعت کر لی تھی مگر عملاً ایسا تھا کہ گویا بیعت کی نہیں تھی۔ اسکے علاوہ طبری کی مندرجہ ذیل دو روایتیں بھی دیکھو۔

قال عمرو بن حريث لسعيد بن زيد اشهدت وفاة رسول الله صلى الله عليه وسلم قال نعم قال فمتى بويع ابوبكر قال يوم مات رسول الله كرهوا	عمرو بن حریث نے سعید بن زید سے پوچھا کہ کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا ہاں پھر پوچھا کہ ابوبکر سے بیعت کب کی گئی؟ تو بولے کہ جس دن

ان يقولوا بعض يوم وليسوا في جماعة قال لخالف عليه احدٌ قال لا الا مرتد او من قد كاد ان يرتد لولا ان الله عزوجل ينقذهم من الانصار قال فهل قعد احد من المهاجرين قال لا تتابع المهاجرون على بيعته من غير ان يدعوهم [1]

آنحضرتؐ کی وفات ہوئی اسی دن صحابہ اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ دن کا ایک حصہ بھی اس طرح گذاریں کہ وہ جماعت کے ساتھ منسلک نہ ہوں۔ اب عمرو بن حریث نے پوچھا کہ کیا ابوبکر کی کسی نے مخالفت کی تھی؟ سعید بن زید نے جواب دیا کہ نہیں البتہ مرتد نے یا انصار میں سے اس شخص نے مخالفت کی جو قریب تھا کہ مرتد ہو جاتا اگر اللہ تعالیٰ اس کو اس سے بچا نہ لیتا۔ اسکے بعد عمرو بن حریث نے دریافت کیا کہ کیا مہاجرین میں سے بھی کسی نے بیعت سے پہلو تہی کی تھی۔ سعید بن زید نے کہا کہ نہیں، مہاجرین تو دعوت بیعت کے بغیر ہی بیعت کے لئے ٹوٹ پڑے۔

اس روایت میں تو عام مہاجرین کی بیعت کا تذکرہ ہے جن میں خود حضرت علی بھی شامل تھے، لیکن جہاں تک خاص حضرت علی کی ذات کا تعلق ہے اس کا ذکر بھی ایک اور روایت میں ہے اور اس قدر وضاحت و صراحت کے ساتھ کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

حدثنا عبيد الله بن سعيد قال اخبرني عمي قال اخبرني سيف عن عبد العزيز بن سياه عن حبيب بن ابي ثابت قال كان علي في بيته اذ أُتي فقيل له قد جلس ابو بكر للبيعة فخرج في قميص ما عليه ازارٌ ولا

. . . .

. . . .

...... حبیب بن ابی ثابت سے مروی ہے کہ علی اپنے گھر میں تھے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ ابوبکر بیعت لینے کے لئے بیٹھے ہیں۔ علی یہ سنتے ہی صرف قمیص پہنے ہی باہر نکل آئے اس وقت ان کے بدن پر نہ چادر تھی اور نہ تہبند، اتنی کو جلدی اسلئے

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۴۷

رداءٌ عجلاً كراهية ان يبطئ عنها حتى بايعه ثمّ جلس اليه وبعث الى ثوبه فاتاه فتجلله ولزم مجلسه [1]

تھی کہ وہ بیعت میں پیچھے رہ جانے کو پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ انہوں نے ابوبکر سے بیعت کی پھر اُن کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے منگوائے جب وہ آ گئے تو انہوں نے کپڑے پہنے اور ابوبکر کی مجلس میں بیٹھے رہے۔

اس پوری بحث سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت علی صدیق اکبر سے بیعت کے معاملہ میں عام مسلمانوں سے نہ الگ رہے اور نہ پیچھے رہے لیکن آگے چل کر جو سیاسی اختلافات پیدا ہوئے ان کا اثر روایات پر بھی پڑا اور اس کی وجہ سے ایک واقعہ کچھ تھا اور اختلاف تعبیر و ادا سے کچھ سے کچھ ہو گیا۔

حضرت زبیر بن عوام

حضرت علی کے بعد دوسرا نام حضرت زبیر کا ہے جو اس بحث میں لائق ذکر ہے۔ حضرت زبیر آنحضرتؐ اور حضرت علی کے پھوپی زاد بھائی تھے انکی والدہ عبدالمطلب کی بیٹی صفیہ تھیں، آٹھ یا بارہ برس کے تھے کہ اسلام لائے جن دس صحابہ کرام کو انکی زندگی میں ہی جنت کی خوش خبری دی گئی اُن میں ایک حضرت زبیر بھی ہیں، ان کا لقب حواری رسول اللہؐ تھا جو خود حضورؐ نے ان کو عطا فرمایا تھا [2] روایت ہے کہ حضرت زبیر نے حضرت ابوبکر کی بیعت کا حال سنا تو تلوار میان سے باہر نکال لی اور بولے لا أغمده حتى يبايع علي ... میں اس وقت میان میں نہیں رکھوں گا جب تک علی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی جائیگی۔ حضرت زبیر کی یہی تلوار تھی جس کو محمد بن مسلمہ نے توڑ دیا تھا۔

لیکن مستدرک حاکم کی وہ روایت جو حضرت علی کی بحث میں گذر چکی ہے۔ اسی میں حضرت زبیر کا بھی ذکر ہے صفحہ اُلٹ کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ جب حضرت ابوبکر نے تقریر کی اور فرمایا کہ میں ہرگز خلافت کا مستحق نہیں تھا لیکن البتہ اس سے ڈرتا تھا

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۴۷ [2] اصابہ ج ۱ ص ۵۲۶ (مطبوعہ مصر)

کہیں مسلمانوں میں پھوٹ نہ پڑ جائے تو حضرت علی اور حضرت زبیر دونوں کھڑے ہوئے اور بولے کہ ہم کو اس بات کا رنج ضرور تھا کہ خلافت کے معاملہ میں جو مجلس مشاورت ہوئی اُس میں ہم کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ ورنہ ہماری رائے میں ابوبکر تمام لوگوں میں خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ ؎۱

اس کے بعد جلد سوم ص ۱۰۱ پر جو روایت ہے اس میں جہاں حضرت علی کا ذکر ہے حضرت زبیر کا بھی ہے۔ حضرت ابوبکر نے بیعت عامہ کے دن حضرت زبیر کو نہیں دیکھا تو پوچھا کہاں ہیں؟ جب لوگ جاکر اُن کو لے آئے تو حضرت ابوبکر نے انکو خطاب کر کے فرمایا "آپ آنحضرت صلعم کے حواری ہیں تو کیا پھر بھی آپ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں؟" حضرت زبیر نے اس کے جواب میں پہلے تو وہی کہا جو حضرت علی نے کہا تھا اور اس کے بعد فرمایا کہ "اے خلیفۂ رسولؐ! اب ملامت نہ کیجئے۔" پھر جہاں حضرت علی نے بیعت کی حضرت زبیر نے بھی کر لی۔

حضرت سعد بن عبادہؓ مدینہ کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ امام بخاری کے بیان کے مطابق انہوں نے غزوۂ بدر میں بھی شرکت کی تھی اگرچہ بعض دوسری روایتوں سے اسکی تردید ہوتی ہے۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ کبار صحابہ میں سے ہیں۔ جن غزوات میں یہ شریک ہوئے انصار کا علم انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ اس بنا پر انصار کے اور خصوصاً خزرج کے سردار سمجھے جاتے تھے۔ بیحد سخی اور فیاض تھے۔ لیکن متعدد واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مزاج میں کسی قدر تشدد تھا اور اپنی رائے پر انہیں اصرار بھی ہوتا تھا۔

سقیفۂ بنو ساعدہ کی مجلس میں انصار نے انہیں کو خلیفہ بنانا چاہا تھا اور انہوں نے انصار کے فضائل و مناقب پر ایک بڑی پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی تھی لیکن جب حضرت ابوبکر منتخب ہو گئے تو ان میں (سعد بن عبادہ میں) اور حضرت عمر میں بڑی تلخ اور گرم گفتگو ہوئی جس کی تفصیل طبری میں موجود ہے۔

حضرت سعد بن عبادہ خلافت صدیقی میں ہی ملک شام میں جاکر آباد ہو گئے تھے اور

؎۱ مستدرک حاکم جزو ۳ ص ۶۶ کتاب ہذا صہ   ؎۲ کتاب ہذا صہ

وہیں مقام حوران میں ۱۵ھ میں وفات پائی۔ سقیفۂ بنی ساعدہ میں ان میں اور حضرت عمر میں جو سخت کلامی ہوئی تھی اور پھر وہ شام چلے گئے۔ اس سے مؤرخین نے قیاس کیا ہے انہوں نے حضرت ابوبکر سے بیعت نہیں کی تھی۔ اور تو اور خود حافظ ابن حجر کو مغالطہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

وقصتہ فی تخلفہ عن بیعۃ ابی بکر مشھورۃ ؎۱ — ابوبکر سے ان کی بیعت نہ کرنے کا قصہ مشہور ہے۔

ابو محمد نے کلبی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے سعد بن عبادہؓ کے پاس شام آدمی بھیجا اور تاکید کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان کو بیعت کرنے پر آمادہ کیا جائے اس شخص نے شام پہنچکر مقام حوران میں ایک باغ میں سعد بن عبادہؓ سے ملاقات کی اور انکو بیعت کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا "میں ایک قریشی کی کبھی بیعت نہیں کروں گا۔" اس شخص نے کہا "تو میں آپ سے جنگ کروں گا۔" سعد بن عبادہ بولے "اگرچہ تم مجھ سے جنگ کرو۔" وہ بولا "کیا امت جس پر اتفاق کر چکی ہے آپ اس سے باہر رہیں گے؟" انہوں نے جواب دیا۔ ہاں میں بیعت کے معاملہ میں تو امت سے الگ ہی رہوں گا۔" اس پر اس شخص نے تیر مار کر سعد بن عبادہ کو قتل کر دیا۔" ؎۲

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ محض افسانہ ہی ہے اصل یہی ہے کہ حضرت زبیر اور حضرت علی کی طرح حضرت سعد بن عبادہ نے بھی بیعت کر لی تھی۔ طبری میں جابر سے روایت ہے کہ ایک دن سعد بن عبادہ نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ اے گروہ مہاجرین تم نے میری امارت پر حسد کیا اور اے ابوبکر آپ نے اور میری قوم نے مجھ کو بیعت پر مجبور کر دیا۔ اس پر مہاجرین نے جواب دیا کہ اگر ہم آپ کو افتراق پر مجبور کرتے مگر آپ اتحاد کی حمایت کرتے تو آپ کیلئے بڑی گنجائش ہوتی (یعنی آپ حق پر ہوتے) لیکن ہم نے تو آپکو اتحاد پر مجبور کیا ہے اسلئے اس پر معذرت خواہی کی ضرورت نہیں ہے، اسکے بعد ان سے کہا گیا۔ لئن نزعت یدا من طاعۃ او فرقت — اگر آپ طاعت سے دست کشی کرتے یا جماعت میں

؎۱ الاصابہ ج ۲ ص ۲۸   ؎۲ العقد الفرید ج ۵ ص ۱۲

جماعۃً تنفذون الذی فیہ عیناک[1] پھر ڈالتے تو البتہ ہم آپ کا مار ڈالتے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے بیعت تو کرلی تھی لیکن کسی قدر ناگواری کے ساتھ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ واضح اور صاف مسند امام احمد بن حنبل کی روایت ذیل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے بطیب خاطر بیعت کی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جب خطبہ دیا تو انصار کی کوئی فضیلت نہ تھی جو آپ نے بیان نہ کی ہو۔ اس کے بعد سعد بن عبادہ کو خطاب کرکے فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے جب قریش ولاۃ ھذا الامر یعنی قریش امر خلافت کے سربراہ ہوں گے فرمایا تھا تو اسے سعد آپ اُس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کو یاد ہے نا۔ ؟ ۔ سعد بولے "جی ہاں! آپ سچ فرماتے ہیں" اس کے بعد سعد بن عبادہ نے کہا۔ نحن الوزراء وانتم الامراء ہم یعنی انصار وزیر ہوں گے اور آپ لوگ یعنی قریش امیر۔ یاد ہوگا کہ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو سقیفہ کی مجلس میں حضرت ابوبکرؓ نے انصار کو خطاب کرکے کہی تھی۔ مسند امام احمد کی اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی تقریر کے بعد حضرت سعد بن عبادہ بالکل صدیق اکبرؓ کے ہمنوا ہوگئے تھے اور دونوں میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ علامہ ابن حجر الہیثمی اس کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ابن عبدالبر نے جو یہ لکھا ہے کہ سعد بن عبادہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے بیعت نہیں کی یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی[2] اس روایت سے اس کی تغلیط ہوتی ہے بلکہ طبری میں تو ایک روایت میں بالکل صاف صاف ہے کہ تتابع القوم علی البیعۃ و بایع سعد[3]

(طبری ج ۲ ص ۴۵۹)

حافظ ابن حجر اور ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں ہی ان سے ناراض ہوکر شام میں جا بسے تھے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں شام گئے ہیں۔

[?] ج ۲ ص ۲۶۰ [2] تغلیط [3] الصواعق المحرقہ ص ۷

اس بحث سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ انصار اور مہاجرین میں کوئی لائق ذکر شخصیت ایسی نہیں تھی جس نے حضرت ابوبکرؓ سے بیعت نہ کی ہو اور اس معاملہ میں جمہور اُمت سے الگ اپنے لئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا ہو۔ البتہ ہاں اس میں شک نہیں کہ کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو کھلم کھلا یا در پردہ صدیق اکبرؓ کے انتخاب پہ نکتہ چینی کرتے اور اس ذریعے سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن یہ وہی لوگ تھے جو محض برائے بیعت یعنی کسی غرض کیلئے مسلمان ہوئے تھے۔ ورنہ حقیقت میں مسلمان نہیں تھے یہ وہی لوگ ہیں جو بعد میں مرتد کہلائے۔ ان کا ذکر آگے آتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ انہیں کی نکتہ چینی کے جواب میں فرمایا کرتے تھے۔

اَلَسْتُ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ[1] کیا میں وہ نہیں ہوں جس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔

ایک شبہ کا ازالہ | کسی خوش فہم کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ انتخاب کے وقت خلیفۂ اوّل نے جو خطبہ دیا تھا اس میں تو صاف فرمایا تھا کہ میں اپنے آپ کو تم سب سے زیادہ خلافت کا مستحق نہیں سمجھتا پھر اب انہوں نے کیسے احق بالخلافۃ ہونے کا دعویٰ کیا؟ اصل یہ ہے کہ خطبہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ صدیق اکبرؓ کا طبعی انکسار تھا لیکن اشارۂ چشم و ابروئے نبوت کا رازداں آپ سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔ آپ نے خلافت کا بارگراں محض ان ارشادات وایمارات نبوی کی تکمیل کے جذبہ میں اپنا فرض سمجھ کر برداشت کیا تھا جو آپ کی خلافت کے بارے تھے اور جو کسی پر بھی مخفی نہیں تھے۔ پس جب آپ نے خلافت کو قبول فرمالیا تو اب بحیثیت خلیفہ آپ کا فرض تھا کہ اپنی اس خلافت کو حق ثابت کریں۔ اور اسطرح کسی شخص کو بھی فتنہ انگیزی کا موقع نہ دیں۔ ورنہ جس شخص کو خود اپنے اوپر اعتماد نہ ہو وہ دوسروں سے وفاداری کا مطالبہ کیونکر کرسکتا ہے!۔

---

[1] الصواعق المحرقہ ص ۸ [2] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۳

خلافت

بیعت عامہ کے بعد حضرت ابوبکر بالکل بجا اور حق طور پر خلیفہ منتخب ہو گئے۔ لیکن خلافت صدیقی کی تاریخ اور اس کے کارناموں کی تفصیل بیان کرنے سے قبل ضروری ہے کہ خلافت کی تعریف، اس کا مرتبہ و مقام اور اس کیلئے جن اوصاف و کمالات کی ضرورت ہے ان سب پر کلام کیا جائے اور ساتھ ہی آنحضرت صلعم نے حضرت ابوبکر کی خلافت کی طرف قولاً وعملاً جو اشارے کئے تھے ان کا بھی ذکر کیا جائے۔

خلافت کی تعریف خلیفہ کا لفظ خلافت سے مشتق ہے۔ خلافت کے لغوی معنی نیابت جانشینی اور کسی کی قائم مقامی کے ہیں۔ خلیفہ کو خلیفہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلعم کا قائم مقام نائب اور جانشین ہوتا ہے۔ بعض بزرگوں کا خیال تھا کہ خلیفہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے۔ اور ان کا استدلال آیات ذیل سے ہے۔

(۱) اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ — یاد کرو اس وقت کو جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔

(۲) وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ۔ — اور وہ خدا وہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا۔

حضرت داؤد سے خطاب کر کے ارشاد ہوا۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ — اے داؤد ہم نے البتہ تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔

اس بنا پر ان علماء کے نزدیک ایک خلیفہ کو اگر خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا جائے تو جائز ہے لیکن جمہور علماء اس کو ناجائز اور کسی کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارنے والے کو فاسق اور فاجر

کہتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ قائم مقامی کسی غائب کی ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو ہر وقت حاضر و ناظر ہے۔ پھر اس کی نیابت کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت ابوبکر صدیق کو یا خلیفۃ اللہ کہہ کر خطاب کیا تو آپ نے فرمایا۔

"میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہ صلعم کا خلیفہ ہوں" [1]

خلیفہ کا منصب اور اس کے فرائض و واجبات چونکہ ایک خلیفہ رسول اللہ صلعم کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے اس بنا پر پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ آپ کا منصب کیا تھا اور آپ کے فرائض و واجبات کیا تھے؟

آنحضرت صلعم کے ذمہ جو فرائض تھے اصولی طور پر وہ دو قسم کے تھے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ احکام و ہدایات لینا اور امت تک پہنچانا۔ (۲) امت کے لیئے ایک ایسا مرکز اطاعت و فرماں برداری بننا کہ خواہ کسی قسم کا کوئی معاملہ ہو معاد سے متعلق ہو یا معاش سے، مادی زندگی سے اس کا تعلق ہو یا روحانی سے، کوئی سیاسی امر ہو یا سماجی، کوئی اخلاقی مسئلہ ہو یا اقتصادی ہر ایک میں آپ کا قول ایک آخری اور قطعی حکم کا مرتبہ رکھتا ہے۔ جس سے انحراف و سرتابی جائز نہیں تھی۔ قرآن مجید کا اعلان ہے۔

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ — رسول اللہ صلعم تم کو جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس کسی چیز سے تم کو وہ روکیں رک جاؤ۔

ظاہر ہے کہ پہلا فرض صرف آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات کے ساتھ مخصوص تھا۔ آپ خاتم النبیین تھے جب آپ کی وفات ہوئی تو وحی کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا اور اب کسی شخص کو بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

البتہ ہاں دوسرا فرض وہ برابر قائم ہے اور قائم رہے گا۔ آنحضرت صلعم کی جب وفات ہوئی تو اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کے ارشاد کے مطابق شریعت کی تکمیل ہو چکی تھی، احکام و مسائل کی قانونی تنقیحات متعین ہو چکی تھیں اور اب آپ کے

[1] الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۴

بعد والوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اس قانون کی روشنی میں امت کی رہنمائی کریں پھر اس دوسرے فرض کے دو پہلو ہیں۔ ایک احکام الٰہی کی تبلیغ و اشاعت اور دوسرے ان احکام کا اجرا و ران کی تنفیذ۔ تبلیغ و اشاعت ہر صحابی کا فرض تھا لیکن احکام کی تنفیذ اور اُن کا اجرا بغیر سیاسی طاقت و اقتدار کے ممکن نہیں تھا۔ پس اس سیاست کا جس کو ہم سیاستِ شرعیہ بھی کہہ سکتے ہیں جو مرکز ہو گا وہی خلیفہ یا امام کہلائے گا۔

ایک خلیفہ اپنے عہد میں پوری امت کا مرکزِ اطاعت ہوتا ہے اور اسکو مسلمانوں پر روحانی اور جسمانی سیاسی اور اخلاقی ہر قسم کا اقتدار حاصل ہوتا ہے چونکہ اس کی حیثیت قانون کی شارح[1] اور احکام کو نافذ کرنے والے کی ہوتی ہے۔ اس بنا پر اس کا ہر قول قولِ فیصل اور اس کا ہر حکم واجب الاتباع ہوتا ہے۔ اس سے بغاوت کرنا یا اس کی نافرمانی ایسا ہی گناہ ہے جیسا کہ خود آنحضرت صلعم کی۔ چنانچہ قرآن میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ جن "اولوا الامر" کی اطاعت کا حکم ہے ان سے مراد وہی لوگ ہیں جو منصبِ خلافت پر سرفراز ہوں۔

صحیح بخاری میں آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے۔

من اطاعنی فقد اطاع اللّٰہ	جو شخص میری اطاعت کرتا ہے اس نے
ومن عصانی فقد عصی اللّٰہ	اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی
ومن اطاع امیری فقد اطاعنی	اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس شخص نے میرے
ومن عصی امیری فقد عصانی	امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ اور میرے
(کتاب الاحکام)	امیر کی جس نے نافرمانی کی اس نے خود میری نافرمانی کی

---

[1] یہ واضح رہنا چاہیئے کہ خلیفہ کی حیثیت صرف قانونِ شریعت کے شارح کی ہے۔ خود قانون ساز کی نہیں ہے۔ قانون وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے مقرر کر دیا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی خلیفہ اسلامی شریعت کے مسلّم قانون (معروف) کے خلاف کوئی حکم دے تو چونکہ اس نے یہ کام اپنی حدود سے متجاوز ہو کر کیا ہے۔ اس بنا پر اسکی اطاعت کا حکم نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں ہے لا طاعۃ الا فی معروف۔

اس حدیث میں لفظِ امیر سے بھی خلیفہ مراد ہے چنانچہ امام بخاری نے جس باب کے ماتحت اس روایت کو نقل کیا ہے اس کا ترجمہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ مقرر کیا ہے۔

خلیفہ کیلئے ضروری اوصاف و کمالات

چونکہ سوائے وحی الٰہی کے اور تمام پیغمبرانہ فرائض کی انجام دہی خلیفہ کے ذمہ ہوتی ہے اس بنا پر ظاہر ہے اسکو ان روحانی جسمانی اور اخلاقی کمالات و فضائل سے متصف ہونا چاہیئے جن سے ایک پیغمبر متصف ہوتا ہے اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ ان کمالات کے ساتھ اس کا درجۂ اتصاف وہ نہیں ہو سکتا جو ایک پیغمبر کا ہو گا کیونکہ اصل بہرحال اصل ہے اور فرع بہرحال فرع۔ تاہم ان پیغمبرانہ اوصاف و شمائل کا عکس اس کے اندر ضرور ہونا چاہیئے۔

اسی حقیقت کا تجزیہ و تحلیل کر کے علماؑ نے خلافت و امامت کے شرائط کا تعین اپنے اپنے مذاق کے مطابق کیا ہے۔ علامہ ابن خلدون کے نزدیک اس منصب جلیل و عظیم کے لیے چار شرطیں ہیں۔

(۱) علم:۔ جب تک خلیفہ کو احکام و مسائلِ شریعت اور ان کے منابع و مآخذ کا علم نہ ہو گا۔ وہ احکامِ خداوندی کا اجرا کیونکر کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں علامہ کی رائے میں صرف عالم ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اس کو صاحبِ اجتہاد بھی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ تقلید نقص ہے اور امامت چاہتی ہے کہ اوصاف و احوال میں کمال ہو۔

(۲) عدالت:۔ چونکہ خلافت ایک منصبِ دینی ہے اس بنا پر خلیفہ میں عدالت یعنی راست بازی اور نکوکاری کا ملکہ راسخ ہونا ضروری ہے۔ اگر خلیفہ ممنوعات و محرمات شرعیہ کا ارتکاب کرتا ہے تو عدالت بالاتفاق ختم ہو جائیگی۔ البتہ اعتقادی بدعتوں میں مبتلا ہونے کی صورت میں اختلاف ہے۔

(۳) کفایت:۔ اس سے یہ مراد ہے کہ خلیفہ میں حدودِ شرعیہ کو قائم کرنے، مملکتِ اسلامی کی سرحدوں کی حفاظت اور دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے جس سمجھ بوجھ، حسنِ تدبیر، عزم و ہمت اور استقلال و جفاکشی کی ضرورت ہے۔ یہ سب اس میں پائے جائیں۔

(۴) سلامتِ حواس واعضاء جس کی وجہ سے اس کی کسی رائے اور عمل پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے یعنی خلیفہ کو آنکھ ناک کان ہاتھ پاؤں غرض ہر جسمانی عضو وجارحہ کے اعتبار سے تندرست وتوانا اور صحیح وسلامت ہونا چاہیئے۔ اسی طرح باطنی قوتوں یعنی ذہانت وفطانت حسنِ تدبیر اور اعتدالِ مزاج وطبیعت کے زیور سے بھی آراستہ ہونا چاہیئے۔ ۱؎

امام ابوالحسن الماوردی المتوفی ۴۵۰ھ نے انہیں اوصاف وشروط کو ذرا پھیلا کر لکھا ہے تو نسب کو چھوڑ کر جس کی بحث آگے آتی ہے چھ کر دیا ہے ۲؎

مذکورہ بالا اوصاف وشروط تو وہ ہیں جن پر سب کا اتفاق ہے ان کے علاوہ ایک اہم بحث یہ ہے کہ کیا خلیفہ کے لیئے نسب کی بھی شرط ہے؟ اور اگر ہے تو کیا اسکو خاندانِ نبوت میں سے ہونا چاہیئے۔ یا صرف قریشی ہونے کی شرط ہے۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں ہی سیاسی اعتبار سے کچھ ایسی صورتِ حالات پیدا ہو گئی کہ یہ مسئلہ نہایت اہم بن گیا۔ ورنہ درحقیقت بات بالکل واضح اور صاف ہے۔

خلافت کے لئے قرابتِ رسول کی شرط

جہاں تک خلافت کیلیئے قرابتِ رسولؐ کی شرط کا تعلق ہے تو ہر شخص جس نے اسلام کا اور آنحضرتؐ کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے جانتا ہے کہ آپ نے اپنے خاندان والوں کے ساتھ مرتبہ ومنصب وراحت وآسائش یا دولت وثروت کے اعتبار سے کبھی کوئی امتیازی سلوک نہیں برتا۔

آپ کو حضرت فاطمہ زہرا کے ساتھ جو محبت تھی اہل بیت میں کسی کے ساتھ نہیں تھی اور پھر حضرت علی ابن عم بھی تھے اور چہیتی بیٹی کے شوہر بھی ایک شہنشاہِ کونین اگر چاہتا تو ان دونوں کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن جس ذاتِ قدسی صفات نے کونین کی شہنشاہی کے باوجود فقر کو اپنے لئے فخر کہا ہو

۱؎ تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۶۱ ۲؎ الاحکام السلطانیہ ص ۴

اس سے اس کے سوا اور کیا توقع ہو سکتی تھی کہ جب اس کی جگر گوشہ حضرت فاطمہؓ نے شکایت کی کہ چکی چلاتے چلاتے ہاتھ میں گٹے پڑ گئے ہیں۔ تو کسی غلام یا باندی کا انتظام کرنے کی بجائے ایک تسبیح بتادی۔

پھر چونکہ اسلام اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے) کی حقیقت کو دنیا میں ثابت اور قائم کرنا چاہتا تھا اس بنا پر رنگ ونسل اور حسب ونسب کے امتیازات کا خاتمہ کرنا اس کے لیئے ضروری تھا آنحضرتؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب کا نکاح ایک غلام زید بن حارثہ سے کر کے اور پھر حضرت زید کی طلاق کے بعد خود ان کو اپنی زوجیت میں قبول فرما کر اسلام کی اس تعلیم کیلیئے ایک نمونہ قائم کر دیا تھا۔ اس بنا پر یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے خلافت کے معاملہ میں اپنے خاندان کی تخصیص کی ہو۔

صرف یہی نہیں کہ آپ نے اس معاملہ میں کوئی تصریح ہی نہیں کی، بلکہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر آنحضرتؐ سے آل بیت میں سے کسی کی خلافت کے بارہ میں دریافت کیا جاتا تو آپ نفی میں جواب دیتے۔ چنانچہ حضور کے مرضِ وفات میں ایک مرتبہ حضرت عباس حضرت علی سے ملے۔ تو کہا کہ مجھ کو آثار وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ اس مرض سے جانبر نہیں ہوں گے۔ تو تم آپ سے دریافت کر لو کہ کیا آپ کے بعد خلافت ہم کو یعنی بنو ہاشم کو ملے گی۔ اگر ایسا ہو گا تو حضور بیان فرما دیں گے۔ حضرت علی نے جواب دیا کہ میں ہرگز آپ سے دریافت نہیں کروں گا کیونکہ اگر آپ نے اس وقت انکار فرما دیا تو پھر کبھی ہم کو خلافت کی توقع نہیں ہو سکتی۔ ۱؎

اسلام

علاوہ ازیں خلافت ایک عالمگیر دینی منصب ہے اور خلیفہ کو پورے عالم

۱؎ طبری ج ۲ ص ۴۳۷

میں اپنے روحانی اور جسمانی و اخلاقی کمالات و اوصاف کے اعتبار سے بلند تر ہوتا جائے
پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس کو کسی ایک خاص خاندان کے ساتھ خواہ وہ اپنے بانی اور
مورثِ اعلیٰ کی طرف نسبت کی وجہ سے کتنا ہی موقر و ممتاز اور سرفراز و سربلند ہو مخصوص
کر دیا جاتا۔ ایسا کر دینا اسلامی نظامِ حکومت کی جمہوری اسپرٹ کے سراسر خلاف
تھا اور اس سے اسلام ایسا عملی مذہب پاپائیت کی شکل اختیار کر لیتا۔

اہل بیت میں سے اگر آنحضرت ﷺ کسی کو خلافت کے لئے نامزد فرماتے تو وہ حضرت
علیؓ کے سوا دوسرا کون ہو سکتا تھا۔ جامۂ خلافت فاتح خیبر کے قامتِ موزوں پر
راست آتا تھا اور وہ بجا طور پر اس کے مستحق بھی تھے لیکن آنحضرت ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔
جس کا اعتراف خود حضرت علی اور بنو ہاشم کو بھی تھا کیوں؟ اس میں دو مصلحتیں تھیں۔

(۱) آنحضرت ﷺ یہ سمجھتے تھے کہ اگرچہ آپ حضرت علیؓ کا استخلاف ان کے ذاتی اوصاف
و کمالات کی بنا پر کریں گے لیکن مسلمانوں کو اس سے یہ اشتباہ ہو سکتا ہے
کہ خلافت خاندانِ نبوت میں محدود ہو گئی اور یہ چیز قطعاً اسلام کی اصل روح
اور اس کی تعلیمات کے خلاف تھی۔ پھر
اس بات کی کون ضمانت لے سکتا تھا کہ خاندانِ نبوت میں ہمیشہ اسد اللہ الغالب
ہی پیدا ہوتے رہیں گے۔

(۲) آنحضرت ﷺ نے اپنی چشمِ دوربین سے دیکھ لیا تھا کہ آپ کی وفات کے بعد ہی
فتنہ و فساد اور کفر و ارتداد کا ایک عظیم طوفان امنڈنے والا ہے اور اس کا مقابلہ
کرنے کے لیئے نہ فقط جلالِ فاروقی کافی ہو سکتا ہے اور نہ صرف شجاعتِ حیدری
بلکہ دلبری کے ساتھ قاہری، جوش کے ساتھ ہوش اور نرمی کے ساتھ گرمی مل کر
ہی اس زہر کا تریاق ہو سکتا تھا۔ حضرت عمر فاروق کے جاہ و جلال رعب و
داب اور طاقت و قوت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن سقیفۂ بنی ساعدہ
میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کا نام خلافت کے لیئے پیش کیا اور فرمایا کہ
تم مجھ سے زیادہ قوی ہو تو فاروق اعظم نے جواب میں کس قدر بلیغ فقرہ ارشاد فرمایا۔

"ان قوتی لک مع فضلک"[1] "میری ساری قوت تو آپ کیلئے ہی وقف ہے اور آپ میں تو فضل بھی ہے"

قریشی ہونے کی شرط

خلافت کے لئے اسی سلسلہ میں ایک اہم بحث یہ چھڑ گئی کہ خلیفہ کے لئے قریشی ہونے کی شرط ہے؟
اس مسئلہ کا تعلق دراصل علم الفقہ سے ہے اور وہ علم الکلام کے دائرہ بحث
میں نہیں آتا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے چونکہ اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت
دیدی گئی اس بنا پر اس کی حیثیت بجائے جزوی مسئلہ ہونے کے اصولی مسئلہ کی ہو گئی
ہے اور اسی وجہ سے اسکو علمائے کلام نے فقہ کے دائرہ سے نکال کر علم الکلام کے مباحث
میں شامل کر لیا ہے۔

ماوردی نے خلافت کیلئے جو شروطِ معتبرہ گنوائی ہیں ان میں ساتویں شرط
قریشیت بیان کی ہے اور اس کو متفق علیہ کہا ہے[2] علامہ ابن خلدون نے بھی اس
شرط کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کو مختلف فیہ کہتے ہیں۔

واختلف فی شرط خامس وھو النسب القرشی[3] — اور پانچویں شرط یعنی قریشی النسب ہونا میں اختلاف کیا گیا ہے۔

اور صحیح بھی یہی ہے چنانچہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک خلیفہ کے لئے قریشی ہونا
ضروری نہیں ہے۔ حضرت الاستاذ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیریؒ مواهب الرحمٰن سے

---

[1] ابن سعد بحوالہ الصواعق المحرقہ ص ۸۔ حضرت ابوبکر کی نرمی اور رقت قلب کا یہ عالم تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی تسکین پر اپنی کبیدہ خاطری کا اظہار فرماتی ہیں اور آنحضرت ﷺ کو ان کے ساتھ جو محبت تھی اسکا تذکرہ کرتی ہیں تو بے ساختہ رو دیتے ہیں اور ہچکی بندھ جاتی ہے۔ حضرت علیؓ کی طرف سے اپنے ملال کا اظہار کرتے ہیں تو بجائے برہم ہونے کے بلکہ الٹا معذرت پیش کرتے ہیں۔ سعد بن عبادہ کے ساتھ حضرت عمرؓ تلخ کلامی کرتے ہیں تو ان کو روک دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی تدبر کا عالم یہ ہے کہ مانعین زکوٰۃ سے قتال کرنے کے بارہ میں فاروق اعظم ذرا پس و پیش کرتے ہیں تو حضرت ابوبکر ان کو طعنہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں اجبار فی الجاهلیة وخوار فی الاسلام" واہ کیا خوب، اسلام سے پہلے آپ بڑے سخت اور متشدد تھے۔ مگر اب اسلام کے عہد میں یہ کمزوری۔
[2] الاحکام السلطانیہ ص ۲
[3] تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۹۱۔

نقل کرتے ہیں کہ :-

انہالیست بشروط عندا امامنا ۔ قریشیت ہمارے امام صاحب کے نزدیک امامت کیلئے شرط نہیں

اس کے بعد تحریر المختار فی المناقضات علی ردالمحتار کے حوالہ سے فرماتے ہیں

کہ امام ابو یوسف کی رائے بھی یہی ہے لہ

ابن خلدون کی رائے اور ان کے دلائل

ابن خلدون نے اگرچہ اس کو مختلف فیہ بتایا ہے لیکن وہ خود اس شرط کی حمایت میں ہیں اور خلافت و امامت کے لئے اس کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

موصوف نے اس سلسلہ میں جو دلائل پیش کئے ہیں اگر ان کو ترتیب وار بیان کیا جائے تو وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے " الائمۃ من قریش "

(۲) سقیفۂ بنی ساعدہ میں انصار نے حضرت سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن جب ابو بکر صدیق نے ان کو آنحضرت صلعم کا مذکورہ بالا ارشاد گرامی یاد دلایا تو سب خاموش ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ اس وقت کسی نے بھی حضرت ابو بکر کی تردید نہیں کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کا قریشیت کی شرط پر اجماع تھا اور وہ سب ارشاد نبوی الائمۃ من قریش سے واقف تھے

(۳) صحیح حدیث میں ہے کہ یہ امر یعنی خلافت ہمیشہ قریش میں رہے گا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ " اسی طرح کی دلیلیں کثرت سے وارد ہیں۔ لیکن جب قریش کے حالات کمزور ہو گئے اور راحت پسندی و آرام طلبی میں پڑ جانے کی وجہ سے انکی عصبیت (خاندانی خصوصیت) پارہ پارہ ہو گئی تو وہ خلافت کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ ان پر عجمی غالب آ گئے اور وہی ارباب حل و عقد بن گئے، اس سے اکثر محققین کو اشتباہ پیدا ہو گیا اور وہ سرے سے قریشیت کی شرط کے ہی منکر ہو گئے " ۲ے

لہ فیض الباری ج ۴ ص ۴۵۸ ۲ے تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۹۲

علامہ ابن خلدون کے دلائل پر بحث

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابن خلدون کی تینوں دلیلوں میں سے کوئی ایک دلیل بھی ایسی نہیں ہے جس پر کوئی اعتراض یا اشکال وارد نہ ہوتا ہو۔ سب سے زیادہ مؤثر اور قوی پہلی دلیل ہے اس پر چند وجوہ سے اشکال وارد ہوتا ہے۔

(الف) " الائمۃ من قریش " کا مطلب کیا ہے؟ یعنی یہ انشاء ہے یا خبر۔

(ب) اگر خبر ہے اور اس کی مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلعم خبر دے رہے ہیں کہ امت میں جو امام پیدا ہونگے وہ قریش میں سے ہی ہونگے تو ظاہر ہے کہ یہ خبر صادق نہیں ہے تاریخ اسلام میں سب نہ سہی وقتاً فوقتاً ایسے خلفاء ضرور پیدا ہوتے رہے ہیں جو اقامت دین کا فرض ادا کرتے تھے اور جملہ شرائط امامت کے جامع تھے لیکن قریشی نہیں تھے۔

(ج) اگر انشاء ہے اور مراد یہ ہے کہ حضور صلعم حکم دے رہے ہیں کہ جو امام منتخب کیا جائے اس کے لئے قریشی ہونا ضروری ہے تو پھر ان روایات کا کیا جواب ہوگا جن میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ایک عبد حبشی بھی تمہارا امام ہو تو اس کی اطاعت کرو۔

عن انس بن مالك قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اسمعوا واطيعوا وان استعمل عليكم عبد حبشي كأن رأسه زبيبة لہ	انس بن مالک سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا تم سمع و اطاعت سے کام لو اگرچہ تمہارا امام ایک حبشی غلام ہو جس کا سر ایک کشمش کے دانہ کی طرح نظر آتا ہو۔ یعنی بدصورت و کریہہ المنظر ہو۔

ایک غیر قریشی کی امامت اگر منعقد ہی نہیں ہو سکتی تو پھر اس کی اطاعت کا حکم کیسا؟ یہ واضح رہنا چاہئے کہ امام بخاری نے اسی روایت کو کتاب الصلوٰۃ میں

لہ صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۵۷ کتاب الاحکام۔ کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ حدیث میں "استعمل" کا مفہوم ہے۔ مذکر "استخلف" کا ہے کیونکہ امام بخاری نے اس روایت کو جس باب کے تحت درج کیا ہے وہ "باب السمع والطاعة للامام مالم تکن معصیة" ہے اس سے معلوم ہوا کہ "استعمال" سے مراد استخلاف ہے۔

باب امامۃ العبد والمولیٰ" کے ماتحت بھی درج کیا ہے جس سے مقصد اس بات کیطرف اشارہ کرنا ہے کہ جب ایک عبد کو امامتِ کبریٰ کا مقام حاصل ہو سکتا ہے تو وہ امامتِ صغریٰ یعنی نماز میں امام بننے کا اہل کیوں نہیں ہوگا؟۔

علاوہ ازیں صحیح بخاری میں ہے۔

ان ھٰذا الامر فی قریش	جب تک قریش دین کی اقامت کرتے رہیں
لا یعادیھم احد الا کبہ	گے یہ امر (خلافت) انہی میں رہیگا جو کوئی اس میں ان
اللہ علی وجھہ ما اقاموا	سے جھگڑا کرے گا اللہ اس کو ذلیل کرے گا۔
الدین [1]	

اب فرض کرو اس حدیث کے مطابق اور جیسا کہ خود تاریخ سے ثابت ہے ایک ایسا وقت آگیا جبکہ قریش اقامتِ دین کے قابل نہیں رہے تو اب سوال یہ ہے کہ چونکہ منصب امام پوری امت پر فرض کفایہ ہے اس لئے ایسی صورت میں امام کا انتخاب کیونکر کیا جائے گا؟ جو قریشی ہے وہ اقامتِ دین سے عاجز ہے اور جو اقامتِ دین کر سکتا ہے وہ بد قسمتی سے قریشی نہیں۔ ان دونوں میں کس کو امام بنایا جائے؟ اگر قریشی کو ہی تو پھر "ما اقاموا الدین" کا مطلب کیا ہوا؟ اور اگر غیر قریشی کو تو پھر ظاہر ہے کہ الائمۃ من قریش انشا کے لئے نہیں ہوا اور اس سے مراد ہرگز یہ نہیں ہو سکتی کہ امام وخلیفہ کے لئے قریشی النسب ہونا ضروری ہے۔

سالم حضرت ابو حذیفہ کے غلام تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت عجیب خوش الحانی سے کرتے تھے جب یمامہ کی جنگ میں شہید ہوئے تو لوگ کہتے تھے۔ ذھب ربع القرآن [2] حضرت عمر فاروق کو ان کے ساتھ بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ لوکان سالم حیا لولیتہ' اگر سالم زندہ ہوتے تو میں ان کو امیر بناتا۔ حضرت عمر خود اجلۂ قریش میں سے تھے اور حضرت ابوبکر نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں جب حدیث الائمۃ من قریش' پڑھی تھی تو اس وقت وہ خود بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت

---

[1] کتاب الاحکام باب الامر من قریش   [2] المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۲۲۶

عمر فاروق کا ایک غلام کی نسبت یہ فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عمر حدیث زیر بحث کا مطلب یہ ہرگز نہیں سمجھتے تھے کہ امام کا قریشی ہونا ضروری ہے اور اس کے بغیر امامت کا انعقاد ہو ہی نہیں سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اچھا جب الائمۃ من قریش نہ انشا ہے اور نہ خبر تو پھر آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جس طرح ہر خاندان کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی ہے اور عام بول چال میں اس خصوصیت کو اس خاندان کے لوگوں میں محدود کر کے بولتے ہیں۔ مثلاً ہم یوں کہیں کہ علما تو دیوبندیوں یا فرنگی محلیوں میں ہوتے ہیں تو اس کا مطلب نہیں ہوتا کہ علما دیوبند اور فرنگی محل کے علاوہ کہیں اور پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اسی طرح آنحضرت کا منشا یہ ہے کہ امامت کے لئے جن اوصاف و کمالات کی ضرورت ہے مثلاً۔ تدبیر، شجاعت شہامت، قیادت کی صلاحیت یہ سب قریش میں پائے جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اوصاف قریش کے علاوہ کسی اور خاندان یا قبیلہ کے کسی شخص میں پائے ہی نہیں جا سکتے۔ بہرحال مدارِ امامت وہ اوصاف و کمالات ہوئے جو قریش کا طغرائے امتیاز تھے، نہ کہ خود قریشی النسب ہونا۔

علامہ ابن خلدون کے کلام میں تضاد

عجیب بات ہے کہ علامہ ابن خلدون جنھوں نے شرط قریشیت کی بڑی پرزور حمایت کی ہے اسی بحث میں جب اس شرط کی حکمت پر گفتگو کرتے ہیں تو ایسی تقریر کر جاتے ہیں جس سے شرط قریشیت کی نفی ہوتی ہے اور اگرچہ پیرایۂ بیان بدلا ہوا ہے لیکن اس تقریر کا حاصل بھی وہ ہی نکلتا ہے جو ہم نے ابھی حدیث زیر بحث کی توجیہ میں لکھا ہے چونکہ اس تقریر میں بعض جیسی اہم باتیں بھی قلم سے نکل گئی ہیں اسلئے کسی قدر طویل ہو جانے کے باوجود ہم اسی کو بجنسہٖ نقل کرتے ہیں لکھتے ہیں۔

" اب ہم امامت وخلافت میں نسب (قریشیت) کی شرط کی حکمت پر کلام کرتے ہیں۔ تاکہ ان مذاہب میں جو حق ہے وہ ظاہر ہو جائے اور ہم کہتے ہیں کہ تمام احکام شرعیہ کے مقاصد بھی ہوتے ہیں اور ان کی حکمتیں بھی ہوتی ہیں جہاں تک قریشی النسب ہونے کی شرط کا تعلق ہے تو اس میں شارع کی حکمت صرف اس قدر ہی نہیں ہے۔

کہ اس ذریعہ سے آنحضرت ﷺ کی قرابت سے برکت و سعادت حاصل کی جائے۔
اگرچہ یہ برکت بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن تبرک مقاصدِ شرعیہ میں سے نہیں ہے۔
جب ہم غور و فکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نسب کی شرط لگانے میں حکمت اور مقصدِ شارع یہ ہے کہ اس ذریعہ سے امت میں استحکام اور مضبوطی رہے اور ان میں آپس میں گروہ بندی اور تفرق و تشتت پیدا نہ ہونے پائے۔ کیونکہ قریش مضر سے زیادہ طاقت و سطوت اور دبدبہ اور رعب رکھتے تھے اور پورا عرب ان کی سیادت و عظمت کو تسلیم کرتا تھا۔ اس کے برعکس قبائل مضر میں یہ بات نہیں تھی اس لیئے اگر خلافت غیر قریش میں چلی جاتی تو پھوٹ پڑ جاتی اور وحدت کلمہ باقی نہیں رہتی ابن اسحق نے بھی کتاب السیر وغیرہ میں یہی لکھا ہے۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ قرشیت کی شرط وضع شارع اور اتحادِ کلمہ کی بقا کی غرض سے ہے اور ہم کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شارع اپنے احکام کسی گروہ، زمانہ یا قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کرتا ہے تو اس سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ قرشیت کی شرط کا دراصل مفہوم وہی ہے جو کفایت[1] کا ہے۔ اسی بنا پر جو شخص بھی مسلمانوں کا والی یا امام ہو اس کیلئے ہم نے اس بات کی شرط لگائی ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت یا ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہو جس کی سیادت اور عظمت مسلّم ہو۔ اور مسلمانوں میں جس کو اعتبار و وقار حاصل ہو جیسا کہ قریش کو عرب میں حاصل تھا۔[2]

اس تقریر کے اخیر فقروں کو غور سے پڑھو اور بتاؤ کیا اس کا حاصل اور مطلب ٹھیک ٹھیک وہی نہیں ہے جو ہم نے اوپر لکھا ہے یعنی آنحضرت ﷺ نے قریش کو بطور تمثیل پیش کیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ امام اپنے زمانہ میں ایک ایسی با اقتدار جماعت کا فرد ہو جیسا کہ قریش عہدِ نبوت و خلافت میں تھے تاکہ اس میں امامت کے اوصاف و کمالات بدرجۂ اتم پائے جائیں تو گویا اصل مقصد وہ اوصاف و کمالات ہیں جن کے مظہر اس زمانہ

[1] کفایت کی تعریف اس بحث کے شروع میں ہی گزر چکی ہے اسے پھر دیکھ لیا جائے [2] تاریخ ابن خلدون جلد اوّل ۱۶۲ - ۱۶۳

میں قریش تھے نہ کہ محض نسباً قریشی ہونا۔ فشتان ما بينهما۔
سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ بھی واضح ہو گیا ہوگا کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیق نے الائمة من قریش سے جو استدلال کیا تھا اور صحابہ کرام اس پر خاموش رہے تھے اس وقت اس سے ان کی مراد کیا تھی؟ بے شبہ ان کا مطلب صرف اس قدر تھا کہ اس وقت کی سوسائٹی میں اور ان حالات میں قریش کو ہی یہ مرتبہ و مقام حاصل تھا کہ مسندِ امامت پر متمکن ہوں۔ غیر قریشی کے امام بننے سے ملت اسلامی میں استحکام اور اجتماعیت کا قیام ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت ابوبکر نے جو تقریر کی تھی اس میں آپ نے فرمایا تھا۔

وان العرب لا تعرف هذا الامر الا لهذا الحی من قریش[1] — اور عرب اس قبیلہ قریش کے سوا کسی اور کی ولایت و امامت سے آشنا ہی نہیں ہیں۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ جب خود قریش میں ابوبکر و عمر اور عثمان و علی جیسی شخصیتیں موجود ہوں تو پھر وہاں کسی اور کو بھی امامت و خلافت کا استحقاق ہو سکتا ہے؟
اب رہی یہ بات کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ خلافت ہمیشہ قریش میں رہے گی "تو اول تو یہ ارشاد مطلقاً نہیں ہے بلکہ "ما عدلوا" یا "ما اقاموا الدین" کی قید کے ساتھ ہے اور اس قید کیساتھ اس کا جو مطلب ہوا وہ ظاہر ہی ہے اس کے علاوہ ہر چیز کا بقا اس کے اوصاف و خصائص کی بنا پر ہوتا ہے ارشادِ گرامی کا منشا یہ ہے کہ جب تک قریش قریش رہیں گے یعنی اپنے امتیازی اوصاف پر قائم رہیں گے۔ ان میں خلافت رہے گی اور کوئی شبہ نہیں کہ اگر قریش میں ابوبکر و عمر برابر پیدا ہوتے رہتے تو پھر کس کی مجال تھی کہ ان سے خلافت سلب کر سکتا۔

خلیفہ کے انتخاب کا طریقہ — اس سلسلہ میں دوسرا اہم مسئلہ انتخابِ خلیفہ کا ہے اس کے لیئے کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں یا حدیث میں صراحت کیساتھ اس بارہ میں

[1] ابن جریر طبری ج ۳ ص ۲۰۳ ان الفاظ کیساتھ ساتھ بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اگر اور ان میں سے کوئی خلیفہ ہوا تو [illegible]

کوئی حکم نہیں البتہ چند اشارات ہیں جن سے خلفائے راشدین کے تعامل کی روشنی میں کچھ اصول مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے۔

أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ مسلمانوں کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہوگا

اس سے معلوم ہوا کہ شخصی استبداد اور تحکم کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں جب خود آنحضرت ﷺ کو حکم وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ مشورہ کرنے اور دوسروں سے استمزاج کا حکم ہے تو پھر کسی اور کا کیا ذکر؟

اب رہی یہ بات کہ استمزاج و استصواب آج کل کی جمہوریتوں کے قانون و دستور کے مطابق مملکت کے ہر بالغ مرد سے کیا جائے جس کو Adult Franchise کہا جاتا ہے یا صرف ارباب حل وعقد سے جن کی حیثیت آجکل کی آئینی اصلاح میں نمائندگان اسمبلی یا ممبران پارلیمنٹ کی ہوتی ہے اس معاملہ میں قرآن نے پہلی صورت یعنی بالغوں کے حق رائے دہندگی کو تسلیم نہیں کیا ہے اور دوسری صورت کا اثبات کیا ہے اور صاف کہا ہے۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ — کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے برابر ہیں۔

ایک اور موقع پر فرمایا گیا۔

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ — اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھو۔

اسلام حقانیت و صداقت کا مذہب ہے۔ ہر چیز کو اس کی اصل ماہیت و نوعیت کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور عوام فریب الفاظ و اصطلاحات کا طلسم نہیں باندھتا۔ اس بناء پر وہ اس بات کا قائل نہیں کہ ایک جاہل، کندۂ ناتراش اور شریر و فتنہ پرور انسان کو بھی ووٹ دینے کا ایسا ہی حق ہے جیسا کہ ایک صاحب علم و فہم اور متقی و صالح کو ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ارباب حل وعقد کا تعین کیونکر کیا جائیگا؟ ہمارے زمانہ میں لوگ عوام سے جھوٹے سچے وعدے کرکے اور چند نمائشی کارنامے انجام دے کر ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس طرح اسمبلی کونسل یا میونسپل بورڈ کے

منتخب ہو جاتے ہیں وہی قوم کے نمائندے اور اس کے ارباب حل وعقد سمجھے جاتے ہیں لیکن اسلام ان لوگوں کو ارباب حل وعقد سمجھتا ہے جو قوم میں اپنے فہم و تدبر، عمل صالح اور بلند کیرکٹر کی وجہ سے عوام کے مرجع اور ان کے معتمد علیہ ہوں، انہوں نے اپنے لئے قوم سے کوئی ووٹ نہ مانگا ہو اور ووٹ حاصل کرنے کیلئے اپنے کارناموں یا آئندہ کے منصوبوں کی کوئی طویل فہرست نہ شائع کی ہو لیکن اس کے باوجود ملت اسلامیہ نے انکی ذہنی اور عملی سربلندیوں سے متاثر ہو کر خود ان کو اپنا امام یا لیڈر تسلیم کر لیا ہو پس قرآن مجید میں جن لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم ہے وہ یہی لوگ ہیں۔

ان اصولی اشارات کے علاوہ خاص خلیفہ کے انتخاب سے متعلق قرآن و حدیث میں کسی مخصوص نظام یا طریقہ کا حکم نہیں دیا گیا اسی بنا پر حضرت عمرؓ تین چیزوں کا ذکر کرکے فرمایا کرتے تھے کہ اگر آنحضرت ﷺ ان کی حقیقت بتا جاتے تو مجھ کو دنیا اور مافیہا سے زیادہ عزیز ہوتی۔ ان میں سے ایک خلافت بھی ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر جب لوگوں نے آپ سے جانشینی کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ میں کسی کو نامزد کردوں یا نہ کردوں میرے لئے دونوں راستے موجود ہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے کسی کو نامزد نہیں کیا لیکن ابوبکرؓ نے مجھ کو نامزد کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے اس قول سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں ان کے ذہن میں کوئی قطعی حکم نہیں تھا اور اسکو مسلمانوں اور ان کے ارباب حل وعقد کی رائے پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے کہ موقع اور محل کے مناسب جو طریقہ پسندیدہ ہو اختیار کرلیں، چنانچہ چاروں خلفاء میں سے ہر ایک کا انتخاب ایک جداگانہ طریقہ پر ہوا۔ ہم ذیل میں اس کی تفصیل درج کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب ایک انتخابی مجلس مشاورت میں ہوا جس میں سب انصار اور اکابر مہاجرین موجود تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب اپنی تقریر سے انصار کو مطمئن کردیا اور ان سے یہ تسلیم کرالیا کہ خلیفہ کو قریش میں ہی سے ہونا چاہئے تو پھر آپ نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے نام پیش کئے، اتنے میں جھٹ حضرت عمرؓ نے بیعت کیلئے حضرت ابوبکرؓ کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے۔ حضرت عمرؓ کا پیش قدمی کرنا تھا کہ

انصار و مہاجرین ٹوٹ پڑے اور حضرت ابوبکر خلیفہ منتخب ہو گئے

حضرت ابوبکر کا یہ انتخاب اگرچہ انتخاب عام تھا یا کم از کم کثرت آراء سے ہوا تھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک فوری کارروائی تھی۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جب کوئی شخص چاہے حضرت عمر کی طرح اچانک کسی کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں کسی نے کہا کہ امیر المومنین (عمر فاروق) کا انتقال ہو گیا تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔ چونکہ بغیر کسی مشورہ کے محض شخصی پسند پر کسی کو خلیفہ مان لینا اسلام کی تعلیم کے خلاف تھا اس پر جب حضرت عمر کو اس شخص کا یہ قول پہنچا تو آپ سخت غضب ناک ہوئے اور حضرت ابوبکر کی بیعت کو ایک استثنائی مثال قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

فلا یغترن امرؤ ان یقول انما
کانت بیعۃ ابی بکر فلتۃ
وتمت الا وانہا قد کانت کذٰلک
ولکن اللہ وقی شرہا۔

کوئی شخص دھوکہ میں پڑ کر یہ نہ کہے کہ ابوبکر کی بیعت
اچانک ہوئی تھی اور پھر بھی درست ہو گئی خبردار رہیں
وہ ایسی ہی اچانک ہوئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس
جلد بازی کے شر سے محفوظ رکھا۔

اس کے بعد فاروق اعظم فرماتے ہیں کہ یہ بیعت اچانک اور دفعۃً سہی لیکن آخر بیعت تھی کس کے ہاتھوں پر! صدیق اکبر کے ہاتھ پر! جن سے زیادہ مستحق خلافت کوئی اور دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت عمر کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

ولیس منکم من تقطع الاعناق
الیہ مثل ابی بکر

اور تم میں ابوبکر جیسا کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس
کے پاس دور دراز سے لوگ سفر کر کے آتے۔

حضرت ابوبکر کی بیعت کا یہ واقعہ جو ایک استثنائی حیثیت رکھتا تھا اگر حضرت ابوبکر کا واقعہ نہ ہوتا تو خود حضرت عمر کے نزدیک ایک عظیم شر اور فتنہ کا باعث ہو سکتا تھا۔ اسی بنا پر بطور اصول کے حضرت عمر نے بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لینا اس شخص کو خلیفہ نہیں بنا دیتا ہے۔

من بایع رجلاً عن غیر مشورۃ
من المسلمین فلا یتابع ھو [1]

جس شخص نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی سے
بیعت کی تو اس سے وہ شخص خلیفہ نہیں بن گیا۔

پہلے دن حضرت ابوبکر کا انتخاب ایک خاص مجلس میں ہوا اور اگرچہ اچانک ہوا لیکن اس وقت کی سب سے پارٹیوں کے نمائندے کی موجودگی میں ہوا اور بلا مقابلہ ہوا۔ اس کے بعد دوسرے روز مسجد میں بیعت عامہ ہوئی اور ایک لائق ذکر شخص بھی ایسا نہیں رہا جس نے بیعت نہ کی ہو یا کم از کم اس انتخاب کی مخالفت میں آواز بلند کی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ خلیفہ کا انتخاب اور پھر بیعت کے ذریعہ تمام مسلمانوں کا اس انتخاب پر اپنی رضامندی کا عملاً اظہار ضروری ہے۔

(۲) خلیفۂ رسول ﷺ کے بعد خلیفۂ دوم کا انتخاب اس طرح ہوا کہ اگرچہ حضرت ابوبکر کو اس کا یقین تھا کہ حضرت عمر سے بڑھ کر دوسرا کوئی شخص ان کی جانشینی کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا تاہم اس معاملہ میں انہوں نے اکابر صحابہ سے مشورہ کیا اور بحث و تمحیص کے بعد آخر حضرت عمر کے حق میں عہد نامۂ خلافت لکھوایا اور اپنے غلام کو دیا کہ مجمع عام میں جا کر سنا دے۔ پھر خود بالا خانہ پر سے جھک کر لوگوں سے جو نیچے جمع تھے پوچھا کہ میں عمر کو نامزد کرتا ہوں تم لوگ اس کو پسند کرتے ہو؟ سب نے سمعنا اطعنا کہا۔

(۳) خلیفۂ سوم حضرت عثمان کا انتخاب اس طرح ہوا کہ ایک زخم کاری کے بعد حضرت عمر کو اپنے جانبر نہ ہو سکنے کا یقین ہو گیا تو چھ نامور ان قریش حضرت علی، عثمان، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم کی ایک کونسل بنا دی اور وصیت کی کہ چھ آدمی اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ فاروق اعظم کی وفات کے بعد کونسل کا جلسہ ہوا۔ دو روز تک بحث ہوتی رہی۔ لیکن فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر تیسرے دن حضرت عبدالرحمن بن عوف کی تجویز کے مطابق تین حضرات نے اپنے نام واپس لے لئے اور اب خلافت بجائے چھ کے تین شخصوں میں دائر رہ گئی جن میں سے ایک خود عبدالرحمن بن عوف بھی تھے۔ بعد میں انہوں نے بھی اپنا نام واپس لے لیا اور

[1] صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۰۹ باب رجم الحبلیٰ من الزنیٰ اذا احصنت

سلے دسے کے صرف دو رہ گئے ایک علی اور دوسرے عثمان ان دونوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو اپنا حکم تسلیم کر لیا۔ اب عبدالرحمٰن بن عوف اور سب صحابہ مسجد میں جمع ہوئے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے ایک مؤثر تقریر کی اور پھر حضرت عثمان کی طرف بیعت کیلئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ ان کے بعد حضرت علی نے بیعت کی۔ آپ کا بیعت کرنا تھا کہ صحابہ ٹوٹ پڑے اور حضرت عثمان اتفاق آراء سے مسند آرائے خلافت ہو گئے۔

(۴) خلیفۂ چہارم حضرت علی کا انتخاب نہایت ہنگامی حالات میں ہوا۔ حضرت عثمان کے شہید ہوتے ہی فتنہ و فساد کے دروازے کھل چکے تھے۔ طوائف الملوکی نے اسلامی جمعیت و اتحاد کا شیرازہ پراگندہ کر دیا تھا۔ مدینہ میں خاک اڑنے لگی تھی صحابہ کرام جو اس وقت حیات تھے منتشر تھے۔ ان میں سے بہتر سے تو مدینہ سے باہر ادھر ادھر کے علاقوں میں تھے۔ قاتلین حضرت عثمان کی آئی تھی۔ مدینہ پر چھائے ہوئے منڈلاتے پھرتے تھے انہیں لوگوں نے حضرت علی کو خلیفہ بنانا چاہا تو حضرت علی نے پہلے پہل انکار کیا لیکن آخر جب ان کا اصرار شدید ہوا تو اسلامی جمعیت کو مزید انتشار و پراگندگی سے بچانے کی غرض سے ہامی بھر لی اور آپ کی خلافت کا اعلان ہو گیا اور عام مسلمانوں کے علاوہ جو اس وقت مدینہ میں موجود تھے حضرت طلحہ اور زبیر جن کی طرف سے اندیشہ ہو سکتا تھا انہوں نے بھی بیعت کر لی لیکن پھر بھی بہت سے لوگوں نے بیعت نہیں کی اور مدینہ سے نکل کر شام کی طرف چلے گئے۔ چونکہ یہ انتخاب ہنگامی تھا اور حضرت علی نے خلافت کی ذمہ داری صرف ایک قومی اور اجتماعی ضرورت سے قبول کی تھی اس بنا پر اس انتخاب کو بطور ایک شرعی اصل کے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ جہاں تک پہلے تینوں خلفاء کے انتخاب کا تعلق ہے اس سے امور ذیل صاف طور پر سمجھ میں آتے ہیں۔

(الف) خلیفہ کا انتخاب مجمع عام میں ہوا۔

(ب) چند ارباب رائے سے مشورہ کرنے کے بعد خلیفہ نے اپنی جانشینی کے لئے ایک شخص کو نامزد کیا۔ اور اس کو استصواب رائے عامہ کی خاطر عام مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔

(ج) خلیفہ نے ایک کونسل مقرر کر دی کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کرے گی اور پھر اس کونسل کے فیصلہ کو استصواب رائے عامہ کی غرض سے مسلمانوں کے عام مجمع میں پیش کیا جائیگا۔

(د) کسی خلیفہ نے اپنے بیٹے کا تو ذکر کیا اپنے کسی رشتہ دار کو نامزد نہیں کیا۔ اس معاملہ میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حضرت علی حضرت عمر کے دست و بازو اور بغایت معتمد علیہ تھے لیکن چونکہ بعض روایات کے مطابق حضرت ام کلثوم بنت علی سے نکاح کر لینے کے بعد دونوں میں رشتۂ مصاہرت بھی قائم ہو گیا تھا اس بنا پر حضرت عمر نے چھ آدمیوں کی جو کونسل بنائی اس میں حضرت علی کا نام تو رکھا لیکن نامزد نہیں کیا حالانکہ اگر نامزدگی کی بات ہوتی تو حضرت علی سے زیادہ اور کون مستحق ہو سکتا تھا۔

(ہ) آخری فیصلہ بہرحال جمہور کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک بیعت عامہ نہیں ہوگی کوئی شخص خلیفہ نہیں ہو سکے گا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا استحقاقِ خلافت

یوں تو جتنے بھی صحابۂ کرام تھے سب ہی فلکِ اسلام و ایمان کے مہر و ماہ تھے۔ اگرچہ ایک حکومت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیئے اور وہ بھی ان حالات میں جو اس وقت درپیش تھے۔ دل اور دماغ کے جن اعلیٰ کمالات و ملکات کی ضرورت ہے۔ تمام صحابہؓ ان میں برابر اور مساوی حیثیت و مرتبہ کے نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن جو حضرات خلافت کے بجا طور پر مستحق اور اہل تھے جیسے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر و سعد رضی اللہ عنہم وہ بھی دو چار نہیں بڑی تعداد میں تھے۔ قرآن مجید نے جن لوگوں کی صلاحیت حکمرانی کی گواہی ان الفاظ میں دی تھی۔

الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج)	وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار دیدیں تو وہ نماز قائم کریں۔ زکوٰۃ دیں۔ بھلائیوں کا حکم کریں اور بُری باتوں سے روک ٹوک کریں۔

وہ ظاہر ہے اکّا دُکّا نہیں۔ ایک پورا گروہ ایک جماعت تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب صورتِ حال یہ تھی تو پھر آخر اس کی وجہ کیا تھی کہ ایک پیغمبر آخرالزمان کی براہِ راست خلافت و نیابتِ پیغمبری کے بعد جس سے بڑھ کر کوئی اور اعزاز نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حصہ میں ہی آئی۔ یہ سب کچھ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ اس کے اسباب و وجوہ ہوں۔ اس سلسلہ میں ہم کو امور ذیل پہ غور کرنا چاہیئے۔

(۱) صحابۂ کرام میں سب سے زیادہ کس کے متعلق قرآن مجید کی آیات نازل ہوئی ہیں اور ان آیات سے اس کی شخصیت پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

(۲) آنحضرتؐ کے ساتھ سب سے زیادہ کس کو رفاقت کا شرف حاصل رہا۔
(۳) سب سے زیادہ رازشناس و مزاج دانِ حضرت کون تھا۔
(۴) آنحضرتؐ کو سب سے زیادہ اعتماد کس پر تھا۔
(۵) صحابۂ کرام میں اُس کو کیا مرتبہ و مقام حاصل تھا۔
(۶) کیا آنحضرتؐ نے قولاً یا عملاً اس کی خلافت کی طرف اشارہ کیا ہے
(۷) اُس نے اپنے کارناموں سے یہ حقیقت کہاں تک ثابت کی کہ وہی خلیفۂ رسولؐ ہونے کا سب سے زیادہ مستحق تھا۔

اب ہم مذکورۂ بالا تنقیحات میں سے ہر ایک پر علی الترتیب کلام کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر قرآن مجید میں

یہ واقعہ ہے کہ تمام صحابۂ کرام میں سب سے زیادہ یہ شرف اور سعادت حضرت ابوبکرؓ کو ہی حاصل ہے کہ قرآن نے آنحضرتؐ کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلق کو، آپ کے خاص خاص اعمال و افعال کو جن سے اسلام کو بڑا فائدہ پہونچا اور آپ کے عہدِ خلافت کے بعض نہایت شاندار کارناموں کو پوری وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور ان پر مدح کی ہے۔ اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ آنحضرتؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کا قبل از بعثت جو دوستانہ تعلق تھا اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (الاحقاف)	یہاں تک کہ جب جوان ہو گیا اور چالیس برس کا ہوا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اس کا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ بیس سال کے اور حضرت ابوبکر اٹھارہ برس کے تھے۔ دونوں تجارت کے سلسلہ میں شام جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک منزل پر قیام کیا۔ یہاں ایک بیری کا درخت تھا۔ حضورؐ اس درخت کے سائے میں جا کر بیٹھ گئے اور ابوبکر وہاں ایک راہب رہتا تھا کچھ دین و مذہب کی باتیں پوچھنے کی غرض سے اسکے پاس جا بیٹھے، راہب نے ابوبکر سے حضورؐ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا

کہ یہ نوجوان جو درخت کے نیچے بیٹھا ہے کون ہے؟ وہ بولے "محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب" راہب نے کہا "خدا کی قسم! یہ نبی ہوگا کیونکہ عیسیٰ بن مریم کے بعد سوائے محمد رسول اللہ کے کوئی اور شخص اس درخت کے سایہ میں نہیں بیٹھ سکتا" راہب کی یہ بات ابوبکر کے دل میں ایسی بیٹھی کہ سفر ہو یا حضر کسی حالت میں بھی حضور کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ابوبکر نے ہی اس کو قبول کیا اور اسلام لائے۔ اس وقت ابوبکر کی عمر اڑتیس سال یعنی آنحضرت ﷺ سے دو برس کم تھی جب ابوبکر چالیس برس کے ہوئے تو انہوں نے وہ دعا مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی

رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ (الآیۃ) [1]

اسلام لانے کے بعد حضرت ابوبکر نے اپنی دولت اللہ کے راستہ میں اور اسلام کی مدد کیلئے جس فیاضی اور بے جگری سے خرچ کی ہے قرآن اس کی داد اس طرح دیتا ہے۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد (الحدید)	تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے روپیہ خرچ کیا اور جہاد کیا تم میں سے کوئی ان کے برابر نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا ہے۔

محمد بن فضیل کلبی سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت ابوبکر صدیق کی شان میں نازل ہوئی ہے اس لیے کہ وہی سب سے پہلے اسلام لائے اور انہوں نے ہی سب سے پہلے اللہ کے راستہ میں اپنی دولت خرچ کی [2] امام ابوالحسن الواحدی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک روایت نقل کی ہے اس سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے پاس حضرت ابوبکر ایک عبا پہنے ہوئے بیٹھے تھے جو سینہ پر سے ادھڑی ہوئی تھی اتنے میں جبریل امین آ گئے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ ابوبکر کی عبا سینہ پر سے چاک ہو رہی ہے حضور ﷺ نے جواب دیا۔

---

[1] اسباب النزول للواحدی ص ۲۸۴ مطبوعہ مصر [2] ازالۃ الخفا ص ۴۸

"اے جبریل! ابوبکر نے اپنی ساری دولت میرے اوپر فتح مکہ سے پہلے ہی خرچ کر دی" اب جبریل امین بولے "آپ اللہ کا سلام ابوبکر کو پہنچا دیجئے اور ان سے پوچھئے کہ آپ اپنے اس فقر پر اللہ سے راضی ہیں یا ناراض! حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر سے یہ دریافت کیا تو وہ رونے لگے اور عرض کیا کہ کیا میں اپنے رب سے ناراض ہونگا؟ نہیں بلکہ میں اپنے رب سے راضی ہوں۔ اپنے رب سے راضی ہوں" [1]

اس آیت میں تو صرف دولت خرچ کرنے کا ذکر ہے ایک اور آیت میں انفاق کے ساتھ دوسری صفات کا بھی ذکر ہے۔ ارشاد ہے۔

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ (واللیل)	پس وہ شخص جس نے دیا، پرہیزگاری برتی اور نیکی کی تصدیق کی ہم اس کیلئے آسانیاں بہم پہنچائیں گے۔

الواحدی نے اس آیت کے ذیل میں متعدد روایات نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ حضرت ابوبکر غلام خرید خرید کر آزاد کیا کرتے تھے یہ غلام اکثر ضعیف و ناتواں ہوتے تھے۔ ایک دن ان کے باپ ابوقحافہ نے کہا کہ بیٹا اگر تم کو غلام آزاد کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو پھر کڑیل نوجوان غلام خرید کر آزاد کرو تاکہ وہ کسی وقت تمہارے کام بھی آئیں۔ حضرت ابوبکر نے جواب دیا ابا! میری نیت تو ان غلاموں کے آزاد کرنے سے کچھ اور ہی ہے [2]

حضرت ابوبکر نے بلال حبشی کو خرید کر آزاد کیا تو مشرکین مکہ نے کہنا شروع کیا کہ ابوبکر پر بلال کا کوئی احسان تھا۔ انہوں نے اس کا بدلہ چکایا ہے۔ قرآن نے اس کی بھی تردید کی اور اعلان کیا۔

وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزیٰ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ ولسوف یرضیٰ	اور ان (ابوبکر) پر کسی کا کوئی احسان نہیں تھا جس کا بدلہ چکایا گیا ہو۔ بجز رب اعلیٰ کی رضا جوئی کے اور یہ عنقریب راضی ہوگا۔

حضرت ابوبکر راتوں کو بیدار رہ کر جو عبادت الٰہی کرتے تھے اس کا ذکر قرآن میں [3]

---

[1] اسباب النزول ص ۳۰۳ [2] اسباب النزول ص ۳۳۶ [3] اسباب النزول ص ۲۷۶

اسطرح کیا گیا ہے۔ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ (زمر)

حضرت ابوبکرؓ جب اسلام لائے اور آنحضرت ﷺ کی تصدیق کی تو عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ وغیرہم ان کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا آپ ایمان لے آئے ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب اثبات میں دیا تو یہ سب بھی مسلمان ہوگئے۔ قرآن نے اس واقعہ کو بھی بیان کیا ہے جس سے حضرت ابوبکرؓ کی مدح کا پہلو نکلتا ہے۔ ارشاد ہے [1]

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ط
پس اے محمدؐ آپ خوشخبری سنا دیجئے ان لوگوں کو جو قول سنتے ہیں اور اس اچھے قول کا اتباع کرتے ہیں

ان متفرق واقعات و محامد کے علاوہ قرآن مجید میں حضرت ابوبکرؓ کا سب سے اہم تذکرہ وہ ہے جو غارِ ثور میں رفاقت سے متعلق ہے۔ فرمایا گیا۔

ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ
غار ثور میں دو جو تھے ان کا دوسرا۔

یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت مآبی کی اتنی بڑی اہم اور مستند دستاویز ہے کہ علما نے کہا ہے کہ چونکہ حضرت ابوبکرؓ کی معیت و صحبت نبویؐ قرآن مجید میں منصوص ہے اس بنا پر اس کا منکر کافر ہے۔ یہ صرف صدیق اکبرؓ کی خصوصیت ہے کسی اور صحابی کو یہ شرف حاصل نہیں ہے پھر حضرت ابوبکرؓ کی آنحضرت ﷺ کے ساتھ رفاقت فی الغار کے عنداللہ و عندالناس مقبول ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ گہری دوستی کے لیے "یارِ غار" بطور استعارہ ہی بولا جانے لگا ہے۔"

پھر جس طرح قرآن مجید میں بعض مواقع پر آنحضرت ﷺ کو تنبیہ کی گئی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم جو نابینا تھے آپؐ کی خدمت میں آئے اور آپ نے ان کی طرف زیادہ التفات نہیں فرمایا تو عَبَسَ وَتَوَلَّى أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى کی آیات نازل ہوئیں، ٹھیک اسی طرح کا معاملہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ بھی ہے واقعہ افک میں حضرت ابوبکرؓ نے مسطح بن اثاثہ کی مالی اعانت و امداد سے دست کشی اختیار کر لینے کا ارادہ کر لیا تھا تو قرآن میں ان لفظوں کے ساتھ تنبیہ کی گئی۔

[1] اسباب النزول ص ۲۷۶

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَى وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا (النور، پارہ ۱۸)
تم میں جو لوگ صاحب فضل و مقدرت ہیں وہ رشتہ داروں مسکینوں اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد کرنے کی قسم نہ کھائیں اور ان کو چاہیے کہ معاف کریں۔

حضرت ابوبکرؓ نے آیت سن کر کہا "خدا کی قسم! میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھے بخش دے" اور عہد کیا کہ اب آئندہ برابر وہ مسطح کے کفیل رہیں گے۔ اگرچہ یہ تنبیہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر معمولی قرب و اختصاص کی دلیل ہے جس کو بے شبہ مختصات حضرت ابوبکرؓ میں شمار کرنا چاہیے۔

پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت کا جو سب سے بڑا اور عظیم الشان کام ہے یعنی مرتدین عرب سے جنگ و قتال اس کا تذکرہ بھی قرآن میں کیا گیا ہے اور نہ صرف حضرت ابوبکرؓ بلکہ وہ تمام صحابۂ کرام جنہوں نے اس قتال میں حصہ لیا ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبوبیت کا طغرائے امتیاز عطا فرمایا ہے۔ لیکن چونکہ اس اہم اور عظیم الشان کارنامہ کی ابتدا و انتہا اور اس کی قیادت و زعامت کا سہرا صدیق اکبرؓ کے ہی سر ہے اس بنا پر محبوبیت الٰہی کے اس تمغۂ اعزاز میں حضرت ابوبکرؓ کا حصہ بھی سب سے زیادہ ہوگا۔ ارشاد ربانی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ط
اے ایمان والو! تم میں سے اگر کوئی شخص اپنے دین سے پھر جائے تو عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے بدلے میں ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے اللہ محبت کرتا ہے اور جو اللہ سے محبت کرتے ہیں، وہ مؤمنین پر جھکے ہوئے ہیں، کافروں پر غالب، اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت

وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ — والا ہے ۔ اور علم والا ہے ۔
(پ۶ مائدہ ۸۲)

امام بیہقی نے حضرت حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابوبکرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے جب عرب مرتد ہوگئے تو انہوں نے اور ان کے رفقاء نے جہاد کیا اور آخر کار ان کو اسلام کی طرف لوٹا دیا ۔ یونس بن بکیر قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم آپس میں کہا کرتے تھے کہ یہ آیت ابوبکرؓ کے بارہ میں نازل ہوئی ہے کیونکہ انہوں نے ہی مرتدین عرب سے قتال کیا تھا [۱]۔

آنحضرتؐ کے ساتھ رفاقت — آنحضرتؐ کے ساتھ سب سے زیادہ کس کو رفاقت و ہمراہی کا شرف حاصل ہوا ہے اور سب سے زیادہ آپ کا شریک جلوت وخلوت کون ہے ؟ اس سوال کا جواب بھی ظاہر ہے ۔ حضرت ابوبکرؓ "اول من اسلم" ہیں پھر اسلام سے قبل بھی دونوں ساتھ اور بعض معاملات میں ایک دوسرے کے شریک و رفیق رہے ہیں ۔ اسلام قبول کرنے کے بعد تو معیت و رفاقت کا یہ عالم رہا کہ حضرت ابوبکرؓ گویا ایک دن کے لئے بھی آپ سے جدا نہ ہوئے قیام مکہ کے زمانہ میں لوگ حبشہ گئے لیکن صدیق اکبرؓ نہ گئے ۔ پھر ہجرت مدینہ کا وقت آیا تو بہت سے صحابہ جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل ہیں پہلے سے مدینہ پہونچ گئے ، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کی تو آنحضرتؐ کے ساتھ اور اسطرح رفیقِ سفر و حضر رہے ۔ غزوات کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جن غزوات میں حضورؐ تشریف لے جاتے تھے حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ ہوتے تھے ۔ سرایا میں لوگ کہتے تھے کہ ابوبکرؓ کو بھیجئے تو حضورؐ فرماتے تھے .... کہ نہیں یہ میرے پاس رہیں گے ۔ اور مجھ کو ان کی ضرورت ہے ۔ اس طویل ترین رفاقت کے باعث ظاہر ہے جو تربیت اور تعلیم حضرت ابوبکرؓ کی ہوسکتی ہے اور کسی دوسرے کی نہیں ہوسکتی تھی

ادا شناسی اور مزاج دانی نبوت — اس قرب و اتصال ۔ ہر وقت کی معیت و رفاقت اور پھر خود اپنی ذاتی استعداد و صلاحیت کے باعث جس درجہ کے ادا شناس و مزاج دان

[۱] الصواعق المحرقہ ص ۹

نبوت صدیق اکبرؓ ہوسکتے تھے کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا ۔ واقعات کا تتبع کیا جائے تو صاف نظر آئیگا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور آنحضرتؐ کا مزاج اور انداز طبیعت ایک ہی خمیر سے تیار ہوا تھا ، عادات و خصائل ، اور امیال و عواطف کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جتنے قریب حضور پرنور اور صدیق اکبرؓ تھے کوئی اور نہیں تھا ۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں بحث صرف مزاج کی ہم رنگی سے ہے نہ کہ شریعت کے اصل احکام و مسائل سے چنانچہ پہلے ایک روایت گزر چکی ہے جس میں ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کے اوصاف و کمالات ٹھیک ٹھیک وہی بیان کئے ہیں جو حضرت خدیجہؓ نے سرور کونینؐ کے بیان کئے تھے اس کے علاوہ چند اور واقعات بھی ہیں جن سے اس پر مزید روشنی پڑے گی ۔

عبداللہ بن ابی جو مشہور منافق تھا اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا عبداللہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اپنی قمیص مرحمت فرما دیجئے ۔ تاکہ ابی کو اس میں کفنا دیا جائے ۔ حضورؐ نے قمیص عطا فرما دی اس کے بعد اس نے کہا کہ اب نماز بھی پڑھ دیجئے ، رحمتِ عالم نے اس درخواست کو بھی شرف قبول عطا فرمایا لیکن آپ نماز کے ارادہ سے کھڑے ہورہے تھے کہ حضرت عمرؓ نے آپکا دامن پکڑ کر کھینچا اور عرض کیا یارسول اللہؐ ! آپ اس شخص کی نماز پڑھتے ہیں حالانکہ آپ کو اللہ نے اس سے منع کیا ہے ۔ ارشاد ہوا " اللہ نے " اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ فرماکر مجھ کو اختیار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو میں نہیں بخشونگا ۔ تو میں اب ستر سے بھی زیادہ مرتبہ استغفار کردوں گا " حضرت عمرؓ نے کہا " وہ تو منافق تھا " لیکن آپ نہ مانے اور نماز پڑھی ۔ اس پر یہ آیت اُتری ۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ط [۱] — آپ کبھی ان میں سے کسی کی نماز نہ پڑھیں اور اس کی قبر پر کھڑے نہ ہوں ۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عمرؓ کی رائے اور منشاء کے مطابق اس آیت کا نزول حضرت عمرؓ کی فضیلت و بزرگی کی دلیل ہے لیکن آنحضرتؐ نے جو کچھ کیا تھا غایت شفقت

[۱] صحیح بخاری کتاب التفسیر ج ۲ ص ۶۷۳

علی الخلق اور رحمۃ للعالمینی کے جذبہ سے کیا تھا جو آپ کے مزاج گرامی کی تربیت
کا ایک خاص جوہر تھا اور چونکہ اس وصفِ خاص میں حضرت عمرؓ کو آپ کے ساتھ اس
درجہ قرب و اختصاص نہیں تھا جتنا کہ حضرت ابوبکرؓ کو تھا اس بنا پر حضرت عمرؓ کو آنحضرتؐ
کے اس فعل پر اچنبھا ہوا لیکن صدیق اکبرؓ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

اسی طرح کا ایک موقع صلح حدیبیہ کے واقعہ میں پیش آیا تھا، ابوجندلؓ جن کو
کافروں نے بڑی بے رحمی سے مارا تھا جب انہوں نے صحابۂ کرام کے سامنے آکر
اپنے زخم دکھائے اور کہا کہ کیا آپ لوگ اس حالت میں بھی مجھ کو کفار کو واپس کر دینا چاہتے
ہیں تو پورا مجمع تڑپ اٹھا، حضرت عمرؓ میں برداشت کہاں تھی، آنحضرتؐ کی خدمت میں
حاضر ہو کر بولے کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں، اور اس طرح کے اور سوال و جواب کیے
آخر جب یہاں تسلی نہ ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور گفتگو وہی کی۔ حضرت
ابوبکرؓ نے فرمایا۔

ایھا الرجل انہ رسول اللّٰہ — اے شخص! وہ بے شبہ اللہ کے رسول ہیں
ولیس یعصی ربہ وھو ناصرہ — اور اپنے رب کی نافرمانی نہیں کرتے، خدا ان کی
فاستمسک بغرزہ فواللّٰہ — مدد کرنے والا ہے، پس تم ان کے دامن کو
انہ علی الحق۔ — پکڑ لو، قسم اللہ کی وہ یقیناً حق پر ہیں۔

اب حضرت عمرؓ نے کہا "کیا آپ آنحضرتؐ ہم سے یہ نہیں کہا کرتے تھے کہ ہم جلد
ہی بیت اللہ آئیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "ہاں
کہا تھا لیکن حضورؐ نے کیا یہ بھی فرما دیا ہے کہ تم اسی سال بیت اللہ پہنچو گے" [1]
اسی طرح تم پڑھ آئے ہو کہ آنحضرتؐ کی وفات ہوئی تو اس حادثۂ فاجعہ کی خبر سنتے ہی حضرت
عمرؓ کا کیا حال ہوا تھا لیکن جب ابوبکرؓ نے وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ (الآیۃ) آیت پڑھی تو
حضرت عمرؓ کی یکایک آنکھ کھل گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا اب تک انہوں نے یہ آیت
سنی ہی نہ تھی۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الشروط ج ۱ ص ۳۸۰

ان سب واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کی تعلیم و تربیت کے
سانچہ میں اس طرح ڈھل گئے تھے کہ فکر، ذہن اور مزاج و طبیعت تک میں یگانگت اور
مکمل مماثلت پیدا ہو گئی تھی اور اس بنا پر اداشناسیٔ نبوت میں کسی کو ان کے ساتھ
دعویٰ ہم سری نہیں ہو سکتا تھا۔

آنحضرتؐ کو سب سے زیادہ اعتماد کس پر تھا

یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ کو سب سے زیادہ اعتماد حضرت ابوبکرؓ کی رائے پر تھا۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ
دونوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔

ان اللّٰہ یکرہ فوق سمائہ — اللہ تعالیٰ آسمان پر اس بات کو ناپسند
ان یخطأ ابوبکر [1] — کرتا ہے کہ ابوبکر خطا کریں۔

اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔
عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ آپ
کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ فرمایا "عائشہؓ" پھر دریافت کیا مردوں میں؟
ارشاد ہوا "عائشہ کے باپ" [2]

ایک مرتبہ آنحضرتؐ کی خدمت میں ایک عورت آئی۔ آپ نے فرمایا "پھر آنا"
عورت بولی "اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں تو کیا کروں" آنحضرتؐ نے جواب دیا۔

ان لم تجدینی فأتی ابابکر [3] — اگر تو آئے اور مجھ کو نہ پائے تو ابوبکر کے پاس آ۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔

لا یبقین فی المسجد باب الا سد — مسجد میں جتنے بھی دروازے ہیں ان کو بند
الا باب ابی بکر [4] — کر دیا جائے البتہ باب ابی بکر کھلا رہے۔

ایک دفعہ ارشاد ہوا۔

---

[1] اصابہ ج ۲ ص ۸۳۳ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۷ [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ [4] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۲۲

لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِنْ أُمَّتِي خَلِيلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ وَلٰكِنْ أَخِي وَصَاحِبِي۔ [1]

اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔ لیکن وہ میرا بھائی اور دوست ہے۔

غزوۂ بدر کے بیان میں گذر چکا ہے کہ میدانِ جنگ میں آنحضرت ﷺ کے خیمہ میں آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق ہی تھے اور جب وہ عبدالرحمٰن سے جنگ کرنے کے لئے جانے لگے تو آنحضرت ﷺ نے ان کو روکا اور فرمایا تم ہمیں خیمہ میں رہ کر مجھ کو زیادہ فائدہ پہونچا سکتے ہو یعنی مشورہ وغیرہ کے سلسلہ میں۔

کیا آنحضرت ﷺ نے قولاً و عملاً کسی کے استخلاف کی طرف اشارات کئے ہیں

اگرچہ آنحضرت ﷺ نے کسی کو بھی صراحۃً اپنی جانشینی کیلئے نامزد نہیں فرمایا لیکن اگر آپ کے قول و عمل سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس باب میں آپ کا گوشۂ چشمِ خاطر کس کی جانب تھا تو بے شبہ وہ خوش قسمت ذات اور شخصیت حضرت ابوبکر صدیق کی ہی تھی۔ آنحضرت ﷺ کے دینی مناصب میں سب سے بڑا منصب امامتِ صلوٰۃ تھا جس کو امامتِ صغریٰ بھی کہتے ہیں۔ تم پڑھ آئے ہو کہ آنحضرت ﷺ نے یہ منصب مرض الوفات میں حضرت ابوبکر ہی کو تفویض فرمایا تھا اور وہ بھی کس اصرار کے ساتھ۔ حضرت عائشہ، حضرت حفصہ کے اشارہ پر حضرت ابوبکر صدیق کی رقتِ قلب کا عذر کرتی ہیں اور اپنے باپ کے بجائے حضرت عمر فاروق کا نام تجویز کرتی ہیں۔ لیکن آپ ہیں کہ نہیں مانتے اور کوئی عذر نہیں سنتے۔ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کو صواحب یوسف کہتے ہیں اور پھر اصرار کے ساتھ حضرت ابوبکر کو ہی امامت کرنے کا حکم دیتے ہیں اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ جیسا کہ حضرت عائشہ کی روایت ہے آپ نے یہاں تک فرمایا کہ

لَا يَنْبَغِي لِقَوْمٍ فِيهِمْ أَبُو بَكْرٍ أَنْ يَؤُمَّهُمْ غَيْرُهُ۔ [2]

جس قوم میں ابوبکر ہوں اس کے لئے یہ مناسب نہیں کہ ابوبکر کے علاوہ کوئی اور شخص امامت کرے۔

صحابہ کرام کیلئے صرف یہ ایک اشارہ ہی کافی تھا چنانچہ حضرت علی اور حضرت عمر

[1] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۴ – [2] ایضاً باب المناقب

نے جہاں حضرت ابوبکر صدیق کے استحقاقِ خلافت پر تقریر کی یا اس کا تذکرہ کیا ہے ان کے "اوّل من اسلم" ہونے کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو امامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا تھا۔

امامت صلوٰۃ کے بعد ایک اہم دینی منصب امارتِ حج ہے اور تم پڑھ آئے ہو کہ اس منصب میں بھی آنحضرت ﷺ کی حیات ہی میں آپ کی نیابت و جانشینی کا شرف حضرت ابوبکر صدیق کو ہی حاصل ہوا تھا۔

علاوہ بریں متعدد روایات میں آنحضرت ﷺ نے اشارات قولاً بھی کئے ہیں ایک مرتبہ آپ نے فرمایا "اگر تم ابوبکر کو امیر بناؤ گے تو ان کو امین پاؤ گے" [1] کسی شخص نے حضرت عائشہ سے دریافت کیا کہ اگر آنحضرت ﷺ کسی کو اپنا جانشین نامزد کرتے تو کس کو کرتے؟ فرمایا ابوبکر کو۔ [2]

ایک مرتبہ مرض الوفات میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اللہ کا ایک بندہ ہے جس کو خدا نے اختیار دیا کہ دنیا یا وہ نعمتیں جو اللہ کے پاس ہیں ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرلے تو اس بندہ نے اللہ کی نعمتوں کو اختیار کرلیا" حضرت ابوبکر سمجھ گئے کہ اس بندہ سے مراد خود آنحضرت ﷺ کی اپنی ذات ہے۔ اس لئے بے ساختہ رونے لگے اور عرض کیا "ہم سب کی جانیں اور اولاد آپ پر قربان ہوں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اے ابوبکر ذرا ٹھہرو" اس کے بعد صحابہ سے خطاب کرکے فرمایا "یہ مسجد کے جتنے دروازے ہیں سب بند کردو البتہ ابوبکر کے گھر کا دروازہ کھلا رہنے دو کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میری صحبت میں ان سے زیادہ کوئی افضل ہو"۔ [3]

یہ روایت ابھی اوپر گذر چکی ہے کہ ایک عورت کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا "اگر تم مجھ کو دنیا میں نہ پاؤ تو ابوبکر کے پاس جانا"۔

آنحضرت ﷺ نے مرض الوفات میں ایک مرتبہ یہاں تک ارادہ کیا کہ صاف صاف حضرت ابوبکر کی خلافت کی وصیت لکھ دیں لیکن آپ نے اس ارادہ کو عملی جامہ اس لئے نہیں پہنایا کہ کہیں اس سے نامزدگی کی رسم جاری نہ ہو جائے اور جمہور اپنے

[1] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۳ [2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۳ باب فضائل ابی بکر [3] طبری ج ۳ ص ۴۳۴

حق انتخاب سے محروم ہو جائیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں

قال لی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم	مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری
فی مرضہ ادعی لی ابابکر اباک واخاک	میں فرمایا کہ ذرا ابوبکرؓ اپنے والد اور اپنے بھائی
حتی اکتب کتاباً فانی اخاف ان یتمنی	کو میرے پاس بلا دو۔ تو میں ایک تحریر لکھ دوں
متمن ویقول قائل انا اولی۔ ویابی اللّٰہ	کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا کہنے
والمؤمنون الا ابابکر [1]	والا کہے کہ میں زیادہ بہتر ہوں حالانکہ اللہ اور

مومنوں کے نزدیک ابوبکرؓ کے سوا کوئی دوسرا بہتر نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ جمعرات کے دن (یعنی وفات سے تین دن پہلے) آنحضرتؐ کی درد کی تکلیف شدید ہو گئی۔ فرمایا "میرے پاس آؤ میں تمہارے لیئے ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ پھر کبھی تم گمراہ نہ ہو اور جھگڑا نہ کرو" لوگوں کو تعجب ہوا کہ آج حضورؐ کیسی بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے دوبارہ حاضر ہو کر معلوم کرنا چاہا کہ اصل مطلب حضورؐ کا کیا تھا؟ اب آپؐ نے فرمایا کہ اچھا! اب مجھ کو تم میری حالت میں چھوڑ دو۔ اُس کے بعد آپؐ نے تین باتوں کی وصیت فرمائی۔ ایک یہ کہ مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔ دوسری یہ کہ وفد سے جس طرح کا معاملہ میں کرتا تھا تم بھی وہی معاملہ کرو۔ رہی تیسری وصیت تو وہ آپ نے قصداً بیان نہیں کی یا راوی یعنی عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ میں اس کو بھول گیا ہوں" [2]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت دوسری جگہ ان لفظوں کے ساتھ ہے "جب آنحضرت صلعم کو درد کی تکلیف شدید ہوئی تو ارشاد فرمایا "تم میرے پاس کتاب لاؤ۔ تاکہ میں ایک کتاب لکھ دوں اور تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو۔ عمرؓ نے کہا کہ نبی کریم صلعم پر درد کا غلبہ ہے اور ہم لوگوں کے پاس اللہ کی کتاب ہے جو ہی وہ ہمارے لئے کافی ہے اس پر بڑا اختلاف اور شور و غل ہوا حضورؐ نے فرمایا "اچھا تم یہاں سے ہٹو۔ تم کو میرے سامنے جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

[1] ج ۲ ص ۲۷۳ باب من فضائل ابی بکرؓ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۳۸ باب مرض النبیؐ و وفاتہ

کہ اس وقت حضورؐ کی وصیت کے قلم بند نہ ہونے کا بڑا افسوس ہوا جب کبھی وہ اس روایت کو بیان کرتے تھے اس افسوس کا اظہار کرتے تھے" [1]

اگرچہ ان روایتوں سے یہ ظاہر ہے کہ صحابہ کے اختلاف کے باعث کچھ لکھ لکھانے کا معاملہ اس وقت رفت و گزشت ہو گیا۔ لیکن محدثین نے قیاس آرائیاں کی ہیں کہ آخر وہ چیز کیا تھی جو حضورؐ قلم بند کروانا چاہتے تھے۔ بعض محدثین کا خیال ہے کہ وہ کتاب الاحکام کی کوئی چیز ہوگی۔ اور بعضوں کے نزدیک آپ خلافت کے بارہ میں وصیت کرنا اور خلفاء کے اسماء گرامی لکھنا چاہتے تھے [2]

ہمارے نزدیک مذکورۂ بالا دوسرا خیال زیادہ قرین قیاس ہے اور اغلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کی ہی وصیت فرمانا چاہتے تھے چنانچہ صحیح مسلم کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کی جو روایت تم ابھی پڑھ آئے ہو اس سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے یہ روایت صحیح بخاری میں بھی ہے [3] لیکن چونکہ راوی کو الفاظ میں شک پیدا ہو گیا ہے اس لئے روایت کے ساتھ ساتھ اپنا شک بھی ظاہر کرتا گیا ہے۔ بہرحال شروع کے الفاظ جو آنحضرتؐ نے حضرت عائشہؓ کو خطاب کر کے ارشاد فرمائے یہ ہیں۔

لقد هممت او اردت ان ارسل	میں نے ضرور ارادہ کیا تھا کہ ابوبکرؓ اور ان کے بیٹے کو بلوا
الی ابی بکر وابنہ واعہد	بھیجوں اور خلافت کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دوں

بہرحال صحیحین کی اس روایت کی روشنی میں قرین قیاس یہی ہے کہ آنحضرتؐ مرض الوفات میں حضرت ابوبکرؓ کیلئے خلافت کی وصیت لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن صحابہ کرامؓ میں جو اس وقت موجود تھے اس پر اختلاف ہو گیا کہ ایسے وقت میں جبکہ آپ کو درد کی شدید تکلیف تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں نے درد کی ایسی شدید تکلیف

[1] باب کتابۃ العلم ج ۱ ص ۲۲ [2] فتح الباری جلد اوّل ص ۱۸۶ [3] جلد دوم ص ۸۴۶ کتاب المرضیٰ مطبوعہ دہلی شریف

کسی شخص کو بھی نہیں دیکھی [1] آپ کو لکھنے لکھانے کی زحمت دی جائے یا نہیں۔ اس بنا پر آنحضرت صلعم نے یہ ارادہ ہی ترک کر دیا۔

حدیث قرطاس پر بحث

صحیح بخاری کی یہ روایت جو اوپر گزری حدیث قرطاس کہلاتی ہے۔ مولانا شبلی نے الفاروق میں اس پر بحث کر کے ثابت کرنا چاہا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مولانا کے دلائل نہایت کمزور ہیں اور ان سے ہرگز ان کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

مولانا کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

(۱) آنحضرت صلعم کم و بیش ۱۳ دن تک بیمار رہے۔

(۲) کاغذ و قلم طلب کرنے کا واقعہ جمعرات کے دن کا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں تصریح مذکور ہے اور چونکہ آنحضرت صلعم نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا اسلئے واقعہ کے بعد آنحضرت صلعم چار دن تک زندہ رہے۔

(۳) اس تمام مدتِ بیماری میں آنحضرت صلعم کی نسبت اور کوئی واقعہ اختلالِ حواس کا کسی روایت میں کہیں مذکور نہیں ہے۔

(۴) اس واقعہ کے وقت کثرت سے صحابہ موجود تھے۔ لیکن یہ حدیث باوجود اس کے کہ بہت سے طریقوں سے مروی ہے باایں ہمہ بجز عبداللہ بن عباس کے اور کسی صحابی سے اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں۔

(۵) عبداللہ ابن عباس کی عمر اس وقت ۱۳-۱۴ برس کی تھی۔

(۶) سب سے بڑھ کر یہ کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس موقع پر عبداللہ بن عباس خود موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انہوں نے کس سے سنا۔

(۷) تمام روایتوں میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلعم نے جب کاغذ و قلم مانگا تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ بہکی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔ [2]

اب ان دلائل کی حقیقت کیا ہے وہ سنئے!

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۳۸ [2] الفاروق مطبوعہ ثمر المطابع لکھنؤ حصہ اوّل ص ۴۹-۵۰

(۱) نمبر ایک سے لیکر تین تک اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ مولانا نے "ھجر" کے معنی ہذیان کے مراد لے رکھے ہیں اس سے قطعاً بحث نہیں کہ پیغمبر کو ہذیان ہو سکتا ہے یا نہیں چنانچہ "ھجر" کے معنی انوکھی سی بات کہنے کے ہیں اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے بیماری میں قلم کاغذ لانے کے متعلق اچانک جس انداز سے فرمایا صحابہ لوگ اس پر سخت حیرت و استعجاب دو وجہوں سے ہوا ایک یہ کہ ان کو یہ خیال ہوا کہ کہیں خدانخواستہ حضور ہم سے جدا تو نہیں ہو رہے ہیں اور دوسری یہ کہ جب قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ دونوں ان کے پاس ہیں تو پھر اب "آنحضرت صلعم کے بعد ان کے گمراہ ہونے کا کیا مطلب ہے۔ حضرت عمر ہوں یا کوئی اور جس کسی نے بھی ھجر کہا ہے اس سے اسی درد آمیز حیرت و تعجب کا اظہار کیا ہے چنانچہ ہم نے اوپر حدیث کا جو ترجمہ لکھا ہے اس میں ھجر کا ترجمہ "حضور کیسی باتیں کر رہے ہیں" کیا ہے۔

(۲) نمبر (۴) کی بھی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ایک واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے ہزاروں ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود واقعہ کی روایت "جو نمایاں شخصیت کے مالک ہوتے ہیں" انہیں کے حوالہ سے کی جاتی ہے۔ پھر اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چونکہ مولانا شبلی کے بقول اس وقت صحابہ کثرت سے موجود تھے، اس بنا پر اگر عبداللہ بن عباس کی روایت خلافِ واقعہ ہوتی تو ضرور دوسرے صحابہ اس کی تردید کرتے۔ ان کا خاموش رہنا اس کی دلیل ہے کہ وہ روایت کو صحیح مانتے تھے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس کی عمر ۱۳-۱۴ سال ضرور تھی لیکن وہ عاقل بالغ تھے چنانچہ خود ان کا بیان ہے "قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا ختین" اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ کوئی شخص ختین اسی وقت کہلاتا تھا جبکہ وہ بالغ ہو لے۔ [1]

(۴) مولانا کا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ عبداللہ بن عباس خود اس واقعہ کے وقت نہیں تھے۔ اس کے ثبوت میں حاشیہ میں فتح الباری کے حوالہ سے صرف اتنا

---

[1] الاصابہ جلد دوم ص ۳۲۲ مطبع مصطفیٰ محمد مصر

لکھتے ہیں کہ محدثین نے بدلائل قطعیہ ثابت کیا ہے کہ وہ (عبداللہ بن عباس) موجود نہ تھے اس موقعہ پر مولانا کو عجیب مغالطہ پیش آیا ہے جس کو وہ دلائل قطعیہ فرماتے ہیں اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ حدیث کا ایک ٹکڑا فخرج ابن عباس یقول ان الرزیۃ کل الرزیۃ بھی ہے اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عباس واقعہ مذکورہ کے بعد آنحضرت صلعم کے مکان سے نکلے تو اس وقت ان الرزیۃ کل الرزیۃ کہتے ہوئے نکلے اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ عبیداللہ بن عبداللہ جو کہ حضرت عبداللہ بن عباس سے اس روایت کے راوی ہیں وہ تو اس واقعہ کے وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے پھر انہوں نے کیسے دیکھا کہ عبداللہ بن عباس یہ کہتے ہوئے نکلے تھے۔ اس کے جواب میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر نہیں ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے عرصہ بعد جب عبداللہ بن عباس نے عبیداللہ سے یہ روایت بیان کی تو اس کے بعد عبداللہ بن عباس کے دل میں اس واقعہ کا صدمہ تازہ ہو گیا اور اس بنا پر وہ "ان الرزیۃ کل الرزیۃ" کہتے ہوئے چلے گئے[1] بس بات اتنی تھی جس کو مولانا نے کیا سے کیا سمجھ لیا۔ حافظ ابن حجر کے اس بیان سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اصل واقعہ کے وقت خود عبداللہ بن عباس موجود ہی نہ تھے۔

اچھا! اگر بالفرض یہ ثابت بھی ہو جائے کہ حضرت عبداللہ بن عباس واقعہ کے وقت موجود نہ تھے تو اس سے روایت کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ کیونکہ اس صورت میں یہ روایت مرسل ہو گی اور باتفاق محدثین مراسیل صحابہ مقبول و معتبر ہیں۔

(۵) مولانا نے (۷) میں پھر وہی ہذیان والی بات دہرائی ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ہذیان کا یہاں کوئی ذکر مذکور ہی نہیں۔

مولانا اس روایت کو حضرت عمرؓ کی شان کے خلاف بتاتے ہیں حالانکہ محدثین لکھتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت عمرؓ کی کتاب فضائل کا ایک روشن باب ہے اس میں کچھ شبہ نہیں کہ آپ جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے وہ منصب نبوت کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس واقعہ کے بعد بھی آپ تین

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۷

روز تک عالم ناسوت میں رہے۔ اگر منصب نبوت کی کوئی چیز ہوتی تو ضرور لکھواتے یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ کے حکم آپ اس پر مامور تھے حضرت عمرؓ نے اس کو محسوس کر لیا تھا اس بنا پر آنحضرت صلعم کے ساتھ غایت محبت و عشق اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلعم کی موجودگی میں اپنے اور دوسرے صحابہ پر یہ اعتماد کہ وہ راہ سے بے راہ نہیں ہوں گے، ان وجوہ سے انہوں نے خیال کیا کہ حضور کو اس وقت درد کی شدید تکلیف ہے۔ اس حالت میں آپ کو لکھنے لکھانے کی کیوں تکلیف دی جائے۔

حدیث قرطاس کی یہ بحث ضمناً آ گئی۔ بہرحال سطور بالا سے ثابت ہے کہ اگرچہ آنحضرت صلعم نے اپنی جانشینی سے متعلق کسی خاص شخص کے نام کی تصریح نہیں کی لیکن آپ کا گوشۂ چشم التفات اور رجحان قلبی حضرت ابوبکرؓ کی ہی طرف تھا۔

حضرت ابوبکرؓ خود اس راز سے آگاہ تھے اسی وجہ سے اس منصب جلیل کا بار عظیم اٹھانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ ورنہ وہ جس طبیعت کے انسان تھے ہرگز اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک قاصد محمد بن الزبیر کی معرفت حضرت حسن بصری سے سوال کیا کہ کیا آنحضرت صلعم نے حضرت ابوبکر کو خلافت کیلئے نامزد کیا تھا؟ حسن بصری یہ سوال سنتے ہی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا "خدا کی قسم آنحضرت صلعم نے حضرت ابوبکر کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ورنہ وہ اس درجہ کے متقی اور اللہ کو جاننے والے تھے کہ ان کو اگر حکم نہ ہوتا تو وہ ہرگز مسلمانوں پر چھلانگ نہ لگاتے" (یعنی جھٹ خلیفہ نہ بن جاتے)[1]

صحابہ کرام میں حضرت ابوبکر کا مرتبہ و مقام

اس سلسلہ میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں تمام صحابہ کرام حضرت ابوبکر کے مرتبہ و مقام سے اچھی طرح باخبر تھے اور اسی کے مطابق آپ کا ادب و احترام کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر کا بیان ہے کہ ہم آنحضرت صلعم کے عہد میں آپس میں ایک دوسرے کے مدارج و مراتب متعین کرتے تھے تو حضرت ابوبکر کو سب سے بہتر سمجھتے تھے[2] ایک موقع پر آنحضرت صلعم نے اپنی وفات

[1] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۲ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ باب فضل ابی بکر بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے قریب آجانے کا اشارہ استعارہ کے پیرایہ میں کیا صحابہ میں سے کسی کا ذہن ادھر منتقل نہیں ہوا حضرت ابوبکر فوراً سمجھ گئے اور رونے لگے صحابہ کو حیرت ہوئی کہ اس میں رونے کی کونسی بات تھی۔ آخر جب ان کو بھی اصل حقیقت کا علم ہوا تو صاف لفظوں میں اعتراف کیا کہ وکان ابوبکر ھو اعلمنا۔ [۱]

دربارِ نبوت کے شاعرِ خاص حضرت حسان بن ثابت کہتے ہیں۔

وثانی اثنین فی الغار المنیف وقد	طاف العدو بہ اذ صعد الجبلا
اور مبارک غار کے رفیق ہیں اور جب وہ پہاڑ	(دھا) پر چڑھے تو دشمن نے ان کو گھیر لیا
وکان حب رسول اللہ قد علموا	من البریۃ لم یعدل بہ رجلا
اور رسول اللہ کے محبوب ہیں سب لوگ جانتے	ہیں کہ پوری دنیا میں ان کی برابر کسی آدمی نہیں ہے

آنحضرت صلعم نے یہ اشعار سنتے تو تبسم فرمایا جس سے دندانِ مبارک نظر آنے لگے اور ارشاد مبارک ہوا "اے حسان! تم نے سچ کہا وہ (ابوبکرؓ) ایسے ہی ہیں۔" [۲]

ہم نے حضرت ابوبکرؓ کے براہ راست خلیفۃ الرسول ہونے کے استحقاق پر بحث کرنے کیلئے جو سات معیار مقرر کئے تھے ان میں سے چھ کا ذکر ہوچکا اور ان سے ثابت ہوگیا کہ اس معیار پر صدیق اکبرؓ ہی پورے اترتے ہیں اور اس بنا پر کوئی شک نہیں کہ وہ ہی اس مرتبہ و مقام بلند کے مستحق تھے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ حضرت ابوبکرؓ کے کارنامہائے خلافت سے اس کی تصدیق کہاں تک ہوتی ہے کہ وہ ہی تمام صحابہ میں اعزاز کے ساتھ اولین مستحق تھے اس کا جواب آئندہ صفحات میں ملے گا۔

---

[۱] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ باب فضل ابی بکر بعد النبی صلعم۔ [۲] ابن سعد تذکرہ ابی بکر۔

کارنامہائے خلافت

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جس وقت عنانِ خلافت ہاتھ میں لی یہ مسلمانوں کے لیے ایک نہایت ہی نازک اور بڑا صبر آزما وقت تھا۔ سب سے بڑا زخم جو ان کے قلب و جگر پر لگا تھا آنحضرت صلعم کا حادثۂ وفات تھا جس نے دنیا ان کی نگاہوں میں تیرہ و تار کر دی تھی خود مدینہ میں منافقوں کا ایسا گروہ موجود تھا جو فتنہ انگیزی کے لیے موقع و بہانہ کی تلاش میں بیٹھا رہتا تھا جھوٹے مدعیانِ نبوت اور مرتدین عن الاسلام کے فتنہ نے خود آنحضرت صلعم کی زندگی میں سر اٹھانا شروع کر دیا تھا اب وہ اس ایک چنگاری کو ہوا دیکر جہنم بنا دینے کا خواب دیکھنے لگے تھے بعض قبیلوں کو مدینہ کی سیادت کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی تھی وہ کل پرزے درست کرنے کی فکر کرنے لگے تھے۔ غرضیکہ دقتوں اور دشواریوں کا ایک پہاڑ تھا جو خلیفۂ رسول اللہ صلعم کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد ہی ہم مسلمانوں کو ایسے حالات سے سابقہ پڑا کہ اگر اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ ہم کو عطا فرما کر ہم پر احسان نہ کرتا تو ہم ہلاک ہو جاتے [۱]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

"رسول اللہ صلعم کی وفات ہوئی اور میرے باپ پر حوادث و مصائب ٹوٹ پڑے کہ اگر بڑے بڑے مضبوط پہاڑوں پر بھی نازل ہوتے تو ان کو ریزہ ریزہ کر دیتے۔ ایک طرف مدینہ میں نفاق گھسا ہوا تھا اور دوسری جانب عرب مرتد ہونے لگے تھے۔" [۲]

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۰۱ [۲] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۰۳

ان سب اندرونی و بیرونی دشواریوں کے باوجود ایک اہم معاملہ یہ درپیش تھا کہ جیسا کہ گذر چکا ہے آنحضرت ﷺ نے اپنی حیات ہی میں اسامہ بن زید کی سرکردگی میں شام کی طرف ایک لشکر روانہ کیا تھا جو ابھی مقام جرف میں پہونچا تھا کہ حضور کی شدید علالت کی خبر پہونچی اور وہ وہیں ٹھہر گیا۔ یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا۔

صحابہ کرام اور حضرت ابوبکر کی گفتگو اب سوال یہ تھا کہ اس لشکر کو جس مہم پر بھیجا گیا تھا اس پر اسے جانے دیا جائے یا پہلے مرتدین کی سرکوبی کی جائے۔ جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی صحابہ کرام اس سے گھبرائے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ لے دے کے اب یہی مسلمان ہیں جو آپ کے سامنے ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ عرب کا کیا حال ہے وہ آپ سے ٹوٹتے جا رہے ہیں اس لیے مناسب نہیں ہے کہ آپ اس وقت مسلمانوں کو الگ الگ کریں [1] لیکن وہ جو خلیفۂ رسول تھا۔ وقت کے دریا میں اُن اُبھرنے والی امواج حوادث سے کہیں سراسیمہ ہو سکتا تھا۔ اس کے سامنے سب سے پہلا کام جو کرنے کا تھا اور ضروری تھا یہی ہو سکتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جو مہم روانہ فرما گئے تھے وہ تکمیل کو پہنچے اور ادھوری نہ رہے۔ حضرت ابوبکر نے جواب دیا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر مدینہ اس طرح خالی ہو جائے کہ میں ہی اکیلا رہ جاؤں اور درندے اور کتے مجھ کو بھنبھوڑ کھائیں میں اس وقت بھی اسامہ کو آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق اس مہم پر روانہ کردوں گا۔" [2]

خلیفۂ رسول کا یہ قطعی فیصلہ معلوم ہو جانے کے بعد حضرت عمر نے انصار کی نمائندگی کرتے ہوئے عرض کیا کہ اس لشکر میں سن رسیدہ اور تجربہ کار صحابہ شامل ہیں اور اسامہ نوجوان ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ امیر لشکر کسی معمر آدمی کو بنا دیجئے۔ حضرت ابوبکر یہ سنتے ہی غصہ میں قابو سے باہر ہو گئے اور فرمایا "اے خطاب کے بیٹے! رسول اللہ ﷺ نے اسامہ کو امیر لشکر مقرر فرمایا اور اب تم کہتے ہو کہ ان کو معزول کردوں" حضرت عمر یہ سن کر واپس گئے اور لوگوں کو برا بھلا کہا کہ ان کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی

[1] ابن جریر طبری ج ۳ ص ۲۱۳ — [2] طبری ج ۳ ص ۲۶۱ و تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۱۷

سے سخت سست سننا پڑا۔ [1]

جیش اسامہ کی روانگی بہر حال حضرت ابوبکر نے اعلان عام کر دیا کہ جیش اسامہ میں جانے کے لئے جو لوگ نامزد کئے گئے تھے ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے۔ سب مقام جرف میں پہونچ جائیں اور خود وہاں پہونچ کر لشکر کو روانگی کا حکم دیا۔ لشکر روانہ ہوا تو پیادہ پا اس کی مشایعت کو چلے۔ حضرت اسامہ جو گھوڑے پر سوار تھے بولے "یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں ورنہ میں بھی پیادہ ہوا جاتا ہوں" فرمایا "تم کو خدا کی قسم جو اُترو۔ اور میں بھی ہرگز سوار نہیں ہوں گا۔ کیا ہوا اگر اللہ کی راہ میں کچھ دیر کے لئے میرے پاؤں غبار آلود ہو گئے۔ غازی کے ہر قدم کے عوض سات سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں" اس کے بعد حضرت اسامہ سے فرمایا "اگر تم نامناسب نہ سمجھو تو عمر کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ مجھ کو ان کے مشورہ کی ضرورت ہوگی" حضرت اسامہ اس پر بخوشی رضامند ہو گئے۔ اب حضرت ابوبکر نے لشکر کو روک کر نہایت قیمتی ہدایات دیں جن کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔ اور لشکر روانہ ہو گیا [2]

مہم کی اہمیت اس مہم کی اہمیت خاص طور پر اس وجہ سے تھی کہ جیسا کہ غزوۂ موتہ کے بیان میں گزر چکا ہے عرب و شام کی سرحد کے ایک رئیس شرحبیل بن عمرو نے آنحضرت ﷺ کے قاصد حارث بن عمیر کو قتل کر دیا تھا اور آنحضرت ﷺ نے ان کا انتقام لینے کی غرض سے زید بن حارثہ کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی تھی۔ لیکن اس فوج کو شدید نقصان پہونچا۔ حضرت زید بن حارثہ اور ان کے بعد یکے بعد دیگرے ان کے قائم مقام سب شہید ہو گئے اور فوج واپس ہو گئی۔ اسلامی لشکر کے اس حادثہ نے عرب و شام کی سرحدوں کے رؤسا و قبائل کو جو عیسائی تھے اس قدر جسارت دلا دی تھی کہ یہ لوگ اب مدینہ پر حملہ کرنے کا خواب دیکھنے لگے تھے اور خود مدینہ میں ان لوگوں کے حملہ کا اندیشہ اس قدر عام ہو گیا تھا کہ ایک مرتبہ (ایلا کے واقعہ میں) عتبان بن مالک نے حضرت عمر فاروق سے دفعتاً آکر کہا تھا کہ "غضب ہو گیا" تو حضرت عمر نے گھبرا کر پوچھا آخر تو ہوا کیا

[1] طبری ج ۳ ص ۲۶۲ [2] ایضاً [3] صدیق اکبر ص ۵۰

عیسائی آسکے" [1]

آنحضرت ؐ غزوۂ تبوک کے نام سے جو مہم لیکر گئے تھے۔ اہی دشمن اسلام قبائل کی سرکوبی کرنے اور حضرت زید بن حارثہ وغیرہ کا انتقام لینے کی غرض سے گئے تھے لیکن حالات ایسے پیش آگئے کہ آپ تبوک سے ہی پلٹ آئے۔ بہرحال ان قبائل کا زور توڑنا ضروری تھا اور آپ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس میں جتنی دیر ہوگی ان لوگوں کا حوصلہ بڑھیگا اسی بنا پر آپ نے اپنی ناسازی طبع کے باوجود حضرت اسامہؓ کی سرکردگی میں یہ لشکر روانہ کر دیا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ جیش اسامہ کی اس اہمیت اور آنحضرت ؐ کا جو مقصد تھا اس سے پوری طرح باخبر تھے اسی وجہ سے آپ نے جب لشکر کو الوداع کہا تو اور باتوں کے ساتھ امیر لشکر کو اس کی بھی تاکید کی کہ "رسول اللہؐ نے تم کو جیسا حکم دیا تھا ویسا ہی کرنا اور وہاں دیکھو اس کی تعمیل میں ذرہ برابر کوئی کوتاہی نہ ہو" [2]

آنحضرت ؐ کا حکم کیا تھا؟ آپ نے فرمایا تھا۔

ان یوطئ الخیل تخوم البلقاء والداروم من ارض فلسطین — فلسطین کی سرزمین میں بلقا اور داروم کے جو علاقے ہیں اسلامی لشکر ان کو پامال کر کے آئے

ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں۔

ولمرہ ان یوطئ من آبل الزیت من مشارق الشام الارض بالاردن۔ — اردن کی زمین جو شام کی سرحدوں میں ابل الزیت کے علاقہ میں ہے اس کو پامال کریں۔

چنانچہ اب لشکر جو تین ہزار مہاجرین وانصار پر مشتمل تھا جن میں سے ایک ہزار سوار فوج تھی روانہ ہوا (آنحضرت ؐ کی وفات کے انیس دن بعد) مدینہ کے شمال میں جہاں قبائل قضاعہ رہتے تھے وہاں پہونچا۔ یہاں سے روانہ ہو کر جب وادی القریٰ پہونچا تو حضرت اسامہؓ نے پہلے سے دو جاسوس روانہ کر دئے۔ یہ جاسوس حالات کی تحقیقات کر کے واپس ہوتے ہوئے ابنیٰ تک جو وادی القریٰ سے دو دن

[1] صحیح بخاری واقعہ ایلاء [2] طبری ج ۲ ص ۴۶۲ و ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۲

کی مسافت پر ہے۔ پہونچے ہی تھے کہ اسامہؓ بھی مع فوج کے پہونچ گئے۔ جاسوسوں نے حالات امید افزا بیان کئے تو حضرت اسامہ نے فوراً حملہ کی تیاری کرنے کا حکم دیا اور اس وقت فوج کو خطاب کر کے فرمایا۔

حضرت اسامہ کا فوج کو خطاب

"اے مجاہدین اسلام! حملہ کیلئے تیار ہو جاؤ۔ دشمن اگر بھاگ پڑے تو اس کا پیچھا نہ کرنا۔ آپس میں متحد و متفق رہو۔ ہلکی آواز سے بولو۔ اللہ کو اپنے دلوں میں یاد کرو۔ اور تلواریں جب ایک مرتبہ نیام سے باہر نکال لو تو پھر جب تک تم اپنے دشمنوں کا جو تم پر ہتھیار اٹھائے ہوئے ہوں سر قلم نہ کردو۔ ان تلواروں کو نیام میں مت رکھو۔"

اس تقریر کے بعد حملہ شروع ہوا۔ دشمن مقاومت نہ کر سکا۔ اور مسلمانوں کی فتح کا اعلان ہو گیا۔ اس وقت حضرت اسامہ سبحہ نامی اسی گھوڑے پر سوار تھے جس پر ان کے والد حضرت زید بن حارثہ شہادت کے وقت سوار تھے چند مقامی لوگوں نے اس شخص کی بھی نشاندہی کی جس نے حضرت زید کو قتل کیا تھا۔ اسے امیر لشکر کے سامنے لایا گیا تو اس کے حکم سے اس شخص کی گردن اڑا دی گئی اور اس طرح موتہ کا انتقام آج پورا ہوا۔

مقام ابنیٰ میں ایک دن قیام کر کے حضرت اسامہ نے مال غنیمت اہل لشکر میں شرعی طور پر تقسیم کر دیا۔ اور دوسرے دن یہاں سے روانہ ہو کر وادی القریٰ ہوتے ہوئے بخیریت و عافیت مدینہ پہونچ گئے اس پوری مہم میں ایک مسلمان کا بھی جانی نقصان نہیں ہوا حضرت اسامہ نے وادی القریٰ پہونچکر مہم کی کامیابی اور اپنی واپسی کی اطلاع دربار خلافت کو کر دی۔ اس خبر سے مدینہ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جب لشکر مدینہ میں داخل ہوا ہے تو حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے صحابہ کے علاوہ خواتین تک ان کے استقبال کیلئے موجود تھیں حضرت اسامہ مدینہ میں داخل ہوئے تو اس شان سے کہ اپنے باپ زید بن حارثہ کے گھوڑے پر سوار تھے اور ان کے آگے آگے حضرت بریدہ پرچم اٹھائے چل رہے تھے یاد ہوگا کہ یہ وہی پرچم تھا جو آنحضرت ؐ نے وفات سے چند روز پہلے اسامہ کو سپرد کیا تھا۔

جس کے متعلق جیش اسامہ کی روانگی کے مخالفوں کو جواب دیتے ہوئے حضرت ابوبکر نے کہا تھا کہ جس پرچم کو رسول اللہ ﷺ نے کھولا تھا میں اسے کس طرح لپیٹ کر رکھدوں

اس منظر نے سب کو بیقرار کر دیا لیکن کون بتا سکتا ہے کہ اس وقت اپنے محبوب آقا و مولا کی آخری خواہش کو اس طرح اپنے ہاتھوں مکمل دیکھ کر خود صدیق اکبر کے قلب و جگر پر کیا کیفیت گزری تھی بخوشی میں حضرت ابوہریرہ کا یہ حال ہوا کہ تین مرتبہ انکی زبان سے نکل گیا کہ لا الٰہ الا ھو — اگر ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی پوجا نہ ہوتی [1]

مہم کا نتیجہ اور فائدہ

سیاسی اعتبار سے اس مہم کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قیصر روم پر جو اس وقت حمص میں تھا اس قدر اثر ہوا کہ اس نے ملک کے بطارقہ (بشپ پادری) کو جمع کیا اور کہا "دیکھو یہ وہی لوگ ہیں جن سے میں تم کو خبردار کرتا تھا لیکن تم نہیں مانتے تھے تم ان عربوں کی ہمت و جرأت دیکھتے ہو ایک مہینہ کی مسافت پر آکر تم پر چھاپہ مارتے ہیں اور صحیح سلامت اسی وقت واپس بھی چلے جاتے ہیں [2] اس کے علاوہ عرب و شام کی سرحد پر جو قبائل آباد تھے اور جو آنحضرت ﷺ کی وفات کی خبر سن کر ہی علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ تھے ان کو یقین ہو گیا کہ اگر مدینہ میں مسلمانوں کی جمعیت بڑی مضبوط نہ ہوتی تو ان حالات میں یہ لشکر ہرگز مدینہ سے اتنی دور دراز مسافت پر نہیں بھیجا جا سکتا تھا اس خیال نے ان کے دلوں پر مسلمانوں کی قوت کی دھاک بٹھا دی اور وہ مرعوب ہو گئے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار ڈبلیو وٹ منٹگمری لکھتا ہے کہ۔

پیغمبر اسلام نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ جب تک شام کی طرف مہمیں روانہ نہیں کی جائیں گی عرب قبائل پر امن نہیں رہ سکتے۔ ابوبکر اس کی سیاسی اہمیت سے واقف تھے۔ اسی وجہ سے باوجود شدید مخالفت اور سخت خطرات کے انہوں نے اسامہ کی زیر قیادت ایک بڑا لشکر شام روانہ کیا تھا۔" [3]

ایک بحث

عام طور پر مورخین لکھتے ہیں کہ اس مہم کی تکمیل میں چالیس دن صرف ہوئے

[1] جزئی طور پر یہ واقعہ تمام تاریخوں میں مذکور ہے لیکن ہم نے یہ تمام تفصیلات تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۲ تا ۱۲۴ سے لی ہیں۔ [2] ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۳ [3] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جدید ایڈیشن ج ۱ ص ۱۱۰

بلکہ ابن عساکر نے تو ۳۵ دن کی بھی ایک روایت نقل کی ہے۔ لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں اور اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) حضرت اسامہ نے جو کارروائی کی اس کا دائرہ بلقا تک جو شام کے جنوب غرب میں واقع ہے وسیع تھا اور مدینہ سے یہاں تک کی مسافت کسی حالت میں چھ سو ساڑھے پانچ سو میل سے کم نہیں ہے۔

(۲) جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ ہرقل نے اس مہم کی خبر سن کر بطارقہ سے کہا کہ دیکھو یہ لوگ (عرب) ایک مہینہ کی مسافت پر آکر چھاپہ مار گئے۔ ہرقل کے اس قول کے بموجب آنے جانے میں کم از کم دو ماہ لگنے چاہئیں۔

(۳) یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر نے یہ مہم ماہ ربیع الاول ۱۱ھ کے آخر میں روانہ کی تھی [1]

(۴) پھر یہ بھی ثابت ہے کہ طلیحہ کے اکسانے پر چند قبائل نے جن کا ذکر آگے آئے گا مدینہ کا جو محاصرہ کیا اور وہاں لوٹ مار مچائی تھی۔ یہ واقعہ ماہ جمادی الاخری میں پیش آیا تھا۔ اور اس وقت تک حضرت اسامہ یقیناً واپس نہیں آئے تھے۔ کیونکہ ان قبیلوں کا یہ حوصلہ ہوا ہی اس لئے تھا کہ ان کے وفد نے مدینہ سے واپس ہو کر ان کو اطلاع دی تھی کہ مسلمانوں کی تعداد مدینہ میں کم اور ان کی دفاعی طاقت کمزور ہے [2] اس کے علاوہ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے تصریح بھی کی ہے کہ حضرت اسامہ اس واقعہ کے بعد آئے تھے۔

ثم قدم اسامة بن زيد بعد ذالك بليال [3]	اس واقعہ (اعراب) کے چند روز بعد اسامہ واپس آئے۔

ماہ جمادی الاخری جو البدایۃ والنہایۃ میں مذکور ہے اس سے اگر شروع ماہ بھی مانا جائے تو ربیع الثانی اور جمادی الاول پورے دو مہینے پھر بھی ہو جاتے ہیں۔

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۰۵ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۴ [3] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۰۴

ابن کثیر نے چالیس دن کی روایت نقل کرکے ایک قول ستر (۷۰) کا بھی نقل کیا ہے [1] ہمارے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح اقرب الی القبول ہے۔ اس کی تائید طبری کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

وکان فراغه فی اربعین	اور اسامہ کی فراغت چالیس دن میں ہوئی
یوماً سوی مقامه و	تھی اور یہ دن اُن کے قیام اور واپسی کے دنوں
منقلبه راجعاً [2]	کے علاوہ ہیں۔

چنانچہ اسلامیات کے فاضل اور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس لشکر کی مدت واپسی ستر دن ہی لکھی ہے [3]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۰۴ [2] طبری ج ۳ ص ۲۶۳
[3] رسول اکرم کی سیاسی زندگی ص ۲۷۹ مطبوعہ ادارہ اسلامیات لاہور

ارتداد و بغاوت اور اسکے اسباب

آنحضرت صلعم کا دنیا سے رخصت ہونا تھا کہ باشثنائے مکہ و مدینہ پورے عرب میں یکایک ارتداد و بغاوت کا طوفان اس زور شور سے اٹھا کہ اسلام کی عمارت کے در و دیوار ہل گئے اور صحابۂ کرام اس میں محصور ہو کر رہ گئے۔ ایک راوی کے بیان کے مطابق مسلمانوں کی اس وقت حالت اس بکری جیسی تھی جو کہ موسم سرما کی بارش والی رات میں کھڑی ہو [1]

بعض یورپین مصنفین نے عرب قبائل کی اس شورش و بغاوت سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اسلام بزور شمشیر اور جبر پھیلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے باعث اسلام کی طاقت میں کچھ ضعف پیدا ہوا تھا کہ عرب نے علم بغاوت بلند کر دیا اور حضرت ابوبکر نے پھر ان کو تلوار کے زور سے اسلام میں داخل کر لیا۔ [2] اس اعتراض سے قطع نظر تاریخ کے ایک طالب علم کو یہ خیال ضرور ہو سکتا ہے کہ آخر اسلام جو ایک دین حق اور مذہب فطرت ہے اس کا یہ نشہ کیسا تھا کہ چڑھا اور فوراً ہی اُتر گیا۔ اس خیال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مؤرخ اس فتنہ کو عام طور پر فتنۂ ارتداد کے لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں اور ہم نے ان کی پیروی میں "ارتداد" کا ہی لفظ لکھا ہے لیکن حق یہ ہے کہ یہ اصطلاحی معنی کے اعتبار سے ارتداد نہیں تھا۔ اور جو لوگ مسلمانوں کے خلاف معرکہ آرا ہوئے وہ زیادہ تر وہی لوگ تھے جنہوں نے اگرچہ اسلام کو کسی طریقہ پر کسی لالچ یا دباؤ سے قبول کر لیا تھا مگر قرآن کے لفظوں میں اسلام اُن کے حلق سے نیچے نہیں اترا تھا۔ اسی بنا پر بعض مستشرقین تو ان لوگوں

---

[1] طبری ج ۳ ص ۴۶۱ [2] تاریخ الاسلام السیاسی ص ۲۶۹

کو سرے سے مسلمان ہی نہیں مانتے اور ان کی بغاوت کو سیاسی بغاوت کہتے ہیں

مستشرقین کی رائے | پروفیسر فلپ ہٹی لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ وسائل آمد و رفت کی کمی مبلغین کی باقاعدہ تنظیم کا فقدان اور قلت وقت آنحضرتؐ اور صحابہ سنہ ۹ھ تک غزوات اور اپنی اندرونی تنظیم میں ہی معروف رہے، مبلغین کو بیرون مدینہ بھیجنے کا وقت کم ملا) یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے پیغمبر اسلام کی زندگی میں جزیرہ نمائے عرب کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی مسلمان نہیں ہو سکی تھی خود حجاز جو پیغمبر اسلام کی سرگرمیوں کا اصل میدان تھا اس کا حال یہ تھا کہ آپ کی وفات سے ایک یا دو سال پہلے مکمل طور پر مسلمان ہوا تھا جو وفد پیغمبر اسلام کی خدمت میں آتے تھے ظاہر ہے ان کو پورے عرب کا ترجمان نہیں کہا جا سکتا۔ اور کسی وفد کے مسلمان ہو جانے کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ ایک قبیلہ کے سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔" ۱؎

یورپین مصنفین میں سے مسٹر جے ولہاسن (J. WELLHAUSEN) اور پروفیسر کیتانی (L. CAETANI) کی رائے یہ ہے کہ جو کچھ ہوا سر تا سر سیاسی بغاوت تھی اور مذہب کے ساتھ اس کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ۲؎

وفات نبوی کے وقت عرب قبائل دو گروہ | اصل یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے وقت راسخ العقیدہ مسلمانوں کے علاوہ جو حجاز اور طائف میں آباد تھے ۳؎

۱؎ ہسٹری آف دی عربس ص ۱۴۱ ۲؎ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جدید اڈیشن ج ۱ ص ۱۱۰ ۳؎ مکہ مدینہ اور طائف کے جو قبیلے اس کے علاوہ قریش کے اسلام پر ثابت قدم رہے ان کے نام یہ ہیں، مزینہ، غفار، جہینہ، بلی، اشجع، اسلم اور خزاعہ طائف کا قبیلہ ثقیف بھی مرتد ہو گیا تھا۔ لیکن وہاں آنحضرتؐ کے مقرر کردہ عامل عثمان بن العاص تھے انہوں نے بڑی تدبر سے کام لیا۔ اور ان لوگوں سے کہا اے آل ثقیف تم سب سے آخر میں مسلمان ہوئے ہو

باقی صفحہ ۱۵۷ میں

عرب قبائل دو قسم کے تھے جن کے تفصیلی حالات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اعراب | ایک قسم تو ان قبیلوں کی تھی جو مدینہ طیبہ کے قرب و جوار میں آباد تھے مثلاً عبس ذبیان، بنو کنانہ، غطفان اور فزارہ۔ یہ وہ لوگ تھے جن تک اگرچہ اسلام کا پیغام پہنچا تھا لیکن چونکہ آنحضرتؐ نے بیرون حجاز میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اس کے تمام فرائض و واجبات کی تعلیم کا باقاعدہ پروگرام وفات سے صرف ڈیڑھ دو برس پہلے ہی شروع کیا تھا اور اس مقصد کے لئے معلمین و مبلغین کا تقرر عمل میں آیا تھا اس بنا پر مدینہ کے قرب و جوار میں رہنے والے قبائل نے اس پیغام کو سُنا اور اسے قبول بھی کیا۔ لیکن چونکہ ان کو براہ راست آنحضرتؐ کی صحبت و خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا اس لئے اسلام کی اصل روح سے وہ آشنا نہیں ہو سکے تھے۔ اور ان کا ایمان پختہ نہیں تھا۔

قرآن مجید میں ان لوگوں کو اعراب کہا گیا ہے اور جگہ جگہ ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کا ایمان پختہ نہیں ہے۔ سورہ الحجرات میں ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔

اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اے محمد آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو لیکن ہاں یوں کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے درانحالیکہ ایمان تمہارے دلوں میں نہیں داخل ہوا ہے اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو تمہارے عملوں میں سے اللہ کچھ کم نہیں کرے گا۔ بے شبہ اللہ غفور و رحیم ہے۔

ان اعراب میں اور راسخ العقیدہ مسلمانوں میں کیا فرق تھا؟ قرآن نے اس کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے تاکہ کسی شخص کو اعراب کے

(باقی صفحہ ۱۵۶)

اس لئے اب سب سے پہلے مرتد نہ بنو۔ عثمان بن العاص کا یہ فقرہ کام کر گیا اور یہ لوگ ارتداد سے باز آ گئے۔ (الصدیق ابوبکر از محمد حسین ہیکل ص ۸۲ مطبوعہ مصر)

سمجھنے اور پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہو۔ فوراً ہی ارشاد ہوا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝

مومن تو صرف وہ ہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں پھر وہ شک بھی نہیں کرتے اور اللہ کے راستے میں اپنے مال وجان کے ساتھ جد وجہد کرتے ہیں اور بس وہی لوگ سچے ہیں۔

یہ اعراب وہی لوگ ہیں جو آگے چل کر مانعین زکوٰۃ بنے اس چیز کو ذہن میں رکھو اور دیکھو کہ قرآن کس بلاغت سے اعراب اور مومنوں میں فرق بتاتے ہوئے خبردار کر رہا ہے کہ۔

(۱) ان اعراب نے اسلام کی ظاہری شوکت وسطوت اور اس کے سیاسی اقتدار و استیلا کو دیکھ کر اپنے آپ کو مسلمان کہنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن درحقیقت ایمان ابتک ان کے دلوں میں اترا نہیں ہے اور (۲) چونکہ یہ ابھی تک مومن نہیں ہوئے ہیں۔ اس بنا پر ان کو ابتک شکوک وشبہات ہیں اور یہ اللہ کے راستہ میں جان ومال خرچ کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہیں چنانچہ اعراب کی اس شتر گربگی کو ایک اور آیت میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے۔

سیقول لک المخلفون من الاعراب شغلتنا اموالنا واھلونا فاستغفر لنا یقولون بالسنتھم ما لیس فی قلوبھم قل فمن یملک لکم من اللہ شیئا ان اراد بکم ضرا او اراد بکم نفعا بل کان اللہ بما تعملون خبیرا۔ (الفتح)

جو اعراب پیچھے رہ گئے ہیں وہ آپ سے کہیں گے کہ ہم کو ہمارے مال اور متعلقین نے مشغول کر لیا۔ اب آپ ہمارے لئے مغفرت طلب کیجئے۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے۔ اے محمد آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر اللہ تم کو نقصان پہنچانے یا نفع تو اللہ کے اس ارادہ کو تمہارے لئے کون روک سکتا ہے؟ بلکہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔

پھر اس کو قرآن کے اعجاز کے علاوہ اور تم کیا کہہ سکتے ہو کہ اس نے ان اعراب کی ایمانی کمزوریوں کی ہی پردہ دری نہیں کی ہے۔ بلکہ اس بات کی بھی پیش گوئی کر دی کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں یہ اعراب سچے مسلمان ہو جائیں گے اور پھر ان کو فارس ور وم جیسی طاقتور قوموں کے مقابلہ میں جنگ کرنے کیلئے بھیجا جائیگا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (الفتح)

آپ پیچھے رہنے والے اعراب سے کہہ دیجئے کہ تم سخت رعب و داب والی ایک قوم کی طرف بلائے جاؤ گے تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے پس اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ اور اگر تم نے ایسی ہی روگردانی کی جیسی کہ تم نے پہلے کی تھی تو اللہ تم کو سخت عذاب دے گا۔

ہم نے اوپر بتایا ہے کہ مدینہ کے قرب و جوار میں جو قبائل آباد تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو قرآن نے اعراب کہا ہے۔ چنانچہ خود قرآن میں ہے۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ (التوبہ)

اہل مدینہ اور وہ اعراب جو ان کے ارد گرد یعنی اطراف واکناف میں رہتے ہیں ان کیلئے مناسب نہیں کہ وہ رسول اللہ سے پیچھے رہ جائیں۔

یہ وہی لوگ تھے جن کی خاطر خواہ تہذیب نفس اور تنظیم نہیں ہو سکی تھی۔ اور اسلام کی پوری حقیقت ان کے ذہن نشین نہیں ہوئی تھی اور اہل بدوات ہونے کی وجہ سے ان کا ذہن امر حق کو فوراً کماینبغی قبول کرنے کی استعداد سے بے بہرہ تھا۔ اس بنا پر خود ان اعراب میں بھی دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو دل و جان سے مومن ہو چکے تھے اور دوسرے وہ جو عصبیت جاہلیہ اور اسلام کے درمیان کشمکش سے دوچار تھے اور ابھی تک اسی لئے کوئی قطعی راہ عمل متعین نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن نے اعراب کی ان دونوں قسموں کو بھی الگ الگ بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

الاعراب اشد کفراً ونفاقاً وّ اجدر الا یعلموا حدود مآ انزل اللہ علیٰ رسولہٖ ط واللہ علیمٌ حکیمٌ ہ ومن الاعراب من یتخذ ما ینفق مغرماً وّ یتربص بکم الدوائر علیہم دآئرۃ السوء ط واللہ سمیع علیم۔ (التوبۃ)

اعراب کفر اور نفاق میں بہت سخت ہیں اور اسی لائق ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو احکام اتارے ہیں اُن کے حدود کو نہ جانیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور اعراب میں بعض وہ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو ایک تاوان سمجھتے ہیں اور (اے مسلمانو) اس کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ تم کو چشم زخم پہنچے۔ یہ وبال انہی پر پڑیگا اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری قسم کے اعراب ہیں جن کا ذکر اس طرح کیا گیا۔

ومن الاعراب من یؤمن باللہ والیوم الاٰخر ویتخذ ما ینفق قربٰتٍ عند اللہ وصلوٰت الرسول ط الآ انہا قربۃٌ لّہم ط سیدخلہم اللہ فی رحمتہٖ ط ان اللہ غفورٌ رحیمٌ ہ (التوبۃ)

اور اعراب میں بعض وہ ہیں جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ سے تقرب کا اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں ہاں بیشک وہ ان کیلئے تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اللہ عنقریب ان کو (اپنی) رحمت میں داخل کرے گا۔ بیشک اللہ غفور و رحیم ہے۔

غور کرو پہلی قسم کے اعراب کی خاص صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو تاوان سمجھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ وہ طبعاً بخیل و کنجوس تھے یا کم از کم انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت اُن کے ذہن نشین نہیں ہوئی تھی وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے بھی تھے ان کے نزدیک اسلام صرف نماز اور روزہ کا نام ہوگا۔ ان کا اصولِ زندگی "مگر زر طلبی سخن دریں است" تھا۔ [1]

[1] اسی قسم کا ایک اعرابی تھا جو ایک مرتبہ آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور اسلام پر بیعت کی اس کے بعد اسے بخار آ گیا۔ تو اب اس نے حضورؐ سے کہا کہ "میری بیعت کو منسوخ کر دیجئے" آپ نے ایسا کرنے سے انکار فرمایا۔ اعرابی پھر آیا۔ اور وہی درخواست کی آپ نے پھر انکار فرمایا (باقی حاشیہ آئندہ)

اس کے بعد ایک بات یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کا باقاعدہ حکم فتح مکہ کے بعد ۸ھ کے آخر میں نازل ہوا ہے اور آنحضرتؐ نے ۹ھ کے شروع میں اس حکم کی تبلیغ و اشاعت اور زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے اپنے عمّال دور دراز اطراف و جوانب میں روانہ کئے ہیں اس بنا پر ان خاص اعراب کا ذہن زکوٰۃ کے بارہ میں صاف نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں شرارت پسند بھی تھے لیکن یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ انہیں اکثر و بیشتر ایسے بھی تھے جو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد یہ سمجھ بیٹھے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم صرف آنحضرتؐ کی زندگی تک کیلئے تھا۔ یا اگر اب بھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ہم اپنی زکوٰۃ مدینہ ہی بھیجیں۔ اپنے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کر کے ہم خود اپنے فقرا پر بھی خرچ کر سکتے ہیں اپنی زکوٰۃ جمع کر کے مدینہ بھیجنے کو وہ لوگ ایک طرح کی زبردستی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمرو بن العاصؓ عمان سے واپس ہوتے ہوئے بنو عامر کے علاقوں سے گزر رہے تھے کہ درمیان میں قرۃ بن ھبیرہ کے پاس قیام کیا۔ قرہ نے خوب خاطر مدارات اور تواضع کی جب عمرو بن العاص رخصت ہونے لگے تو قرہ اُن کو تنہائی میں لے گیا۔ اور بولا کہ اگر آپ لوگ (یعنی مدینہ والے) ہم سے مال لینا چھوڑ دیں تو ہم سب عرب آپ کے مطیع و فرماں بردار رہیں گے۔ ورنہ ہم اس تاوان کو قبول نہیں کر سکتے اور آپ کے ساتھ متفق نہیں ہوں گے۔ حضرت عمرو بن العاص قریش کے نامور اربابِ سیاست میں سے تھے قرہ کی اس دھمکی کے جواب میں بولے "کیا تو کافر ہو گیا ہے اور تو ہم کو عرب کی دھمکی دیتا ہے۔ میں تم لوگوں کو گھوڑوں سے پامال کر دوں گا" یہ کہا اور روانہ ہو گئے [1]

ان لوگوں کے اس خیال کو تقویت اس سے بھی ہوئی ہوگی کہ جو قبائل عرب مسلمان ہوتے جاتے تھے آنحضرتؐ ان کی آزادی اور اعلیٰ خالص مالی خود مختاری قائم رکھتے تھے۔ بازان یا بدھان (علی اختلاف الروایات) جو حکومت فارس کی طرف سے

بقیہ حاشیہ گزشتہ: اب اعرابی اسی حالت میں مدینہ چھوڑ کر چلا گیا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا "مدینہ ایک بھٹی کی مانند ہے جو کھوٹے کھرے کو الگ کر دیتی ہے" صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۰ باب بیعۃ الاعراب [1] طبری ج ۲ ص ۴۸۱

یمن کا گورنر تھا مسلمان ہوا تو آنحضرت صلعم نے اُسکی سیادت کو جوں کا توں برقرار رکھا بحرین اور حضرموت کے امراء نے اسلام قبول کیا تو آپ نے اُن کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا اور حکم دیا ان علاقوں کے مالداروں سے جو زکوٰۃ وصول کی جائے وہ انہیں کے فقیروں غریبوں پر خرچ کی جائے[1] ان وجوہ کی بنا پر جب تک آنحضرت صلعم اس عالم ناسوت میں تشریف فرما رہے یہ لوگ مطیع اور فرماں بردار رہے لیکن آپ کی وفات کے بعد ہی انہوں نے محسوس کیا کہ اب مدینہ کی اسٹیٹ کو زکوٰۃ دینا گویا اس کا باج گزار ہونا ہے اور اپنی قبائلی عصبیت کی وجہ سے وہ اس ننگ کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔

قبائل عرب میں اعراب کا یہی وہ طبقہ ہے جن کو ہمارے مؤرخین مرتد لکھتے ہیں لیکن درحقیقت یہ مرتد نہیں تھے۔ بلکہ مسلمان تھے۔ البتہ مختلف اسباب کی بنا پر جن کا ذکر ابھی ہوا۔ اپنی زکوٰۃ مدینہ اسٹیٹ کو نہیں دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے جیسا کہ اپنے موقع پر ہم بیان کریں گے حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرام ان لوگوں سے جہاد وقتال کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

سرکش و باغی قبائل (۲) ان اعراب کے علاوہ دوسرے قبائل وہ تھے جو مدینہ سے دور دراز اس کے جنوب میں یمن اور اس کے گرد و نواح میں شمال مشرق کی جانب عرب و شام کی سرحدوں پر آباد تھے۔ مؤرخین ان کو مرتد کہتے ہیں اور اسکی وجہ یہ ایک عام غلط فہمی ہے آنحضرت صلعم کے دنیا سے رخصت ہوتے ہوتے سارا عرب مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ طبری نے سدی کے واسطے سے روایت کی ہے حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلعم کی طرف سے اعلان برأت کے بعد کفار عام طور پر مسلمان ہو گئے تھے۔ اس بنا پر اب بغاوت و سرکشی کا طوفان اٹھا تو اس کو ارتداد کے سوا اور کیا کہیں؟

[1] حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل کو آنحضرت نے جب اسلام کی دعوت اور اسکی تبلیغ و اشاعت کیلئے یمن بھیجا تو جہاں اور ہدایات کیں آپ نے معاذ بن جبل کو خطاب کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ اخبرھم ان اللہ قد فرض علیھم صدقۃ تؤخذ من اغنیاءھم فترد علی فقراءھم۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۳ باب بعث ابی موسیٰ و معاذ الی الیمن)

لیکن حق یہ ہے کہ یہ قبائل سرے سے اسلام کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہوئے تھے فتح مکہ کے بعد جب قریش بھی سب کے سب مسلمان ہو گئے اور اسلام کی ایک زبردست اسٹیٹ مدینہ میں قائم ہو گئی تو عرب کے ان قبائل نے آنحضرت صلعم کی خدمت میں اس کثرت سے وفد بھیجنے شروع کئے کہ سنہ ۹ھ کا نام ہی عام الوفود ہو گیا لیکن ان وفود نے آنحضرت صلعم سے جس طرح آکر گفتگو کی ہے اس سے صاف نظر آتا ہے کہ اگرچہ ہر قبیلہ کے دو چار آدمیوں نے اسلام کو صدق دل سے قبول کر لیا تھا لیکن قبائل کا عام انداز یہ تھا کہ گویا وہ ایک سیاسی طاقت کے سامنے سر خم کر رہے ہیں اور ایک فاتح سے اپنے معاملات طے کر کے اپنے قبیلہ کیلئے معاشی اور سیاسی مراعات حاصل کرنا چاہتے ہیں دین اور روحانیت کا ان کی گفتگو میں بہت کم شائبہ تھا اس بنا پر اگرچہ ان قبائل نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لیا لیکن یہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب ان کو موقع ملے اور یہ اسلام کے یا بالفاظ صحیح تر مدینہ کی ریاست کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں چنانچہ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد ہی ان کو موقع ملا اور وہ جھٹ اسلام کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

ہم اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کیلئے ذیل میں اُن قبائل کے وفود کی آنحضرت صلعم کے ساتھ گفتگو کی مختصر روئیداد لکھتے ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ جن لوگوں کا آنحضرت صلعم کیساتھ یہ طرز گفتگو ہو کیا ان کو صحیح صحیح مسلمان کہا جا سکتا ہے؟ اور جب یہ مسلمان ہی نہیں تو پھر ارتداد کا کیا ذکر؟

بنو تمیم اس شورش و بغاوت میں جن قبیلوں نے حصہ لیا ان میں پیش پیش بنو تمیم اور بنو حنیفہ تھے۔ سنہ ۹ھ میں بنو تمیم کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا آنحضرت صلعم نے ان کو جنت کی بشارت کی پیش کش کی۔ لیکن یہ لوگ اسکی قدر دانی نہیں کر سکتے تھے۔ بولے "قد بشرتنا فاعطنا" آپ نے ہم کو خوش خبری دی ہے تو کچھ دیجئے بھی" آنحضرت صلعم کو اس جواب سے بڑا صدمہ ہوا۔ یہاں تک کہ چہرہ کا رنگ بدل گیا اس کے بعد یمن کا ایک وفد آیا تو آپ نے اس کو خطاب کر کے فرمایا بنو تمیم نے تو حق پیش کش

کو قبول نہیں کیا، تم پر لو تو ان لوگوں نے کہا "قبلنا یا رسول اللہ"

بنو حنیفہ اس قبیلہ کو شروع سے ہی اسلام اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ بیر تھا چنانچہ ہجرت سے قبل ایک مرتبہ عکاظ کے میلہ کے موقع پر اور قبیلوں کے علاوہ، اس قبیلہ بنو حنیفہ کے لوگوں کے پاس بھی آنحضرت ﷺ تشریف لے گئے تو یہ لوگ نہایت بدتہذیبی اور ترش کلامی سے پیش آئے تھے۔[1] مکہ اور یمن کے درمیان ایک مقام یمامہ ہے، یہ قبیلہ یہیں کا رہنے والا تھا۔ مسیلمہ کذاب اسی قبیلہ کا ایک فرد تھا جس نے بعد میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ اسی قبیلہ کا ایک وفد بھی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، مسیلمہ ساتھ تھا۔ اس نے کہا اگر محمد ﷺ مجھ سے یہ وعدہ کرلیں کہ ان کے بعد میں سردار ہونگا، تو میں ان کی تابعداری قبول کرلونگا۔ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ تھی اسے لئے ہوئے مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں کے پاس گئے اور فرمایا کہ اگر تو مجھ سے یہ شاخ بھی مانگے گا تو نہیں دونگا۔[2]

اس قبیلہ کا ایک سردار ثمامہ بن اثال تھا۔ اگرچہ اس نے بھی ہجرت سے قبل مکہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہایت شوخ چشمی کا معاملہ کیا تھا[3] اور پھر سنہ ۴ھ میں اسی کے علاقہ میں عامر بن الطفیل نے مسلمان مبلغوں اور مہمانوں کو دھوکہ سے قتل کر دیا تھا۔ لیکن سنہ ۶ھ میں یہ گرفتار ہو کر مدینہ آیا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو معاف کر دیا اور یہ مسلمان ہو گیا۔ بنو حنیفہ کے کسی شخص نے مذہب بدل دینے پر طعنہ دیا۔ لیکن یہ آخر وقت تک اسلام پر قائم رہے[4] اور نامور صحابی ہوئے۔[5]

مضر یمن کا مشہور قبیلہ ہے۔ یہ لوگ کفر میں اس قدر شدید تھے کہ جو لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آنا چاہتے تھے ان کی راہ میں بھی رکاوٹیں ڈال دیتے تھے۔ اسی سال قبیلہ عبد القیس کا ایک وفد خدمتِ گرامی میں آیا تو عرض کیا "ہم لوگ قبیلہ ربیعہ

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۶۲۶ باب وفد بنی تمیم [2] سیرت ابن ہشام [3] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۸ [4] اصابہ تذکرہ ثمامہ [5] بخاری ج ۲ ص ۶۲۸ اگرچہ طبری نے واقدی کے حوالے سے ثمامہ بن اثال کا نام بھی مرتدین کی فہرست میں لکھا ہے، (دیکھو طبری ج ۲ ص ۲۱۴۲) لیکن ظاہر ہے ہم بخاری کے مقابلہ میں واقدی کا بیان کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں

سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے آپ کے درمیان مضر کے کفار حائل ہیں۔[1] ان لوگوں کے اس تشددِ طبع کی وجہ سے ہی ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ان کے حق میں بددعا بھی کی تھی۔[2]

دوس یہ قبیلہ بھی یمن کا ہے۔ سنہ ۹ھ میں طفیل بن عمرو الدوسی خدمتِ عالی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ قبیلہ دوس کے لوگ آپ کی اطاعت قبول کرتے نہیں اور سرکشی پر تلے ہوئے ہیں آپ ان کے حق میں بددعا کر دیجئے۔ لیکن رحمتِ عالم ﷺ نے دعا کی تو یہ کہ "اے اللہ تو دوس کو ہدایت دے اور ان کو مسلمان بنا دے"۔[3]

اہل نجران نجران یمن کا مشہور شہر ہے جو مکہ سے سات دن کی مسافت پر ہے، عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا۔ اس شہر کے دو سردار عاقب اور سید بھی اسی سال بارگاہ رسالت میں حضور ﷺ سے مباہلہ کرنے آئے تھے لیکن بعد میں ان کی رائے بدل گئی اور آخر نہ اسلام لائے اور نہ مباہلہ کیا یوں ہی واپس لوٹ گئے۔[4]

اہل حضرموت اس شورش و بغاوت میں اہل حضرموت نے بھی کافی حصہ لیا تھا۔ اسلام سے قطع نظر، ان بدبختوں کو خود آقائے دو جہاں کی ذاتِ والا صفات کے ساتھ اس درجہ شدید دشمنی تھی کہ جب بنو عامر بن عوف کے ایک شخص کے ذریعہ یہاں آنحضرت ﷺ کی خبرِ وفات پہونچی تو یہاں کی عورتوں نے جن میں شریف و وضیع دونوں قسم کی عورتیں تھیں باقاعدہ جشنِ مسرت منایا۔ انہوں نے ہاتھوں پر مہندی لگائی اور دف بجائے۔ یہ عورتیں پہلے سے آنحضرت ﷺ کی موت کی دعائیں مانگتی تھیں۔ ابو جعفر محمد بن حبیب المتوفی ۲۴۵ھ نے ان عورتوں کی تعداد تیس کے لگ بھگ بتائی ہے اور ان میں سے خاص خاص عورتوں کے نام اور ان کے نسب بھی لکھے ہیں۔ موصوف کے بیان کے مطابق یہ عورتیں حضرموت کے مختلف علاقوں مثلاً تریم، بشطر، النجیر اور دمنہ وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھیں یعنی وہ ان علاقوں کی نمائندگی کر رہی تھیں۔[5] پس جب عورتوں کی آنحضرت ﷺ کے ساتھ دشمنی کا یہ عالم تھا تو اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا جن قبیلوں

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۶۲۷ [2] العقد الفرید ج ۲ ص ۴۴ جدید ایڈیشن [3] بخاری ج ۲ ص ۶۳۰ [4] بخاری ج ۲ ص ۶۲۹ [5] کتاب المحبر ص ۱۸۳-۱۸۵ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن۔

سے تعلق تھا وہاں کی عام فضا کیا ہوگی ۔ ؟

بنو عامر | پھر معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں تھا بلکہ بعض قبیلوں نے آنحضرت ؐ کو دھوکہ سے قتل تک کر دینے کی سازش کی تھی ۔ چنانچہ سنہ ۱۰ھ میں عامر بن الطفیل اربد بن قیس اور جبار بن سلمی کی سرکردگی میں بنو عامر کا ایک وفد خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو اسی ناپاک منصوبہ کو لے کر آیا تھا ۔ عامر بن الطفیل اور اربد دونوں میں قرارداد ہوئی تھی کہ عامر بن الطفیل حضور کو باتوں میں لگا کر اپنے ساتھ مشغول کر لیگا اور تم اربد موقع پا کر آپ ؐ پر تلوار کا وار کر دے گا ۔ لیکن یہاں پہونچکر اربد پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ عامر کے اشارہ کرنے کے باوجود ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکا ۔ اور آخر دونوں واپس چلے گئے [1]

یہی عامر بن الطفیل ہے کہ جب اس کو بعض لوگوں نے اسلام کی دعوت دی تو اس نے بپھر کر جواب دیا تھا " میں نے تو قسم کھالی ہے کہ میں اسوقت تک چین نہیں لونگا جب تک سارا عرب میرا مطیع نہیں ہو جائیگا ۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں قریش کے ایک نوحوصلہ مند شخص کی پیروی کر دوں " [2]

یہ وفد بنو عامر جب واپس لوٹ رہا تھا ۔ تو عامر بن الطفیل کو ایک مقام پر طاعون ہوا اور قبیلۂ بنو سلول کی ایک عورت کے گھر میں مر گیا ۔ اربد اپنے قبیلہ میں واپس پہونچا تو لوگوں نے حالات پوچھے ۔ اس شخص نے نہایت حقارت آمیز الفاظ میں آنحضرت صلعم کا تذکرہ کیا اور بولا " کچھ نہیں ، یہ شخص (آنحضرت ؐ) کس شئی کی عبادت کی ہم کو دعوت دیتا ہے ۔ اگر یہ یہاں میرے پاس ہو تو میں اس کو اپنے تیروں کا نشانہ بنا دوں [3]

قدرت نے اس بدزبانی اور گستاخی کا انتقام اس سے اس طرح لیا کہ اس واقعہ کے ایک یا دو دن بعد وہ اپنا اونٹ لئے اسے فروخت کرنے جا رہا تھا کہ درمیان راہ میں اچانک اس پر اور اس کے اونٹ پر بجلی گری اور دونوں وہیں جل کر بھسم ہو گئے ۔ [4]

---

[1] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۲۹۸ [2] ایضاً [3] طبری ج ۲ ص ۲۹۹ [4] ایضاً

یہ جو کچھ تم نے پڑھا جنوبی عرب کا حال تھا ۔ شمال مشرق میں عرب و شام کی سرحد پر غسان قضاعہ وغیرہ جو قبائل آباد تھے ان کی فتنہ انگیزی اور شورش پسندی کی کیفیت تم غزوۂ موتہ کے ذکر میں پڑھ آئے ہو ۔ انہیں کی سرزنش اور تادیب کیلئے آنحضرت ؐ نے حضرت اسامہ کی زیر سرکردگی ایک لشکر روانہ کیا تھا ۔ لیکن ابھی یہ مقام جرف سے آگے بھی نہیں بڑھا تھا کہ خود حضور دنیا سے رخصت ہو گئے ۔ یعنی آنحضرت ؐ کی وفات تک یہ قبائل بھی بحیثیتِ مجموعی اپنی اسی جاہلیت پر قائم رہے ۔

سطور بالا میں ہم نے قبائل کی ایک عام کیفیت و حالت پر روشنی ڈالی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ان قبائل کو من حیث المجموع کیونکر مسلمان کہا جا سکتا ہے اور جب یہ مسلمان ہی نہیں تو پھر یہ کہنا کہ خلافتِ صدیقی میں یہ مرتد ہو گئے تھے کیونکر درست ہو سکتا ہے ۔

اب ہم بعض خاص اشخاص کی نسبت گفتگو کرینگے جن کے متعلق اولاً غزواتِ نبوی تک میں شریک ہونا اور پھر باغیوں کی قیادت کرنا ثابت ہے تو اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی مرتد نہیں تھے

عینیہ بن حصن الفزاری | حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ شخص فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو گیا تھا اور فتح مکہ کے علاوہ غزوۂ حنین و محاصرۂ طائف میں شریک ہوا تھا ۔ پھر آنحضرت ؐ نے اس کو بنو العنبر پر جو بنی تمیم کی ایک شاخ ہے چھاپا مارنے کے لئے بھی بھیجا تھا لیکن ابوبکر کے عہد میں مرتد ہو گیا ۔ [1]

حافظ ابن حجر نے اس کو مسلمان ماننے کے بعد مرتد کہا تھا لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے یہ شخص آنحضرت صلعم کے زمانہ تک مسلمان ہی نہیں ہوا تھا ۔

اصل یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو " مولفۃ القلوب " کہلاتے تھے ۔ آنحضرت صلعم ان لوگوں کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دلاتے تھے اور ان کے ساتھ دوسری رعایتیں بھی کرتے تھے اور یہ سب کچھ تالیفِ قلب کی غرض سے ہوتا تھا ۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ شخص یا تو خود سچا اور پکا مسلمان ہو جائے اور یا اگر

---

[1] الاصابہ تذکرہ عینیہ ابن حصین ج ۳ ص ۵۵

وہ اپنے قبیلہ کا کوئی بااثر آدمی ہے تو مسلمان اس کے شر سے محفوظ رہیں۔ مؤلفۃ القلوب کی بس صرف یہی حیثیت تھی۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مؤلفۃ القلوب سچ مچ مسلمان بھی ہوں۔ یہ لوگ غزوات تک میں شریک ہوتے تھے لیکن صرف مالی منفعت اور غنیمت میں حصہ دار ہونے کے لئے۔ اسلام یا جذبۂ اقامتِ دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے ساتھ رہنے سے بہرحال مسلمان کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے اور پھر مالِ غنیمت میں اپنا حصہ حلال کرنے کی غرض سے یہ لوگ کچھ نہ کچھ کرتے بھی ہوں گے اس بنا پر آنحضرت ؐ انکو اپنے ساتھ لگائے رکھتے تھے اور کوئی شبہ نہیں کہ سیاسی اعتبار سے تدبر و دور اندیشی کا مقتضا بھی یہی تھا۔ [1]

عُیینہ بن حصن اپنی قوم کا سردار تھا [1] اور مؤلفۃ القلوب میں سے تھا [2]۔ غزوۂ حنین کے موقعہ پر آنحضرت ؐ نے جن مؤلفۃ القلوب کو بہت کچھ دیا تھا۔ طبری نے اُن کی فہرست دی ہے اور اس فہرست میں عُیینہ کا نام بھی ہے۔

---

[1] طبری کی روایت ہے کہ آنحضرت ؐ ابو سفیان بن حرب۔ اُن کے بیٹے امیر معاویہ اور حکیم بن حزام کو بحیثیت مؤلفۃ القلوب کچھ زیادہ حصہ دیا کرتے تھے۔ یہ حضرات مسلمان تھے اور اسلام پر قائم رہے اس سے معلوم ہوا کہ مؤلفۃ القلوب مسلمان بھی ہوتے تھے اور تالیفِ قلب کا فائدہ صرف سیاسی نہیں دینی بھی ہو سکتا تھا۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ محض غزوات میں شرکت کی بنا پر کسی شخص کے اسلام کا حکم نہیں لگایا جا سکتا تھا اس کیلئے اسکی زندگی کے عام حالات دیکھنے ہوں گے کیونکہ ممکن ہے وہ مؤلفۃ القلوب میں سے ہو اور تالیفِ قلب نے بھی اس کو نہ بدلا ہو یا منافق ہو گیا ہو چنانچہ حافظ نے اس کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ یہ خدمتِ گرامی میں حاضر ہوا اس وقت حضرت عائشہ آپ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں عیینہ نے حضرت عائشہ کیطرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ کون عورت ہے" آپ نے جواب دیا "عائشہ" اب عیینہ بولا "آپ میری بیوی ام البنین کو قبول کر لیجئے یا جو عائشہ سے زیادہ بہتر ہے" حضرت عائشہ کو یہ سن کر غصہ آگیا تو آنحضرت ؐ نے فرمایا "یہ شخص احمق ہے مگر اپنی قوم کا سردار مطاع ہے" [2]

[2] الاصابہ جلد ۳ ص ۵۵

عبداللہ بن ابی بکر کا بیان ہے کہ یہ سب لوگ اشراف میں سے تھے اور آنحضرت ؐ نے ان لوگوں کو سو اونٹ فی کس کے حساب سے دئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود عیینہ کا کیا حال تھا اور اگر وہ مسلمان تھا تو اس کا اسلام کس قسم کا تھا اس کا اندازہ واقعاتِ ذیل سے ہو گا۔

کسی شخص نے آنحضرت ؐ سے کہا "یا رسول اللہ! آپ نے عیینہ اور اقرع بن حابس کو سو سو اونٹ دئے ہیں لیکن جعیل بن سراقہ کو چھوڑ دیا۔" آنحضرت ؐ نے فرمایا۔

اما والذی نفسی بیدہ لجعیل	جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اسکی قسم اس میں
بن سراقۃ الضمری خیر من	شک نہیں کہ جعیل، عیینہ اور اقرع جیسے تمام دنیا
طلاع الارض کلھم مثل عیینۃ	بھر کے چھاپہ ماروں سے زیادہ بہتر ہے۔ لیکن میں
بن حصن والاقرع بن حابس و	ان دونوں (عیینہ اور اقرع) کی دلجوئی کرتا ہوں
لکنی تألفتھما لیسلما و وکلت	تاکہ یہ مسلمان ہو جائیں اور رہا جعیل تو اس کو میں نے
جعیل بن سراقۃ الی اسلامہ [1]	اس کے اسلام کے حوالہ کر دیا ہے۔

غور کرو! آنحضرت ؐ کا "لیسلما" فرمانا صاف بتاتا ہے کہ اس وقت تک یہ دونوں آپ کے نزدیک مسلمان نہیں تھے۔ اس طرح ایک مرتبہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں چند انصاریوں کی نسبت آنحضرت ؐ کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ اس بات سے شاکی ہیں کہ آپ مؤلفۃ القلوب کو تو کافی دے رہے ہیں۔ لیکن انصار کو نظر انداز کر رہے ہیں تو آپ نے فوراً تمام انصار کو جمع کیا اور ایک نہایت مؤثر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

تألفت بھا قوماً لیسلموا	میں ان عطیات کے ذریعہ ایک گروہ کی دلجوئی کرتا ہوں
و وکلتکم الی الاسلام [2]	تاکہ یہ لوگ مسلمان ہو جائیں اور تمکو اے انصار اسلام کے
	حوالہ کر دیا ہے۔

لیکن عیینہ کی فطرت احسان ناشناس تھی۔ آنحضرت ؐ کی اس غیر معمولی داد و دہش

---

[1] طبری جلد ۲ ص ۳۵۹

کے باوجود وہ آپ سے صرف انہیں احکام کی تعمیل کرتا تھا جو اس کے ذاتی مفاد سے نہیں ٹکراتے تھے۔ غزوہ حنین میں اگرچہ اس کو سو اونٹ مل چکے تھے لیکن اس کے باوجود آنحضرتؐ نے فریق مخالف کی ایک بڑھیا کو جو گرفتار ہو کر آئی تھی باندی بنانے سے منع کیا تھا۔ عیینہ نہ مانا اور زر فدیہ کے لالچ میں اسے بھی اپنے قبضہ میں کر لیا اور آنحضرتؐ کے حکم کے باوجود اسے واپس کر دینے سے انکار کر دیا [1]

علاوہ بریں اس نے جاہلیت کے عادات و رسوم کو بھی ترک نہیں کیا تھا اور اس بنا پر آنحضرتؐ کے ساتھ کبھی بڑی بے ادبی اور گستاخی سے پیش آتا تھا طبری نے سنہ ۹ ھ کے واقعات میں عبداللہ بن ابی بکر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ بنو تمیم کا وفد آیا۔ عیینہ بن حصن الفزاری اور اقرع بن حابس یہ دونوں بھی ساتھ تھے آنحضرتؐ زنانخانہ میں تشریف رکھتے تھے، ان لوگوں نے بڑی بے ادبی سے چیخ کر حضورؐ کو آواز دی اور باہر آنے کیلئے کہا۔ آپ باہر تشریف لائے تو ان لوگوں نے کہا "ہم آپ سے حسب و نسب میں مفاخرت کرنے کی غرض سے آئے ہیں آنحضرتؐ نے انکا چیلنج قبول کر لیا اور ان کے خطیب کے مقابلہ میں اپنے خطیب ثابت بن قیس اور ان کے شاعر زبرقان بن بدر کے بالمقابل اپنے شاعر حسان بن ثابت کو حکم دیا کہ انکے مفواب کا جواب دیں طبری نے اس واقعہ کی پوری تفصیل لکھی ہے اور جانبین کے خطبے اور اشعار نقل کئے ہیں اُن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بعض غزوات میں شریک ہونے کے باوجود عیینہ اور اس کے دوسرے ساتھی، اقرع بن حابس، عطارد بن حاجب بدستور عہد جاہلیت کے رسوم و افکار پر قائم تھے اور اسلام کی کسی تعلیم کا ان لوگوں کی زندگی پر کوئی اثر نہیں تھا [2]

اسی کا یہ اثر تھا کہ جب طلیحہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو عیینہ جھٹ اس کا دست راست بن گیا اور اب وہ کہا کرتا تھا "خدا کی قسم دو حلیفوں میں سے کسی ایک نبی کا ہم اتباع کریں

---

[1] طبری ج ۳ ص ۲۵۷ [2] طبری ج ۲ ص ۳۸۷ [3] طبری ج ۲ ص ۳۸۷

یہ ہمارے لئے زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک قریشی نبی کی پیروی کریں [1] عیینہ کا اقرار کردہ مسلمان نہیں تھا بہرحال اس لحاظ سے ہم کو عیینہ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے اپنے اسلام قبل از ارتداد کے بارے میں ہمکو کسی مغالطہ میں نہیں چھوڑا جب یہ گرفتار کرکے مدینہ لایا گیا ہے تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ اسکی گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ مدینہ کے لڑکے کھجور کی ایک شاخ سے اس کو ٹہکاتے پھرتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ او دشمن خدا! تجھ کو آخر یہ کیا سوجھی تھی کہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گیا۔ عیینہ اسکے جواب میں کہتا تھا "قسم خدا کی میں تو کبھی ایمان لایا ہی نہیں تھا [2]

اس سلسلہ میں ایک خاص اہم بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس کا خون معاف کر دیا اور درگزر فرمایا [3] اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عیینہ حضرت ابوبکرؓ کی رائے میں مرتد نہیں بلکہ باغی تھا۔

دوسرے لوگ عیینہ پر اس قسم کے دوسرے لوگوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے عباس بن مرداس السلمی اور اقرع بن حابس یہ بھی مؤلفۃ القلوب میں سے تھے اور اس حیثیت سے غزوات تک میں شریک ہوتے تھے لیکن عالم یہ تھا کہ غزوہ حنین میں عباس بن مرداس کو دوسرے مؤلفۃ القلوب سے حصہ کم ملا تھا تو یہ شخص بگڑ گیا اور چند اشعار پڑھے جن میں یہ دو شعر حافظ ابن حجر نے نقل کئے ہیں۔

اتجعل نهبی ونهب العبید　　بین عیینة والاقرع

وما کان حصن ولا حابس　　یفوقان مرداس فی مجمع

ترجمہ:- اے محمدؐ! کیا آپ میرا اور میرے گھوڑے عبید کا لوٹا ہوا مال عیینہ اور اقرع کے درمیان تقسیم کرتے ہیں حالانکہ حصن اور حابس یہ دونوں بھی کسی مجمع میں مرداس پر فائق نہیں ہو سکتے تھے

---

[1] طبری ج ۲ ص ۲۸۹ محاصرۂ طائف کے موقع پر عیینہ بھی اسلامی لشکر کے ساتھ تھا یہاں کسی شخص نے عیینہ کو مشرکین کی تعریف کرتے سنا تو اس سے کہا "عیینہ خدا تجھ کو غارت کرے، تو آیا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنے لیکن تعریف کر رہا ہے مشرکین کی۔ عیینہ نے جواب دیا۔ خدا کی قسم میں تو تم مسلمانوں کے ساتھ (باقی آئندہ)

آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو آپ کو بڑا صدمہ ہوا اور حکم دیا کہ "اسکی زبان کاٹ لو" صحابۂ کرام نے اس کی تعمیل اسطرح کی کہ اسکو کچھ اور دیکر اسکی زبان بند کر دی[1]

اقرع بن حابس کا حال تم ابھی پڑھ ہی چکے ہو کہ سنہ ۹ھ میں بنو تمیم کا جو وفد آنحضرت ﷺ کے ساتھ مفاخرت کرنے آیا تھا اُس وفد کا ایک رکن یہ بھی تھا۔ پھر انصار کے شکوہ کرنے پر آنحضرت ﷺ نے جن دو مؤلفۃ القلوب کو زیادہ حصہ دینے کی وجہ بتاتے ہوئے فرمایا تھا "لیسلما" ان میں سے ایک یہ اقرع بھی تھا۔ اسکے علاوہ عہد صدیقی میں ایک مرتبہ عیینہ اور اقرع خلیفۂ رسول کے پاس آئے اور کہا کہ آنحضرت ﷺ مؤلفۃ القلوب کی حیثیت سے ہم پر داد و دہش کرتے تھے آپ بھی ایسا کیجئے اور اس کے بعد ایک زمین کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابوبکر جو آنحضرت ﷺ کے قدم بقدم چلتے تھے انہوں نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ لیکن جب پروانۂ خلافت کی تصدیق کے لئے یہ دونوں حضرت عمر فاروق کی خدمت میں پہونچے تو انہوں نے شدید مخالفت کی اور فرمایا "اسلام جب کمزور تھا۔ آنحضرت ﷺ تم لوگوں کی تالیف قلب کرتے تھے لیکن اب اسلام مضبوط اور قوی ہوگیا ہے اور ہم کو تم لوگوں کی پرواہ نہیں ہے تم اسلام کو نقصان پہونچانے کے لئے اپنی جیسی جو کوشش بھی کر سکتے ہو کر گزرو۔"[2]

غور کرو! ارتداد سے تائب ہونے کے بعد بھی ان لوگوں کی حیثیت حضرت عمر کے نزدیک کیا تھی؟ مذکورۂ بالا اقتباس کے آخری فقرہ سے صاف ظاہر ہے۔

قبیلۂ بنو سلیم کا ایاس بن عبداللہ بن عبد یالیل جو الفجاءۃ کے لقب سے مشہور ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ثقیف سے جنگ کرنے آیا ہی نہیں ہوں، بلکہ میری غرض تو صرف یہ ہے کہ اگر طائف فتح کر لیا تو مجھ کو ثقیف کی ایک لڑکی ملے گی جس سے میں لطف اندوز ہونگا اور اس سے میری اولاد ہوگی (طبری ج ۲ ص ۱۵۸۸) [1] طبری ج ۳ ص ۹۸۹ [2] الاصابہ ج ۱ ص ۲۶۳ (حاشیہ صفحہ ہٰذا)

[1] طبری ج ۲ ص ۱۵۹ [2] الاصابہ ج ۳ ص ۵۱۔ اسی واقعہ کو طبری نے بھی لکھا ہے (ج ۳ ص ۲۰۰) لیکن الفاظ کچھ بدلے ہوئے ہیں۔

مرتدین کے ایک گروہ کا عُنصر تھا[1] لیکن ارتداد سے تائب ہونیکے بعد بھی اس کے اسلام کا کیا حال تھا؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اس نے حضرت ابوبکر کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ میں مسلمان ہوں اور جو لوگ مرتد ہوگئے ہیں ان سے جنگ کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت ابوبکر نے اُس کو ہتھیار اور ساز و سامان سے لیس کر دیا لیکن یہ بدبخت ان ہتھیاروں سے خود مسلمانوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی تو گرفتاری کے احکام جاری کئے جب گرفتار ہو کر آیا تو حضرت ابوبکر نے شدید غداری اور بے وفائی کی وجہ سے اس کو بڑی سخت سزا دی اور آگ میں ڈلوا کر زندہ جلا دیا[1]

بہرحال اس بحث سے تم کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ جن لوگوں کو مرتد کہا جاتا ہے ان کے اسلام قبل از ارتداد کی کیا حقیقت تھی؟ حد یہ ہے کہ مسیلمہ اور طلیحہ جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا ان تک کی نسبت مؤرخین لکھتے ہیں کہ انہوں نے شروع میں اسلام قبول کر لیا تھا؟ لیکن اگر اسلام یہی ہے تو کفر کس چیز کا نام ہے؟ اصل بات یہی ہے کہ اوّل تو یہ ارتداد تھا ہی نہیں اور اگر تھا تو بجائے دینی اور مذہبی ارتداد کے سیاسی ارتداد تھا۔ یعنی ان لوگوں نے مصلحت وقت کے پیش نظر آنحضرت ﷺ کی طرف سیاسی اطاعت قبول کی تھی۔ اور وہ بھی محض منافقانہ طور پر۔ چنانچہ اس کے بعد بھی ریشہ دوانیوں میں لگے رہے اور جب فضا سازگار ہوتی نظر آئی تو کھلم کھلا علم بغاوت بلند کر دیا۔

وجوہ واسباب

یہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس صورت حال کے اسباب کیا تھے؟ اور وہ کیا وجوہ تھے جن کے باعث یہ لوگ دین حق کو اب تک قبول نہیں کر سکے تھے؟

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۹۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اسکا نام انس لکھا ہے لیکن صحیح ایاس ہے طبری وغیرہ ایاس ہی لکھتے ہیں۔ [2] طبری ج ۳ ص ۲۹۲

اصل یہ ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا، آنحضرت صلعم کی نبوت کے تیرہ سال تو مکہ مکرمہ میں بسر ہو گئے تھے یہاں اگرچہ حج کے موقع پر عرب کے مختلف قبائل کے لوگ آتے تھے اور آنحضرت صلعم ان کو اپنا پیغام پہونچاتے تھے۔ لیکن اول تو یہ پیغام ظاہر ہے کہ چند آدمیوں تک ہی پہنچا تھا اور پھر جو لوگ اسکو سنتے تھے وہ بھی مختلف طبیعت اور مختلف استعداد کے تھے، ان میں کچھ صدق دل سے اسکو سنتے تھے اور سچے مسلمان ہو جاتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو تھوڑا بہت اثر قبول کرتے تھے لیکن قبیلہ میں پہونچنے کے بعد وہ اثر زائل ہو جاتا تھا اور کچھ ایسے بھی تھے جن کے دل سرے سے پسیجتے ہی نہیں تھے، اس کے علاوہ چونکہ قریش کی سخت ترین عداوت کے باعث خود آنحضرت صلعم اور آپکے جاں نثاروں کو سخت ترین مشکلات اور دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا اس لئے تبلیغ اسلام کا ایک ہمہ گیر نظام قائم نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر جب آپ مدینہ ہجرت کر گئے تو مدنی زندگی کے آٹھ سال غزوات و سرایا میں صرف ہو گئے اور اس کا اثر اگرچہ یہ ضرور ہوا کہ حجاز کی بڑی آبادی مسلمان ہو گئی لیکن یہاں بھی منافقین کا ایک مستقل گروہ موجود تھا۔ پھر یہود و نصاریٰ بھی تھے جو یقیناً اسلام کے اس عروج پر خوش نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ تو خود حجاز کا عالم تھا۔ رہ گئے وہ قبائل جو مدینہ سے دور دراز کے فاصلوں پر آباد تھے۔ تو اگرچہ آنحضرت صلعم نے آخر عہد نبوت میں ان میں تبلیغ اسلام کے لیے مبلغین اسلام کے وفود روانہ کئے لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر یہ سب قبائل اسقدر جلد اسلام کی دعوت کو لبیک کہنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکے اور وہ وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) عرب عاربہ اور مستعربہ یعنی جنوبی عرب اور شمالی عرب کے قبائل میں دیرینہ عداوتیں تھیں یہاں تک کہ شمالی عرب کے لوگ خدا کو اللہ کہتے تھے تو جنوبی عرب کے قبائل رحمٰن کہتے تھے، مسیلمہ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو بعض اس کے ساتھی صاف کہتے تھے کہ ہم جانتے ہیں کہ مسیلمہ جھوٹا ہے اور محمد سچے ہیں لیکن بایں ہمہ کذاب ربیعة احب الینا من صادق مضر "قبیلہ ربیعہ کا جھوٹا مضر کے سچے سے ہم کو زیادہ محبوب ہے"

(۲) یہود و نصاریٰ، مجوس اور منافقین، یہ لوگ اسلام کے دشمن اور موقع کے منتظر تھے ہی۔ اب انہوں نے قبائل عرب میں بے چینی دیکھی تو انہیں شہ دیکر اور آمادہ بہ فساد کر دیا چنانچہ سجاح بنت الحارث جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اس کے ساتھیوں میں ایک بڑی تعداد بنو تغلب کے عیسائیوں کی تھی۔[۱]

اسی طرح بحرین میں حطم کی زیر قیادت مجوسیوں نے بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ (۳) پھر سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ رومیوں اور ایرانیوں میں مدت سے چپقلش چلی آ رہی تھی اور عرب کے خانہ بدوش قبائل ان دونوں حکومتوں کے علاقوں پر گرنے دن چھاپے مارتے تھے اس بنا پر دونوں نے اپنی اپنی سرحدوں پر ان عربوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر دی تھیں جنکو آجکل کی اصطلاح میں درمیانی مملکتیں (BAFFER STATER) کہا جاتا ہے۔ ایرانیوں نے حیرہ (حال کوفہ) میں ایک عربی ریاست اور رومیوں نے اسی طرح کی ایک عربی ریاست دمشق میں قائم کی۔ ایرانیوں اور رومیوں میں جنگ ہوتی تھی تو حیرہ اور دمشق کے عرب بھی اپنی اپنی حامی مملکتوں کا ساتھ دیتے اور اس طرح خود اپنی ہی برادری کے خلاف صف آرا ہوتے تھے۔ ایرانی اور رومی حکومتوں کی داد و دہش اور عرب نوازی کا اثر صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ مذہبی بھی تھا، چنانچہ قبیلہ غسان جو سد مارب کے ٹوٹنے کے باعث شام کی سرحد پر آکر آباد ہو گیا تھا اس نے عیسائی مذہب ہی قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح بحرین میں باغیوں نے جب حضرت ابوبکر صدیق کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ایران کی ساسانی حکومت نے ان کی پوری پشت پناہی کی اور کمک بھیجکر ان کی مدد کی۔[۲]

ابن عبد ربہ نے "وفود العرب علی کسریٰ" کے زیر عنوان بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ عرب کے وفود کس طرح شاہِ ایران کے دربار میں جاتے تھے اور وہاں سے بڑے عطیات و صلات حاصل کر کے آتے تھے۔[۳] اسی طرح قیصر روم کی طرف سے ان عربوں کو بڑی بڑی رقمیں سالانہ عطیہ کے طور پر ملتی تھیں۔

ان حکومتوں کا عربوں پر اثر کس قدر عمیق تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے

[۱] محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ جز ا ص ۱۷۸ [۲] فتوح ابن اعثم الکوفی [۳] دیکھو العقد الفرید جلد اول

ہو سکتا ہے کہ قیام مکہ کے زمانہ حج کے موقع پر آنحضرت صلعم حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ قبیلہ بنو ذہل بن شیبان کے پاس تشریف لے گئے اور قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَنْ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ (الآیۃ) چند آیتیں پڑھ کر ان کو اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ کے سردار مفروق شنی اور ہانی بن قبیصہ ان آیتوں سے بڑے متاثر ہوئے لیکن ساتھ ہی یہ کہ اوّل تو مدتوں کا خاندانی دین اچانک ترک کر دینا زود اعتقادی ہے اور پھر ہم لوگ کسریٰ کے زیر اثر ہیں اور ہم دونوں میں باہمی معاہدہ ہو چکا ہے کہ کسی اور کے اثر میں نہ جائیں گے[1]

اسلام کا جب غلغلہ بلند ہوا اور پیہم فتوحات کے باعث اس کے قدم حجاز میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے اور مدینہ میں ایک نہایت با اقتدار اسلام کی پہلی ریاست قائم ہو گئی تو اب ایران اور روم دونوں کی مملکتوں کو اپنی فکر ہوئی اور انہوں نے ان عرب قبائل کو جو ان کے احسان مند اور دست نگر تھے۔ اسلام کے خلاف بھڑکانا شروع کیا اور آخر کار انہیں بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ آنحضرت صلعم نے غزوۂ موتہ کا اہتمام انہیں لوگوں کی سرکوبی کے لئے کیا تھا۔ لیکن ابھی اس مہم کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوا تھا کہ آنحضرت صلعم کی ہی وفات ہو گئی۔ اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا جو مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا بغاوت کے کوہ آتش فشاں کی شکل میں اچانک پھوٹ پڑا۔

مدّعیانِ نبوّت

ظاہر ہے اتنی بڑی اور وسیع تحریک بغاوت کسی لیڈر کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ یمن میں الاسود العنسی اس تحریک کا قائد تھا اور یمامہ میں بنو حنیفہ میں مسلمہ۔ قبیلہ اسد اور غطفان میں طلیحہ اور قبیلہ بنو تمیم میں سجاح اس تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ دراصل یہ تحریک ایک خالص سیاسی قسم کی تھی اور مذہب سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ

[1] روض الانف بحوالہ قاسم بن ثابت [2] کامل ابن اثیر جلد دوم ص ۲۵۵ مطبوعہ لیدن۔

جانتے تھے کہ اس تحریک کو مذہبی رنگ دیئے بغیر کامیاب نہیں بنایا جا سکتا اور پھر آنحضرت صلعم کی مثال ان کے سامنے تھی اس بنا پر ان لوگوں نے مذہب کا نام دیکر یہ تحریک شروع کی اور خود اپنے لئے نبوت کا دعویٰ کیا۔

اب ہم ان مدعیان نبوت کا حال الگ الگ لکھتے ہیں۔

الاسود العنسی مورخین لکھتے ہیں کہ اسلام میں سب سے پہلا شخص جو مرتد ہوا وہ الاسود العنسی ہے[1]۔ اس کا نام عبہلہ بن کعب تھا۔ قبیلہ مذحج کی شاخ عنس سے تعلق رکھتا تھا۔ کہانت اور شعبدہ بازی میں اسکو بڑی دسترس تھی۔ اُسکا ایک گدھا تھا جس کو اس نے سکھا پڑھا رکھا تھا۔ گدھے سے کہتا کہ کیا تو اپنے رب کے سامنے سجدہ نہیں کریگا اور اسکے بعد وہ گدھے سے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کو کہتا اور گدھا فوراً اس کی تعمیل کرتا تھا اس کی وجہ سے اس کا لقب ذوالحمار پڑ گیا تھا۔ یہ بلاذری کا بیان ہے[2] لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ ذوالحمار نہیں بلکہ ذوالخمار ہے خمار دوپٹہ یا اوڑھنی کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ ہر وقت عمامہ باندھے رہتا اور چادر اوڑھے رہتا تھا۔ اسلئے اس کو ذوالخمار کہتے تھے۔[3]

العنسی کے ارتداد کے وقت یمن کی حالت یمن سیاسی اعتبار سے شاہ ایران کے ماتحت تھا اور جب آنحضرت صلعم نے اور سلاطین وامراء کیساتھ شاہ ایران کو بھی دعوت اسلام کا خط لکھا ہے تو اس وقت باذان یا بدھان علی اختلاف الروایہ حکومت ایران کی طرف سے یمن کا گورنر تھا کسریٰ (شاہ ایران) نامۂ نبوی صلعم دیکھ کر چراغ پا ہوا اور اس نے باذان کو لکھا کہ حجاز کے اس شخص (آنحضرت صلعم) کا سر اسکے پاس بھیجدے لیکن باذان کا قلب اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو چکا تھا اس لئے کسریٰ کے حکم کی تعمیل کرنیکی بجائے اس نے کیا یہ کہ جب اسے آنحضرت صلعم کی طرف سے اسلام کی دعوت پہونچی تو اس نے فوراً اس کو لبیک کہا اور اسلام قبول کر لیا اس سے پہلے اسلام کی دعوت یمن میں پھیل ہی چکی تھی اور بہت سے لوگ یہاں مسلمان ہو چکے تھے۔ اب آنحضرت صلعم نے باذان

[1] کامل ابن اثیر جلد دوم ص ۲۵۵ مطبوعہ لیدن [2] فتوح البلدان ص ۱۱۳ [3] تاریخ الکامل ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۲۵۶

کو اپنی طرف سے پورے یمن کا گورنر مقرر فرمایا لیکن کچھ دنوں بعد جب باذان کا انتقال
ہو گیا تو آپ نے یمن کی علمداری کو مختلف عمال میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ عمرو بن حزم کو نجران کا،
خالد بن سعید بن العاص کو نجران و زبید کے درمیانی علاقہ کا، عامر بن شہر کو ہمدان کا، شہر
بن باذان کو صنعاء کا، عک اور اشعریین کا طاہر بن ابی ہالہ کو، مارب کا ابو موسیٰ اور جند پر
یعلی بن امیہ کو عامل مقرر فرما دیا۔ ان عمال کے علاوہ آپ نے چند معلمین بھی بھیجے تھے جو
مختلف قبیلوں میں رہ کر ان کو اسلامی احکام و مسائل کی تعلیم دیتے تھے۔ معاذ بن جبلؓ ان
کے صدر تھے جن کیلئے کوئی علاقہ مخصوص نہیں تھا اور وہ قبیلہ قبیلہ تعلیم و تبلیغ کا کام انجام
دیتے تھے۔ ان کے علاوہ حضر موت کے علاقوں پر زیاد بن لبید، سکاسک اور سکون
پر عکاشہ بن ثور اور بنو معاویہ بن کندہ پر عبداللہ یا مہاجر عامل مقرر کیے گئے تھے۔ لیکن
مہاجر آنحضرت صلعم کی علالت کے باعث روانہ نہ ہو سکے تھے۔ آخر جب آپ کا وصال
ہو گیا تو حضرت ابو بکر نے ان کو روانہ کیا۔

اسود عنسی کا دعویٰ نبوت اور خروج

حجۃ الوداع سے تشریف لانے کے بعد آنحضرت صلعم کا مزاج گرامی
کچھ ناساز ہو گیا تھا اسود عنسی کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس کا حوصلہ
بڑھا اور اس نے خود نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ جیسا کہ گزر چکا ہے یہ شعبدہ باز تو تھا ہی قبیلہ
مذحج اس کا ہمنوا ہو گیا۔ اسود نے سب سے پہلے نجران پر حملہ کیا اور آنحضرت صلعم کی
طرف سے اس جگہ جو عامل اور مبلغ مقرر تھے یعنی عمرو بن حزم اور خالد بن سعید ان کو
یہاں سے نکال دیا اب وہ صنعاء کی طرف بڑھا۔ ادھر سے باذان کا بیٹا شہر مقابلہ کیلئے
نکلا لیکن شہر بن باذان نے جام شہادت نوش کیا (یہ واقعہ اسود عنسی کے خروج کے
پچیس دن کے بعد پیش آیا) شہر صنعاء کی حیثیت چونکہ مرکزی تھی اس لیے اسکے سقوط
کے ساتھ ہی مسلمان عمال میں اضطراب پیدا ہو گیا اور وہ فضا کو ناساز گار پا کر منتشر
ہو گئے۔ بقول مورخ ابن اثیر کے اسود عنسی کی شہرت آگ کی طرح پھیل گئی اور چند
روز میں ہی یہ یمن کی سب سے بڑی طاقت بن گیا۔ شہر بن باذان کی شہادت کے بعد
اس نے اسکی بیوہ سے نکاح بھی کر لیا تھا جس کا نام آزاد تھا، قدرت نے اسی بیوہ کے

ہاتھوں اسکی ہلاکت مقدر کی تھی۔

اسود عنسی کا خاتمہ

اس کا واقعہ یہ ہوا کہ جب آنحضرت صلعم کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے یہاں جو لوگ
اپنے اسلام پر ثابت قدم تھے ان کو پیغام بھیجا کہ وہ صاف طور پر
کھلم کھلا یا چالاکی کیساتھ جس طرح بھی ممکن ہو اسود عنسی کا مقابلہ کریں[1] ادھر ایران
کے شاہی خاندان کے افراد اور اعیان و امراء جو یمن میں آباد تھے اسود عنسی نے ان کیساتھ
انتہائی تحقیر و تذلیل کا معاملہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے یہ لوگ یوں بھی اس شخص
سے نالاں اور پریشان تھے۔ اب آنحضرت صلعم کا یہ حکم پہنچا جس کو وبر بن یحنس الازدی
لیکر گئے تھے اور ادھر آپ نے قیس بن ھبیرۃ بن مکشوح کو بھی تھوڑی سی جمعیت کے
ساتھ اسود سے جنگ کرنے کے لئے روانہ کر دیا تھا تو ان لوگوں نے ایرانی امراء فیروز
اور داذویہ اور شہر بن باذان کی بیوہ آزاد جو اب اسود کی بیوی تھی ان سب کے ساتھ
ملکر اسود کو دھوکہ سے قتل کر دینے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا چنانچہ آزاد کی رہنمائی میں
ایک شب یہ سب لوگ اسود عنسی کے مکان میں ایک پوشیدہ راستہ سے داخل ہو کر
چھپ کر بیٹھ گئے اور آخر صبح کے وقت جبکہ اسود نشہ کی حالت میں پڑا سو رہا تھا فیروز
نے آگے بڑھ کر اس زور کا وار کیا کہ وہ شدید زخمی ہو گیا اور مذبوح بیل کی طرح
ڈہاڑیں مارنے لگا۔ اسود کے مکان کے پہرہ دار جو ادھر تھے یہ چیخ سن کر دوڑ پڑے
اور پوچھا کہ یہ کیا ہوا تو آزاد نے مذاق میں کہا کہ تمہارے پیغمبر پر وحی نازل ہوئی ہے۔
اتنے میں داذویہ اور قیس اور چند اور مسلمان جو چھپے بیٹھے تھے آگئے اور قیس نے اسود
کی گردن اسکے تن سے جدا کر دی۔ اسکے بعد شہر کی چہار دیواری پر کھڑے ہو کر اعلان کیا
کہ محمد رسول اللہ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور اسود عنسی جھوٹا اور کاذب تھا۔ اسود کے قتل
ہوتے ہی اس کے ساتھیوں کے پاؤں اکھڑ گئے جو بھاگ سکتے تھے بھاگ گئے جنہوں
نے کچھ مقاومت کی ان کا کام تمام کر دیا گیا[2]

یہ واقعہ اگرچہ آنحضرت صلعم کی وفات سے پانچ روز پہلے پیش آیا تھا اور آپ نے اپنی

[1] یہاں تک کی تفصیلات کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۵۵ - ۲۵۶ سے ماخوذ ہیں [2] ابن اثیر و فتوح البلدان بلاذری ص ۱۱۳

زبانِ وحی ترجمان سے اسکا اظہار بھی فرما دیا تھا لیکن اسکی اطلاع مدینہ میں آپکی وفات کے دس دن بعد پہونچی [1]
چونکہ خلافتِ صدیقی کے عہد کی یہ پہلی خوشخبری تھی اسلئے حضرت ابوبکرؓ کو قدرتی طور پر اسکی بڑی مسرت ہوئی [2]

اسود عنسی کے قتل کے بارہ میں مورخین میں بڑا اختلاف ہے کہ وفاتِ نبوی سے قبل ہوا ہے یا بعد میں لیکن سطورِ
بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے دونوں کے بیانات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

طلیحہ الاسدی | طلیحہ کے باپ کا نام خویلد تھا اور قبیلہ بنی اسد کے ساتھ تعلق رکھنے کی
وجہ سے اسدی کہلاتا تھا۔ اس نے بھی نبوت کا دعویٰ آنحضرت صلعم کے عہد میں کیا تھا۔ آپ کو
اطلاع ہوئی تو آپ نے ضرار بن الازور کو بنو اسد کا عامل بنا کر بھیجا اور حکم دیا کہ طلیحہ اور
اس کے ساتھیوں کے ساتھ جو لوگ مرتد ہو گئے ہیں انکی سرزنش کیجائے۔ ضرار مسلمانوں کے
ساتھ مقام واردات میں مقیم تھے اور یہاں مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی ان
کے برخلاف طلیحہ اپنے آدمیوں کیساتھ سمیرا میں فروکش تھا لیکن اسکے ساتھیوں کی تعداد
زیادہ نہیں تھی۔ آخر ضرار کے کسی ساتھی نے طلیحہ کو پکڑ کر اس پر تلوار ماری لیکن اتفاق سے
یہ بچکر بھاگ نکلا۔ اب اسکو پروپیگنڈہ کا اچھا موقع مل گیا کہ تلوار اس پر اثر ہی نہیں
کرتی ہے۔ ضعیف الاعتقاد لوگوں کا ایک وسیع حلقہ اسکے گرد جمع ہو گیا۔ اتنے میں
آنحضرت صلعم کی وفات ہو گئی۔ طلیحہ دعویٰ کرتا تھا کہ اسکے پاس جبریل آتے ہیں اور مسجع
عبارتیں گھڑ گھڑ کر بطور وحی سناتا تھا۔ اور کہتا ہے کہ نماز میں رکوع و سجود کی ضرورت نہیں ہے
اللہ تعالیٰ یہ پسند نہیں کرتا کہ تمہاری کمر جھکے اور تمہاری پیشانیاں گرد آلود ہوں۔ آنحضرت صلعم
کی وفات کو بھی پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنایا گیا [3] چنانچہ عیینہ بن حصن الفزاری جو طلیحہ کا دست
راست تھا۔ جہاں عصبیت کے نام پر لوگوں کو ابھارتا تھا۔ یہ بھی کہتا تھا کہ دیکھو محمد صلعم کا انتقال
ہو گیا۔ لیکن ہمارا پیغمبر زندہ ہے [4] بہرحال اسد، غطفان اور طے کے قبائل میں اس کو بڑا نفوذ
و اثر حاصل ہو گیا۔ طلیحہ نے ان سب لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو مقام ابرق
میں ٹھہرا دیا اور دوسرے فریق کو مقام ذوالقصہ کیطرف بھیجا جو مدینہ طیبہ سے نجد کے راستہ پر
قریب ہی واقع ہے۔

---

[1] بلاذری ص ۱۱۳ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۵۸۔ [3] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۰ [4] طبری ج ۳ ص ۲۸۰

سجاح بنت الحارث | اس وقت نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے کی ہوا کچھ ایسی چل رہی تھی کہ مرد تو
مرد عورتیں بھی اس میدان میں قسمت آزمائی کیلئے اتر پڑیں چنانچہ سجاح نے جو بنو تغلب سے
تعلق رکھتی تھی آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا۔ بنو تغلب اور بنو تمیم میں کچھ لوگ
اسکے پیرو ہو گئے۔ اسکے علاوہ قبیلہ ہذیل جو عیسائی تھا وہ بھی اس کا حامی ہو گیا اور مسیحیت کو ترک
کر دیا۔ مالک بن نویرہ جو مرتد ہو گیا تھا اس کا دستِ راست تھا لیکن سجاح اور مسیلمہ میں کا ذکر
ابھی آتا ہے۔ دونوں میں ازدواجی تعلق ہو گیا [1] اور اسطرح اسکی نبوت مسیلمہ کی نبوت میں ضم ہو گئی

مسیلمہ الکذاب | مسیلمہ کے باپ کا نام حبیب تھا اور کنیت ابو ثمامہ یا ابو ثمالہ تھی [2] بنو حنیفہ
سے تعلق رکھتا تھا۔ بنو حنیفہ کا جو وفد آنحضرت صلعم کی خدمت میں ۹ھ میں آیا تھا۔ اسکا
ایک رکن یہ بھی تھا اور اس نے آنحضرت صلعم سے کہا تھا کہ اگر اپنے بعد مجھ کو اپنا قائم مقام
بنانے کا آپ وعدہ کریں تو میں آپ سے بیعت کر لوں گا۔ لیکن آپ نے کھجور کی ایک شاخ
جو آپ کے پاس تھی اس کی طرف اشارہ کر کے صاف جواب دیدیا کہ اگر تو مجھ سے کھجور کی یہ
شاخ بھی مانگے گا تو میں نہیں دونگا۔ [3] اسی قبیلہ کے ایک اور شخص ھوذہ بن علی نے بھی
آنحضرت صلعم کو اسی طرح کی بات لکھی تھی۔ لیکن آپ نے اس کو بھی یہی جواب دیا اور ساتھ ہی
دعا فرمائی کہ اے اللہ! تو مجھ کو اسکے شر سے بچا۔ چنانچہ چند روز کے بعد ہی یہ مر گیا۔ الغرض
مسیلمہ وفد بنو حنیفہ کے ساتھ اپنے قبیلہ میں واپس پہنچا تو نبوت کا دعویٰ کر دیا اور
اسکے ساتھیوں نے یہ خبر اڑا دی کہ محمد رسول اللہ صلعم نے مسیلمہ کو اپنا شریک کار تسلیم کر لیا ہے۔
بنو حنیفہ اور جو لوگ ان کے حلیف تھے وہ سب مسیلمہ کے ساتھی ہو گئے۔ اب مسیلمہ کو جرأت
یہاں تک ہو گئی کہ اس نے آنحضرت صلعم کو ایک خط لکھا جس کا سرنامہ یہ عبارت تھی۔

---

[1] اس تعلق کی ابتدا کیسے ہوئی اور یہ کس نوعیت کا تعلق تھا۔ ابن جریر نے اس کی تفصیل جو کہ نہایت
فحش ہے۔ ج ۳ ص ۲۷۹ پر لکھی ہے [2] فتوح البلدان ص ۹۰ بلاذری نے مسیلمہ کا حلیہ یہ لکھا ہے کہ پست قامت
زرد رنگ اور چپٹی ناک والا تھا۔ بلاذری بیان کے مطابق حبیب مسیلمہ کے باپ کا نہیں دادا کا نام تھا اور باپ
کا نام کبیر تھا لیکن طبری وغیرہ مسیلمہ بن حبیب لکھتے ہیں [3] صحیح بخاری

"من مسیلمة رسول الله الی محمد رسول الله" اور اس کے بعد لکھا تھا۔ آدھی زمین میری ہے اور آدھی زمین قریش کے لئے ہے لیکن قریش انصاف نہیں کریں گے۔"

یہ خط عمرو بن الجارود الحنفی نے مسیلمہ کی طرف سے لکھا تھا۔ اس کا جواب نبی صادق مصدوق نے ابی بن کعب سے جو لکھوایا اسکے شروع میں یہ الفاظ تھے "محمد النبی الی مسیلمة الکذاب" اور پھر لکھا تھا کہ زمین اللہ کی ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔

مسیلمہ کے ساتھیوں میں کثرت سے ایسے لوگ تھے جو مسیلمہ کو جھوٹا سمجھتے تھے اور اسکی بداخلاقی و بدعملی کے باعث اسکو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن صرف قبائلی عصبیت کے باعث اس کے ساتھ لگے ہوئے تھے چنانچہ خود مسیلمہ کا مؤذن جس کا نام حجیر تھا وہ جب اذان دیتا تھا تو برملا کہتا تھا۔ اشهد ان مسیلمة یزعم انه رسول الله" یعنی میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ مسیلمہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور لطف یہ ہے کہ مسیلمہ بھی یہ سن کر کہتا تھا افصح حجیر [1]" اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسیلمہ خود بھی اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھا لیکن صرف اپنا کام نکالنے کیلئے چہرہ پر نبوت کا نقاب ڈال لیا تھا۔

یوں تو مدعیان نبوت کے سلسلہ میں اور بھی دو تین نام ملتے ہیں لیکن انکو فروغ نہیں ہوا۔ اور وہ جلد ہی گمنامی کی موت مر گئے۔ ارتداد و بغاوت کا عرب میں یکبیک جو طوفان امڈا تھا اسکی رہبری اور قیادت بھی مذکورہ بالا چار شخص تین مرد اور ایک عورت کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ عیینہ بن حصن الفزاری اور مالک بن نویرہ وغیرہ بھی اسی قسم کے لوگ انہی میں سے کسی نہ کسی کے اعوان و انصار تھے۔ ان چار میں سے ایک شخص یعنی اسود عنسی تو آنحضرت ﷺ کی ہی حیات میں یا آپ کی وفات کے فوراً بعد (علی اختلاف الروایات) مارا گیا تھا اور اس کے ساتھیوں میں سے جو چند آدمی زندہ و سلامت بچ رہے تھے انہوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی [1] اب فتنہ کے سرخیل درحقیقت طلیحہ سجاح اور مسیلمہ باقی رہ گئے تھے

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۰۷ کہ خود فیروز دیلمی جنہوں نے اسود عنسی کو قتل کیا تھا اور جن کے آنحضرت ﷺ نے انکے متعلق یہ الفاظ فرمائے تھے فقتله رجل مبارک من اهل بیت مبارکین (ایرانی عرب کی طرف اشارہ ہے) انکا بیان ہے کہ اسود کی قتل کے بعد صنعاء میں ہمارا دینی اقتدار قائم ہو گیا جو پہلے تھا اور معاذ بن جبل نماز پڑھاتے تھے (ابوداؤد الانبیاء [illegible])

حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے ان کا خاتمہ کس طرح کیا اور اس طوفان پر کیونکر قابو پایا آئندہ باب میں اس کی تفصیل پڑھو۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے جنگی اقدامات

پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت ابوبکر ؓ نے جب حضرت اسامہ ؓ کی سرکردگی میں لشکر حدود شام کی طرف روانہ کرنے کا ارادہ کیا ہے تو انصار اور کبار مہاجرین کی رائے عرب کی عام بغاوت و فتنہ انگیزی کے باعث اس کے خلاف تھی۔ ان حضرات کو اندیشہ تھا کہ مدینہ کو اسلامی فوج سے خالی دیکھ کر باغی مدینہ پر حملہ کر دیں گے اور پھر ان کا عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جائیگا۔ لیکن خلیفۂ رسول نے اس مشورہ کو محض اسلئے قبول نہیں کیا تھا کہ آپ کے نزدیک سب سے مقدم اور ضروری آنحضرت ﷺ کے ادھورے چھوڑے کام کو پورا کر دینا تھا چنانچہ آپنے ایسا ہی کیا۔

مانعین زکوٰۃ اعراب کا وفد | قبائل عبس ذبیان بنو کنانہ غطفان اور بنو فزارہ جو حوالی مدینہ میں آباد تھے یہ لوگ وہ تھے جو اس کا اقرار کرتے تھے کہ ہم نماز پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ ان میں بھی دو قسم کے لوگ تھے بعض تو وہ تھے جو بربنائے بخل سرے سے ادائے زکوٰۃ کے ہی منکر تھے اور بعض کہتے تھے کہ ہم زکوٰۃ نکالیں گے لیکن اسکو مدینہ نہیں بھیجیں گے۔ ان لوگوں کا استدلال یہ تھا کہ قرآن مجید میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے۔

خذ من اموالهم صدقة تطهرهم	اے پیغمبر آپ لوگوں سے صدقہ لیجئے جو ان کو
وتزكيهم بها وصل عليهم ان صلاتك	پاک و صاف کر دے اور ان کیلئے سلام و رحمت طلب
سكن لهم ۔	کیجئے آپکی صلوٰۃ ان کے لئے تسکین کا باعث ہے

یہ کہتے تھے کہ اب حضور ﷺ کی وفات کے بعد کوئی ایسا نہیں ہے جسکی صلوٰۃ ہمارے لئے تسکین ہو۔ اس لئے اب ہم کسی کو زکوٰۃ نہیں دیں گے اس کے علاوہ ان کا ایک استدلال یہ بھی تھا کہ آنحضرت ﷺ کا زکوٰۃ کے بارہ میں ارشاد ہے۔

تؤخذ من اغنیاءهم وترد الی	زکوٰۃ ہر جگہ کے مال داروں سے لیجائے اور

فَفَرِّقُوا فِي فُقَرَائِهِمْ ۔ انہیں لوگوں کے فقیروں پر تقسیم کردی جائے ۔

اس بنا پر یہ لوگ کہتے تھے کہ ہم زکوٰۃ نکالیں گے تو اس کو مدینہ نہیں بھیجیں گے بلکہ خود اپنے قبیلہ کے فقراء پر ہی تقسیم کردیں گے۔ اب ان لوگوں نے سلسلہ جنبانی اس طرح کی کہ پہلے اپنے وفد گفتگو کے لئے مدینہ بھیجنے شروع کئے۔

ان وفود نے پہلے مدینہ کے دوسرے ذمہ دار حضرات سے گفتگو کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ سے ان کی سفارش کردیں۔

صحابۂ کرام اور حضرت ابوبکرؓ میں گفتگو — اس وقت عرب کی جو عام حالت تھی کچھ اس کا احساس اور کچھ ان وفود کا استدلال بھی کچھ دل لگتا سا تھا۔ صحابۂ کرام ان لوگوں کی گفتگو سے متاثر ہوگئے اور انہوں نے صدیق اکبرؓ سے کہا کہ ان اعراب کو جو زکوٰۃ ادا کرنا نہیں چاہتے اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے اور ان سے مزید کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ صحابۂ کرام کا خیال تھا کہ ان اعراب کا ایمان ابھی نیا نیا ہے۔ مکمل طور پر جب دل نشین اور راسخ ہوجائے گا تو پھر یہ لوگ خود زکوٰۃ دیں گے[1] لیکن حضرت ابوبکرؓ نے یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ "خدا کی قسم اگر یہ لوگ اونٹ کی ایک رسی سے بھی جس کو وہ آنحضرتؐ کے عہد میں ادا کرتے تھے انکار کریں گے تو میں اس پر ان سے جنگ کروں گا۔ اسکے بعد فرمایا "زکوٰۃ مال کا حق (یعنی عبادت) ہے۔ جو لوگ نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کریں گے ان سے قتال کروں گا۔

حضرت عمرؓ جو اپنی رائے کے اظہار میں زیادہ جری اور بیباک تھے انہوں نے کہا "آپ ان لوگوں سے قتال کس بنیاد پر کریں گے؟ آنحضرتؐ نے تو فرمایا ہے" مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک کہ وہ "لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ" نہ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جز ۶ ص ۳۱۱ علامہ ابن حزم نے اسی بنا پر ان لوگوں کی نسبت لکھا ہے وطائفۃ بقیت علی الاسلام ایضا الا انہم قالوا "نقیم الصلوٰۃ" و "شرائع الاسلام" الا انا لا نؤدی الزکوٰۃ الی ابی بکر رضی اللہ عنہ ولا نعطی طاعۃ لاحد بعد رسول اللہ ﷺ (الفصل والنحل ج ۲ ص ۱۱۲) [2] بعض ۔۔۔ روایتوں میں عقال کا لفظ ہے جس کے معنی رسی کے ہیں اور بعض میں عناق کا لفظ ہے اسکے معنی ایک برس سے کم عمر کی بکری کے ہیں۔

پڑھیں۔ لیکن جب وہ یہ کلمہ پڑھ لیں گے تو ان کی جانیں اور ان کے مال محفوظ ہوجائیں گے مگر ہاں جب ان پر کسی کا کوئی حق ہو۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کا استدلال یہ تھا کہ نماز اور زکوٰۃ میں باعتبار فرضیت کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر نماز اور زکوٰۃ دونوں کا ذکر ایک ساتھ ہی ہے اس کے علاوہ قرآن میں ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ ۔ — پس اگر یہ لوگ توبہ کرلیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تم ان سے کچھ نہ کہو۔

پھر یہ معلوم ہے کہ بنو ثقیف کا ایک وفد جو آنحضرتؐ کی خدمت میں طائف سے حاضر ہوا تھا اور اس نے کہا تھا کہ ہم اسلام قبول کرنے کیلئے تیار ہیں لیکن نماز سے ہم کو مستثنیٰ کر دیجئے تو آپ نے بڑی سختی کے ساتھ انکی یہ درخواست رد کردی تھی اور فرمایا تھا "بھلا وہ دین ہی کیا ہے جس میں نماز نہ ہو" انہ لاخیر فی دین لاصلوٰۃ فیہ" پس جس طرح دین نماز کے بغیر کچھ نہیں ہے زکوٰۃ کے بغیر بھی وہ دین باقی نہیں رہ سکتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ چونکہ بالکل حق تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی ایک فیصلہ نے دین کی اصل عظمت اور اس کی اصلیت کو قائم رکھ لیا۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ بھی قائل ہوگئے خود فرماتے ہیں۔

فما ھو الا ان رأیت اللہ قد شرح صدر ابی بکر ۔ — تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی میں نے دیکھ لیا کہ اللہ نے ابوبکر کا سینہ کھول دیا تھا۔

وفود کی ناکام واپسی اور مدینہ کی حفاظت کے انتظامات — بارگاہِ خلافت سے مایوس ہوکر یہ ارکانِ وفد اپنے اپنے قبیلوں کی طرف واپس ہوئے یہاں مدینہ میں دیکھ ہی گئے تھے کہ صحابۂ کرام کی ایک بڑی تعداد حضرت اسامہؓ کے ساتھ جاچکی تھی اور یہاں تھوڑے سے صحابۂ کرام رہ گئے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے قبیلوں کو آمادہ کیا کہ موقع سے فائدہ اٹھاکر مدینہ پر حملہ کردیا جائے۔ ادھر یہ لوگ یہ منصوبے باندھ رہے تھے اور ادھر حضرت ابوبکرؓ نے وقت کی نزاکت کو محسوس کرکے مدینہ کی حفاظت و نگرانی کا بندوبست شروع کردیا۔ آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ کبار صحابہ یعنی حضرت علیؓ۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔ زبیر بن عوامؓ

عبداللہ بن مسعود اور طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہم کی سرکردگی میں مدینہ کے مختلف راستوں پر حفاظتی دستے متعین کر دیئے اور جو اہلِ مدینہ تھے ان پر مسجد میں حاضر ہونا لازمی کر دیا تاکہ اگر کوئی ہنگامی صورت اچانک پیدا ہو جائے تو ان کو فوراً اطلاع ہو سکے اور سب کو خبردار کر دیا کہ اے مسلمانو! یہ وفد تمہاری قلت تعداد کو دیکھ کر گیا ہے۔ اس لئے تم نہیں جانتے کہ یہ صبح کو حملہ کر دیں گے یا شب میں، یہ لوگ مسافت کے اعتبار سے تو آخر تم سے قریب ہیں ہی یہ لوگ ہم سے معاملہ طے کرنے اور بہت کچھ توقعات لیکر آئے تھے لیکن ہم نے ان کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا ہے اس لئے تم تیار ہو جاؤ اور ہوشیار رہو۔[1]

مدینہ پر شبخون

حضرت ابوبکرؓ کا جو اندیشہ تھا وہ آخر صحیح ثابت ہوا۔ وفد کو ناکام گئے ابھی تین دن ہی ہوئے تھے کہ ان قبیلوں نے جو طلیحہ اسدی کے زیرِ اثر تھے اپنے آپ کو دو حصوں میں برابر تقسیم کیا۔ ایک حصہ مقام ذوحسی میں چھوڑا جو مدینہ کے قریب نجد کے راستہ پر واقع ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ کمک کا کام دے۔ رہا دوسرا حصہ تو اس نے مدینہ پر غارت گری کے ارادہ سے چڑھائی کر دی۔ مدینہ کی حفاظت پر جو دستہ متعین تھا اس نے حضرت ابوبکرؓ کو اطلاع پہونچائی۔ آپ نے حکم دیا کہ تم اپنی جگہوں پر رہو اور ادھر سے آپ خود مسلمانوں کو اونٹنیوں پر لیکر روانہ ہوئے باغی مقابلہ کی تاب نہ لاکر بھاگ پڑے، مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا۔ باغی مقام ذوحسی پہونچے تو جو لوگ یہاں پہلے سے موجود تھے وہ بھی اب ان کے ساتھ مل گئے مسلمان اونٹوں پر انکا تعاقب کرتے ہوئے آ ہی رہے تھے کہ ذوحسی والوں نے کیا حرکت کی چمڑہ کے تھیلے جو ان کے ساتھ تھے ان میں پھونک بھر کر غبارہ کی شکل بنا کر ان میں رسیاں باندھیں اور انکو اونٹوں کی طرف پھینک مارا۔ مسلمانوں کے یہ اونٹ جنگ کی فریب کاریوں کے عادی نہ تھے اسلئے بھاگ پڑے اور سیدھے مدینہ میں آکر ٹھہرے

مدینہ پر حملہ کی تیاریاں

قبیلۂ عبس و ذبیان، بنو مرۃ اور بنو کنانہ وغیرہم جو انکے حلیف تھے سمجھے کہ مسلمان کمزور پڑ کر بھاگ گئے ہیں، اس لیے اب انکا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۱، ۳۱۲ و کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۴۰ و طبری ج ۳ ص ۲۴۶ و البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۲

مدینہ پر باقاعدہ حملہ کے ارادہ سے ذوالقصہ (یہ مقام بھی مدینہ سے قریب نجد کے راستہ پر ہے) والوں کو بھی پیغام بھیجا کہ ان کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ طلیحہ کا بھائی (حافظ عماد الدین ابن کثیر نے بیٹا لکھا ہے) حبال ان کی قیادت کر رہا تھا۔ ادھر یہ لوگ مدینہ پر حملہ کا جواب دیکھ رہے تھے اور ادھر حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ واپس پہونچکر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا آتے ہی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ باقاعدہ فوج کی ترتیب کی۔ فوج کے دائیں بازو پر نعمان بن مقرن کو، بائیں بازو پر عبداللہ بن مقرن کو مقرر کیا اور پچھلا حصہ ان کے بھائی سوید کے سپرد کیا۔ ابھی ایک پہر شب باقی تھی کہ روانہ ہو گئے۔ صبح کی پو پھٹی بھی نہیں تھی کہ دشمن پر جا پہونچے یہ لوگ بے خبر آرام سے سو رہے تھے مسلمانوں نے تلوار چلانی شروع کر دی یہ لوگ بدحواس ہو کر بھاگے تو ذوالقصہ میں دم لیا خلیفۂ رسول نے ذوالقصہ تک ان کا تعاقب کیا لیکن اب ان لوگوں میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی اسلئے حضرت نعمان بن مقرن کو ان کے دستہ کے ساتھ ذوالقصہ میں چھوڑ کر خود مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ یہاں مسلمانوں کی اس کامیابی سے جو آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ حاصل ہوئی تھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ پھر اس پر مزید یہ ہوا کہ مختلف قبائل کے جو سردار مسلمان تھے وہ اپنی اپنی زکوٰۃ لے کر مدینہ پہونچ گئے اس سے جہاں مالی اعتبار سے تقویت ہوئی اور مسلمانوں کو امداد پہنچی یہ بھی ثابت ہو گیا کہ باغیوں اور مرتدوں کی کثرت کے باوجود متعدد بیرونی قبائل کے رؤسا پکے اور سچے مسلمان تھے اس احساس نے خوشی دوچند کر دی۔

جو حضرات مدینہ کا پہرہ دے رہے تھے ان میں سے ایک ایک صاحب زکوٰۃ پیش کو لیکر مدینہ میں آتا تھا تو مسلمان ان کو دیکھ کر کہتے "نذیر"[1] حضرت ابوبکرؓ فوراً فرماتے کہ نہیں بلکہ وہ بشیر ہیں اور اسلام کے حامی ہیں۔ سست نہیں ہیں۔ اصل الفاظ یہ ہیں"

[1] طبری ج ۳ ص ۲۴۷ چونکہ یہ حضرات مدینہ کے پہرہ دار تھے اس لئے ان کا آنا بظاہر اس بات کی علامت تھی کہ مدینہ کو کوئی خطرہ پیش آگیا ہے اور یہ اسکی اطلاع لیکر آئے ہیں مسلمان فرطِ مسرت سے مذاق میں ان کو نذیر اسی مناسبت سے کہتے تھے جو حضرات صدقات لیکر آئے تھے تاریخوں میں ان سب کے نام لکھے ہوئے

"بَل ھو بشیرٌ۔ وھو ھام ولیس بوانٍ" لوگ اس کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ سے کہتے "طالما بشرت بالخیر" آپ تو ہمیشہ ہی خیر کی بشارت دیتے رہے ہیں۔

عبس وذبیان کی غداری حضرت ابوبکرؓ کی ذوالقصہ سے واپسی کے بعد قبیلہ عبس وذبیان کا اور کوئی بس نہ چلا تو یہاں تھوڑے بہت جو مسلمان تھے ان کو دھوکہ سے قتل کر ڈالا۔ صدیق اکبرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو قسم کھائی کہ جب تک وہ ان قبیلوں سے مسلمانوں کے خونِ ناحق کا بدلہ نہیں لے لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اسی اثناء میں حضرت اسامہ اپنی مہم سے فارغ ہو کر مدینہ واپس آ گئے تھے اب حضرت ابوبکرؓ کو اور زیادہ اطمینان ہوا، آپ نے حضرت اسامہ کو مدینہ میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور فرمایا اریحو واستریحو! تم لوگ اب آرام کرو۔

ذوالقصہ کو روانگی اس انتظام سے فارغ ہو کر آپ نے بنفس نفیس ایک فوج لیکر ذوالقصہ کی روانگی کا ارادہ کیا تاکہ غدار قبیلوں کو انکی غداری کی سزا دیکر مسلمانوں کا انتقام لیں صحابہ کرام نے ہر چند منت وسماجت کی اور کہا اے خلیفۂ رسول! ہم آپکو قسم دیتے ہیں آپ نہ جائیے اگر خدانخواستہ آپ کو چشم زخم پہنچا تو ہم لوگوں کا کوئی نظام باقی نہیں رہے گا۔ اور آپ کا یہاں رہنا دشمن کیلئے سخت مرعوب کن ہوگا آپ اپنے بجائے کسی دوسرے کو بھیج دیجئے گا وہ اگر کام آ گئے تو آپ انکی جگہ کسی دوسرے کو مقرر کر سکتے ہیں[1] لیکن حضرت ابوبکرؓ نہ مانے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جب میرے باپ سواری پر بیٹھے اور تلوار میان سے باہر نکالے ذوالقصہ کیلئے روانہ ہونے لگے تو حضرت علی ابن ابی طالب ان کی سواری کی باگ روک کر کھڑے ہو گئے اور بولے "اے رسول اللہؐ کے خلیفہ! آپ کہاں جا رہے ہیں! میں آپ سے وہی کہوں گا جو آنحضرتؐ نے غزوۂ احد کے موقع پر آپ سے کہا تھا یعنی یہ کہ آپ اپنی تلوار میان میں کیجئے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر دردمند نہ کیجئے"۔[2]

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۷۹ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۵ لیکن اسکے بعد حافظ صاحب فرماتے (بقیہ صفحہ آئندہ)

مانعین زکوٰۃ کی مکمل سرکوبی لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان سب کے جواب میں فرمایا۔ "اللہ کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا۔ اور میں اپنے نفس کے ساتھ تمہاری غمخواری قبول نہیں کر سکتا"، چنانچہ آپ اپنا لشکر لیکر ذی حسی اور ذوالقصہ کیطرف روانہ ہو گئے۔ مقام ابرق میں اہل ربذہ پر حملہ کیا۔ حارث اور عوف یہاں کے لیڈر تھے، ان کو شکست دی بنو عبس اور بنو بکر خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ ابرق میں چند روز قیام فرمانے کے بعد آگے بڑھے اور بنو ذبیان کو مغلوب کیا اور ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اور آخر اس طرح عبس وذبیان نے جن مسلمانوں کو شہید کیا تھا ان کا انتقام لیکر فتح وکامرانی کا پرچم اڑاتے ہوئے مدینہ واپس آ گئے۔[1]

بنو ذبیان۔ عبس۔ غطفان۔ بنو بکر اور ان کے علاوہ دوسرے قبیلے جو مدینہ کے قرب وجوار میں آباد تھے اور جو اعراب مدینہ کہلاتے تھے حضرت ابوبکرؓ کی ان کے ساتھ یہ آخری کامیاب جنگ تھی، ان کو چاہئے تھا کہ اب وہ حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت قبول کر لیتے اور زکوٰۃ کی فرضیت کے بھی قائل ہو کر مسلمان اور پکے مومن بن جاتے لیکن ان پیہم شکستوں نے ان کو بوکھلا دیا تھا۔ اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک اسلام کی جو مصنوعی نقاب انہوں نے اپنے چہرہ پر ڈال رکھی تھی اسے بھی نوچ کر پھینک دیا اور جو کھلم کھلا باغی اور کافر تھے ان کی صفوں میں جا کر مل گئے۔ اس لئے حروب ارتداد کا اب ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

---

[1] طبری ج ۳ ص ۴۷۹ (بقیہ صفحہ گزشتہ) ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت علی کی درخواست قبول کر لی اور وہ خود واپس ہو گئے اور لشکر روانہ کر دیا حالانکہ طبری وغیرہ میں ہے کہ آپ نے یہ مشورہ منظور نہیں فرمایا اور بنفس نفیس تشریف لے گئے۔

مدعیانِ نبوّت اور مرتدین سے عام جنگ

اس وقت تک حضرت اُسامہ اور انکے رفقاء کچھ دنوں آرام کرنیکے بعد تازہ دم ہوچکے تھے اس لئے اب موقع تھا کہ مدعیانِ نبوت کے برخلاف نہایت شدید اور ہمہ گیر مہم کا آغاز کیا جائے اور اس کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ بنو عبس و ذبیان اور بنو بکر وغیرہم ربذہ میں شکست فاش کھانے کے باوجود راہ راست پر آنیکے بجائے طلیحہ کے زیر دامن پناہ گیر ہو گئے تھے وہاں سے بنو غطفان اور بنو سلیم دوسرے قبیلے پہلے سے تھے ہی اسلیئے اب طلیحہ کی طاقت دو چند ہو گئی تھی اور وہ اس وقت اسلام کے لیئے بڑا خطرہ بنا ہوا تھا یہ حال تو مدینہ کے مشرق اور شمال مشرق کا تھا۔ اس کے علاوہ جنوب میں جو آگ لگی ہوئی تھی اس کا مختصراً ذکر آ ہی چکا ہے۔

اسلامی فوج کے گیارہ دستے

ان سب امور کے پیشِ نظر حضرت ابوبکرؓ ذوالقصہ میں دوبارہ تشریف لائے اور یہاں پوری اسلامی فوج کو گیارہ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصہ کا الگ الگ ایک سردار جو صاحبِ علم ہوتا تھا مقرر فرمایا۔ اسکی تفصیل حسب ذیل نقشہ سے معلوم ہوگی۔

(نقشہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیے)

نمبر	سردار فوج کا نام	مقام جنگ	ان قبیلوں یا اشخاص کے نام جن سے جنگ کرنے کیلئے ان سرداران فوج کا تقرر ہوا تھا۔
۱	حضرت خالد بن الولید سیف اللہ	بزاختہ اور بطاح	طلیحہ اور مالک بن نویرہ
۲	" عکرمۃ ابن ابی جہل	یمامہ	مسیلمہ کذاب اور بنو حنیفہ
۳	" مہاجر ابن ابی امیہ	یمن و حضرت موت	پیروانِ اسود عنسی اور قیس بن المکشوح
۴	" عمرو بن العاص	عرب و شام کی سرحد	قضاعہ۔ ودیعہ اور حارث
۵	" خالد بن سعید بن العاص	الحمقتین (حدود شام میں)	یہاں جو قبائل آباد تھے بڑے سرکش تھے
۶	" علاء بن الحضرمی	بحرین	الحطم بن ضبیعہ
۷	" سوید بن المقرن	یمن کا نشیبی علاقہ	
۸	" عرفجہ بن ہرثمہ	مہرہ	
۹	" حذیفہ بن محصن	عمان	لقیط بن مالک الازدی
۱۰	" طریفہ بن حاجز السلمی[1]	عرب کا شمالی حصہ	بنو سلیم و ہوازن۔
۱۱	" شرحبیل بن حسنہ	یمامہ (حضرت عکرمہ کیساتھ)	مسیلمہ و بنو حنیفہ[2]

وقت اور سیاست کا تقاضہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ خود مدینہ میں قیام فرمائیں چنانچہ آپ فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے دار الخلافہ میں مقیم رہے اور یہیں سے فوج کی نقل و حرکت کی نگرانی اور اس کیلئے احکام و ہدایات جاری کرتے رہے۔

اتمام حجت کے لئے حضرت ابوبکرؓ نے فوج کو روانہ کرتے وقت ایک اعلان عام لکھ کر ہر ہر دستہ فوج کو الگ الگ دیا تاکہ جنگ سے پہلے باغیوں اور دشمنوں کو سنا دیا جائے۔ اسکو سنکر اگر یہ لوگ راہ راست پر آجائیں اور اسلام کی اطاعت قبول کرلیں تو ان سے درگزر کیا جائے ورنہ پھر جنگ فیصلہ کریگی چونکہ حضرت ابوبکرؓ کی یہ تحریر نہایت

[1] طبری نے (ج ۳ ص ۲۸۰) ان کا نام طریفہ لکھا ہے لیکن ابن اثیر اور دوسری تاریخوں میں معن بن حاجز ہے دیکھو کامل ابن اثیر ج ۲ ص ص ۲۹۳ [2] طبری و ابن اثیر

اہم ہے جس سے آپ کی سیاسی بصیرت عزم و ہمت پر روشنی پڑتی ہے۔ اور ساتھ ہی مختصراً اسلام کی اصل روح اس میں سمو دیگئی ہے اسلیئے ہم ذیل میں طوالت کے باوجود اس کا پورا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

خلیفۂ رسول کا اعلان عام | ابوبکر خلیفۂ رسول اللہ کیطرف سے اُن تمام عام و خاص لوگوں کے نام جن کے پاس میری یہ تحریر پہونچے اور جو اسلام پر قائم ہوں یا اُس سے روگرداں ہو گئے ہوں۔ سلام اُن پر جنھوں نے ہدایت کی پیروی کی اور ایک مرتبہ اسکو قبول کرنیکے بعد اس سے گمراہی اور اندھے پن کی طرف نہیں لوٹے میں تم سب لوگوں کے سامنے اس اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور محمدؐ اس کے بندہ اور رسول ہیں ہم اُن تمام چیزوں کا اقرار کرتے ہیں جو آپ لیکر آئے اور جو شخص اس کا منکر ہے ہم اس کی تکفیر کرتے ہیں اور ہم اس سے جہاد کرینگے اما بعد (اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کو اپنی طرف سے حق کیساتھ اپنی مخلوق کیطرف بشیر و نذیر اور حق کا داعی بنا کر اور چراغ فروزاں بنا کر بھیجا۔ تاکہ جو لوگ زندہ ہیں آپؐ انکو ڈرائیں اور کافروں پر اللہ کی حجت تمام کر دیں۔ اللہ نے جس کو توفیق دی اس نے یہ امر حق بخوشی قبول کر لیا اور جس نے اس سے پشت پھیری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم اللہ اس پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ بھی طوعاً یا کرہاً اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے رسولؐ کو اس دنیا سے اٹھالیا۔ آپؐ اللہ کے امر کو نافذ کر چکے تھے اور آپ پر جو کچھ فرض تھا اس کو پورا کر چکے تھے اللہ اس بات[1] (وفات نبویؐ) کو اپنی کتاب کے ذریعہ محمدؐ رسول اللہ

---

[1] حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر آنحضرتؐ کی وفات کا ذکر زیادہ فوقیت کیساتھ اس لیئے کیا کہ عیینہ بن حصن وغیرہ جیسے مفسد قبائل میں یہی پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ محمدؐ کی وفات ہو گئی اور طلیحہ ابتک زندہ ہے اور زندہ رہیگا اس سے معلوم ہوا کہ اصل پیغمبر طلیحہ ہی ہے۔ غور کرو حضرت ابوبکرؓ کے یہ ارشادات منصب نبوت اور مقام رسالت سے متعلق اسلام کے اصل نقطۂ نظر کی کتنی اعلیٰ قسم کی توضیح ہے جسکے باعث اسلام دوسرے مذاہب باطلہ سے ممتاز ہو جاتا ہے

اور تمام اہل اسلام کو صاف طور بیان کر چکا تھا چنانچہ اُس نے کہا۔

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ ۝	بیشک آپ بھی مرنے والے ہیں اور دوسرے بھی مرنے والے ہیں

اور اس نے کہا۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِنْ مِتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ۝	اور آپ سے پہلے ہم نے کسی انسان کو بھی دوامی زندگی نہیں بخشی تو کیا جب آپ مر جائیں گے تو یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیتوں میں تو خطاب خاص آنحضرتؐ سے تھا۔ ان کے علاوہ عام مومنوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا۔

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم على اعقابكم ومن ينقلب على عقبيه فلن يضر الله شيئا وسيجزي الله الشاكرين ۝	اور محمدؐ نہیں ہیں مگر ایک رسول ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو اگر یہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم روگردانی اختیار کر لوگے اور جو روگردانی اختیار کریگا۔ تو وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا ہے اور اللہ شکر گزاروں کو جزا دے گا۔

پس جو شخص محمدؐ کی پوجا کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمدؐ مر گئے۔ لیکن ہاں جو شخص صرف اللہ کو پوجتا ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے تو اللہ اسکی نگرانی کرنیوالا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے وہ قیوم ہے اور اس کو کبھی موت نہیں آئیگی اس کو نہ غنودگی آتی ہے اور نہ نیند۔ وہ اپنے امر کی حفاظت کرنے والا ہے۔ اپنے دشمن سے بدلہ لینے والا ہے اور وہ اس کو اس دشمنی کی سزا دیگا اور میں تم لوگوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو اس سے اور جو چیز تمہارے نبیؐ لائے ہیں اس سے اپنا حصہ لو آنحضرتؐ کے اسوہ کا اتباع کرو اللہ کے دین کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو کیونکہ جس شخص کو اللہ ہدایت نہیں دیتا وہ گمراہ ہے اور جس کو اللہ معاف نہیں کرتا وہ عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جس شخص کی مدد اللہ نہیں کرتا وہ رسوا ہوتا ہے۔ جس کو اللہ نے ہدایت دی وہ راہ راست پر آیا۔ اور جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا وہ گم کردہ

راہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا۔ اور پھر اس کا دنیا میں کوئی عمل قبول نہیں کیا جاتا جو اسکو اللہ سے قریب کر دے۔ اور آخرت میں نہ کوئی فدیہ قبول کیا جاتا ہے اور نہ اس کے برابر کی کوئی چیز۔

تم میں سے جو لوگ اسلام کا اقرار کرنے اور اس پر عمل کرنے کے بعد اپنے دین سے پھر گئے ہیں مجھ کو ان کی اطلاع پہونچی ہے۔ ان لوگوں نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ وہ اللہ کے متعلق غلط فہمی میں ہیں۔ اس کے امر سے جاہل ہیں اور انہوں نے شیطان کی آواز پر لبیک کہا ہے۔

اب میں انصار و مہاجرین اور تابعین باحسان کے لشکر کا فلاں فلاں کو سردار بنا کر تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میں نے ان کو حکم کیا ہے کہ وہ اس وقت تک کسی سے نہ قتال کریں اور نہ قتل کریں جب تک کہ اللہ کیطرف اسکو دعوت نہ دیں۔ اس دعوت کو جو شخص لبیک کہے گا اقرار کریگا۔ اپنی شرارت اور فتنہ انگیزی سے باز آجائیگا۔ اور نیک عمل کریگا۔ یہ میرا نمائندہ اسکو قبول کریگا۔ اور اسکی مدد کریگا۔ لیکن اس کے برخلاف جو شخص انکار کریگا تو میں نے حکم دیا ہے کہ اس سے قتال کیا جائے۔ پھر جب یہ دشمن ہاتھ لگ جائے تو ان کو آگ میں جلائے۔ ان کو قتال کر کر کے ختم کرے اور ان کی عورتوں اور اولاد کو گرفتار کرلے۔ اور اب سوائے اسلام کے ان سے کوئی چیز قبول نہیں کی جائیگی۔ پس جو لوگ ان میرے نمائندوں کا اتباع کریں گے تو وہ ان کیلئے بہتر ہوگا۔ اور جو ان کی پرواہ نہیں کرے گا وہ اللہ کو ذرا عاجز نہیں کر سکتا۔

میں نے اپنے نامہ بردوں کو حکم دیا ہے کہ میری یہ تحریر تم لوگوں کے ہر مجمع میں پڑھ کر سنائی جائے"۔ [1]

عہد نامہ | لشکر روانہ ہوئے تو ان کے آگے آگے یہ نامہ بر چل رہے تھے جو اس تحریر کیلئے

[1] طبری ج ۳ ص ۴۸۱ - ۴۸۲

ہوئے تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی کا یہ اعلان تو مرتدین کے نام تھا جن سے قتال کرنیکے لئے یہ لشکر روانہ ہو رہے تھے اس کے علاوہ خاص امراء فوج کے نام آپنے ایک عہد نامہ الگ تحریر فرمایا تھا جس میں ان کے فرائض و واجبات بتائے گئے تھے اور جنگ کے سلسلہ میں انکو خاص خاص ہدایات اور احکام دئے گئے تھے اس میں بھی یہ بات بالکل صاف صاف کہدی گئی تھی کہ ان مرتدین سے اسلام کے سوا کوئی اور دوسری چیز مقبول نہیں ہوگی اور خود مسلمانوں کے ساتھ نرمی و ملاطفت کا برتاؤ کرنے کی تاکید کی تھی۔ [1]

جنگِ بُزاخہ

عبس اور ذبیان کی شکست کے وقت طلیحہ سمیرا ایک مقام میں مقیم تھا اب وہ بزاخہ میں آگیا تھا۔ اور ادھر ادھر کے قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک بڑی جنگ کی تیاری کر رہا تھا۔ حضرت خالد بن الولید اسی کے مقابلہ پر مامور کئے گئے تھے۔

حضرت خالد کو ہدایات | حضرت خالد جب اپنی مہم پر روانہ ہوئے لگے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی نے ان کو چند ہدایات دیں جن سے خلیفۂ رسول کی فوجی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے آپنے فرمایا۔

"تم پیش قدمی اس طرح کرنا کہ قبیلۂ بنو طے سے آغاز کرو [2] پھر بزاخہ کا رخ کرنا اور جب یہاں سے فارغ ہو جاؤ تو پھر بطاح کیطرف پیش قدمی کرنا۔ اور ساتھ ہی حکم دیا کہ جب تم ایک مہم سے فارغ ہو جاؤ تو بس اسی جگہ اس وقت تک رہنا جب تک کہ میرا حکم نہ پہنچ جائے ساتھ ہی حضرت ابوبکر نے بطور ایک تدبیر کے

[1] طبری ج ۳ ص ۴۸۲ [2] صدیق اکبر کو معلوم تھا کہ اگرچہ اس وقت بنو طے بھی طلیحہ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں لیکن وہ ایسے زیادہ سرکش نہیں ہیں معمولی گفتگو اور کسی قدر تخویف و تنبیہ سے رام ہو جائیں گے۔ اسی بنا پر آپ نے بنو طے کے متعلق یہ مشورہ دیا۔

دشمن کو مرعوب کرنے کی غرض سے خود اپنے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ میں ایک فوج لے کر خیبر جا رہا ہوں اور وہاں خالد کی فوج کے ساتھ مل کر اسکی مدد کروں گا۔

بنو طے مسلمان ہوتے ہیں قبیلہ بنو طے کا مقام اجا تھا۔ خلیفۂ رسول کی ہدایت کے مطابق حضرت خالد نے پہلے اس کا رخ کیا۔ حضرت عدی بن حاتم جو اس قبیلہ کے معزز شخص تھے اور اپنے اسلام پر قائم تھے حضرت ابوبکر کے حکم سے بنو طے کے پاس آئے اور کہا کہ دیکھو خالد ایک لشکر جرار لیکر تم لوگوں کیطرف روانہ ہو چکے ہیں۔ اور ادھر خود ابوبکر بھی ایک لشکر کیساتھ خیبر جا رہے تھے۔ اس لئے تم لوگوں کیلئے بہتر یہی ہے کہ اسلام قبول کر لو اور طلیحہ کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ اسلامی فوج تمکو تباہ و برباد کر دیگی۔ ان لوگوں نے پہلے تو حضرت عدی کی بات کا مذاق اڑایا اور حضرت ابوبکر کیلئے بطور استخفاف و تمسخر ابوالفصیل کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن جب حضرت عدی نے پھر دوبارہ قوت کے ساتھ کہا کہ تم کس خواب خرگوش میں ہو۔ جو فوج تمہاری طرف بڑھ کر آ رہی ہے اس کا قائد کسی بچھڑے کا باپ (ابوالفصیل) نہیں بلکہ فحل اکبر (ایک بڑا سانڈ) ہے اب تم جانو ورنہ تمہارا کام۔ اب یہ لوگ نرم ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اچھا! آپ جا کر ذرا اس لشکر کو ہم سے دور رکھئے ہمارے وہ بھائی جو طلیحہ کے پاس بزاخہ چلے گئے ہیں ہم انکو حسن تدبیر سے واپس بلا لیں ورنہ طلیحہ ان سب کو قتل کر دیگا۔ عدی نے یہ بات مان لی۔ حضرت خالد اس وقت مقام سنح میں فروکش تھے عدی یہاں آئے اور کہا "آپ ذرا تین دن کا توقف کیجئے اس درمیان میں پانچ سو بڑے بڑے جنگجو سپاہی آپ سے آکر مل جائیں گے جن سے آپ کو بڑی تقویت ہوگی۔ حضرت خالد نے یہ درخواست منظور کر لی۔ آخر حضرت عدی نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ بزاخہ سے قبیلہ بنو طے کے لوگ جو وہاں چلے گئے تھے جب واپس آگئے تو حضرت عدی ان کو لیکر حضرت خالد کی خدمت میں آئے اور انہوں نے اسلام کی اطاعت قبول کی۔[1]

ابن کثیر کا بیان ہے کہ اسطرح حضرت خالد کی فوج میں ایک ہزار شہسواروں کا اضافہ ہو گیا۔

[1] تین دن کی مہلت کا ذکر طبری نے کیا ہے۔ ج ۲ ص ۴۸۳ لیکن کامل ابن اثیر (ج ۲ ص ۲۶۲) میں دنوں کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ اور غالباً صحیح بھی یہی ہے کیونکہ بظاہر تین دن میں ان تمام سپاہیوں کا واپس آنا مشکل تھا۔

بنو جدیلہ مسلمان ہوتے ہیں اب حضرت خالد مقام انسر کیطرف بڑھے جو جدیلہ کی قیام گاہ تھا۔ حضرت عدی نے پھر مداخلت کی اور فرمایا کہ قبیلہ طے ایک پرندہ کی طرح ہے اور جدیلہ اس پرندہ کا ایک پر ہے۔ اس پرندہ کا ایک پر یعنی طے تو درست ہو گیا۔ اب مجھ کو ذرا موقع دیجئے کہ میں دوسرے پر (جدیلہ) کو بھی درست کر دوں۔ حضرت خالد نے یہ درخواست بھی منظور کر لی۔ عدی ان لوگوں کے پاس آئے اور ان سے بھی وہی بات کہی جو طے سے کہی تھی اس کے بعد ان کو اسلام کی دعوت دی۔ ان لوگوں نے دعوت فوراً قبول کر لی اور حضرت عدی کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ اب بنو جدیلہ کے مسلمان ہو جانے سے حضرت خالد کی فوج میں مزید ایک ہزار سواروں کا اضافہ ہو گیا۔[1]

حضرت عدی بن حاتم کا یہ کارنامہ اتنا شاندار اور مبارک ہے کہ مورخین لکھتے ہیں "عدی بہترین شخص تھے ان سب لوگوں میں جو طے میں پیدا ہوئے تھے"

ایسی حالت میں جبکہ تمام عرب میں اسلام کی مخالفت کی آگ لگی ہوئی تھی اچانک بلا کسی جنگ و جدال کے محض ایک شخص کی تبلیغ و فہمائش پر دو قبیلوں کا مسلمان ہو جانا اور ان کے دو ہزار سپاہیوں کا اسلامی فوج میں آ شریک ہونا جہاں اسلام کا ایک معجزہ ہے حضرت ابوبکر صدیق کے حسن تدبیر و سیاست کا بھی بڑا ثبوت ہے۔

اب حضرت خالد اپنی اصل منزل مقصود یعنی بزاخہ کیطرف روانہ ہوئے مقدمۃ الجیش کے طور پر حضرت عکاشہ بن محصن اور ثابت بن اقرم انصاری کو پہلے سے روانہ کر دیا تھا۔ اتفاق سے کہیں ان دونوں کو طلیحہ کا بھائی حبال مل گیا۔ انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ طلیحہ کو اسکی اطلاع ہوئی تو وہ اپنے بھائی سلمہ کو لیکر نکلا اور طلیحہ نے حضرت عکاشہ کو اور حضرت ثابت کو سلمہ نے قتل کر دیا اور اسکے بعد یہ دونوں واپس لوٹ آئے۔ اب حضرت خالد اپنے لشکر کے ساتھ اس مقام پر پہنچے تو حضرت عکاشہ اور حضرت ثابت کو مقتول دیکھ کر آپکو اور مسلمانوں کو سخت رنج ہوا۔ بہرحال اب بزاخہ کا میدان جنگ سامنے تھا۔ طلیحہ کیساتھ اس وقت عیینہ بن حصن الفزاری اپنے قبیلہ کے سات سو بہادروں کیساتھ تھا۔ انکے علاوہ قبیلہ قیس اور ہوا

[1] طبری ج ۲ ص ۴۸۳ وابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۳

بھی ایسے جانثاروں میں تھے چونکہ بنو اسد اور بنو طے دونوں آپس میں ایک دوسرے کے حلیف تھے اسلئے طے کے جو سپاہی حضرت خالد کی فوج میں شامل تھے انہوں نے بلا کم و کاست قبیلۂ قیس سے جنگ کی لیکن حضرت عدی بن حاتم اس پر کہاں چپ رہ سکتے تھے۔ فوراً بولے! خدا کی قسم میرے خاندان کا زیادہ سے زیادہ عزیز و قریب بھی اس دین کو ترک کریگا تو میں اس سے بھی قتال کر دونگا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ چونکہ بنو اسد اور بنو طے آپس میں ایک دوسرے کے حلیف ہیں اسلئے بنو طے بنو اسد سے جنگ نہیں کریں گے! حضرت خالد نے فرمایا "یہ قیس بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اگر بنو طے انہیں سے لڑنا چاہتے ہیں تو اچھا ایسا کرو کہ خود ان کی مخالفت نہ کرو۔"

طلیحہ سے جنگ اب مسلمان فوج اسطرح بڑھی کہ بہادرانِ طے قیس کے بالمقابل صف آرا تھے اور باقی مجاہدین دوسرے قبیلوں کے سامنے صفیں جمائے کھڑے تھے جنگ شروع ہوئی تو نہایت گھمسان کا رن پڑا عیینہ کو اپنے بہادروں پر بڑا ناز تھا لیکن اسلامی فوج نے اس کو بدحواس کردیا طلیحہ ایک چادر میں لپٹا ہوا بالوں کے ایک خیمہ میں مقیم تھا عیینہ کو اپنی فوج کے پاؤں اکھڑتے نظر آئے تو گھبرا گھبرا کر طلیحہ کے خیمہ میں پہنچکر پوچھتا تھا کہ کوئی وحی آئی لیکن طلیحہ ہر مرتبہ جواب نفی میں دیتا ہے۔ آخر جب تیسری بار عیینہ آیا اور یہی سوال کیا تو طلیحہ نے کہا ہاں وحی آئی ہے اور وہ یہ ہے ان لك رحاً كرحاه وحديثاً لا تنساه "عیینہ غصہ کے مارے بے قابو ہوگیا اور بولا "اللہ جانتا ہے کہ تجھ کو ایسا واقعہ پیش آئیگا کہ تو اسکو نہیں بھولیگا" طلیحہ سے یہ کہکر اس نے بنو فزارہ سے کہا کہ لوگو! یہ شخص جھوٹا ہے اس لئے اب تم جنگ سے ہٹ جاؤ۔ طلیحہ کی سب سے بڑی طاقت یہی بنو فزارہ تھے اس لئے میدان جنگ سے ان کا الگ ہونا تھا کہ طلیحہ کی فوج کو شکست ہوگئی طلیحہ نے اپنے لئے ایک گھوڑا اور اپنی بیوی نوار کیلئے ایک سواری کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا میاں بیوی دونوں اپنی اپنی سواری پر بیٹھ میدان جنگ سے بھاگ نکلے طلیحہ نے بھاگتے بھاگتے کہا "اے بنو فزارہ تم میں سے جو شخص بھی اس وقت اپنی بیوی کے ساتھ بھاگ سکتا ہو اسے چاہیئے کہ اپنی جان لے کر بھاگ جائے۔"

طلیحہ کی شکست اور اس کا مسلمان ہونا طلیحہ یہاں سے فرار ہو کر سیدھا شام پہونچا۔ کچھ دنوں بعد جب اسکو معلوم ہوا کہ قبیلۂ اسد و غطفان دونوں مسلمان ہوگئے ہیں تو بنو کلب میں آکر خود بھی مسلمان ہوگیا۔ ایک مرتبہ عمرہ کے ارادے سے مکہ جاتے ہوئے مدینہ کے قرب و جوار سے گذر رہا تھا کہ کسی شخص نے حضرت ابوبکر کو اطلاع دی آپ نے فرمایا "اب میں کیا کروں وہ مسلمان ہوچکا ہے"

حضرت ابوبکر کی وفات تک وہ بنو کلب ہی میں رہا جب حضرت عمر فاروق سے بیعت خلافت کرنیکی غرض سے وہ خلیفۂ دوم کے سامنے آیا تو حضرت عمر نے پوچھا "کیا تو وہی ہے جس نے عکاشہ اور ثابت کو قتل کیا تھا؟ واللہ میں تجھ کو کبھی پسند نہیں کرسکتا" طلیحہ نے جواب دیا امیر المومنین! اسلام تو پرانی چیزوں کو منہدم کردیتا ہے۔ اب ان باتوں کا کیا ذکر۔ اس کے علاوہ آپکو ایسے دو شخصوں کی کیا فکر ہے جن کو اللہ نے میرے ذریعہ عزت بخشی یعنی شہادت پائی اور ان دونوں کے ہاتھوں نے مجھ کو ذلیل نہیں کیا۔ یہ سنکر حضرت عمر نے طلیحہ کو بیعت کرلیا [1]

جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق کے جو مرتد قبائل تھے حضرت خالد کی ان کے ساتھ یہ آخری جنگ تھی۔ یہ شکست خوردہ قبائل بنو اسد اور قیس اور بنو فزارہ اپنے متعلقین کو میدان جنگ میں نہیں لائے تھے اور خود انہوں نے شکست کے بعد فوراً اسلام قبول کرلیا اسلئے ان میں سے کسی کو غلام باندی نہیں بنایا گیا اور حضرت خالد نے ان کو امن دیدیا [2]

بنو عامر کا اسلام بنو عامر نہ ادھر تھے اور نہ ادھر۔ متردد تھے اور یہ دیکھ رہے تھے کہ جنگ میں کس کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ اب حضرت خالد کو فتح ہوئی اور بنو طے، بنو جدیلہ، اسد، قیس اور غطفان یہ سب قبائل مسلمان ہوگئے تو اب ان میں سرکشی اور بغاوت کی جرأت نہیں رہی حضرت خالد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اقرار کیا کہ ہم اسلام قبول کرتے ہیں اور اب نماز بھی پڑھیں گے اور زکوٰۃ بھی ادا کریں گے حضرت خالد نے ان سے بیعت لی اور انکو امن دیا

ظالموں کو سخت سزائیں مذکورۂ بالا جو قبائل مسلمان ہوگئے تھے انکے خاص خاص خبیث الفطرت سرداروں اور امیروں نے ان مسلمانوں پر اپنے ارتداد کے زمانہ میں بہت شدید مظالم کئے تھے جو ان میں گھر کر رہ گئے تھے اس لئے ان مسلمانوں کا انتقام لینا ضروری تھا چنانچہ حضرت خالد نے ان تمام قبائل کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اس قسم کے لوگوں کو پیش کریں۔ یہ لوگ آئے تو ان میں سے چند ایک کو تو آپ نے گرفتار کرکے مدینہ بھیجدیا۔ انہیں میں عیینہ بن حصن الفزاری قرۃ بن ہبیرۃ۔ الفجاءۃ السلمی اور علقمہ بن علاثہ تھے ان کے علاوہ باقی تمام کو خود بہت سخت اور عبرتناک سزائیں دیں بعد میں حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی تو آپ نے بھی حضرت خالد کو

---

[1] الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۲ و طبری ج ۳ ص ۲۴۹ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۵

تقویٰ اور پرہیزگاری اور لوگوں کیساتھ احسان کا معاملہ کرنے کی تاکید فرمائی اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا اُن سے انتقام لینے کی بھی توثیق فرمائی۔ [1]

ام زمل کی فتنہ انگیزی اور اس کا استیصال

اس مہم سے فارغ ہونیکے بعد بھی حضرت خالد بزاخہ میں ایک مہینہ مقیم رہے، کیونکہ اب بھی کچھ ایسے شریر اور سرکش لوگ باقی تھے جو شکست کھاجانے اور قبائل کے مسلمان ہوجانیکے باوجود فتنہ انگیزی پر تلے ہوئے تھے چنانچہ اسی قماش کے کچھ لوگ ام زمل نامی ایک عورت کے پاس جمع ہوگئے۔ ام زمل، ام قرفہ کی بیٹی تھی، بنو فزارہ کی طرف آنحضرت ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ کی سرکردگی میں جو سریہ بھیجا تھا اس کے ہاتھوں ام قرفہ گرفتار ہوئی تھی اور چونکہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ انتہائی عداوت اور دشمنی کا مظاہرہ کیا تھا اس لئے قتل کردی گئی تھی، ام زمل کے دل میں وہی غبار بھرا ہوا تھا حالانکہ خود اس کے ساتھ معاملہ یہ کیا گیا تھا کہ جب یہ گرفتار ہو کر آئی تو حضرت عائشہ کے حصہ میں پڑی لیکن حضرت عائشہ نے چند روز کے بعد اسکو آزاد کردیا اور یہ اپنے قبیلہ میں واپس چلی گئی۔ حضرت عائشہ کے اس احسان کے باوجود یہ اپنی ماں کے خون کو فراموش نہیں کرسکی تھی اب غطفان، طے، سلیم اور ہوازن کے بچے کھچے باغی اور سرکش لوگ جو ابتک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ام زمل کے اردگرد جمع ہوئے تو عورت کی بات اس نے ان سب لوگوں کو پھر لڑنے پر آمادہ کردیا اور باغیوں کے اس گروہ کے ساتھ خود ایک اونٹ پر بیٹھ کر جو اسکی ماں کا تھا بڑے کروفر اور شان وشوکت کیساتھ نکلی۔ حضرت خالد کو ان واقعات کا علم ہوا تو خود اسکے مقابلہ کو بڑھے۔ مسلمان مجاہدین نے ام زمل کے اونٹ کا محاصرہ کرلیا پہلے اونٹ کی کونچیں قطع کیں اور پھر ام زمل کو قتل کردیا۔ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس اونٹ کے اردگرد ایک سو باغی شہسوار کام آئے اور اس فتح کا مژدہ فوراً حضرت ابوبکر کو پہنچا دیا گیا [2]

حضرت خالد نے اسکے علاوہ بھی دو تین شورشوں کا جو بزاخہ کے قریب وجوار میں برپا ہورہی تھیں خاتمہ کیا اور آخر یہاں کے ایک ماہ قیام کی مدت میں شمال مشرق کے محاذ کا مطلع بالکل صاف ہوگیا۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۹۱ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۴۶۶

قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک

اس جنگ میں جو بڑے بڑے سردار پکڑے گئے تھے حضرت خالد نے ان کو مدینہ بھیجدیا تھا حضرت ابوبکر نے ان کیساتھ جس ملاطفت اور نرمی کا معاملہ کیا اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ یہ سب آگ طلیحہ کی ہی لگائی ہوئی تھی لیکن اسکے باوجود جب اس نے مسلمان ہونے کا اعلان کردیا تو حضرت ابوبکر نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ پھر طلیحہ کی جو کچھ بھی طاقت تھی عیینہ کے دم سے تھی لیکن اس نے جب اسلام کے قبول کرلینے کا اعلان کیا تو اسکی بھی جان بخشی کردی گئی اور قید سے رہا کردیا گیا۔ قرہ بن ہبیرہ جو بنو عامر کا سردار تھا مدینہ میں قیدی بنا کر لایا گیا۔ لیکن اس نے کہا کہ میں کبھی بھی مرتد نہیں ہوا۔ البتہ میری قوم زکوٰۃ کو تاوان سمجھتی تھی اس لئے اس سے اپنا اشتنا چاہتی تھی حضرت ابوبکر نے پوچھا تیرے اس ایمان کا کوئی گواہ ہے؟ قرہ نے حضرت عمرو بن العاص کو گواہی میں پیش کیا۔ جو عمان میں جیفر کے پاس سے مدینہ جاتے ہوئے بنو عامر کے قبیلہ میں ایک شب کیلئے قرہ بن ہبیرہ کے مہمان رہے تھے اور اس وقت قرہ میں اور حضرت عمرو بن العاص میں زکوٰۃ کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی تھی۔ اب اس وقت عمرو بن العاص نے گواہی میں وہی گفتگو نقل کردی اور اس سے ثابت ہوگیا کہ قرہ واقعی مرتد نہیں ہوا تھا تو حضرت ابوبکر نے اسکو بھی رہا کردیا البتہ جیسا کہ پیچھے گزرچکا ہے صرف ایک الفجاءۃ السلمی ہے جس کو اس کی حد درجہ غداری اور سفاکی کی وجہ سے حضرت ابوبکر نے بڑی سختی اور بے رحمی کے ساتھ قتل کرایا ہے۔

سجاح اور مالک بن نویرہ

بنو تمیم کی اہمیت

قبیلہ بنو تمیم کے مکانات جنوب کی جانب بنو عامر سے ذرا فاصلہ پر اور مدینہ کے مشرق میں واقع تھے جو خلیج فارس تک چلے گئے تھے شمال مشرق کی جانب میں دریائے فرات کے دہانے سے ملے ہوئے تھے۔ عہد جاہلیت میں اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے عہد میں بھی یہ قبیلہ بڑا معزز سمجھا جاتا تھا اور شجاعت وسخاوت کے اوصاف میں ممتاز تھا اس قبیلہ میں نامور شعراء، بہادر اور فیاض طبع لوگ پیدا ہوئے اس قبیلہ کی شاخیں بنو حنظلہ

دارم بنو مالک۔ بنو یربوع وہ ہیں جن کے کارناموں سے عربی ادب و تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

چونکہ یہ قبائل خلیج فارس اور فرات کے دہانہ سے قریب تھے اس بنا پر بعض عراق اور جزیرہ نمائے عرب دونوں کیساتھ ان کے تعلقات تھے اور عراق ایران میں بھی ان کی آمد و رفت تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے اکثر لوگ نصرانیت کے زیر اثر آگئے یہ سب اسباب تھے جن کے باعث عرب میں جب بغاوت و ارتداد کا طوفان اٹھا تو بنو تمیم نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا۔

مالک بن نویرہ کی بغاوت | آنحضرت صلعم کی جب وفات ہوئی تو اس وقت آپ کے چند عمال بنو تمیم میں موجود تھے جو زکوٰۃ وصول کرنے کی غرض سے بھیجے گئے تھے[1] انہیں میں مالک بن نویرہ تھا جو قبیلہ بنو یربوع کا سردار تھا۔ آنحضرت صلعم کی خبر وفات ملنے پر ان عاملوں میں اختلاف ہوا کہ جو زکوٰۃ اور صدقات ان لوگوں نے جمع کر لئے تھے ان کا کیا کریں؟ ان کو حضرت ابوبکر کے پاس بھیجیں یا وہیں لوگوں میں تقسیم کردیں۔ مالک بن نویرہ اس گروہ میں شامل تھا جو زکوٰۃ کو مدینہ بھیجنے کا مخالف تھا اس طرح اب وہ اسلام سے منحرف ہو کر اس کے مخالفوں کی صف میں شریک ہو گیا اور مسلمانوں کا کھلم کھلا دشمن بن گیا۔

سجاح کی آمد | یہ عمال آپس میں اختلاف کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں سجاح بنت الحارث الجزیرہ سے جو عراق میں ہے اس شان سے یہاں پہونچ گئی کہ اس کے قبیلہ بنو تغلب کے لوگ اس کو گھیرے ہوئے تھے اور وہ ایک عظیم لشکر کی قیادت کر رہی تھی جس میں قبیلہ ربیعہ، نمر، ایاد اور شیبان کے نامور لوگ شریک تھے۔ سجاح بنو تمیم کی شاخ بنو یربوع سے تعلق رکھتی تھی اور عراق کے بنو تغلب سے جنہوں نے مسیحیت کو اختیار کر لیا تھا اس کے ننھیالی تعلقات تھے اس بنا پر ابتداءً یہ خود بھی مسیحی تھی اور اسلام کے ساتھ جو دشمنی یہود اور

[1] طبری نے ان تمام عمال کے نام اور جن جن قبیلوں پر یہ مقرر کئے گئے تھے ان کے نام ذکر کئے ہیں یہ عمال آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد تین جماعتوں میں بٹ گئے تھے ایک وہ جو اسلام کے سچے اور پکے حامی تھے انہوں نے اپنی جمع کردہ زکوٰۃ مدینہ بھیجی جیسے صفوان بن صفوان۔ دوسرے وہ جو متردد تھے جیسے زبرقان بن بدر تیسرے وہ جو کھلم کھلا مخالف ہو گئے تھے مثلاً مالک بن نویرہ (ج ۲ ص ۲۹۵)

نصاریٰ کو تھی سجاح بھی اسلام کیساتھ وہی عداوت رکھتی تھی یہ کاہنہ تھی اور اسکی قابلیت ذہانت اور ہوشیاری کی دلیل یہی کیا کم ہے کہ اس زمانہ میں عورت ہو کر عرب کے نامور قبیلوں کی قیادت کر رہی تھی۔

اسلام کیساتھ دشمنی کے باعث یہ موقع کی تلاش میں تو تھی ہی۔ آنحضرت صلعم کی خبر وفات سنتے ہی ایک لشکر لے مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے چل پڑی۔ بعض مورخین کا خیال ہے اور غالباً صحیح ہے کہ سجاح کا یہ اقدام حکومت ایران اور عراق میں اس کے جو عمال تھے ان کے بھڑکانے اور جوش دلانے کا نتیجہ تھا۔ ورنہ خود اس کو اپنے بل بوتہ پر مدینہ پر حملہ کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

سجاح کی تمیم سے جنگ | سجاح شمالی عراق سے اتر کر جب جزیرہ نمائے عرب میں داخل ہوئی تو طبعی طور پر اس کو سب سے پہلے خود اپنے قبیلہ بنو تمیم کے پاس آنا چاہئے تھا۔ یہاں پہونچی تو دیکھا کہ آنحضرت صلعم کے عمال صدقات میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے، اب اسے موقع اچھا مل گیا۔ اس نے مالک بن نویرہ کو جلد ہی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ لیکن مالک بن نویرہ نے سجاح کو مشورہ دیا کہ وہ ابھی مدینہ پر حملہ کا ارادہ نہ کرے بلکہ بنو تمیم سے جو بعض قبیلے اب تک اسکی (سجاح کی) پیغمبری کا اقرار نہیں کر سکے ہیں اور اس کے مخالف ہیں۔ پہلے ان سے جنگ کی جائے۔ سجاح نے اس مشورہ کو فوراً قبول کر لیا۔ اس کے اصل قوت بازو دو شخص تھے۔ ایک مالک بن نویرہ اور دوسرا وکیع جو تمیم کی ایک شاخ بنو حنظلہ کا سردار تھا۔ ان دونوں کے مشورے سے اب سجاح نے بنو تمیم کی مختلف شاخوں پر حملہ شروع کر دئیے جن میں قتل و قتال ہوا۔ دونوں طرف کے آدمی گرفتار ہوئے اور غلام بنائے گئے لیکن آخر میں صلح ہو گئی اور قیدیوں کا تبادلہ کر لیا گیا۔

یمامہ پر حملہ کا ارادہ | یہاں سے فارغ ہو کر سجاح کے دل میں پھر مدینہ پر حملہ کرنے کا ولولہ اٹھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ مالک بن نویرہ اور وکیع دونوں اپنے قبیلوں کو زبان دے چکے تھے کہ سجاح مدینہ جانے کے لئے ان[1] قبیلوں سے نہیں گزرے گی اس لئے جب اہل جزیرہ کے سرداران فوج نے اس سے آکر کہا کہ اب ہم کیا کریں۔ مالک اور وکیع تو

[1] ان قبیلوں کو دراصل مدینہ یا حضرت ابوبکر کے ساتھ ہمدردی نہیں تھی بلکہ اصل سبب یہ تھا کہ [illegible]

ہماری کوئی مدد نہیں کریں گے اور ہم ان کے علاقوں میں گزر بھی نہیں سکتے ہیں تو اس نے یہ معجزانہ
شان میں جواب دیا کہ "یمامہ کا رخ کرو"۔ ان لوگوں نے کہا "یمامہ کا معاملہ تو بڑا مشکل ہے
وہاں مسیلمہ کی طاقت بڑی مضبوط ہے"۔ لیکن سجاح بولی "کوئی پرواہ کی بات نہیں ہے
یمامہ پر حملہ لازمی طور پر کرنا ہے۔" [1]

مسیلمہ اور سجاح کا نکاح اب ادھر مسیلمہ کو خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا۔ اسکو اس بات
کا اندیشہ تھا کہ اگر وہ سجاح سے جنگ کرنے میں مشغول ہو گیا تو مسلمانوں کا لشکر جو ثمامہ
بن آثال یا شرجیل بن حسنہ کی سرکردگی میں چلا آ رہا تھا اس کو غلبہ حاصل ہو جائیگا یا جو قبائل
اسکے اطراف واکناف میں آباد تھے ان کو سر اٹھانے کا موقع مل جائیگا۔ اس بنا پر اس نے یہ
چال چلی کہ اس نے سجاح کے پاس ایک ہدیہ بھیجا اور اپنی جان کی امان طلب کر کے اس سے
ملنے کی درخواست کی۔ سجاح نے درخواست منظور کر لی تو مسیلمہ بنو حنیفہ کے چالیس آدمیوں
کو ہمراہ لیکر سجاح کے جائے قیام پر پہونچا۔ یہاں دونوں میں خلوت میں گفتگو ہوئی۔
دونوں ہی کاہن تھے اور پیغمبری کا دعویٰ کرتے تھے دونوں پر وحی نازل ہوتی تھی لیکن مسیلمہ
بہرحال مرد تھا آخر وہ اس فتنہ کی پری کو شیشے میں اتار لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا
کہ دونوں میاں بیوی بن گئے۔ [2]

نکاح کے بعد مسیلمہ سجاح کو اپنی جائے قیام پر لے آیا۔ سجاح تین دن یہاں رہی
پھر اپنی قوم میں واپس چلی گئی۔ مسیلمہ اور سجاح کے درمیان جو معاملات طے ہوئے تھے ان
میں سے ایک یہ بھی تھا کہ یمامہ کی پیداوار سے جو کچھ آمدنی ہوگی اس کا نصف حصہ سجاح کو دیا جائیگا

(بقیہ صفحہ گزشتہ) چونکہ سجاح کے ساتھ الجزیرہ اور عراق کے لوگ تھے اسلئے ان قبیلوں کو اس بات کا اندیشہ تھا
کہ اگر سجاح ان لوگوں کو لے کر ان قبائل میں سے گزرے گی تو اس سے ان کی آزادی اور خود مختاری خطرہ
میں پڑ جائیگی۔ [1] سجاح نے اس وقت پیغمبرانہ انداز میں گویا کہ ابھی ابھی وحی نازل ہوئی ہے جو الفاظ کہے وہ
یہ تھے: علیکم بالیمامۃ ودفوا دفیف الحمامۃ۔ فانہا غزوۃ صرامۃ لا یلحقکم بعدہا ملامۃ

[2] طبری نے اس موقع کے جو واردات اور مسیلمہ و سجاح کی جو باہمی گفتگو لکھی ہے اگرچہ عربی ادب و تاریخ کے
ایک محقق کو اس کا اعتبار کرنا بہت مشکل ہے نہایت فحش اور گندی ہے۔

سجاح ان معاملات کے انصرام و تکمیل کی غرض سے اپنے کارکن ہذیل، عقہ اور زیاد کو یہاں
چھوڑ کر الجزیرہ واپس لوٹ گئی۔ جہاں تک خلافت صدیقی کا تعلق ہے سجاح کے ڈرامہ
کا یہ آخری سین ہے۔ کیونکہ پھر وہ عراق سے باہر نہیں نکلی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ امیر معاویہ
کے عہد حکومت میں مسلمان ہو گئی تھی۔ [1]

بطاح میں حضرت خالد کا نزول

سجاح کے جزیرہ لوٹ جانے کے بعد بنو تمیم کے بعض امراء مثلاً وکیع اور سماعہ اپنی حرکت
پر نادم ہوئے اور جب حضرت خالد حضرت ابوبکر کے حکم کے مطابق بزاخہ کی مہم سے فارغ ہونے کے
بعد بطاح پہونچے تو وکیع بن مالک سماعہ اور زبرقان اپنی اپنی زکوٰۃ لے کر حضرت خالد کی خدمت
میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ ان کے برخلاف مالک بن نویرہ اب
تک متردد تھا۔ لیکن چونکہ اس کو حضرت خالد کے مقابلہ کی جرأت نہیں تھی اس بنا پر اس نے اپنے
تمام ساتھیوں اور قبیلہ والوں کو منتشر کر کے ان کے گھروں کو واپس کر دیا۔ حضرت خالد
یہاں پہونچے تو مطلع صاف تھا۔ آپ نے مسلمانوں کی چند ٹولیاں (سرایات) ادھر ادھر
روانہ کیں اور تاکید کی کہ تم اسلام پیش کرو اور اذان دو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں
اور اذان دیں نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی عہد کریں ان سے کچھ نہ کہو۔ لیکن جو
ایسا نہ کریں ان کو سزا دی جائے۔

مالک بن نویرہ کا قتل ایک ٹولی واپس ہوئی تو اپنے ساتھ مالک بن نویرہ اور چند اور
لوگوں کو گرفتار کر کے لائی۔ یہ لوگ جو گرفتار کر کے لائے گئے تھے ان میں ابوقتادہ بھی
تھے انہوں نے شہادت دی کہ قیدیوں نے اذان دی تھی اور نماز پڑھی تھی۔ لیکن بعض
اور ارکان سریہ نے اس کی مخالفت کی۔ حضرت خالد نے اس اختلاف کے باعث قیدیوں
کے متعلق اس وقت فیصلہ کرنا ملتوی کر دیا اور ان کو کسی جگہ محبوس کرنے کا حکم دیا
لیکن رات ہی رات میں مالک بن نویرہ اور اسکے ساتھی قتل کر دیئے گئے۔ اور حضرت خالد بن ولید نے

[1] طبری ج ۲ ص ۵۰۰

مالک بن نویرہ کی بیوی ام تمیم سے نکاح کر لیا۔ ابوقتادہ انصاری کو اس پر سخت برہمی ہوئی اور مدینہ میں حضرت خالد سے تیز کلامی کی لیکن انہوں نے اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ مدینہ پہنچ کر انہوں نے اور مالک بن نویرہ کے بھائی متمم بن نویرہ نے اولاً حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر سے خالد بن الولید کی شکایت کی اور پورا واقعہ کہہ سنایا۔ حضرت ابوبکر کو سن کر صدمہ تو ہوا لیکن مصلحت وقت کے پیش نظر چپ ہو گئے۔ فاروق اعظم کو شدید غصہ تھا ان کی رائے ہوئی کہ خالد کو فوراً معزول کر دیا جائے۔ اور چونکہ ایک مسلمان کو عمداً قتل کر کے اس کی بیوی سے عدت وفات کے انقضاء سے قبل انہوں نے شادی کی ہے۔ اس لئے انہیں رجم کر دیا جائے۔ حضرت عمر کا اس پر جب اصرار زیادہ بڑھا تو حضرت ابوبکر نے آخر حضرت خالد کو مدینہ طلب کیا اور ان سے گفتگو کے بعد آپ کو جب یقین ہو گیا کہ اگر مالک نویرہ کا قتل بحالت اسلام ہوا بھی ہے تو بہر حال وہ قتل عمد نہیں۔ قتل خطا ہے تو آپ نے حضرت خالد کی طرف سے مالک کا خون بہا ادا کیا اور چونکہ مقام جنگ (بطاح) سے حضرت خالد کی غیر حاضری کے باعث حالات زیادہ بگڑ گئے تھے اس بنا پر فوراً ان کو واپس روانہ کر دیا۔

مالک بن نویرہ کے واقعۂ قتل پر ایک نظر

ارتداد سے تائب ہو چکنے کے باوجود مالک بن نویرہ کا قتل اور پھر اس کے بعد ہی فوراً اس کی بیوی سے نکاح ان دونوں چیزوں نے جہاں خالد کی سیرت سے متعلق ایک پیچیدہ بحث پیدا کر دی ہے اس سے بظاہر حضرت ابوبکر پر بھی مداہنت اور جرم سے چشم پوشی کا اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اس پر ذرا تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔

واقعہ کی مختلف صورتیں | سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ واقعہ کی اصل صورت کیا تھی؟

(۱) اس سلسلہ میں ایک روایت جو طبری نے نقل کی ہے یہ ہے کہ مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کے اسلام سے متعلق جب ارکان سریہ میں اختلاف ہو گیا تو حضرت خالد بن الولید نے خیال کیا کہ دوسرے دن فیصلہ کریں گے اور قیدیوں کے بارے میں حکم دیا کہ ان کو بند کر کے رکھا جائے۔ اتفاق سے اس رات سردی بہت زیادہ تھی۔

اسی لئے حضرت خالد کو قیدیوں کا خیال آیا تو آپ نے منادی کو حکم دیا۔ "ادفئوا اسراکم"۔ عام لغت کے مطابق اس فقرہ سے حضرت خالد کی مراد یہ تھی کہ اپنے قیدیوں کو کچھ اڑھا دو تاکہ سردی سے ان کی حفاظت ہو جائے لیکن جو لوگ پہرہ دے رہے تھے وہ ادفاء کے اس معنی سے بے خبر تھے اس لئے انہوں نے بنو کنانہ کے لغت کے مطابق ادفاء کے معنی قتل کے سمجھے اور اس بنا پر سب قیدیوں کو قتل کر دیا۔ اب چیخ و پکار کا شور بلند ہوا تو حضرت خالد نے پوچھا "یہ کیا ہے!" اور جب معلوم ہوا کہ قیدی قتل کر دئے گئے ہیں تو انہیں افسوس تو ہوا لیکن فرمایا "جو چیز مقدر ہوتی ہے وہ ہو کر رہتی ہے"۔ [۱]

(۲) طبری کی ہی ایک اور روایت یہ ہے کہ حضرت خالد نے یہ معلوم کرنے کی غرض سے کہ کونسی شہادت سچی ہے۔ مالک بن نویرہ کے اسلام کی یا اسکے اصرار علی الارتداد کی خود مالک بن نویرہ کو بلایا اور گفتگو شروع کر دی۔ اثنائے گفتگو میں ایک مرتبہ مالک نے کہا "میرا خیال تو یہی ہے کہ تمہارے ساتھی (صاحبکم) یہ کہا کرتے تھے" "تمہارے ساتھی" کے لفظ سے آنحضرت صلعم کی طرف اشارہ تھا۔ حضرت خالد نے کہا "کیا تو ان کو (آنحضرت صلعم کو) اپنا صاحب نہیں سمجھتا" یہ کہا اور اس کی اور ان کے ساتھیوں کی گردنیں اڑا دیں۔ [۲]

(۳) تیسری روایت ابن خلکان کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت خالد اور مالک بن نویرہ میں خوب گفتگو ہوئی اس کے سلسلہ میں مالک نے کہا "میں نماز پڑھتا ہوں۔ لیکن زکوٰۃ نہیں دیتا" حضرت خالد نے کہا "کیا تجھ کو معلوم نہیں ہے کہ نماز اور زکوٰۃ دونوں ہی فرض ہیں اور ایک بغیر دوسرے کے مقبول نہیں ہے"۔ [۳] اس پر مالک بن نویرہ نے آنحضرت صلعم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "قد کان صاحبک یقول ذالک"۔ "آپ کے صاحب تو بیشک یہی کہتے تھے"۔ حضرت خالد کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص ابھی تک مسلمان نہیں

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۵۰۲ [۲] طبری ج ۲ ص ۵۰۳ [۳] کسی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے مراد یہ ہے کہ نماز ہو یا زکوٰۃ دونوں ہی فرض ہیں اور جب تک کوئی شخص ان دونوں کی فرضیت کا قائل نہ ہو اس کی کوئی ایک عبادت خواہ وہ فقط نماز ہو یا فقط زکوٰۃ مقبول نہیں ہوگی۔

ہوا ہے چنانچہ انہوں نے کہا "اوما تراہ لک صاحبا" کیا تو ان کو آنحضرتؐ کو اپنا
صاحب نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد فرمایا "میں تیری گردن اڑا دوں گا۔ اس پر دونوں
میں مزید بحث کلامی ہوئی۔ مالک بن نویرہ "صاحبک" کا لفظ بار بار دہرائے جاتا
تھا۔ آخر حضرت خالد نے حکم دیا۔ اور مالک بن نویرہ قتل کر دیا گیا [1]

(۴) چوتھی روایت یعقوبی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کو لکھا کہ مالک
بن نویرہ کا رُخ کریں چنانچہ وہ وہاں پہنچے۔ مالک بن نویرہ حضرت خالد کے
بلانے پر آیا تو اس کی بیوی بھی ساتھ تھی۔ خالد پر اس کی بیوی کا کچھ اثر ہوا اور
انہوں نے کہا۔

والله لانلت ما فی مثابتك	جو تیرا ٹھکانہ ہے تو اس وقت تک نہیں پائیگا۔
حتیٰ اقتلك	جب تک میں تجھ کو قتل نہیں کر دوں گا۔

اس کے بعد مالک بن نویرہ سے مناظرہ کیا [2] اور اس کی گردن اڑا دی اور پھر
اس کی بیوی سے نکاح کیا [3]

(۵) پانچویں روایت یاقوت حموی کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت خالد کا دستہ جو
ضرار بن الازور کی سرکردگی میں تھا اس کا مقابلہ مالک بن نویرہ کے دستہ سے ہوا۔
دونوں میں جنگ ہوئی اور ضرار نے مالک کو قتل کر دیا [4]

اگرچہ کتاب الاغانی لابی الفرج الاصفہانی اور بعض دوسری ادبی کتابوں میں
یہ واقعہ ایک افسانۂ حسن و عشق بنا کر لکھا گیا ہے اور اس میں کافی رنگ آمیزی کی
گئی ہے لیکن وہ سرتاسر بیہودہ اور لغو ہے تاریخی حیثیت سے واقعہ کی جو صورت بھی ہو
مذکورۂ بالا چار صورتوں میں محدود ہے۔

واقعہ کی اصل صورت | اب یہ دیکھنا چاہیے کہ قرائن اور قیاس کی روشنی میں واقعہ کی اصل صورت کیا تھی؟

[1] ابن خلکان ج ۵ ص ۲۶ مطبوعہ مصر جدید اڈیشن [2] اصل کتاب میں منتظر مانگا چھپا ہوا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ تصحیف ہے اصل لفظ مناظر ہوگا۔ اس کی تائید طبری وغیرہ کی روایات سے بھی ہوتی ہے
[3] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۸ [4] معجم البلدان ج ۱ ص ۴۹۱ مطبوعہ لیپزگ۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے وہ کچھ زیادہ قابل اعتبار نظر نہیں آتی وجہ یہ ہے
کہ ادفئوا کے عام معنی ڈھانکنے چھپانے اور گرمی پہونچانا ہی ہیں قرآن و حدیث میں یہ
لفظ اسی معنی میں آیا ہے قتل کرنے کے معنی میں اس لفظ کا استعمال یا قتل سے اس کا
کنایہ ہونا دور کا احتمال ہے۔ اس بنا پر جب قیدیوں کے محافظین کو اس لفظ کی حقیقی مراد
میں شبہ ہوا تھا تو انکو حضرت خالد سے پوچھنا چاہیے تھا محض ایک دور کے احتمال یا ایہام
پر قتل کر دینا اور وہ بھی کسی معمولی شخص کو نہیں بلکہ مالک بن نویرہ ایسے اہم شخص کو اور
پھر وہ بھی ایک جماعت کیساتھ کسی طرح قیاس میں نہیں آتا۔ اور اچھا اگر ان لوگوں سے
یہ حرکت عجلت میں ہو بھی گئی تھی تو حضرت خالد کو ان سے باز پرس کرنی چاہیے تھی صرف یہ کہدینا
کہ "جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے" کافی نہیں ہے۔ اگر واقعہ کی دراصل صورت یہ ہی
تھی تو حضرت خالد صاف طور پر معذور تھے پھر حضرت عمرؓ کا اس قدر غضبناک ہونا اور حضرت ابوبکر
کا اس کے جواب میں "فاوّل فاخطا" خالد نے تاویل کی اور ان سے خطا ہو گئی" فرمانا کوئی
معنی ہی نہیں رکھتا۔ اور اگر ان سب باتوں کی بھی کوئی توجیہ کر لی جائے تو حضرت خالد نے
مالک کی بیوی سے جو فوراً نکاح کیا ہے درانحالیکہ وہ مسلمان تھا اس کی کیا توجیہ ہوگی۔

باقی رہیں اب تین صورتیں تو وہ تقریباً ایک ہی متن کی مختلف شرحیں معلوم ہوتی ہیں
لیکن ۲ اور ۴ اتنی واضح اور صاف نہیں ہیں جتنی کہ ۳ یعنی ابن خلکان کی روایت ہے۔
اس بنا پر ہمارے نزدیک اسی کو اصل سمجھنا چاہیے۔

مالک بن نویرہ کا مختصر حال | واقعہ کی اس صورت کے متعین ہو جانے کے بعد اب یہ سنو کہ مالک
بن نویرہ کے حالات کیا ہیں؟

مالک بن نویرہ بنو تمیم کی شاخ بنو یربوع کا سردار تھا کنیت ابو حنظلہ تھی عرب کے
مشہور شعراء اور شہسواروں میں اس کا شمار ہوتا ہے یہ مسلمان کب ہوا؟ اس کی صحیح تاریخ
کا متعین کرنا مشکل ہے۔ غالباً ۸ھ یا ۹ھ ہجری میں ہوا ہوگا۔ جب کہ بنو تمیم کا ایک وفد
خدمت نبوی میں حاضر ہوا تھا۔ بہرحال اتنا معلوم ہے کہ آنحضرتؐ نے اسکو اپنی قوم کے
صدقات کے جمع کرنے پر عامل مقرر فرمایا تھا۔ آنحضرتؐ کی وفات کی خبر پہونچی تو

اس نے زکوٰۃ روک لی اور اس کو مدینہ بھیجنے کے بجائے اپنی قوم میں تقسیم کر دیا اور اس نے یہ شعر پڑھے۔

فقلت خذوا اموالکم غیر خائفٍ ولا ناظرٍ فیما یجیٔ من الغدِ
فان قام بالدین المخوف قائمٌ اطعنا وقلنا الدین دین محمدٍ [1]

اب اس وقت سے لیکر قتل ہونے تک مالک بن نویرہ نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں جیسا کہ طبری کے حوالہ سے ہم پہلے لکھ چکے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) مالک بن نویرہ نے صرف یہ ہی نہیں کیا کہ اس نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا ہو بلکہ جب سجاح عراق سے چل کر مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے یہاں پہونچی تو مالک بن نویرہ نے اس سے ساز باز کر لی اور اس جھوٹی مدعیہ نبوت کا وہ دستِ راست بن گیا۔

(۲) سجاح کو آمادہ کیا کہ بنو تمیم کی بعض شاخیں جواب تک اپنے اسلام پر قائم تھیں ان پر وہ حملہ کرے۔ چنانچہ سجاح نے ایسا کیا اور مالک بن نویرہ نے اس معاملہ میں اسکی ہر قسم کی مدد کی۔

(۳) سجاح کے عراق چلے جانے کے بعد زبرقان، وکیع بن مالک اور سماعہ جو آنحضرت صلعم کی خبر وفات سنکر مرتد یا مخالف ہو گئے تھے ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ حضرت خالد بزاخہ سے مقام بطاح میں پہونچے تو ان لوگوں نے حضرت خالد کا استقبال کیا اور اپنے جمع کئے ہوئے صدقات ان کے حوالہ کر دیئے لیکن مالک بن نویرہ کو اب بھی ہوش نہیں آیا اور وہ اپنے لوگوں کو لیکر اپنے قبیلہ میں چلا گیا [2]

(۴) حضرت خالد نے جو جماعت (سریہ) ان لوگوں کے تعاقب میں روانہ کی تھی اس سے تاکیداً کہا تھا کہ اگر یہ لوگ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے بھی راضی

---

[1] الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۶ اصل کتاب میں المخوف چھپا ہوا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

[2] ابن اثیر کے الفاظ یہ ہیں۔ وعرف وکیع وسماعۃ قبح ما اتیا فراجعا رجوعاً حسناً ولم یتجبرا واخرجا الصدقات فاستقبلا بہا خالداً وسار خالد یرید البطاح وبہا مالک بن نویرۃ قد تردد علیہ امرہ ۔ التاریخ الکامل ج ۲ ص ۲۴۲۔

بھر لیں تو پھر ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے [1]

حضرت خالد کے اس صاف و صریح حکم کے باوجود اس سریہ کا مالک بن نویرہ کو گرفتار کر کے لانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ مالک بن نویرہ نے اس جماعت کے سامنے ادائے زکوٰۃ کی حامی نہیں بھری تھی۔

(۵) مالک بن نویرہ کے واقعہ قتل سے متعلق طبری اور ابن خلکان کے حوالہ سے جو دو روایتیں اوپر گزر چکی ہیں ان میں صاف تصریح ہے کہ حضرت خالد اور مالک بن نویرہ میں جو گفتگو ہوئی ہے اس میں مالک بن نویرہ نے ادائے زکوٰۃ کا اقرار نہیں کیا اور وہ اپنے انکار پر برابر مصر رہا۔ اس کے علاوہ اس نے آنحضرت صلعم کیلئے صاحبکم کی ترکیب استعمال کی۔

اب غور کرو مالک بن نویرہ کے اس تجزیہ حالات سے کیا کسی درجہ میں بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارتداد سے تائب ہو کر پھر مسلمان ہو گیا تھا؟

مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت

یہ حالات تو خود مالک بن نویرہ کے تھے اب ہم کو اُس شہادت پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہئے جو اس کے اسلام سے متعلق تاریخ سے فراہم ہوتی ہو۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ مالک بن نویرہ کو گرفتار کر کے لانیوالی جماعت میں چار نہیں بلکہ کافی تعداد میں مسلمان ہونگے لیکن اس کے باوجود مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت صرف دو شخصوں سے ہی منقول ہے۔ ایک متمم بن نویرہ جو خود مالک بن نویرہ کے حقیقی بھائی تھے اور ان کو اپنے اس بھائی سے کس درجہ محبت تھی وہ ان کے اُن مراثی سے ظاہر ہے جو خنساء کے مراثی کی طرح عرب کی تاریخ مرثیہ گوئی میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرے شخص ابو قتادہ انصاری ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ موخر الذکر ایک جلیل القدر صحابی اور انصاری ہیں اس بنا پر ہم انکی طرف جھوٹ اور دروغ گوئی کی نسبت نہیں کر سکتے لیکن اس سلسلہ میں بہر حال مندرجہ ذیل باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۰۲

(١) حضرت ابو قتادہ نے جو شہادت مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کے اسلام کی دی ہے اس میں ادائے زکوٰۃ کے اقرار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ صرف اس قدر ہے کہ انہوں نے اقاموا الصلوٰۃ۔ ان لوگوں نے نماز پڑھی تھی [١]

(٢) حافظ ابن حجر نے اقامتِ صلوٰۃ کے علاوہ اذان کا بھی ذکر کیا ہے لیکن زکوٰۃ کا وہاں بھی نام نہیں [٢]

حضرت خالد جب بزاخہ کی مہم سے فارغ ہو کر بطاح کے قصد سے روانہ ہونے لگے ہیں تو انصار نے ساتھ جانے سے انکار کیا اور کہا کہ اس بارہ میں خلیفہ کا ہمارے پاس کوئی حکم نہیں ہے۔ ہرچند حضرت خالد نے سمجھایا کہ میرے پاس حکم موجود ہے اور میں امیر بھی ہوں۔ لیکن نہ مانے۔ آخر جب خالد ان کو پیچھے چھوڑ کر کافی دور نکل گئے تو ان کو خیال ہوا کہ اگر اسلامی لشکر کو کامیابی ہوئی تو ہم اس میں حصہ دار بننے سے محروم رہیں گے اور اگر ناکامی ہوئی اور مسلمانوں کو نقصان پہونچا تو لوگ ہمیں کو برا بھلا کہیں گے اب ان کو ندامت محسوس ہوئی اور وہ حضرت خالد کے لشکر میں جاکر شریک ہوئے۔ [٣]

اگرچہ اس واقعہ کو نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ چونکہ حضرت ابو قتادہ بھی انصاری تھے اس بنا پر ان کو پہلے سے ہی حضرت خالد کے ساتھ اختلاف تھا اور وہ یہاں (مقام بطاح) میں آنے کیلئے تیار نہیں تھے، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کے جزئی واقعات کو قانون شہادت کی رو سے کسی واقعہ کی اصل نوعیت کے تعین کرنے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ واقعہ زیر بحث میں اگرچہ حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کا عذر قبول فرمالیا اور پھر دوبارہ مسیلمہ سے جنگ کرنے کی غرض سے ان کو اس عہدہ پر بحال کر دیا لیکن چونکہ ابو قتادہ کے دل میں حضرت خالد کی طرف سے جو تکدر پیدا ہو گیا تھا وہ پھر بھی نہ نکلا اور انہوں نے قسم کھائی کہ اب وہ آئندہ کبھی خالد کے جھنڈے کے نیچے نہیں چلیں گے یعنی ان کی سرداری میں کسی جنگ میں شریک نہیں ہوں گے [٤]

اب تفصیلات کے کسی طالب علم سے دریافت کرو حضرت ابو قتادہ کا یہ رویہ کس چیز

[١] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۲
[٢] الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۷
[٣] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۴۲
[٤] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۸

کی غمازی کر رہا ہے۔

اوپر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اگر واقعی مالک بن نویرہ قتل سے پہلے ارتداد سے تائب ہو کر سچا اور پکا مسلمان بن بھی گیا تھا تو بجز آخرت میں اس کا اس کو اجر ملے گا۔ اور یہ معاملہ خود اس کے اور خدا کے درمیان ہے لیکن جہانتک واقعات کی ترتیب اور انکی تحقیق و تنقید کا تعلق ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ حضرت خالد پر ایک مسلمان کے قتل عمد کا کوئی الزام عائد نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ حضرت خالد کی رائے اور یقین میں اپنے ارتداد پر بدستور قائم تھا اور مسلمان نہیں ہوا تھا چنانچہ حضرت ابوبکر سے حضرت خالد نے کہا تھا کہ مالک جب اثنائے گفتگو میں رسول اللہ صلعم کا ذکر کرتا تھا تو آپ کیلئے "صاحبکم" کی ترکیب استعمال کرتا تھا [١] حضرت ابوبکر نے خالد کے اس عذر کو قبول فرمالیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابوبکر نے بھی مالک بن نویرہ کے عدم اسلام و قیام علی الارتداد کو تسلیم کر لیا تھا، ورنہ جیسا کہ حضرت ابوبکر کے الفاظ "تاول فاخطأ" سے متبادر ہوتا ہے اگر واقعہ یہی ہے کہ حضرت خالد کو غلط فہمی ہوئی تھی اور اس بنا پر انہوں نے ایک مسلمان کو قائم علی الارتداد سمجھ لیا تھا تو اگرچہ حضرت خالد ایک مسلمان کے قتل عمد سے بری ہو جاتے ہیں بہرحال ان کا مالک کی بیوی سے اس کی عدت وفات کے انقضا سے قبل نکاح کر لینا تو کسی طرح بھی جائز اور درست نہیں ہو سکتا۔ اور اس بنا پر ضروری تھا کہ اول تو حضرت خالد اس عورت سے خود قطع تعلق کر لیتے اور اگر خود نہ کرتے تو کم از کم حضرت ابوبکر کو حکم کرنا چاہیئے تھا کہ وہ تعلق منقطع کر دیں کیونکہ سرے سے نکاح ہی فاسد تھا۔

حافظ ابن حجر نے زبیر بن بکار کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے خالد بن الولید کو حکم کیا تھا کہ وہ مالک کی بیوی سے مفارقت اختیار کر لیں [٢] ممکن ہے یہ روایت صحیح ہو اور حضرت ابوبکر نے واقعی حضرت خالد سے ایسا کہا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت خالد نے ام تمیم سے تعلق منقطع نہیں کیا چنانچہ خالد کی بنو حنیفہ کے ساتھ جو جنگ ہوئی ہے اس موقع پر ام تمیم حضرت خالد کے ساتھ موجود تھی اور حضرت خالد نے ایک خیمہ میں اسکی

[١] الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۷
[٢] الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۷

کی حفاظت پر مقرر کر رکھا تھا[1] اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً حضرت خالد کا نکاح ام تمیم کیساتھ درست تھا۔ اسی بنا پر حضرت خالد نے اس سے از خود مفارقت اختیار کی اور چونکہ انہوں نے اس بارہ میں حضرت ابوبکر کے حکم یا مشورہ کی پرواہ کی۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ واقعی حضرت ابوبکر نے اس بارہ میں حکم دیا تھا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب	اس موقع پر بعض مورخین کو اشکال یہ پیش آیا ہے کہ اچھا ہم نے مانا کہ مالک بن نویرہ نے ارتداد سے توبہ نہیں کی تھی لیکن وجہ کیا ہے کہ جنگ

بزاخہ کے موقع پر اپنے اپنے قبیلہ کے بڑے بڑے سردار قرۃ بن ہبیرہ، الفجاءۃ السلمی ابو شجرہ اور عیینۃ بن حصن الفزاری جیسے لوگ گرفتار ہوئے تو حضرت خالد نے ان کو سیدھا مدینہ بھیج دیا تھا اور خود ان کی نسبت کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ پھر مالک بن نویرہ کے بارے میں بھی ایسا کیوں نہیں کیا جب کہ وہ مرتبہ اور حیثیت میں ان لوگوں سے کسی طرح کم اور جرم کے اعتبار سے کسی طرح بڑھا ہوا نہیں تھا[2]

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ دراصل حضرت ابوبکر اس قسم کے معاملات میں اپنے اعیان لشکر اور امرائے فوج پر پورا اعتماد کرتے اور انہیں کو وسیع اختیارات دیتے تھے چنانچہ قعقاع بن عمرو کو ایک جماعت کے ساتھ علقمہ بن علاثہ کو اسکے ارتداد و بغاوت کی سزا دینے کیلئے روانہ کیا تو آپ نے فرمایا "علقمہ تمہارے ہاتھ پڑ جائے تو تمہیں اختیار ہے اس کو میرے پاس بھیجو یا تم خود قتل کر دو" اسکے بعد آپنے یہ نہایت ہی حکیمانہ جملہ ارشاد فرمایا۔

واعلموا ان شفاء النفس الحنوص فاصنع ما عندك[3]	اور یاد رکھو کہ نفس کی شفا کسی کام کو خوب اچھی طرح کرنے میں ہے۔ اس لئے جو تمکو مناسب معلوم ہو کر گزرو۔

اس عام پالیسی کے ماتحت اسی طرح کے اختیارات حضرت ابوبکر نے حضرت خالد بن الولید کو بھی دے رکھے تھے کہ جس مجرم کے حق میں وہ جو چاہیں اپنی صواب دید کے مطابق فیصلہ کریں

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۶ اس جنگ کا مفصل تذکرہ آگے آئے گا۔
[2] الصدیق ابوبکر از محمد حسین ہیکل مصر ص ۱۵۶ [3] طبری ج ۲ ص ۴۹۰

حضرت خالد کے نام ایک مکتوب گرامی میں ارشاد فرماتے ہیں:

لیزدك ما انعم الله به علیك خیرا واتق الله فی امرك فان الله مع الذین اتقوا والذین هم محسنون وجد فی امر الله ولا تنین ولا تظفرن باحد قتل المسلمین الا قتلته ونكلت به غیره ومن احببت ممن حاد الله او ضاده ممن ترى ان فی ذالك صلاحا فاقتله[1]	اللہ نے تم کو جو نعمتیں خیر کی دے رکھی ہیں ان میں اور اضافہ ہو تم اپنے معاملات میں اللہ سے برابر ڈرتے رہو کیونکہ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو متقی ہوتے ہیں اور جو نیک ہوتے ہیں تم اللہ کے معاملات میں پوری کوشش کرو سستی نہ کیا کرو اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو قتل کیا ہے ان میں سے اگر کوئی تمہارے ہاتھ لگ جائے تو اسکو قتل کر دو اور اس طرح دوسروں کو سبق دو، اور انکے علاوہ جن لوگوں نے اللہ سے انحراف یا بغاوت کی ہے اگر تمہاری رائے میں انکو قتل کر دینا مناسب ہو تو قتل کر دو۔

بلکہ جہاں تک مالک بن نویرہ کا تعلق ہے ایک روایت یہ بھی ہے کہ خود حضرت ابوبکر نے حضرت خالد سے قسم کی تھی کہ اگر مالک بن نویرہ ہاتھ پڑ جائے تو اسکو بلا تامل قتل کر دیں۔ اصل الفاظ یہ ہیں: وعزم علیه لیقتلن مالكا ان اخذه[2]

مذکورۂ بالا تقریر سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ مالک بن نویرہ قتل کے وقت مرتد تھا اس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا حضرت خالد نے اسی وجہ سے ان اختیارات کے ماتحت جو حضرت ابوبکر نے ان کو دے رکھے تھے مالک کو قتل کیا اور وہ اس میں حق بجانب تھے، مالک کے بھائی متمم بن نویرہ کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضرت عمر کے

[1] طبری ج ۲ ص ۴۹۱ [2] ابو ریاش احمد بن ابی ہاشم القیسی نے خاص حضرت خالد اور مالک بن نویرہ کے واقعہ پر ایک مستقل رسالہ لکھا تھا۔ شیخ عبدالقادر بن عمر البغدادی نے اپنی مشہور کتاب خزانۃ الادب علی شواهد شرح الکافیہ میں اس رسالہ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ یہ جملہ اسی اقتباس میں ہے دیکھو خزانۃ الادب ج ۱ ص ۲۳۷ مطبوعہ میریہ بولاق

پاس آیا اور اس نے بھائی کا جو مرثیہ لکھا تھا سنایا تو فاروق اعظم پر اس کا بڑا اثر ہوا
اور فرمایا کہ اگر میں بھی شاعر ہوتا تو اپنے بھائی زید کا مرثیہ کہتا۔ متمم بن نویرہ بولا کہ
امیر المومنین دونوں برابر نہیں ہیں۔ اگر میرا بھائی بھی اسی طرح قتل ہوتا جیسا کہ آپ کا بھائی
ہوا ہے تو میں کبھی اپنے بھائی کا مرثیہ کہتا ہی نہیں۔ حضرت عمر نے یہ سنکر فرمایا جیسی تعزیت
آج متمم بن نویرہ نے میری کی ہے ایسی آجتک کسی نے کی ہی نہیں۔

علامہ ابن شاکر المتوفی ۷۶۴ھ اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ مالک بن نویرہ
خود اس کے بھائی متمم کے نزدیک بھی مرتد قتل ہوا تھا اور حضرت عمر سے اس نے جو کچھ کہا اسکا
مطلب یہ تھا کہ میں تو اپنے بھائی کو اس لئے روتا ہوں کہ وہ اسلام پر نہیں مارا گیا اسکا
انجام خراب ہوا۔ لیکن آپ کے بھائی زید تو اسلام کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے
ہیں حق کی راہ میں مارے گئے ہیں انکے مراتب اور مدارج تو اللہ کے ہاں بہت بلند ہیں۔ تو
پھر اُن کے ماتم کی کیا ضرورت ہے [1]

ام تمیم سے نکاح اس واقعہ میں حضرت خالد نے صرف ایک مالک بن نویرہ کو ہی تو قتل
نہیں کیا تھا بلکہ اس کے جتنے ساتھی تھے وہ بھی قتل کر دئے گئے تھے لیکن اسکے باوجود
حضرت خالد کے خلاف جو شورش ہوئی اس کی بنیاد مالک بن نویرہ ہی کا قتل تھا اس
سلسلہ میں کسی اور مقتول کا نام نہیں لیا جاتا۔ اس کی وجہ در حقیقت ایک تو یہ ہے کہ
حضرت خالد نے مالک بن نویرہ کی بیوی ام تمیم بنت منہال سے اسی روز نکاح کر لیا اور
اسکی وجہ سے لوگوں کو موقع مل گیا کہ وہ اس نکاح کو قتل مالک کا سبب قرار دیں [2] اور دوسری وجہ خود
متمم بن نویرہ تھا چنانچہ حضرت عائشہ نے بھی اپنے بھائی عبدالرحمن بن ابی بکر کی شہادت پر وہی
شعر بطور مرثیہ پڑھے ہیں اور صحیح بخاری میں درج ہیں۔

---

[1] فوات الوفیات ج ۲ ص ۲۹۶ مطبوعہ مکتبۃ النہضۃ المصریہ
[2] چنانچہ اغانی وغیرہ میں لکھ ہی دیا کہ حضرت خالد تو اس عورت سے زمانہ جاہلیت سے محبت کرتے تھے حالانکہ جو شخص عربوں کے اخلاق سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ محض بیوی حاصل کرنے کے لیے اسکے شوہر کو قتل کرنا انکے ہاں حد درجہ بزدلانہ اور غیر شریفانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور پھر عرب بھی خالد بن ولید سا بہادر شخص اس بزدلی کا کیونکر مرتکب ہو سکتا تھا۔

جہاں تک دوسری وجہ کا تعلق ہے تو ظاہر ہے یہ شعر کی کرشمہ سازیاں ہیں جن سے تاریخ
ادب کے صفحات بھرے ہوئے ہیں حضرت خالد پر اسکی ذمہ داری کیونکر عائد ہو سکتی ہے
رہی پہلی وجہ تو ہمارے خیال میں اصل صورت یہ پیش آئی ہے کہ حضرت خالد نے پہلے
ام تمیم کو باندی بنایا ہوگا۔ اور یہ ثابت ہی ہے کہ گرفتار شدہ لوگ "سبایا" بنائے گئے
تھے جنکو بعد میں متمم بن نویرہ کی درخواست پر حضرت ابوبکر کے حکم سے آزاد کر دیا گیا تھا۔
لیکن ام تمیم نے فوراً ہی اسلام قبول کر لیا ہوگا تو اب حضرت خالد نے اس سے نکاح کر لیا
معترضین کہتے ہیں کہ حضرت خالد اس کو دیکھ کر عاشق ہو گئے تھے اس لئے نکاح کیا۔ ممکن
ہے یہ صحیح ہو لیکن جب نکاح شرعاً درست تھا اور مالک بر بنائے ارتداد قتل ہوا تھا
تو اس میں شرع یا اخلاق کسی اعتبار سے کیا قباحت ہے یہ تو اس وقت ہے جب کہ معترضین
کی بات کو صحیح مان لیا جائے۔ ورنہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ام تمیم چونکہ ایک عالی مرتبت
اور معزز شخص کی بیوی تھی اور اب وہ بیوہ ہو گئی اسلئے حضرت خالد نے اس کی تسلی
اور دلدہی کیلئے اس سے نکاح کیا تھا۔ رہا قتل کے بعد فوراً نکاح کرنا تو ہمارے خیال
میں راوی کو اس میں شبہ ہوا ہے۔ کیونکہ طبری کے الفاظ یہ ہیں۔

وتزوج خالدؓ ام تمیم ابنۃ المنہال	خالد نے ام تمیم سے نکاح کیا اور پھر اسکو چھوڑ رکھا
وترکہا لینقضی طہرہا (ج ۳ ص ۲۴۳)	تاکہ اسکی مدت طہر پوری ہو جائے۔

غالباً مالک کے قتل کے بعد حضرت خالد ام تمیم کو بطور سبی اپنے خیمہ میں لے گئے ہونگے اور پھر
اسکے مسلمان ہو جانے پر کچھ دنوں کے بعد اس سے نکاح کیا ہوگا۔ اسکو راوی نے اسطرح بیان کر دیا
یاد رکھنا چاہئے کہ یہ صرف ہمارا قیاس نہیں ہے بلکہ اسکی ایک اصل بھی موجود ہے
ابو زید وثیمہ بن الوشاء المتوفی ۲۳۷ھ تیسری صدی کے ایک بلند پایہ مورخ ہیں
انہوں نے حضرت ابوبکر کے عہد میں فتنہ ارتداد کا جو طوفان اٹھا تھا خاص اسی موضوع
پر ایک مستقل کتاب "کتاب الردہ" کے نام سے لکھی تھی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے لیکن یہ
کس پایہ کی کتاب تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں
جگہ جگہ اسکے حوالے دئے ہیں اور اسکے اقتباسات نقل کئے ہیں چنانچہ اصابہ کا ہیں

اقتباسات کو ایک جرمن فاضل نے یکجا مرتب کر کے کتاب الردہ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ البتہ یربوع تمیمہ کا تذکرہ وفیات الاعیان اور فوات الوفیات دونوں میں ہے اس کے علاوہ محمد بن عمر الواقدی نے بھی اسی موضوع پر اور اسی نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ایک نسخہ ابتدائی اور انکے مطابق اصلاح کرنی ضروری ہے۔ پٹنہ میں موجود ہے ابن خلکان نے متمم بن نویرہ کے تذکرہ میں وثیمہ اور واقدی ان دونوں کی مذکورہ بالا کتابوں کے حوالے سے حضرت خالد اور مالک بن نویرہ کا جزا واقعہ نقل کیا ہے اس میں حضرت خالد اور ام تمیم کے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قیل انہ اشتراھا من الفیء	کہا جاتا ہے کہ خالد نے ام تمیم کو مال غنیمت
وتزوج بھا وقیل انھا	میں سے خرید لیا تھا اور پھر اس کے ساتھ نکاح
اعتدت بثلاث حیض ثم	کر لیا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ام تمیم نے تین
خطبھا الی نفسہ	حیض کی عدت گزاری تھی اور اس کے بعد خالد
فاجابتہ [1]	نے اس کو اپنا پیغام نکاح دیا اور ام تمیم نے اس کو قبول کر لیا

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اچھا جب بات یہی تھی تو پھر حضرت عمر نے حضرت خالد سے رجم کر دینے کا مطالبہ کیوں کیا، تو اسکے جواب میں ہم ایک روایت پیش کرتے ہیں جس سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جائیگا۔ حافظ ابن حجر نے ضرار بن الازور الاسدی کے تذکرہ میں الاصابہ میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق کے عہد خلافت میں حضرت خالد نے ضرار بن الازور کے ماتحت بنو اسد کیطرف ایک دستہ (سریہ) روانہ کیا۔ اس دستہ نے بنو اسد پر چھاپہ مارا اور ایک عورت گرفتار کر لی۔ ضرار جو دستہ کے امیر تھے وہ مسلمانوں سے اجازت لیکر عورت کو اپنے تصرف میں لے آئے۔ لیکن بعد میں ان کو ندامت ہوئی اور انہوں نے حضرت خالد سے درخواست کی کہ وہ اس واقعہ کی اطلاع حضرت عمر کو کر دیں اور اس کے لئے بارگاہ خلافت سے باقاعدہ منظوری لے لیں حضرت خالد کے نزدیک چونکہ اسکی ضرورت نہیں تھی اس لئے انہوں نے ٹال دیا کہ اسکی ضرورت

---

[1] دیکھو فوات الوفیات ج ۲ صفحہ از ۶۲۵ تا صفحہ ۶۲۸

نہیں ہے لیکن وہ نہ مانے۔ آخر حضرت خالد نے فاروق اعظم کو اس کی اطلاع دی تو آپ کو سخت غصہ آیا اور فوراً حضرت خالد کو حکم بھیجا کہ ضرار کو سنگسار کر دیا جائے۔ اتفاق یہ ہوا کہ حکم پہنچنے سے پہلے ہی ضرار کا انتقال ہو گیا۔ اب حضرت خالد کو یہ حکم ملا تو انہوں نے فرمایا "اللہ ضرار کو رسوا کرنا نہیں چاہتا تھا"

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر اذن خلیفہ کے بغیر مال غنیمت میں تصرف کو ناجائز اور حرام سمجھتے تھے اور اسی بنا پر انہوں نے ام تمیم کیساتھ تسری کو حرام سمجھ کر حضرت خالد کو مستحق رجم قرار دیا لیکن اس کے برخلاف حضرت خالد مسلمانوں کی باہمی رضامندی کے بعد مال غنیمت میں تصرف کو جائز قرار دیتے تھے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت خالد نے در پردہ حضرت ابوبکر سے اس طرح کے تصرفات کیلئے اجازت لے رکھی ہو اور اسی بنا پر حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کے خلاف اس معاملہ میں کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی۔

چند ضمنی مباحث تو بیچ میں آ گئے ہونگے جب ابو قتادہ انصاری نے مدینہ آ کر حضرت خالد کی شکایت صدیق اکبر سے کی تو آپ سنکر غضبناک ہو گئے اور انکی شکایت پر کوئی اعتنا نہیں کیا۔ آخر ابو قتادہ حضرت عمر کے پاس آئے اور پورا واقعہ کہہ سنایا۔ حضرت عمر فاروق سخت برہم ہوئے اور اسی وقت حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "خالد کی تلوار میں فساد ہے آپ ان کو فوراً معزول کر دیجئے اور میدان جنگ سے واپس بلا لیجئے۔ اسکے علاوہ حضرت خالد کی شان میں کچھ اور سخت الفاظ بھی استعمال کئے۔ حضرت ابوبکر نے انکو ٹوکا اور فرمایا جس تلوار کو اللہ نے اپنے دشمنوں پر بے نیام کر دیا ہے میں اس کو نیام کے اندر واپس نہیں کر سکتا (اشارہ تھا حضرت خالد کے سیف اللہ ہونے کی طرف) لیکن حضرت عمر کا اصرار زیادہ بڑھا تو حضرت خالد کو مدینہ طلب کیا۔ خالد مدینہ پہونچکر مسجد نبوی میں سے گزر رہے تھے کہ وہاں فاروق اعظم نے انکو دیکھ کر سخت سست کہا لیکن انہوں نے پرواہ نہیں کی۔ وہ سیدھے صدیق اکبر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گفتگو ہوئی اور اس کے بعد حضرت ابوبکر نے متمم بن نویرہ کو اس کے بھائی کا خون بہا بیت المال سے ادا کیا اور خالد بن ولید کو نکاح واپس کر دیا۔ یہ پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر درج ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں
(۱) اگر حضرت خالد خلیفۂ رسول کی رائے میں بے گناہ تھے تو انہوں نے خون بہا کیوں ادا کیا

(۲) حضرت ابوبکر اور حضرت عمر میں اس قدر شدید اختلاف کی وجہ کیا ہے۔

اب ہم ہر ایک سوال کا جواب الگ الگ بالترتیب لکھتے ہیں۔

حضرت ابوبکر کا دیت ادا کرنا اگرچہ حضرت خالد سے گفتگو کے بعد اور دوسرے ذرائع سے بھی واقعہ کی اصل نوعیت حضرت ابوبکر پر روشن ہو گئی تھی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت خالد نے عجلت پسندی اور بے احتیاطی سے کام لیا تھا اگر وہ مالک بن نویرہ کو قتل کرنے کی بجائے مدینہ بھیج دیتے تو جب وہ دیکھتا کہ سب ہی نواحات و علاقے قبائل مسلمان ہوتے جا رہے ہیں تو ممکن ہے وہ بھی مسلمان ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ام تمیم سے نکاح کیسا ہی جائز سہی۔ بے احتیاطی کا عمل ضرور تھا۔ ان دونوں باتوں کی وجہ سے اوّل تو خود حضرت ابوبکر کو ناگواری تھی ہی[1] پھر متمم بن نویرہ کی تالیف قلب اور حضرت عمر فاروقؓ کی تسکین خاطر بھی ضروری تھی۔ ان مصالح کے پیش نظر آپ نے متمم کو دیت بیت المال سے ادا کی۔

آپ کا یہ عمل محض بربنائے مصلحت و سیاست تھا۔ اسلئے نہیں تھا کہ آپ کی رائے میں بھی حضرت خالد ایک مسلمان کے قتل خطا کے مرتکب ہوئے تھے۔ چنانچہ جیسا آگے آئیگا عراق کی فتوحات کے سلسلہ میں مصیخ نامی ایک مقام پر حضرت خالد نے عبد العزیٰ جس کا نام بعد میں عبد اللہ ہو گیا تھا اور لبید بن جریر ان دونوں کو جو دشمن کے کیمپ میں تھے قتل کر دیا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ دونوں مسلمان تھے اور اس بارہ میں ان کے پاس حضرت ابوبکر کی ایک تحریر بھی تھی۔ حضرت ابوبکر کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان کی دیت ادا کی لیکن ساتھ ہی حضرت خالد کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ یوں ادا کرنے کو تو میں ادا کر دیتا ہوں لیکن درحقیقت یہ دیت مجھ پر واجب نہیں تھی کیونکہ یہ دونوں شخص مقتول اہل حرب کے ہاں مقیم اور انکے مہمان تھے

اور حقیقت یہ ہے کہ اور معاملات کی طرح اس ایک معاملہ میں بھی خلیفۂ رسول نے بعینہٖ وہی

[1] حافظ ابن حجر نے زبیر بن بکار کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب خالد کے پاس اموال غنیمت آتے تھے تو وہ انکو ارباب غنائم میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان کا حساب حضرت ابوبکر تک نہیں پہنچاتے تھے وہ بعض اوقات ایسے اقدامات بھی کر جاتے تھے جن کو حضرت ابوبکر اچھا نہیں سمجھتے تھے چنانچہ مالک بن نویرہ کا قتل اور اسکی بیوہ کے ساتھ نکاح حضرت ابوبکر نے ان دونوں باتوں کو مکروہ سمجھا۔ الاصابہ ج ۱ ص ۴۱۴ تذکرہ خالد بن ولید (طبع ج ۱ ص ۵۱۸)

کیا جو اسی قسم کے ایک واقعہ میں (یا جبکہ حضرت خالد کے ہاتھوں بنو جذیمہ کے لوگوں کا قتل عمل میں آیا) رسول اللہ صلعم نے کیا تھا۔ آپ نے اس واقعہ کو سنکر ایک طرف تو دونوں ہاتھ اٹھا کر دو مرتبہ فرمایا۔

اللّٰھم انی ابرء الیک مما صنع خالد[1] — اے اللہ جو کچھ خالد نے کیا ہے میں تیری جناب میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔

اور دوسری جانب حضرت علی کو مقتولین بنی جذیمہ میں سے ہر ایک کی نصف دیت (خون بہا) ادا کی۔ حضرت ناالاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ فرماتے ہیں کہ میری رائے میں یہ خون بہا محض مصالحت کی غرض سے ادا کیا گیا تھا کیونکہ مقتولین کے ورثہ نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا لیکن رحمت عالم نے پسند نہیں کیا کہ ان کا خون رائگاں جائے[2] لیکن بایں ہمہ آں حضرت صلعم نے حضرت خالد کو معزول نہیں کیا۔ اور اس واقعہ کے بعد بھی آنحضرت صلعم کی زندگی میں وہ برابر فوجی امارت کے عہدہ پر سرفراز رہے۔

شیخین کا اختلاف اب صرف ایک بات باقی رہتی ہے اور وہ یہ کہ آخر حضرت ابوبکر و حضرت عمر میں اس درجہ شدید اختلاف کی وجہ کیا تھی؟

ایک وہ شخص جس کی نظر عہد نبوت اور اس کے بعد کی تاریخ پر ہے جانتا ہے کہ خلیفہ اول و دوم کا یہ اختلاف پہلی مرتبہ نہیں تھا۔ عہد نبوت میں بھی دونوں میں متعدد بار مختلف معاملات و مسائل میں اختلاف ہوا۔ اور اس کے بعد جیش اسامہ کی روانگی کے وقت اور مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنے کے بارے میں بھی اختلاف ہوا تھا۔ لیکن جب کبھی اختلاف ہوا فاروق اعظم کو آخر میں اقرار کرنا پڑا کہ حضرت ابوبکر کی جو رائے تھی وہ صواب تھی چنانچہ اس موقع پر بھی ایسا ہی ہوا۔ حضرت عمر نے بعد میں فرمایا۔

رحم اللہ ابابکر فھو کان اعلم منی بالرجال — اللہ تعالیٰ ابوبکر پر رحم فرمائے وہ مجھ سے زیادہ مردم شناس واقع ہوئے تھے۔

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۲ باب بعث النبی صلعم خالد بن ولید الی بنی جذیمۃ

[2] فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۴ ص ۱۱۷

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ایک مرتبہ متمم بن نویرہ نے حاضر ہو کر حضرت خالدؓ سے قصاص کا مطالبہ کیا تو آپ نے فرمایا۔

لا اردشیئاً صنعہ ابوبکر [1] ابوبکرؓ جو کر گئے ہیں میں اس کو رد نہیں کروں گا۔

اصل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ جن کی شان میں فرمایا گیا تھا "اشدھم فی امر اللہ عمر" انہوں نے ابو قتادہ انصاری سے مالک بن نویرہ کا واقعہ سنا تو چونکہ بنو جذیمہ کیساتھ بھی اس قسم کا واقعہ پیش آچکا تھا اس بنا پر ان کو سخت غصہ آیا۔ کیونکہ بحکم حسنات الابرار سیات المقربین وہ ایک صحابی سے اس طرح کے فعل کا صدور اور وہ بھی مکرر بہت مستبعد جانتے تھے، انکے برخلاف حضرت ابوبکرؓ کا معاملہ یہ تھا کہ ہر بات میں اسوۂ رسول صلعم کا اتباع انکی فطرت اور طبیعت بن گئی تھی۔ وہ انسانی فطرت کی کمزوریوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور دوسری طرف سیاست اور فوجی تدابیر کا جو مقتضا تھا اس سے بھی پورے طور پر آگاہ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے میں اگر حضرت خالدؓ سے کسی غلطی کا ارتکاب ہوا بھی تھا تو بہرحال وہ اتنی بڑی غلطی ہرگز نہیں تھی جس کی پاداش میں حضرت خالدؓ ایسے مدبر سپہ سالار اور بہادر جرنیل کی قیادت سے لشکر کو محروم کر کے اسلامی محاذِ جنگ کو خطرہ میں ڈالتے۔ بارگاہِ خلافت کی طلب پر حضرت خالدؓ کا مدینہ چلا آنا اور خلیفۂ رسولؐ کے روبرو معذرت خواہ ہونا بھی حضرت خالدؓ کے جرم فروگزاشت کی تلافی کیلئے کافی تھا آج کی مہذب دنیا میں کیا ہوتا ہے؟ کسی ذمہ دار شخصیت سے بڑے سے بڑا جرم سرزد ہو جاتا ہے لیکن صرف ایک لفظ "افسوس" (REGRET) کہہ دینا ہی اسکی مکافات کر دیتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے مزاج میں اولاً تو شدت تھی ہی۔ پھر اس وقت تک حکومت کی براہ راست ذمہ داری کا بوجھ بھی ان کے کاندھوں پر نہیں پڑا تھا۔ لیکن جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے وفات کے وقت اپنی جانشینی کیلئے فاروق اعظمؓ کے نام کی سفارش کرتے ہوئے پیشگوئی کی تھی۔ جب خود حضرت عمرؓ کو حکومت و خلافت کے بار گراں کا متحمل ہونا پڑا تو ان کے تشدد میں خود بخود اعتدال کا رنگ پیدا ہو گیا۔

---

[1] خزانۃ الادب ج ۱ ص ۲۲۸

مسیلمہ اور اہلِ یمامہ سے جنگ

یاد ہوگا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے باغی اور مرتد قبائل سے جنگ کرنے کی غرض سے جو گیارہ لشکر مختلف اطراف میں روانہ کیے تھے ان میں سے ایک لشکر جو مسیلمہ کیطرف روانہ کیا گیا تھا عکرمہ بن ابی جہل کی سرکردگی میں تھا لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ یہ لشکر ناکافی ہوگا تو آپ نے شرحبیل بن حسنہ کے ماتحت ایک لشکر اور بھیجا۔ حضرت عکرمہ نے یمامہ پہونچتے ہی شرحبیل کا انتظار کیے بغیر حملہ کر دیا۔ لیکن ان کو پسپا ہونا پڑا۔ ادھر شرحبیل کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہیں راستہ میں ٹھہر گئے۔ عکرمہ نے حضرت ابوبکرؓ کو اصل واقعہ کی خبر کی تو آپکو بڑا ملال ہوا اور عکرمہ کو لکھا کہ اب آئندہ تم میری شکل نہ دیکھنا اور میں تمہاری شکل نہ دیکھوں گا ساتھ ہی حکم بھیجا کہ وہ حذیفہ اور عرفجہ کے پاس پہونچکر عمان اور مہرہ کے لوگوں کے ساتھ جنگ کریں اور یہاں سے فارغ ہو کر یمن اور حضر موت کا رُخ کریں۔ اب رہے شرحبیل تو ان کو حکم بھیجا کہ وہ جہاں ہیں وہیں رہیں یہاں تک کہ خالد پہنچ جائیں۔

حضرت خالدؓ کی نامزدگی | غالباً حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مسیلمہ کی طاقت کا شروع میں صحیح اندازہ نہیں تھا اور اسی وجہ سے حضرت خالدؓ کو ابتداً اس محاذ پر نہیں بھیجا گیا تھا لیکن جب عکرمہ کو شکست ہوئی اور ساتھ ہی معلوم ہوا کہ مسیلمہ کے ساتھ چالیس ہزار عرب منتخب نبرد آزما ہیں تو اب آپکو موقع کی نزاکت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ بظاہر ہے اتنے بڑے معرکہ کو سر کرنے کے لیے سیف اللہ کے سوا اور کس کے نام قرعۂ فال نکل سکتا تھا چنانچہ حضرت خالدؓ دربارِ خلافت کی طلبی پر بطاح سے مدینہ آئے اور یہاں مالک بن نویرہ کے واقعہ کی جو صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی جب حضرت خالدؓ کا بیان سننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو اس کے متعلق اطمینان ہو گیا تو اب

حضرت ابوبکرؓ نے معرکہ یمامہ کو سر کرنے کی پوری ذمہ حضرت خالدؓ کے سپرد کی۔

ناموران مہاجرین و انصار کی شرکت غزوۂ بدر کے بعد یمامہ کا معرکہ سب سے بڑا معرکہ تھا جس کی اسلام کی زندگی اور موت کا قطعی فیصلہ ہونے والا تھا۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکرؓ صرف حضرت خالدؓ کے بھیجنے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ناموران مہاجرین و انصار جو بدر وحنین کے معرکے سر کر چکے تھے اور جن میں بڑے بڑے حفاظ و قرّاء تھے ان کو بھی اس جنگ کیلئے نامزد کیا گیا مہاجرین کے دستہ کے سردار حضرت ابوحذیفہؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی زید بن خطابؓ تھے اور انصار کا دستہ ثابت بن قیس بن شماس کی ماتحتی و نگرانی میں تھا غرضیکہ اس شان و شوکت اور اہتمام کیساتھ حضرت خالدؓ مسیلمہ سے جنگ کرنیکے لئے یمامہ روانہ ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس خیال سے کہ کوئی پیچھے سے حملہ نہ کر دے حضرت خالدؓ کے عقب میں سلیطؓ کی سرکردگی میں ایک اور دستہ روانہ کیا۔

مجاعہ کی گرفتاری حضرت خالدؓ یمامہ سے ابھی ایک شب کی مسافت پر تھے کہ ان کو ایک دستہ ملا جس کا سردار مجاعہ بن مرارہ تھا جو بنو حنیفہ کے معزز ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ دستہ بنو تمیم اور بنو عامر پر شب خون مار کر آ رہا تھا۔ حضرت خالدؓ کے حکم سے اس دستہ کے سب آدمی قتل کر دیئے گئے اور مجاعہ گرفتار کر لیا گیا۔ اب لشکر آگے بڑھا اور یمامہ کے ایک مقام عقربا پہونچا۔ جہاں مسیلمہ اپنا لشکر کثیر لئے پڑا تھا جس کی تعداد عام مورخین کے بیان کے مطابق چالیس ہزار اور بعض روایات میں ساٹھ ہزار بیان کی جاتی ہے۔ ؎

لشکر کی ترتیب دوسرے دن صبح کو حضرت خالدؓ نے اپنے لشکر کو اسطرح ترتیب دی کہ دائیں بازو (میمنہ) کے کمانڈر حضرت زید بن خطاب تھے اور بائیں بازو (میسرہ) کی قیادت حضرت اسامہ بن زید کے سپرد تھی۔ اور خود ایک دستہ لئے ہوئے وسط لشکر

له صحابۂ بدریین کو حضرت ابوبکرؓ اسقدر عزیز رکھتے اور ان کو اس درجہ بابرکت سمجھتے تھے کہ آپ انکو کسی جنگ میں جانا پسند نہیں کرتے تھے (طبری ج ۲ ص ۵۵) یمامہ کے معرکہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ذاتی رجحان کے برخلاف اس موقع پر بدری صحابہ کو بھی بھیجنا پڑا۔ ؎ طبری ج ۲ ص ۵۵

میں تھے ادھر مسیلمہ نے اپنے لشکر کی صف بندی کی اور دونوں لشکر ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہو گئے۔

جنگ کا آغاز اب مسیلمہ کی طرف سے شرحبیل بن مسیلمہ نے بنو حنیفہ کو للکار کر کہا اے لوگو! آج کا دن غیرت کا دن ہے۔ اگر تم نے شکست کھائی تو تمہاری عورتوں کو لونڈی باندیاں بنا لیا جائے گا۔ اور بغیر نکاح کے ان کے ساتھ تمتع کیا جائیگا۔ اس لئے تم اپنے حسب و شرف کی طرف سے مدافعت کرو اور اپنی عورتوں کو بچاؤ۔ ادھر مجاہدین اسلام کے ولولہ و جوش کا یہ عالم تھا کہ "جوہر شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا۔"

مجاہدین کا جوش وخروش مہاجرین کا علم حضرت سالم مولی حذیفہؓ کے ہاتھ میں تھا۔ کسی نے کہا کہ اگر آپ قتل ہو گئے تو ایک حامل قرآن جاتا رہے گا۔ انہوں نے کہا "اگر میں اس بات کا اندیشہ کروں تو مجھ سے برا حامل قرآن کون ہوگا۔ نہار رجال ایک شخص تھا جس نے مشہور کر دیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم نے اپنی نبوت میں سے نصف کا شریک مسیلمہ کو کر لیا ہے اور اسطرح مسیلمہ کا دست راست تھا۔ اس نے صف سے باہر نکل کر پکار کر کہا کون مبارز ہے کیا مجھ سے کوئی مقابلہ کرنے والا ہے۔ اسکے جواب میں اسلامی لشکر کی طرف سے حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی زید بن خطاب آگے بڑھے اور انہوں نے اس زور کا وار کیا کہ نہار رجال ڈھیر تھا۔ اب دونوں لشکر گت بت ہو گئے اور بڑے زور کا رن پڑا۔ مسیلمہ کا ایک ایک آدمی اس پر پروانہ وار اپنی جان قربان کرنے پر تلا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کو یقین تھا کہ اگر اس جنگ میں شکست ہو گئی تو حجاز کی سیادت جنوبی عرب پر ہمیشہ کیلئے قائم ہو جائیگی اور شدید قبائلی عصبیت کے باعث یہ چیز انکی موت کے مرادف تھی۔ مسلمانوں کو ایسی ہولناک اور سخت جنگ لڑنے کا پہلا اتفاق تھا۔ اس لئے اول اول مسلمان پسپا ہو گئے یہ رنگ دیکھ کر مسیلمہ کی فوج کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ اس نے حضرت خالدؓ کے خیمہ پر حملہ کر دیا۔ یہاں حضرت خالدؓ کی نئی بیوی ام تمیم تھیں حملہ آوروں نے چاہا کہ انہیں قتل کر دیں لیکن مجاعہ جسکو حضرت خالدؓ ام تمیم کی نگرانی میں رکھ گئے تھے اس نے روکا اور کہا کہ میں اس عورت کا پڑوسی ہوں۔ ان لوگوں نے اب ام تمیم سے کوئی تعرض نہیں کیا لیکن خیمہ کی دھجیاں اڑا دیں۔

مسلمانوں کا دوسرا حملہ اب مسلمانوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک دوسرے کو پکار پکار کر ثابت قدمی اور استقلال کی دعوت دینے لگا۔ ثابت بن قیس نے کہا "آہ! اے مسلمانو! آخر تم کیا کرو گے اے اللہ! ان مسلمانوں نے جو پسپائی دکھائی ہے میں اس سے بری ہوں زید بن خطاب بولے "خدا کی قسم! اب میں اس وقت تک زبان نہیں کھولوں گا جب تک کہ ہم لوگ دشمنوں کو شکست نہیں دیدیں گے یا میں خود قتل نہیں کر دیا جاؤں گا۔ ابو حذیفہ نے للکار کر کہا "اے اہل قرآن! تم اپنے افعال سے قرآن کو زینت دو" یہ مجاہدین اسلام اپنی اپنی جگہ پر شیر کی طرح ہنکار رہے تھے کہ اتنے میں حضرت خالد نے پلٹ کر اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے لیکن کچھ فاصلہ پر پہونچکر جوابی حملہ کیا۔ اور جنگ تیز ہو گئی۔ مہاجرین انصار، اہل قری اور اہل بادیہ ان سب کے دستے ایک دوسرے کیساتھ ملے ہوئے داد شجاعت دے رہے تھے حضرت خالد نے حکم دیا کہ ہر دستہ فوج الگ الگ ہو جائے۔ اب حضرت خالد نے جائزہ لیا۔ تو معلوم ہوا کہ مہاجرین انصار اور اہل قری کو بہ نسبت اہل بادیہ کے زیادہ نقصان پہونچا تھا۔ اور مشہور صحابہ حضرت زید بن خطاب حضرت سالم اور ان کے آقا حضرت ابو حذیفہ اس معرکہ میں کام آچکے تھے حضرت خالد نے دشمن کی جمعیت پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ مسیلمہ اپنی جگہ پر جما ہوا کھڑا ہے اور اسکے حمائتیوں نے چاروں طرف سے اسکو اپنے حلقہ میں لے رکھا ہے اب حضرت خالد نے محسوس کیا کہ جب تک مسیلمہ کی دستۂ خاص پر حملہ کر کے اسے شکست نہیں دیجائیگی دشمن کی جمعیت منتشر نہ ہوگی چنانچہ انہوں نے بیک "احمداہ" نعرہ لگایا اور مسیلمہ کے دستہ پر حملہ کر دیا اب عالم یہ تھا کہ دشمن کی فوج کا ایک ایک بہادر سربکف ہو کر آگے بڑھتا تھا اور اسکی لاش خاک و خون میں تڑپ کر رہ جاتی تھی مسیلمہ نے یہ دیکھ کر چاہا کہ خود مقابلہ کے لئے آگے بڑھے لیکن شدتِ خوف و اضطراب سے ایک قدم آگے بڑھاتا تھا اور اسے پھر پیچھے ہٹا لیتا تھا۔ اتنے میں حضرت خالد نے اپنے دستہ کے مجاہدوں کے ساتھ اچانک اس زور کا حملہ کیا کہ اب مسیلمہ کیلئے راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔ مسیلمہ کے جانثاروں نے ہر چند اس سے کہا کہ "تو ہم سے جس فتح و ظفر کا وعدہ کرتا تھا وہ کہاں گیا"

لیکن اب اس کیلئے ٹھہرنا ناممکن تھا۔ خود بھاگتا جاتا تھا اور لوگوں سے کہہ رہا تھا " اپنے حسب و نسب کی طرف سے مدافعت کرو۔ لیکن ظاہر ہے اسکی اب ان باتوں کا اثر ہی کیا ہو سکتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھی میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ پڑی۔ ذرا فاصلہ پر ایک باغ تھا جس کی چہار دیواری محفوظ تھی محکم بن الطفیل نے چیخ کر کہا۔ اے بنو حنیفہ باغ! باغ! یعنی اس میں چل کر پناہ لو۔ یہ باغ درحقیقت مسیلمہ کا قلعہ تھا اور چونکہ مسیلمہ اپنے آپ کو رحمٰن الیمامہ کہتا تھا اس لئے باغ کا نام حدیقۃ الرحمٰن تھا یہ سب لوگ اس میں پہونچکر قلعہ بند ہو گئے۔

مسیلمہ کا قتل اسلامی لشکر نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا اندر جانیکا راستہ نہیں تھا اسلئے حضرت براء بن مالک نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ ان کو اوپر اٹھا کر باغ (قلعہ) کے اندر ڈالدیں۔ مجاہدین نے کہا "ہم ایسا نہیں کریں گے۔ لیکن براء بن مالک نے اصرار کیا تو مسلمانوں نے مجبوراً ان کو باغ کی دیوار پر پہونچا دیا اور اندر کی طرف کود کر تن تنہا لڑتے بھڑتے گھستے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دروازہ کھول دیا۔ بس اب کیا تھا؟ مسلمان باغ کے اندر گھس آئے اور پھر شدید جنگ شروع ہو گئی۔ دونوں طرف سے کشتوں کے پشتے لگ گئے لیکن بنو حنیفہ کے مقتولین کی تعداد بہت زیادہ تھی اس معرکہ میں مسیلمہ بھی جبیر بن مطعم کے غلام وحشی کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب بنو حنیفہ کیلئے جمنا ناممکن تھا لہٰذا پسپا ہو کر بھاگ پڑے۔

حضرت خالد کو یہ خوشخبری پہونچی تو مجاعہ کو لیکر بنو حنیفہ کے مقتولین کو دیکھنا شروع کیا ایک طرف محکم کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ شخص خوبصورت اور وجیہ تھا حضرت خالد نے پوچھا "کیا تمہارا سردار مسیلمہ یہی ہے؟" مجاعہ نے جواب دیا "نہیں! بخدا یہ اس سے زیادہ بہتر اور شریف ہے۔ یہ محکم الیمامہ ہے۔ محکم کو حضرت عبدالرحمن ابن ابی بکر نے ایک تیر مار کر اس وقت ہلاک کیا تھا جبکہ ابھی وہ باغ کے احاطہ سے باہر پیچھے سے اپنے ساتھیوں کی حفاظت کر رہا تھا۔ اب حضرت خالد قلعہ کے اندر داخل ہوئے یہاں ایک لاش کی طرف اشارہ کر کے مجاعہ نے بتایا کہ یہ مسیلمہ ہے اسی لئے اس باغ کا نام "حدیقۃ الموت" یعنی موت کا باغ پڑ گیا اور وہ اسی نام سے تاریخوں میں مشہور ہے طبری کا بیان ہے کہ باغ سے باہر اور اندر دس ہزار آدمی مسیلمہ کے اور بارہ سو مسلمان مجاہدین قتل ہوئے[1]

[1] یہ پوری تفصیل طبری ج ۲ از صفحہ ۵۰۴ تا صفحہ ۵۱۹ و ابن اثیر ج ۲ از صفحہ ۱۳۲ تا صفحہ ۱۳۸ سے ماخوذ ہے۔

باقی قلعوں پر قبضہ | اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمن بن ابی بکرؓ نے حضرت خالدؓ کو مشورہ دیا کہ باقی دوسرے قلعوں پر بھی جہاں مسیلمہ کے ساتھی ابھی تک محفوظ ہیں حملہ کیا جائے۔

ادھر مجاعہ نے جس پر حضرت خالدؓ اعتماد کرنے لگے تھے آکر کہا کہ مسیلمہ کیساتھ جو لوگ آئے تھے جلد باز قسم کے تھے ورنہ ایک بہت بڑی تعداد تو ابھی تک قلعوں میں بند ہے مجاعہ کا مقصد اس کہنے سے صرف یہ تھا کہ حضرت خالدؓ بنو حنیفہ کے بچے کھچے لوگوں کیساتھ مصالحت کرلیں اور ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مراعات برتیں چنانچہ مجاعہ نے ایک طرف تو حضرت خالدؓ سے یہ کہا اور دوسری جانب اپنی قوم کی عورتوں سے کہا "تم سب ہتھیار پہن لو اور قلعوں کی منڈیروں پر کھڑی ہو جاؤ۔ عورتوں نے فوراً اس پر عمل کیا اب حضرت خالدؓ نے یہاں پہنچکر نظر اٹھائی تو دیکھا کہ قلعوں پر زرہ پوش اور ہتھیار بند سپاہیوں کی صفیں کھڑی ہیں ادھر چونکہ مسیلمہ کے ساتھ مسلمان مجاہدین کو بڑی شدید جنگ لڑنی پڑی تھی اس لئے وہ تھکے ماندے اور گھر واپس جانے کیلئے بے قرار تھے ان وجوہ کی بنا پر مجاعہ نے جو ترکیب چلی تھی وہ کامیاب ہوئی اور حضرت خالدؓ نے معمولی سی شرطوں پر صلح کرلی۔ بعد میں مجاعہ کی فریب کا بھید کھلا تو حضرت خالدؓ کو بڑا غصہ آیا لیکن مجاعہ نے صاف کہا "یہ لوگ (بنو حنیفہ) میرے ہم قوم ہیں۔ اس لئے میرے لئے ناممکن تھا کہ میں انکی مدد نہ کروں"

صلح ہو جانے کے بعد حضرت خالدؓ نے ان سب بقیۃ السیف پر اسلام پیش کیا جس کو انھوں نے فوراً قبول کرلیا۔ اور حضرت خالدؓ نے از روئے صلح جو کچھ ان سے وصول کیا تھا وہ سب انکو واپس کردیا [1]

جنگ یمامہ کی تاریخ | یہ جنگ یمامہ کب ہوئی؟ اس میں اختلاف ہے، کوئی ۱۱ھ بتاتا ہے، اور کوئی ۱۲ھ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے دونوں میں تطبیق اس طرح دی کہ اس کا آغاز تو ہوا ۱۱ھ میں لیکن ختم ہوئی ۱۲ھ میں واللہ اعلم [2]

حدیقۃ الموت کا جائے وقوع | عام طور پر محدثین اور مورخین کے ہاں مشہور ہے اور جیسا کہ ہم نے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۵ — [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۶

بھی لکھا ہے کہ مسیلمہ کیساتھ یہ جنگ یمامہ میں لڑی گئی تھی اور حدیقۃ الموت جس میں مسیلمہ قتل ہوا تھا اسکی نسبت یہی تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ یمامہ کی حدود میں یا اس کے قریب ہی تھا لیکن مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر [1] جس نے ابواسمٰعیل الازدی کی کتاب "فتوح الشام" کو ۱۸۵۴ء میں اڈٹ کیا تھا اس نے ایک اور مستشرق کیپٹن لیس (LEES) کو ۷ فروری ۱۸۶۵ء کو ایک خط لکھا تھا جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی کارروائیوں (PROCEEDINGS) کی رپورٹ بابت ۱۸۶۵ء میں از صفحہ ۱۰۲ تا صفحہ ۱۰۷ چھپا ہوا ہے۔ اس میں ڈاکٹر موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسیلمہ کا باغ یمامہ میں نہیں بلکہ مقام ابجر میں ہے۔

جنگ کا اثر | مرتد اور باغی قبائل سے جتنی لڑائیاں لڑی گئی ہیں ان میں یمامہ کی جنگ سب سے بڑی اور سخت ترین تھی مسیلمہ کیساتھ جو لشکر تھا اس کی تعداد اکثر نے چالیس ہزار اور بعض نے ساٹھ ہزار لکھی ہے اور یہ سب کے سب مسیلمہ پر پروانہ وار فدا تھے جس کے متعدد اسباب و وجوہ کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

موقع کی اس نزاکت کے باعث وہ اکابر مہاجرین و انصار جن کو حضرت ابوبکرؓ مدینہ سے باہر بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے، انکو بھی محاذ جنگ پر بھیجا گیا اور اگرچہ اس معرکہ میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہونچا۔ اکابر صحابہ اور بڑے بڑے حفاظ و قرآ [2] جام شہادت نوش کرگئے لیکن چونکہ اسلام کے سب سے بڑے حریف پر یہ آخری اور فیصلہ کن فتح تھی جس نے جزیرۃ العرب میں ہمیشہ کیلئے اسلام کے قدم جما دئے اور اس کو کسی مخالفت کا اندیشہ نہیں رہا۔ اسلئے اگلی فوج فتح و ظفر کا پرچم اڑاتی ہوئی جب مدینہ میں داخل ہوئی ہے تو مدینہ کا گوشہ گوشہ مرحبا اور آفرین کے نعروں اور حمد و صلوٰۃ کے نغموں سے گونج اٹھا جو صحابہ کرام اس جنگ میں شہید ہوگئے تھے انکا غم ہونا ایک طبعی بات تھی لیکن نصرت خداوندی پر ترانہ ہائے حمد کی آوازوں میں نوحہ و ماتم کی یہ صدائیں دب دب کر رہ گئیں۔

---

[1] ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم نساؤ لیس یہ دونوں کلکتہ مدرسہ کے جو مسلمانوں میں عام طور پر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نام سے مشہور ہے۔ پرنسپل تھے اول الذکر ۱۸۵۰ء میں اور مؤخر الذکر ۱۸۵۷ء میں۔

[2] ابن اثیر اور بلاذری نے اعلام صحابہ کے نام کی فہرست دی ہے۔

اس فتح و کامرانی پر حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ خوش ہونیکا حق اور کسے ہو سکتا تھا
لیکن ایکہزار بارہ سو صحابہؓ کے شہید ہو جانے کا رنج و ملال بھی کم نہیں تھا چنانچہ آپ کو اطلاع
ملی کہ حضرت خالدؓ نے جنگ کے بعد مجاعہ کی بیٹی سے نکاح کر لیا ہے تو انتہائی حلیم و بردبار ہونیکے
باوجود حضرت خالدؓ کو ایک سخت غضب آلود خط لکھا کہ "اے ام خالد کے بیٹے! معلوم ہوتا
ہے تمہارے دل میں درد نہیں ہے۔ تم اس وقت عورتوں سے نکاح کرتے ہو جبکہ تمہارے
گھر کے صحن میں بارہ سو مسلمانوں کا خون ابھی تک خشک نہیں ہوا ہے۔" [1]

بحرین

حضرت خالدؓ جس وقت یمامہ کی جنگ میں معروف تھے دوسرے مسلمان قائدین فوج
جن کا ذکر پہلے آچکا ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے احکام کے مطابق عرب کے مختلف حصوں میں
باغیوں کے ساتھ معروف پیکار تھے۔ انہیں میں سے ایک ریگستانی صوبہ بحرین کا تھا جو
مدینہ سے بہت دور شمال مشرق میں خلیج فارس کے کنارہ پر واقع تھا۔ یہ علاقہ حکومت
ایران کے ماتحت تھا اور اس میں متعدد عرب قبائل بنو عبدالقیس، بکر بن وائل اور تمیم
آباد تھے جن کا سردار ایران کی طرف سے مقرر کیا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کے عہد میں یہ سردار منذر
بن ساوی تھا جس کے نام آنحضرت ﷺ کے لکھے ہوئے خطوط ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی قابل
قدر کتاب "الوثائق السیاسیۃ" میں نقل کئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی دعوت پر منذر اور بحرین کا
صدر مقام ہجر کا گورنر (مرزبان) یہ دونوں مسلمان ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ جتنے
عرب قبائل یہاں آباد تھے انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا یہ واقعہ ۸ھ کا ہے [2]
بعض مؤرخین اسکو ۹ ہجری کے واقعات میں شمار کرتے ہیں لیکن اصح اول ہی ہے۔
آنحضرت ﷺ کی وفات کے چند روز بعد ہی منذر بن ساوی کا بھی انتقال ہو گیا تو الحطم
ایک سردار کیساتھ بنو عبدالقیس اور بنو بکر مرتد ہو گئے۔ لیکن جارود بن بشر بن عمرو العبدی
جنہوں نے آنحضرت ﷺ کا فیض صحبت حاصل کیا تھا انکی کوششوں سے بنو عبدالقیس تو

[1] طبری ج ۲ ص ۵۱۹ [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۸۵۔

جلد ہی اسلام کی طرف لوٹ آئے [1] لیکن بنو بکر اپنے ارتداد پر اصرار رہا اور ان لوگوں نے
نعمان بن منذر بن ماء السماء (صاحب الخورنق والسدیر) کے بیٹے کو جس کا نام بھی منذر تھا اپنا
سردار منتخب کر لیا۔ الحطم بن ضبیعہ، بنو بکر اور دوسرے عجمی لوگ جو بحرین میں آباد تھے اور جو سرے
سے مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے ان کو ساتھ ملا کر مقام جواثا میں حضرت جارودؓ کے خلاف
معرکہ آرا ہوا اور ان لوگوں نے مسلمانوں کا محاصرہ کر کے سامان رسد تک سے انکو محروم کر دیا
لیکن مسلمان فقر و فاقہ اور ان تمام سختیوں کے باوجود اسلام کے دامن کو پکڑے رہے۔
یہی حالات گذر رہے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے علاء بن الحضرمی کو بحرین کے محاذ پر روانہ کیا
علاء بحرین اس وقت پہونچے ہیں جبکہ حضرت خالدؓ مسیلمہ کی جنگ سے فارغ ہو چکے ہیں اس
بنا پر بنو حنیفہ کے بچے کھچے لوگ جو اب مسلمان ہو گئے تھے وہ بھی حضرت علاءؓ کے ہمرکاب
ہو گئے۔ ان کے علاوہ ثمامہ بن آثال اور قیس بن عاصم المنقری بھی اپنے اپنے لوگوں کے
ساتھ اس لشکر میں شریک ہو گئے۔ حضرت علاءؓ اپنے لشکر کو لئے ہوئے صحرائے دھنا میں سے
گذر رہے تھے کہ شام ہو گئی تو انہوں نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اکرات کے وقت جنگل میں
کہیں راستہ نہ بھول جائیں۔ جب یہ لشکر پڑاؤ ڈالے پڑا تھا اتفاق ایسا ہوا کہ اونٹ جن پر سامان خورد
نوش لدا ہوا تھا بدک کر بھاگ پڑے اور یہاں کھانے پینے کی کوئی چیز باقی نہیں رہی مسلمان
سخت پریشان ہوئے۔ یہاں تک کہ انہیں اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ اور ایک دوسرے کو
وصیت کرنے لگا۔ حضرت علاء بن الحضرمی نے آپکی ہمت بندھائی اور کہا کہ بلے لوگو! کیا
تم سب مسلمان نہیں ہو۔ کیا تم اللہ کے انصار اور اسکی راہ میں جہاد کرنے والے نہیں ہو؟
تم یقین رکھو کہ اللہ تم جیسے لوگوں کو رسوا اور ذلیل نہیں کرے گا۔ چنانچہ اسلامی فوج جب نماز فجر
سے فارغ ہوئی تو ان کو دور سے سراب چمکتا ہوا نظر آیا۔ فوج کے پیش رو دستہ نے پاس جا
کر دیکھا تو وہ پانی تھا بہت خوش ہوئے سب نے پانی پیا۔ غسل کیا اور اپنے اپنے مشکیزوں میں
بھر لیا۔ اس کے بعد آفتاب ذرا بلند ہوا تو کرا چانک اونٹ بھی ادھر ادھر بھاگتے ہوئے
واپس آ گئے۔ مسلمانوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اب یہ لشکر تازہ دم ہو کر روانہ ہوا

[1] طبری ج ۲ ص ۵۱۹

بڑی بے جگری سے لڑے۔ لیکن فتح مسلمانوں کو ہی ہوئی۔ اور یہ سب لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ طبری کی روایت ہے کہ اس جنگ میں مال غنیمت اس کثرت سے ہاتھ آیا کہ ایک ایک سوار کو چھ چھ ہزار اور پیادہ کو دو دو ہزار ملے۔ حضرت علاء اسی دن بحرین کیلئے واپس روانہ ہوگئے اور بحرین پہنچکر حضرت ابوبکر کو مژدۂ فتح کا خط لکھا اور جو حالات گذرے تھے سب از اول تا آخر لکھے۔ اب یہاں مرتدین اور باغیوں کی طاقت مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی۔ جو بچ رہے ایں سب مسلمان ہوگئے۔ کسی نے خبر اڑادی کہ بنو شیبان حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں لیکن یہ محض افواہ تھی۔ حضرت علاء نے تحقیق کی تو اس کی کوئی اصلیت نہ تھی۔[1]

جنگ بحرین کی اہمیت: اگرچہ اس جنگ کا نمبر جنگ یمامہ کے بعد ہے۔ لیکن بعض خاص اعتبارات سے یہ جنگ یمامہ سے بھی زیادہ اہم تھی۔ یمامہ میں صرف ایک قوم اور ایک گروہ سے واسطہ تھا لیکن بحرین چونکہ خلیج فارس پر واقع تھا۔ ایران کی حکومت کے ماتحت تھا اور یہاں ہندوستان اور ایران کے تاجر آباد تھے جنہوں نے فرات کے دہانہ سے عدن تک اپنی آبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ اس بنا پر اسلام کی یہ جنگ صرف کسی ایک قوم سے نہیں تھی۔ بلکہ بین الاقوامی تھی۔ اور پھر چونکہ ان لوگوں میں عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی آتش پرست بھی تھے۔ اور بت پرستی بھی اس لئے اس جنگ کو بین المذاہبی جنگ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو جو شاندار فتح ہوئی اور اثرات و نتائج کے علاوہ اس کا اثر یہ بھی ہوا کہ جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق میں ایرانی حکومت نے اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا جو جال پھیلا رکھا تھا اس کا تار و پود بکھر گیا اور مسلمانوں کے لئے عراق کی فتح کا راستہ کھل گیا۔ جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

[1] یہ پوری تفصیل ملخصاً طبری ج ۲ از صفحہ ۵۱۹ تا صفحہ ۵۲۸ سے ماخوذ ہے۔

اور بحرین پہونچا یہاں جارود مقامی مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ حطم بن ضبیعہ کے بالمقابل صف آرا تھے حضرت علاء ابن الحضرمی نے جارود کو پیغام بھیجا کہ تم اپنی جگہ پر ڈٹے رہو لیکن حطم کا لشکر تعداد میں بہت زیادہ تھا اور ساز و سامان بھی اس کے پاس بافراط تھا اس لئے حضرت علاء اور حطم دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں خندقیں کھود کر پڑ گئے، دن کے وقت یہ دونوں فوجیں خندقوں سے باہر آکر جنگ کرتی تھیں اور پھر خندقوں میں واپس چلی جاتی تھیں، ایک ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ فتح و شکست کسی فریق کو نہیں ہوئی تھی۔ آخر ایک رات دشمن کے لشکر میں اچانک شور و غل اور مار دھاڑ کی آواز بلند ہوئی حضرت علاء نے عبداللہ بن حذف کو خبر لانے کیلئے بھیجا۔ انہوں نے آکر بتایا کہ فریق مخالف کے سپاہی شراب میں بدمست ہیں اور خوش فعلیاں کر رہے ہیں حضرت علاء یہ سنتے ہی اپنی فوج لے کر ان لوگوں پر جا پڑے اور تلوار چلانی شروع کر دی۔ یہ لوگ سخت بدحواس ہو کر رہ گئے۔ ان میں کچھ قتل ہو گئے۔ کچھ گرفتار ہوئے کچھ ادھر ادھر جہاں جگہ نظر آئی چھپ گئے اور باقی جو تھے وہ بھاگ پڑے۔ اسی ہنگامہ میں حطم مارا گیا۔ جو لوگ اس دار و گیر سے بچ نکلے تھے وہ کشتیوں میں سوار ہو کر جزیرہ دارین[1] پہونچے۔

حضرت علاء نے ان لوگوں کا تعاقب کرنا چاہا لیکن مشکل یہ تھی کہ مسلمانوں کے پاس کشتیاں نہیں تھیں کہ سمندر پار کر سکیں۔ آخر حضرت علاء نے مسلمانوں کو جمع کر کے کہا کہ کچھ خوف نہ کرو۔ جس خدا نے تمہاری مدد خشکی (صحرائے دھنا) میں کی ہے وہ بحرین میں تمہاری مدد کرے گا اس کے بعد سب مسلمانوں نے مل کر جناب باری تعالیٰ میں عجز و الحاح کیساتھ دعا کی۔ دعا سے فارغ ہوئے تو مسلمانوں میں اس قدر جوش و خروش تھا کہ گھوڑا، اونٹ، گدھا اور خچر غرض کہ جس کے پاس جو سواری تھی اس نے بے جھجک سمندر میں ڈالدی۔ بقول اقبال ؎

بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

اس شان سے مسلمانوں نے سمندر پار کیا اور جزیرہ دارین کے ساحل پر پہونچے یہاں چونکہ مفرورین کے لئے اب کہیں بھاگ نکلنے کی گنجائش نہیں تھی اس لئے وہ

[1] دارین خلیج فارس کے جزیروں میں سے ایک جزیرہ کے سامنے ہی تھا یہاں کی آبادی زیادہ تر عیسائی تھی۔

عمان و مہرہ

عمان بحرین سے قریب ہی بحرِ ہند کے ساحل پر واقع ہے۔ یہاں زیادہ آبادی قبیلۂ ازد کی تھی لیکن دوسری قومیں بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ۸ھ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوزید انصاری کو جو قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے تبلیغ اسلام کیلئے بھیجا جیفر اور عبید جو یہاں کے امیر تھے ان کے نام عمرو بن العاص کے ذریعہ ایک مکتوب والا ارسال فرمایا جیفر اور عبید دونوں نے اسلام کی دعوت کو لبیک کہا اور پھر ان کی دعوت پر باقی عرب بھی مسلمان ہو گئے [1]

لیکن جب آنحضرت ﷺ کی وفات ہوئی تو ازد سب مرتد ہو گئے۔ لقیط بن مالک ذوالتاج جس نے اس زمانہ کی عام ہوا کے مطابق نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور ان مرتدین کا قائد تھا اس نے عمان پر قبضہ کرلیا۔ اور جیفر اور عبید [2] کو مجبوراً پہاڑوں پر پناہ لینی پڑی۔ حضرت ابوبکر کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے حذیفہ بن محصن اور عرفجہ بن ہرثمہ کو عمان کے محاذ پر روانہ کیا اور ان کے عقب میں عکرمہ بن ابی جہل کو بھیجا جو یمامہ کی جنگ میں شکست کھا چکے تھے۔ حذیفہ اور عرفجہ ابھی عمان پہونچے بھی نہیں تھے کہ عکرمہ ان سے آملے۔ عمان کے قریب پہونچکر ان حضرات نے جیفر اور عبید کو اپنی آمد کی خبر کی اور یہ بھی اسلامی فوج سے آکر مل گئے۔ اب اسلامی فوج نے عمان کے دارالسلطنت مقام صحار میں پڑاؤ ڈالا ادھر لقیط بن مالک اپنی فوج لئے مقام دبا میں پڑا تھا۔ آخر مسلمانوں نے پیش قدمی کر کے لقیط پر حملہ کیا۔ بڑا سخت قسم کا معرکہ ہوا۔ جنگ کے پہلے دور میں دشمن کا پلہ بھاری نظر آتا تھا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں میں اضطراب و تشویش کی لہر دوڑ گئی کہ اسی اثناء میں خریت بن راشد بنو ناجیہ کا لشکر اور سیحان بن صوحان بنو عبد القیس کی ایک بڑی جمعیت لئے ہوئے پہونچ گئے۔ اچانک اس غیبی امداد کو دیکھ کر مسلمانوں کے دل بڑھے مضبوط ہو گئے اور انہوں نے پینترا بدل کر اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۸۳
[2] ابن اثیر نے عبید کا نام عیاذ لکھا ہے۔ ج ۲ ص ۲۸۵

ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس معرکہ میں دشمن کی فوج کے دس ہزار آدمی قتل ہوئے۔ اور بہت بڑی تعداد میں مال غنیمت ہاتھ آیا اس کا پانچواں حصہ حضرت عرفجہ کے ہاتھ مدینہ روانہ کر دیا گیا۔ اور حضرت حذیفہ یہاں کے انتظام اور بندوبست کی غرض سے عمان ہی میں قیام پذیر رہے [1]

اب رہے عکرمہ بن ابی جہل تو وہ ایک لشکر کثیر کے ساتھ مہرہ چلے گئے یہاں مہرہ میں دو گروہ تھے جو آپس میں ایک دوسرے کے رقیب و حریف تھے۔ ایک گروہ کا سردار ایک شخص شخریت نامی تھا۔ اور دوسرے گروہ کا امیر مصبح نام کا ایک شخص تھا جو بنو محارب سے تعلق رکھتا تھا۔ ان دونوں میں مصبح کا گروہ نسبۃً زیادہ طاقتور اور با اقتدار تھا۔ اب حضرت عکرمہ نے سیاسی چال یہ چلی کہ جو گروہ کمزور تھا اس کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی چنانچہ اس مقصد کیلئے شخریت سے گفت و شنید کی شخریت نے بڑی خوشی سے عکرمہ کی دعوت پر لبیک کہا اور مسلمان ہو گیا۔ اب عکرمہ نے مصبح کو دعوتِ اسلام دی لیکن وہ اپنی طاقت پر نازاں تھا اس لئے یہ دعوت قبول نہیں کی عکرمہ نے اعلانِ جنگ کر دیا۔ شدید قتال کے بعد مصبح شکست کھا گیا اور قتل کر دیا گیا جو لوگ اسلام کی شمشیر خارا شگاف سے بچ رہے تھے مسلمان ہو گئے [2]

یمن

پہلے گذر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی حیات ہی میں اسود عنسی نے یمن میں نبوت کا دعویٰ کر کے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائی تھی اور چند روز کے بعد ہی اس کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ اسود عنسی کے قتل ہو جانے کے بعد یمن میں سخت قسم کی طوائف الملوکی اور لاقانونیت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ مسلمانوں کو اپنی جان اور عزت کا محفوظ رکھنا دشوار ہو گیا۔ اسود عنسی کے فوج کے سردار تھے کہ صنعا اور عدن کے درمیان گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے اور جو جی میں آتا تھا کرتے تھے۔ اسود عنسی کے ساتھیوں کے علاوہ عرب کا مشہور بہادر اور شہسوار عمرو بن معدیکرب اور قیس بن عبد یغوث یہ دونوں بھی آنحضرت ﷺ کی خبر وفات سنتے ہی مرتد

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۵
[2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۶

ہو گئے تھے اس بنا پر پورے یمن میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور مدینہ اور یمن کا درمیانی راستہ تک خطرناک ہو گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی طرف سے جو عمال اور امراء مقرر تھے انہوں نے حضرت ابوبکر کو اصل صورت حال سے مطلع کیا۔ فیروز دیلمی جس نے اسود عنسی کو قتل کیا تھا ابناء سے تعلق رکھتا تھا جو اگرچہ ایرانی النسل تھے لیکن مدت سے یمن میں آباد ہو گئے تھے اور یہاں اچھا خاصا اقتدار رکھتے تھے اس بنا پر یہ تمام باغی اور فتنہ پرداز ابناء کے خاص طور پر دشمن تھے اور انکو یمن سے جلا وطن کرنے کا ارادہ کئے ہوئے تھے۔

حضرت ابوبکر کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے فیروز دیلمی کو یمن میں اپنا نائب مقرر فرمایا اور عمرو ذی مران، سعید ذی زود، ذوالکلاع الحمیری اور حوشب ذی ظلیم وغیرہم جو یمن کے با اقتدار لوگ تھے اور اسلام پر قائم تھے ان سب کو حکم بھیجا کہ وہ فیروز کی اطاعت کریں اور ان کیساتھ پورا تعاون کریں۔ فیروز دیلمی نے بنو عقیل بن ربیعہ اور بنو عک وغیرہ قبائل جو اسلام پر قائم تھے انکو اپنے ساتھ لیکر صنعاء سے باہر قیس بن عبد یغوث بن مکشوح کا سخت مقابلہ کیا اور ابناء جن کو وہ جلا وطن کرنے پر تلا ہوا تھا انہیں قیس کے پنجۂ ظلم سے نجات دی یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ اتنے میں حضرت ابوبکر کی ہدایت اور حکم کے مطابق ایک طرف ادھر شمال سے مہاجر بن ابی امیہ اور ان کے بعد ہی عکرمہ بن ابی جہل عمان و مہرہ کی مہم سے فارغ ہو کر یہاں پہنچ گئے۔ اب مسلمانوں کی طاقت اس قدر زیادہ اور مضبوط تھی کہ انکا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ معمولی سی جھڑپوں کے بعد ہی قیس شکست کھا گیا اور گرفتار ہو گیا۔ اور عمرو بن معدیکرب کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا اس نے خود اپنے آپکو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ مہاجر بن ابی امیہ نے ان دونوں کو مدینہ روانہ کیا جہاں حضرت ابوبکر کیساتھ معمولی سی گفتگو اور ان کی فہمائش کے بعد دونوں پھر مسلمان ہو گئے اور عراق و شام کی مہمات میں شریک ہوئے۔ اب مہاجر صنعاء میں آکر مقیم ہو گئے اور عکرمہ نے جنوبی یمن قیام کیا اور اس طرح پورا یمن فتنہ و فساد سے پاک و صاف ہو کر پھر گہوارۂ امن بن گیا[1]

مہم یمن کی اہمیت: اس مہم کی سب سے اہم اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فیروز الدیلمی، داذویہ اور دوسرے ابناء یہ سب اگرچہ یمن میں آ بسے تھے لیکن ایرانی النسل تھے اس بنا پر اگرچہ

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۷ و ۲۸۸

قیس بن مکشوح مسلمان تھا اور اسود عنسی کے قتل کے مشورہ میں بھی شریک تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود حضرت ابوبکر صدیق نے جب فیروز کو اپنا نائب مقرر کیا تو اس کی عربی عصبیت کی رگ غیرت و حمیت پھڑک اٹھی اور یہ مرتد ہو گیا اسکے بعد اس نے ایک جمعیت اپنے ارد گرد فراہم کر کے ان ایرانی النسل متوطنین یمن سے یمن کو پاک و صاف کر دینے کا ایک منصوبہ باندھا۔ لیکن حضرت ابوبکر نے اس کا یہ منصوبہ ناکام بنا دیا۔ اس طرح گویا تاریخ اسلام میں یہ سب سے پہلا واقعہ ہے جب کہ عربی عصبیت کے سر پر عملاً ایک ضرب کاری لگا کر اسلامی اخوت و مساوات کی مثال قائم کی گئی اس کا اثر جہاں عربوں پر یہ ہوا کہ انکی آنکھ کھل گئی غیر عربی قوموں پر یہ ہوا کہ ان کیلئے اسلام میں زیادہ کشش پیدا ہو گئی۔ قیس بن مکشوح کو حضرت ابوبکر صدیق نے ایک ایرانی النسل مسلمان داذویہ کے قصاص میں چاہا کہ اسے قتل کر دیں لیکن چونکہ قیس نے یہ قتل خفیہ طور پر کیا تھا اور اس کے ثبوت کے لئے کوئی شہادت نہیں مل سکی اس لئے یہ قتل نہیں کیا جا سکا پھر ارتداد سے توبہ کر لینے پر معاف کر دیا گیا[1]۔

کندہ و حضرموت

کندہ اور حضرموت بھی یمن سے قریب ہیں آنحضرت ﷺ کی طرف سے ان دونوں جگہوں کے گورنر عامل زیاد بن لبید الانصاری تھے جن کا کام صدقات کے جمع کرنے کے علاوہ اسلامی احکام و مسائل کی تعلیم و تبلیغ بھی تھا۔ جب آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے دوسرے قبائل مرتد ہوئے تو اہل کندہ و حضرموت بھی اس گمراہی سے محفوظ نہیں رہے۔ اشعث بن قیس کندہ کا نہایت معزز اور نامور شخص تھا۔ سنہ ۱۰ھ میں کندہ کے اسی آدمیوں[2] کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شان سے حاضر ہوا تھا کہ یہ اور اس کے سب ریشمین لباس پہنے ہوئے تھے اشعث نے اسلام قبول کیا لیکن اب کندہ اور حضرموت میں جو ارتداد پیدا ہوا اسکی قیادت بھی اسی کے ہاتھ میں تھی۔ زیاد بن لبید الانصاری نے مقابلہ کیا لیکن جم نہ سکے اتنے میں مہاجر بن امیہ اور عکرمہ دونوں یمن سے یہاں پہنچ ہی گئے۔ حضرت مہاجر نے عکرمہ کو تو وہیں چھوڑا اور خود ایک لشکر لیکر زیاد بن لبید سے ملے اور پھر دونوں نے پیش قدمی کر کے

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۸ [2] حافظ ابن حجر نے بروایت ابن سعد تعداد ستر بتائی ہے، الاصابہ ج ۱ ص ۶۶

مجزالذیرقان نامی ایک مقام پر اشعث بن قیس کو چیلنج کیا۔ دونوں فوجوں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی اشعث جم نہیں سکا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کیساتھ بھاگ کر قلعہ النجیر میں پناہ لی اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اسلامی فوج قلعہ کا محاصرہ کر کے پڑ گئی بسبب محاصرہ طویل ہوا اور سامان رسد وغیرہ کا پہونچنا بھی مسدود ہو گیا تو آخر جان کی بازی لگا کر یہ سب باہر نکل آئے اور بڑی بہادری کے ساتھ لڑے لیکن اس درمیان میں حضرت عکرمہ بھی اپنی فوج لیکر آ گئے تھے اس لئے اشعث بن قیس نے انکو درمیان میں ڈالکر حضرت مہاجر سے پناہ طلب کی، یہ پناہ نو آدمیوں کے لئے طلب کی گئی تھی لیکن اشعث کچھ ایسا بدحواس تھا کہ جب اس نے ان آدمیوں کے ناموں کی فہرست پیش کی تو اس میں خود اپنا نام لکھنا بھول گیا۔ اس بنا پر قلعہ کے ان نو آدمیوں کو جن کے نام درج فہرست تھے امن دیدیا گیا۔ اور اشعث گرفتار کر کے مدینہ بھیجدیا گیا یہاں حضرت ابوبکرؓ اور اشعث میں طویل گفتگو ہوئی جس میں اشعث نے دوبارہ مسلمان ہونے اور اسلام پر ثابت قدم رہنے کا اقرار و اعتراف کیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے معاف کر دیا۔ اشعث بن قیس جب آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے تو انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بہن ام فروہ سے نکاح کرنے کی درخواست کی تھی لیکن اس وقت نکاح نہیں ہو سکا تھا۔ اب ارتداد سے تائب ہونے کے بعد انہوں نے پھر اپنی اس خواہش کا اعادہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے یہ درخواست منظور فرما لی اور بہن کا نکاح ان سے کر دیا۔ اس کے بعد ان کا قیام مع متعلقین کے مدینہ میں ہی رہا اور عراق و شام کی مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے [1] کندہ و حضرت موت کی یہ جنگ حروب ارتداد و بغاوت کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے جس پر ان کا خاتمہ ہو گیا اور پورا عرب اسلام کے علم کے نیچے آ گیا۔

ان جنگوں میں بہت سے لوگ باندی غلام بھی بنائے گئے تھے لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے فدیہ لے کر ان سب کو آزاد کر دیا اور فرمایا "یہ بات عرب کیلئے بہت بری ہے کہ ان میں سے کوئی کسی کا مملوک ہو" عہد اسلام میں جو لوگ باندی غلام بنائے گئے تھے حضرت عمرؓ نے صرف انہیں کے ساتھ نہیں بلکہ عہد جاہلیت کے باندی غلاموں کو بھی آزاد کر دیا [2]

---

[1] الاصابہ ج ۱ ص ۶۶ - [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۱۹۲

حروب ارتداد و بغاوت پر ایک نظر

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مسند آرائے خلافت ہوتے ہی پورے عرب میں ارتداد و بغاوت کا طوفان جب زور شور سے اٹھا تھا تو تمہیں یاد ہو گا۔ اس وقت مدینہ کی حالت کیا تھی؟ حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی زبانی تم سن آئے ہو کہ مدینہ میں جو مسلمان تھے انکی حالت اس بکری کی مانند تھی جو سخت سرد رات میں بارش میں بھیگی کھڑی ہو۔ اسلام دشمنی اور دین محمدی کی مخالفت کی ایک ہمہ گیر آگ تھی جس کے شعلے شمال میں حدود شام اور الجزیرۃ تک جنوب میں بحر ہند کے کناروں تک مشرق میں عراق عرب اور خلیج فارس تک اور مغرب میں بحر احمر کے سواحل اور تنگنائے باب المندب تک پھیلے ہوئے تھے لیکن دنیا نے دیکھا کہ ایک سال سے بھی کم مدت میں مجاہدین اسلام نے کس طرح تعداد ساز و سامان اور اسلحہ ہر اعتبار سے اقلیت میں ہونے کے باوجود شر و فساد کی ان تمام طاقتوں کو فنا کر کے دین قیم کی فتح و ظفر کا پرچم لہرایا اور پورے جزیرۃ العرب کو اسلام کے جھنڈے کے نیچے لا کر کھڑا کر دیا۔ یہ واقعہ تاریخ عالم کا ایک نہایت ہی اہم واقعہ ہے کہ اسی سے انسانی تہذیب و معاشرت، کلچر اور فکر و نظر میں وہ عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا جس کا داعی اسلام تھا۔ ورنہ اگر خدانخواستہ اسلام خود اپنے وطن میں گھٹ کر رہ جاتا تو باہر کی دنیا پر اس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ اس انقلاب کا ہیرو اور لیڈر کون ہے؟ وہی ابوبکر صدیقؓ جن کی رقت قلب کا یہ عالم تھا کہ حضور پر نور کی جگہ نماز کی امامت کو کھڑے ہوئے تو آنسوؤں کی لڑی بندھ گئی لیکن آج بھی وہ رقیق القلب انسان ہے جو حزن کی روشنائی سے اسلام کی عظمت و حقانیت کی دستاویز مرتب کر رہا ہے اشدت و رقت۔ قہر و مہر اور رحم و تشدد کا یہ لطیف امتزاج ایک انسان کامل جس کی سیاست سراپا سیاست محمدی ہو اس کے سوا اور کس میں ہو سکتا تھا رضی اللہ عنہ۔

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۲

اس فتنہ کا استیصال جس تیزی اور قوت کیساتھ ہوا ہے اس پر مستشرقین کو سخت حیرت ہے چنانچہ کیتانی کا خیال ہے کہ ان تمام جنگوں سے فراغت ایک سال میں نہیں بلکہ دو سال میں ہوئی ہوگی [1] لیکن درحقیقت یہ صرف خیال ہی خیال ہے۔ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۲ھ کے آغاز میں حضرت ابوبکرؓ نے شام و عراق کی مہم شروع کر دی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ اندرونِ عرب استحکام و استقلال حاصل کئے بغیر وہ کسی اور طرف توجہ کرتے۔

اصل یہ ہے کہ حروبِ ارتداد کا ایک طویل سلسلہ وسیع و عریض محاذِ جنگ اور عرب قبائل کا تمرد و سرکشی ان سب چیزوں کی وجہ سے کیتانی اور اس کے ہم خیال مستشرقین کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس محاذِ جنگ کا قطعی فیصلہ ایک برس کی قلیل مدت میں کیونکر ہو گیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فتوحاتِ عراق و شام کا سلسلہ بھی تو جیسا آگے چل کر معلوم ہوگا۔ کافی دراز و وسیع ہے اور پھر یہاں تو مقابلہ رومی اور ایرانی اس وقت کی دو عظیم الشان سلطنتوں سے تھا۔ پس اگر حروبِ ارتداد کی انجام دہی میں دو برس لگے تو اس حساب سے عراق و شام کی فتوحات میں بھی کم از کم دو ہی برس لگنے چاہئیں۔

حالانکہ حضرت ابوبکرؓ کی مدتِ خلافت ہی کل سوا دو برس ہے اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ بالکل بعید از قیاس بات ہے کہ حروبِ ارتداد کے ساتھ ساتھ فتوحاتِ عراق و شام کی مہم بھی جاری ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پروفیسر فلپ ہٹی کی رائے میں ان تمام اندرونی لڑائیوں کا خاتمہ صرف چھ مہینہ کی قلیل مدت میں ہی ہو گیا تھا [2]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جز اص ۱۱۰ جدید ایڈیشن [2] ایک مشہور اطالوی مستشرق جس کی کتاب ANNALS OF ISLAN اطالوی زبان میں ہے۔ [2] دیکھو ہسٹری آف دی عربس ایڈیشن سنہ ۱۹۴۹ء ص ۱۴۱

فتوحات

تیسری صدی عیسوی میں عرب کے شمال میں بازنطینی سلطنت قائم تھی جو شام پر قابض تھی اور اس کے مشرقی سرحد پر جو عراق سے ملتی تھی ایرانی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ صحرائے شام ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ دونوں حکومتیں آپس میں ایک دوسرے کی رقیب تھیں اور ان میں آئے دن جنگ رہتی تھی۔ عراق اور شام ان دونوں ملکوں کی سرحدیں چونکہ عرب سے ملتی تھیں اس لئے عرب کے خانہ بدوش اور بدو قبائل ان ملکوں میں گھس کر لوٹ مار مچاتے رہتے تھے جس کے باعث دونوں سلطنتوں کا ناک میں دم تھا اس بنا پر ان دونوں نے تعلق مندی یہ کی بفر اسٹیٹ (BUFFER STATE) کے طور پر عربوں کو اپنے اپنے ملک کی سرحدوں پر آباد کر کے ان کی اپنی باقاعدہ ریاستیں قائم کر دیں تاکہ اسطرح وہ عربوں کی لوٹ مار سے محفوظ رہیں اور ساتھ ہی جب ایرانی اور بازنطینی حکومتوں میں جنگ ہو تو ہر ایک کی رعیت پروردہ عرب حکومت اس کی مدد کر سکے ساسانی حکومت کے ماتحت جو عرب حکومت قائم ہوئی۔ وہ حکومت حیرہ یا لخمی حکومت کہلاتی ہے اور شام کی سرحد پر قیصر روم کے زیر سایہ جو عرب حکومت بنی اس کا نام غسانہ ہے۔

حکومت حیرہ کا پہلا بادشاہ مالک بن فہم ازدی تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا جذیمۃ الابرش تخت نشین ہوا۔ یہ جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ عربی تاریخ و ادب میں اس سے متعلق بہت سی کہاوتیں اور روایتیں مشہور ہیں۔ جذیمہ زبا نامی ایک عورت کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس کا بھانجہ عمرو بن عدی اس کا قائم مقام ہوا۔ اس نے زبا سے اپنے ماموں کا انتقام لیا اور حیرہ کو جو کوفہ سے متصل ہے۔ اپنا دارالسلطنت بنایا اور

عراق کا بادشاہ کہلایا۔ لیکن اسی زمانہ میں ایران میں اردشیر بن بابک نے ایک وسیع سلطنت قائم کی اور عمرو بن معدی کو اپنا باج گزار بنالیا۔ یہ صورتِ حال اس خاندان کے آخری بادشاہ منذر کے زمانہ تک قائم رہی جس کا خاتمہ سنہ ۶۳۲ء میں ہوا۔

شاہ پور بن اردشیر نے حجاز اور یمن کو بھی باج گزار بنالیا۔ اور امراء القیس کندی کو ان صوبوں کا گورنر مقرر کیا۔

لیکن چونکہ اول تو محکوم رہنا عرب کی فطرت کے خلاف تھا۔ اور پھر ساسانی حکومت کا ان عربوں کیساتھ معاملہ بھی تحقیر و تذلیل کا تھا۔ اس لئے عربوں کو جب کبھی موقع ملتا تھا ساسانی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے تھے۔ چنانچہ سابور ذی الاکتاف جب ایران کے تخت پر بیٹھا تو تمام عرب میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے اور عراق کے متعدد صوبوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ سابور اسوقت کم سن تھا۔ بڑے ہو کر اس نے عربوں سے اس طرح انتقام لیا کہ مقام ہجر میں پہنچ کر سخت خوں ریزی کی اور جو عرب گرفتار ہو کر آتے تھے ان کے شانے اکھڑوا دیتا تھا۔ اسی سے اس کا لقب ذوالاکتاف ہو گیا [1]

ایران میں مزدک کے زیر اثر بے حیائی اور بے شرمی عام ہو گئی تھی۔ انہیں مزدکی اثرات کا نتیجہ تھا کہ خسرو پرویز نے حیرہ کے بادشاہ نعمان سوم ابوقابوس سے اس کی خاندانی حسین عورتوں کا مطالبہ کیا اور جب نعمان نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا تو اس کو مدائن بلا کر قید میں ڈلوا دیا جہاں طاعون سے اس کا انتقال ہو گیا۔ نعمان نے اپنے بیش قیمت اسلحہ بکر کے ایک شخص ہانی بن مسعود کے پاس بطور امانت رکھ دیئے تھے۔ نعمان کی گرفتاری کے بعد خسرو پرویز نے حیرہ کا فرماں روا بنو طے کے ایک شخص ایاس بن قبیصہ کو بنا دیا۔ خسرو پرویز کے حکم سے ایاس نے ہانی نعمان کی اس امانت کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب ہانی نے امانت میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا تو کسریٰ کو سخت غصہ آیا اور اس نے ذی قار نامی ایک مقام پر بنو بکر کا خاتمہ کر دینے کی غرض سے ایک لشکر جرار بھیجا بنو بکر اپنی ضد پر قائم تھے نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے زور کا معرکہ ہوا اور ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔

---

۱ تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۲۶۸ ۲ اس واقعہ کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔

آنحضرت ﷺ ان دنوں مدینہ میں تشریف رکھتے تھے آپ کو ایرانیوں کی شکست کا علم ہوا تو فرمایا۔

الیوم انتصف العرب من العجم [1] آج عرب نے عجم سے اپنا بدلہ لے لیا۔

تاریخ عرب میں "یوم ذی قار" کی بڑی اہمیت ہے۔ شعراء نے بڑے فخر اور جوش کے ساتھ قصیدے لکھے ہیں۔

سنہ ۶ھ میں آنحضرت ﷺ نے جہاں اوروں کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے تھے ایک خط شاہ ایران کے نام بھی بھیجا تھا۔ لیکن شاہ ایران نے اس نامۂ مبارک کے ساتھ بڑی بے ادبی اور گستاخی کا معاملہ کیا اسے پڑھے بغیر ہی چاک کر دیا اور نامہ بر کو دربار سے نکلوا دیا۔ اس کے علاوہ یمن کے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو گرفتار کر کے ایران کے پایۂ تخت مدائن روانہ کر دے۔ آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا۔

هلك كسرى ولا كسرى بعده — کسریٰ ہلاک ہو گیا۔ اور اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوگا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شیرویہ نے اپنے باپ خسرو پرویز کو قتل کر دیا۔ یہ معجزہ دیکھ کر باذان خود مسلمان ہو گیا۔ [2]

اس کے علاوہ تم پڑھ آئے ہو کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ہی ایرانی حکومت کے اشارہ پر سجاح مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے ایک لشکر جرار کیساتھ آئی تھی۔

ان سب واقعات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عرب اور ایران کے تعلقات بہت پرانے تھے اور ایرانی ہمیشہ عربوں کو دبا کر رکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اور دنیا کی عام شہنشاہیتوں کی طرح اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے خود عربوں کے ہی ایک قبیلہ مثلاً بنو عبد القیس کو دوسرے قبیلہ مثلاً بنو بکر کے خلاف استعمال کرتے تھے جس کا اثر یہ تھا کہ عربوں میں قومی وحدت قائم نہیں ہو سکتی تھی۔

---

۱ تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۲۶۸ ۲ اس واقعہ کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔

ایرانی حکومت کو اسلام سے جو خاص پرخاش تھی اس کی وجہ بھی یہی تھی یہ لوگ سمجھتے تھے کہ اسلام سے وابستہ ہو کر عرب ایک منظم اور مضبوط طاقت بن رہے ہیں اور یہ طاقت انکی شہنشاہیت کیلئے ایک کھلا چیلنج ہے۔ اس بنا پر جزیرہ نمائے عرب کی مشرقی سرحد اس وقت تک محفوظ ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک کہ عراق کے عربوں کو ایران کی شہنشاہیت کے جوئے سے آزاد نہ کرا لیا جاتا اور ظاہر ہے یہ مقصد ایران کے ساتھ جنگ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ سر ولیم میور لکھتا ہے۔

"سرحد پر جو مسلمان رہتے تھے۔ عراق اور شام کے لوگ جب ان سے متصادم ہوئے تو قیصر روم اور کسریٰ ایران دونوں نے اپنے علاقوں کے لوگوں کی مدد کی اس بنا پر جنگ کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اور اسلام کو مشرق اور مغرب کی "طاقتور حکومتوں سے مجبوراً مقابلہ کرنا پڑا" ۱

ایک طرف ایران کے ساتھ عرب کے یہ تعلقات تھے۔ اور دوسری جانب شام کے ساتھ تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ شروع میں بنو قضاعہ کے چند قبیلے وہاں جا بسے تھے وہاں رومیوں کی حکومت تھی۔ انہوں نے انہیں لوگوں میں سے ایک سردار کو ان کا حاکم مقرر کر دیا اور غرض وہی تھی کہ ایک طرف وہ خانہ بدوش عرب قبائل کی لوٹ مار سے محفوظ رہیں اور دوسری جانب ایران اور روم کے درمیان ایک بفر اسٹیٹ کا کام لیں اور ان سرداروں کو ملوک کہا جاتا تھا سدِ مآرب کے ٹوٹنے سے قبل غسانی قبیلہ یمن سے ہجرت کر کے یہاں پہونچا اور آباد ہو گیا۔ غسانیوں ۲ نے کچھ دنوں بعد اس درجہ طاقت و قوت حاصل کر لی کہ یہ بنو قضاعہ پر غالب آگئے اور اب رومیوں نے ان کو ہی ملوک تسلیم کر لیا۔ ان کی مدت حکومت کے بارہ میں اختلاف ہے۔ زیادہ صحیح وہ ہے کہ

---

۱ The Khilafat, its Rise, Decline And Fall Page 46.

۲ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بنو غسان عمرو بن عامر المزیقیہ کی اولاد میں تھے۔ عمرو بن عامر کے ایک بیٹے کا نام جفنہ تھا۔ اس کی نسبت سے یہ لوگ آل جفنہ کہلاتے تھے۔ غسان دراصل ایک چشمہ کا نام تھا جس پر یہ لوگ ایک مدت تک مقیم رہے تھے۔ اس تقریب سے ان کا نام آل غسان یا بنو غسان پڑ گیا۔

جو ابو الفداء نے لکھا ہے یعنی چار سو برس کیونکہ غسانی دوسری یا تیسری صدی عیسوی میں شام پہونچے ہیں۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ جبلہ بن الایہم تھا۔ جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پہلے مسلمان ہوا۔ اور پھر مرتد ہو کر قسطنطنیہ بھاگ گیا۔ جرجی زیدان کے ناول "فتاۃ غسان" میں اسی جبلہ کا تذکرہ ہے۔

عراق میں ملوک حیرہ کا جو حال تھا۔ وہی ان غساسنہ کا تھا، کہنے کو خود مختار اور صاحب حکومت تھے لیکن درحقیقت رومیوں کی باج گزاری کا حلقہ ان کے کانوں میں پڑا ہوا تھا۔ اور رومی حکومت ان کے ساتھ سخت تحقیر و تذلیل کا معاملہ کرتی تھی جس کا اعتراف سر ولیم میور جیسے مصنف تک نے کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

"شام کے لوگ بازنطینی حکومت کے ماتحت طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کرتے تھے اختلافِ مذہب کی بنا پر ان کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ بھاری بھاری ٹیکس ان سے وصول کئے جاتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر جب مسلمان عربوں نے شام پر حملہ کیا تو یہ شامی عرب صرف تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہے کیونکہ ان کو عرب حملہ آوروں سے جو زیادہ نرم برتاؤ کرتے تھے اور جن میں زیادہ رواداری اور رحمدلی تھی، بہت کچھ توقعات تھیں ۱

مشہور جرمن مصنف وان کریمر (Von Kramer) نے اسی حقیقت کو اور زیادہ صاف لفظوں میں کہا ہے۔

"جو عرب عرصۂ دراز سے شام اور عراق میں آباد تھے چونکہ یہ عرب مسلمانوں کے ہم نسل ہم قوم اور ہم زبان تھے۔ اس لئے انہوں نے حملہ آور عربوں کی مدد صرف پیچھے چوری نہیں بلکہ علی الاعلان کی۔ ان عراقی اور شامی عربوں نے صرف جاسوسی کی خدمات انجام نہیں دیں بلکہ بسا اوقات میدانِ جنگ میں بھی ان کا ساتھ دیا" ۲

The Caliphate its Rise, Decline And fall. P. 65 ۱

۲ The orient Under The Caliphs. Translation By Prof Khuda Bakhsh P. 92,

جب اسلام کا غلغلہ بلند ہوا اور اس کے ذریعہ عربوں میں قومی تنظیم پیدا ہوئی اور انہوں نے عظیم سیاسی طاقت حاصل کر لی تو حکومت ایران کی طرح بیزنطینی حکومت کو بھی شدید خطرہ لاحق ہوا اور اس خطرہ سے محفوظ رہنے کیلئے اس نے انہیں عربوں کو استعمال کیا جو حدود شام میں آباد تھے چنانچہ سنہ ۸ھ میں جب آنحضرت ﷺ نے دعوت اسلام کا خط قیصر روم ہرقل کے پاس حضرت دحیہ کلبی کے ہاتھ بھیجا اور وہ واپس آتے ہوئے مقام جذام میں پہونچے تو انہیں شامی عربوں نے حضرت دحیہ کلبی پر حملہ کر دیا اور ان کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ اسی طرح جب آنحضرت ﷺ نے بصریٰ کے حاکم کو ایک خط لکھا اور حارث بن عمیر اس کو لیکر گئے تو شرحبیل بن عمرو جو شام کے سرحدی علاقہ کا ایک رئیس حکمران اور قیصر کے ماتحت تھا اس نے حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا اس کا انتقام لینے کیلئے آنحضرت ﷺ نے تین ہزار فوج شام روانہ کی اور غزوہ موتہ کا واقعہ پیش آیا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ جو اکابر صحابہ میں سے تھے اسی غزوہ میں شہید ہوئے تھے۔ اس سے رومیوں کا حوصلہ بڑھا اور وہ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگے آں حضرت ﷺ کو جب یہ خبریں پہونچیں تو آپ بہ نفس نفیس ایک لشکر جرار لیکر مقام تبوک کیطرف بڑھے اور اگرچہ اس وقت جنگ نہیں ہوئی لیکن مسلمانوں کی روز افزوں طاقت رومیوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی اور وہ برابر کوئی نہ کوئی شورش چھوڑتے ہی رہتے تھے۔ تم پڑھ آئے ہو کہ وفات سے چند روز پہلے آنحضرت ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت جو لشکر بھیجا تھا وہ اسی حفظ ماتقدم کیلئے بھیجا تھا اس لشکر کی اہمیت اس قدر زیادہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عنان خلافت ہاتھ میں لیتے ہی ہزار مشکلوں کے باوجود پہلا کام یہی کیا کہ اس لشکر کو حدود شام کی طرف روانہ کیا، ولیم میور کہتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل انتہائی سیاسی دانش مندی پر مبنی تھا کیونکہ اس نے اسلام کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے دل پر اسلام کی سیاسی طاقت و قوت کی دھاک بٹھا دی ۱

اور ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے واضح ہوا ہوگا کہ مسلمان درحقیقت اس وقت ایران اور

---

۱ The caliPhate P:42

روم دو طاقتور دشمنوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے جو اسلام کیلئے مستقل خطرہ ہونے کے علاوہ خود عربی قومیت کے اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے اس بنا پر جب تک ان دونوں حکومتوں کی سرکوبی نہ کی جاتی نہ اسلام کو پھیلنے اور بڑھنے کا موقع مل سکتا تھا نہ عربی قومیت مستحکم اور مضبوط ہو سکتی تھی اور نہ عراق اور شام کے عرب قبائل کو ان دونوں حکومتوں کی غلامی اور ان کے حقارت آمیز برتاؤ سے نجات مل سکتی تھی۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار لکھتا ہے رسول اللہ ﷺ نے جس پیمانہ پر لشکر شام کی طرف روانہ کیا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ عرب قبائل میں امن اپنی سرحدوں کو وسیع کیے بغیر قائم ہی نہیں کیا جا سکتا تھا ۲

ان بیانات سے ان یورپین مصنفین کی بھی تردید ہوتی ہے جو عراق و شام پر اسلامی لشکر کی پیش قدمی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ عرب طبعاً جنگ جو تھے اور حروب ارتداد سے فارغ ہونے کے بعد اندیشہ تھا کہ پھر کہیں اور کسی طرف سے بغاوت کا شعلہ نہ بھڑک اٹھے اس لئے حضرت ابوبکر نے ان کو مشغول رکھنے کیلئے ان کا رخ ان ملکوں کی طرف پھیر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ اقدام صرف اسی غرض سے تھا تو اس میں کوئی جان نہ تھی اور اس صورت میں مسلمان ہرگز اس لائق نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ دنیا کی دو عظیم الشان طاقتوں سے بیک وقت ٹکرا سکتے۔ انصاف پسند یورپین مصنفین نے خود اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کی یہ فتوحات کسی دنیوی لالچ اور طمع کا نتیجہ نہیں بلکہ اس اسپرٹ، بے خوفی اور بے جگری اور اس ڈسپلن کا نتیجہ تھیں جو اسلام نے ان کے اندر پیدا کر دیا تھا وان کریمر لکھتا ہے۔

ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ مدینہ سے جو معمولی سی فوجیں روانہ کی جاتی تھیں انہوں نے کس طرح بازنطینی اور ایرانی ہمسایہ شہنشاہیتوں کے مقابلہ میں عجیب و غریب کامیابیاں حاصل کیں لیکن ہم کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اسلام نے پچھلے زمانہ کے غیر منظم لوگوں میں ایک غیر مشروط اور مطلق اطاعت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا صرف یہی جذبہ تھا جس نے عرب مسلمانوں کو یونانی اور ایرانی خود غرضیوں کے مقابلہ

---

۲ جدید ایڈیشن ج ۱ ص ۱۱۰

میں سو گنا زیادہ برتر بنا دیا تھا [1]

امریکہ کا مشہور فاضل پروفیسر فلپ ہٹی لکھتا ہے۔

در حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات گویا مشرق قریب کی اپنے دیرینہ اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی ایک کوشش تھی۔ اسلام کے جذبہ اور جوش کے ماتحت مشرق بیدار ہو گیا تھا اور اب وہ صدیوں کے مغربی تسلط و استیلا کے بعد پھر بھی انفرادیت قائم کرنے کی جدو جہد کر رہا تھا [2]

غرضیکہ یہ اسباب تھے جن کے باعث ارتداد و بغاوت کا سرزمین حجاز و یمن سے خاتمہ کرنے کے بعد ہی فوراً حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے عراق و شام کی طرف توجہ کی۔

عراق پر لشکر کشی

مسلمان مورخین عراق کو دو حصّوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ عراق عرب اور عراق عجم۔ عراق عرب اس علاقہ کا نام ہے جو عرب سے متصل ہے۔ قرون وسطی میں اس کا دارالسلطنت مدائن تھا بعد میں بغداد ہوا۔ کوفہ بصرہ اور واسط اس علاقہ کے مشہور شہر ہیں اس کے حدود اربعہ یہ ہیں۔ شمال میں صوبہ جزیرہ۔ جنوب میں خلیج فارس۔ جنوب مشرق میں خوزستان، مشرق میں عراق عجم اور مغرب میں صحرائے شام۔

اس وقت ایران میں جو حکومت قائم تھی وہ ساسانی خاندان کی تھی جس کا بانی اردشیر ابن بابک تھا۔ جس نے ملک میں طوائف الملوکی کا خاتمہ کر کے اسے ایک وحدت (UNIT) بنا دیا تھا۔ یہ واقعہ ۲۲۶ء کا ہے ساتھ ہی اس نے عراق اور اس کے ہمسایہ عرب شہروں پر قبضہ کر لیا اس کا لقب شہنشاہ تھا۔ اردشیر کے بعد حکومت ایران دست بدست اس کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی۔ نوشیرواں جو اپنے عدل و انصاف کیلئے ضرب المثل ہے اور جس کے عہد میں آنحضرت ؐ کی ولادت باسعادت ہوئی ہے اسی خاندان کا بادشاہ اس کے بعد ہرمز اس کا

---

1. The orient under The caliphs P. 92
2. "History of Th Arabs" 1949 Edition, P 143

جانشین ہوا۔ اور ہرمز کے بعد خسرو پرویز تخت پر بیٹھا۔ یہ وہی شہنشاہ ایران ہے جس کے نام آنحضرت ؐ نے خط بھیجا تھا اور جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس نے مکتوب گرامی کیساتھ گستاخی کی تھی اس کا ادبار اس پر ایسا پڑا کہ اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ شیرویہ ڈیڑھ برس کے قریب بادشاہ رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اردشیر تاج و تخت کا مالک ہوا۔ لیکن چونکہ یہ کمسن تھا اس لیے ایک سردار فوج نے اس کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ لیکن چالیس روز کے بعد یہ بھی قتل کر دیا گیا۔ اور اب شیرویہ کی بہن بوران تخت و تاج ایران کی مالک ہوئی اس کے بعد ملک میں اختلال پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس خاندان کا آخری فرماں روا یزدگرد تخت نشین ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عراق پر پیش قدمی اسی یزدگرد کے عہد حکومت میں کی ہے۔

فوج کشی کی ابتداء عراق کی مہم کا آغاز اس طرح ہوا کہ مثنیٰ بن حارثۃ الشیبانیؓ ایک صحابی تھے جو قبیلہ بنو بکر کے ایک سردار تھے۔ یہ قبیلہ بحرین میں رہتا تھا اور جب عام ارتداد کی ہوا چل رہی تھی تو یہ بھی مرتد ہو گیا تھا لیکن حضرت مثنیٰ چند ساتھیوں کیساتھ اسلام پر ثابت قدم تھا چنانچہ علاء بن الحضرمی جو معرکہ بحرین کے ہیرو تھے انہوں نے مرتدین بحرین کے مقابلہ میں جہاں دوسرے مقامی مسلمانوں سے مدد لی۔ مثنیٰ کو بھی لکھا کہ وہ راستوں کی نگرانی کریں [1] مثنیٰ نے اس فرض کو بڑی خوبی کیساتھ انجام دیا اور آٹھ ہزار مسلمانوں کی ایک جمعیت کو اپنے اردگرد جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بحرین کا معرکہ ختم ہو جانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ ان کو ان کی قوم کا سردار بنا دیا جائے تاکہ وہ اہل فارس سے اور اُن کے اطراف و اکناف میں جو دشمن ہیں ان کے ساتھ جنگ کر سکیں [2] حضرت ابوبکرؓ نے پہلے ہی ان کے کارناموں کی جب شہرت سنی تھی تو دریافت کیا تھا کہ "یہ مثنیٰ کون ہیں"؟

اس کے جواب میں قیس بن عاصم بن سنان المنقری نے کہا تھا کہ مثنیٰ مشہور، معروف النسب اور بہت مضبوط شخص ہیں [3] اسی بنا پر اب مثنیٰ نے خود بارگاہ خلافت میں حاضر ہو کر یہ درخواست کی تو حضرت ابوبکرؓ کو کوئی تامل نہیں ہوا فوراً ان کو پروانۂ امارت لکھ کر عطا فرما دیا [4]۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۲۹ [2] الاصابہ ج ۳ ص ۲۴۱ [3] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۰ [4] بلاذری ص ۲۵

حضرت خالدؓ کی نامزدگی | لیکن حضرت مثنیٰ کے چلے جانیکے بعد حضرت ابوبکرؓ کو خیال ہوا کہ عراق کی مہم بہت اہم ہے اکیلے مثنیٰ سے سر نہ ہوگی اس لئے حضرت خالدؓ کو جو جنگ یمامہ سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ میں مقیم تھا[1] حکم دیا کہ دس ہزار کا لشکر لیکر عراق کا رخ کریں یہ واقعہ سنہ ۱۲ھ کا ہے[2] اور ادھر مثنیٰ بن حارثہ اور مذعور بن عدی العجلی کو جنھیں حضرت ابوبکرؓ نے ان کی قوم ہی کی درخواست کے مطابق امیر بنا دیا تھا، ہدایات بھیجیں کہ وہ حضرت خالدؓ کے ساتھ ساتھ کوچ اور قیام کریں اور پورے طور پر ان کے مطیع اور فرمانبردار ہوکر رہیں، ان کے علاوہ حضرت عیاضؓ بن غنم جو اس وقت بناج اور حجاز کے درمیان کسی مقام پر تھے ان کو بھی لکھا کہ حضرت خالدؓ کے پاس پہونچیں اور ان کی قیادت میں کام کریں۔

حضرت خالدؓ کو ہدایات | اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ کو جو ہدایات دی ہیں وہ خلیفۂ رسول ﷺ کی فوجی مہارت، تدبر اور غیر معمولی بیدار مغزی کی روشن دلیل ہیں آپ نے فرمایا

(۱) عراق کا کوچ اس کی بلند زمینوں کے ذریعہ کریں۔ مورخین کو اس میں دھوکہ ہوگیا ہے چنانچہ طبری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت خالدؓ کو عراق کی نشیبی زمینوں کے ذریعہ کوچ کرنے کا حکم ہوا تھا اور حضرت عیاضؓ کو بلند زمینوں کے ذریعہ، بہرحال ان سب کو جمع ہونا تھا اُبلہ کے مقام پر اور مقصد یہ تھا کہ مختلف فوجیں مختلف راستوں سے جائیں تو ہر طرف کی آبادی پر اثر پڑے۔

(۲) عراق کی سرزمین میں پہونچکر لوگوں کی دلجوئی کریں اللہ کی طرف ان کو دعوت دیں اگر وہ اس کو قبول کرلیں تو خیر ورنہ ان سے جزیہ طلب کریں اگر وہ اس سے بھی انکار کریں تو پھر ان سے جنگ کی جائے۔

(۳) جو شخص ان کے (حضرت خالدؓ) ساتھ جانے کیلئے تیار نہ ہو اس پر جبر نہ کریں۔

(۴) جو لوگ مرتد ہوگئے تھے مگر اب پھر مسلمان ہوگئے ہیں ان سے کسی قسم کی کوئی مدد طلب

---

[1] بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خالدؓ یمامہ ہی میں تھے اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کو یہ حکم وہیں بھیجا تھا لیکن عراق کی مہم کی اہمیت کے پیش نظر حضرت ابوبکرؓ کی سیاست اور تدبر سے بعید تھا کہ وہ حضرت خالدؓ کو بالا بالا بھیجدیتے اس لیے ہم نے مدینہ والی روایت کو اختیار کیا ہے [2] ص ۲۵۰

نہ کریں۔

(۵) ان کے علاوہ جو مسلمان اُن کے پاس سے گزریں اس کو ہمراہ لے لیں[1]

اُبلہ کی اہمیت | ساتھ ہی حکم دیا تھا کہ اپنی جنگی کاروائیوں کا آغاز اُبلہ[2] سے کریں۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ اُبلہ میں شاہ ایران کا تمام بیگیرین جمع تھا اور اس بنا پر اس کی حیثیت فوجی چھاؤنی کی تھی اس کے علاوہ آب و ہوا اور کاروبار تجارت کے اعتبار سے نہایت عمدہ جگہ سمجھی جاتی تھی۔ مشہور امام لغت اصمعی کا قول ہے "دنیا میں جنتیں تین ہیں۔ غوطہ دمشق نہر بلخ اور اُبلہ" اس کے علاوہ یہی وہ بندرگاہ تھی جس کے ذریعہ سے عرب اور ہند و سندھ میں تجارتی تعلقات قائم تھے اور ایک ملک کا مال دوسرے ملک میں آتا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے اس کو "فرج الہند" کہا تھا۔

عراق میں حضرت خالدؓ نے جو لڑائیاں لڑیں ان کی ترتیب کیا ہے؟ اس میں روایات اس قدر مختلف ہیں کہ کسی ایک نتیجہ تک پہونچنا بہت دشوار ہے اب ہم جس ترتیب سے واقعات لکھیں گے وہ زیادہ تر طبری اور ابن اثیر کے بیانات پر مبنی ہے اور جزوی ترمیم و تنسیخ کیساتھ ترتیب تقریباً وہی ہے جو ان دونوں بزرگوں کے ہاں ہے۔

جنگِ ذات السلاسل

عام مورخین کا رجحان یہ ہے کہ عراق میں جو پہلی جنگ لڑی گئی ہے وہ غزوہ حفیر یا ذات السلاسل کے نام سے مشہور ہے۔

حفیر خلیج فارس کے قریب اور کاظمہ کی سرحد پر واقع ہے۔ مدینہ سے بصرہ تک اگر خط مستقیم کھینچا جائے تو حفیر اسی خط پر بصرہ سے پہلے واقع ہوگا۔ اس مقام کا حاکم ہرمز تھا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۴۲ [2] یہ مقام دجلہ بصرہ کے کنارہ پر خلیج فارس کے کونے میں جو شہر بصرہ تک آتا ہے واقع ہے اور بصرہ چونکہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں آباد ہوا ہے اس لیے اس سے مقدم ہے۔ [3] ابن اثیر ج ۲ ص ۳۶۱ [4] معجم البلدان یاقوت حموی ج ۱ ص ۹۰ مطبوعہ لیبزک۔

جو حکومت ایران کے ماتحت تھا۔ ایرانیوں میں یہ دستور تھا کہ جو شخص جس مرتبہ اور درجہ کا ہوتا تھا اس کے مطابق اس کی ٹوپی قیمتی ہوتی تھی۔ اسی بنا پر ہرمز چونکہ یہاں کے امراء اور اشرف میں سب سے بڑا تھا اس لیے اس کی ٹوپی ایک لاکھ کی تھی۔ حفیر کے اطراف و جوانب میں سرحدوں پر جو عرب قبائل آباد تھے ہرمز کا معاملہ ان کے ساتھ نہایت برا تھا چنانچہ عرب خباثتِ نفس اور درشت خوئی کی ضرب المثل کے طور پر کہا کرتے تھے یہ وہ شخص ہرمز سے بھی زیادہ خبیث یا اس سے بھی بڑا کافر ہے۔ اس باہمی عناد و منافرت کا نتیجہ یہ تھا کہ ان عرب قبائل کے بنی اعمام جو جزیرہ نمائے عرب میں مقیم تھے وہ جب کبھی موقع ملتا تھا ہرمز کے علاقوں میں گھس کر غارت گری کرتے تھے اور ہرمز ان کے ساتھ خشکی میں اور اہل ہند کے ساتھ بحر میں جنگ و پیکار کرتا رہتا تھا اس بنا پر حکومت ایران ہرمز کو اپنے ملک کے ناکوں کا محافظ و پاسبان سمجھتی تھی۔

حضرت خالدؓ مدینہ سے دس ہزار کی فوج اپنے ساتھ لیکر روانہ ہوئے تھے حدود عراق میں داخل ہوئے تو یہاں مثنیٰ بن حارثہؓ آٹھ ہزار کی جمعیت کیساتھ ان کے استقبال کیلئے موجود تھے۔ حضرت خالدؓ نے اب پوری فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور حکم دیا کہ وہ مختلف راستوں سے چل کر حفیر میں جمع ہو جائیں۔ ان تین حصوں میں سے ایک حصہ کے سردار مثنیٰ بن حارثہؓ تھے۔ دوسرا حصہ عدی بن حاتم الطائی کی سرکردگی میں تھا۔ اور تیسرا حصہ خود حضرت خالدؓ کے ماتحت تھا۔ یہ تینوں لشکر دو دو اور تین تین دن کے فاصلے سے روانہ ہوئے۔ سب کے آخر میں حضرت خالدؓ کی روانگی ہوئی۔ لیکن روانگی سے قبل حضرت خالدؓ نے ہرمز کے نام ایک خط روانہ کر دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا۔

فاسلم تسلم او اعتقد لنفسك	تو اسلام لے آ تو محفوظ رہے گا ورنہ اپنے اور اپنی
وقومك الذمة واقرار بالجزية	قوم کیلئے ذمی ہونے کا یقین رکھ اور جزیہ کا اقرار کر
والا فلا تلومن الا نفسك فقد	ورنہ پھر تو اپنے نفس کے علاوہ کسی اور کو ملامت نہیں
جئتك بقوم يحبون الموت كما	کریگا کیونکہ میں تیرے پاس ان لوگوں کو لیکر آیا ہوں جو موت
تحبون الحياة۔[1]	کو ایسا محبوب رکھتے ہیں جیسا کہ تم زندگی کو محبوب رکھتے ہو

[1] طبری ج ۲ ص ۵۵۳

ادھر ہرمز کو یہ خط ملا اور ادھر اسے مسلمان افواج کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی تو اس نے شہنشاہِ ایران اردشیر دیزدگرد کو یہ تمام حالات لکھ کر بھیجے اور حضرت خالدؓ کا مقابلہ کرنے کی غرض سے مقام کواظم میں فوجیں اتار دیں لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اسلامی فوجیں حفیر کی طرف بڑھ رہی ہیں تو بڑی تیزی کیساتھ اپنا لشکر لیکر حفیر پہنچا اور یہاں ایک گھاٹ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اب حضرت خالدؓ نے کاظمہ کیطرف ہٹ کر اپنے لشکر کو خیمہ فگن ہونے کا حکم دیا تو لوگوں نے کہا کہ دشمن نے پانی پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہمارے پاس پانی کہیں نہیں ہے لیکن خدا کی شان تھوڑی دیر بعد بارش ہوئی اور جل تھل بھر گئے۔

اب ہرمز نے صف بندی اس طرح کی کہ اس کے لشکر کا میمنہ اور میسرہ شاہی خاندان کے دو جوانمرد قباذ اور انوشجان کی سرکردگی میں تھا اور جتنے مردان کارزار تھے سب نے اپنے آپکو ایک دوسرے کیساتھ زنجیروں میں جکڑ لیا تھا تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔ اسی وجہ سے یہ غزوہ ذات السلاسل کہلاتا ہے۔ یہ سب انتظامات ہو چکے تو جنگ شروع ہوئی۔ ہرمز نے آگے بڑھ کر حضرت خالدؓ کو دعوتِ مبارزت دی۔ حضرت خالدؓ فوراً آگے بڑھے اور لڑائی ہونے لگی۔ ہرمز نے قواعد جنگ کے بالکل خلاف ازراہ غدر و فریب پہلے سے اپنے شہسواروں کی ایک جماعت کو اس پر آمادہ کر رکھا تھا کہ جب خالدؓ تنہا ہرمز کیساتھ مصروف جنگ ہوں تو یہ لوگ اچانک کمین گاہ سے نکل کر حضرت خالدؓ پر حملہ کر دیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن ٹھیک اس وقت جبکہ ہرمز کے شہسواروں نے حضرت خالدؓ پر حملہ کرنا چاہا۔ حضرت قعقاع بن عمروؓ نے اچانک اسلامی فوج سے نکل کر اس زور کے ساتھ حملہ کیا کہ شہسواروں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اتنے میں حضرت خالدؓ نے پہلو بچا کر ہرمز کی پیشانی پر ضرب کاری لگائی کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ میدان جنگ کا یہ رنگ دیکھ کر مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔ ایرانی شکست کھا کر بھاگے تو مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ فرات کا پل جہاں بعد میں بصرہ آباد ہوا وہاں پہونچ کر دم لیا۔ قباذ اور انوشجان جان بچا کر نکلے لیکن ایرانیوں کی بڑی تعداد قتل ہو گئی۔

[1] ان کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ مدینہ سے حضرت خالدؓ کی روانگی کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو خیال آیا تو حضرت قعقاعؓ کو بھی پیچھے سے مدد کی غرض سے روانہ کیا۔ کسی نے پوچھا ایک آدمی سے کیا ہوگا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا جس لشکر میں قعقاع ہوں گے اس کو کبھی شکست نہیں ہوگی۔

حضرت خالدؓ نے مال غنیمت جس میں ایک ہاتھی اور ہرمز کی بیش قیمت ٹوپی بھی شامل تھی مدینہ بھیجا تو ہاتھی کو مدینہ کی گلیوں اور سڑکوں پر گھمایا گیا عورتوں کیلئے یہ ایک بالکل نیا جانور تھا اس لیے مدینہ کی بڑھی بوڑھی عورتیں اور بچے اسے دیکھ کر خوش ہوتے اور تعجب کرتے تھے لیکن چونکہ یہ جانور شاہی تزک و احتشام کی علامت تھا اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے اس کو مدینہ میں رکھنا پسند نہیں کیا اور زربن کلیب جو اسے لائے تھے انہی کے ہاتھ اسے واپس کردیا۔ فرات کے بڑے پل پر پہنچکر حضرت خالد نے مثنیٰ بن حارثہ کو تو ایرانیوں کے تعاقب میں روانہ کردیا اور معقل بن مقرن المزنی کو اُبلہ روانہ کیا کہ اس کی فتح کی تکمیل و انصرام کا انتظام کریں

اُبلہ سے متعلق ایک بحث | اُبلہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اس سے متعلق مورخین میں اختلاف یہ ہے کہ یہ خلافت صدیقی میں فتح ہوا ہے یا حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں، ابن اثیر کی رائے یہ ہے کہ حضرت عتبہ بن غزوان کے ہاتھوں حضرت عمرؓ کے عہد میں فتح ہوا۔ چنانچہ معقل ابن والی مذکورہ بالا روایت نقل کرکے انہوں نے اس کی تردید کی ہے اور اس کو اہل نقل کے علم کے خلاف کہا ہے [۲] لیکن بلاذری [۳] اور ابو اسماعیل محمد بن عبداللہ الازدی [۴] نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت خالدؓ بصرہ پہونچے تو سوید بن قطبۃ الذہلی نے ان سے ملکر کہا کہ ابلہ کے لوگ تمہارا مقابلہ کرنے کیلئے جمع ہو رہے تھے اور میری رائے میں وہ اس وقت تک باز نہیں آئیں گے جب تک کہ آپ میری مدد نہ کریں اس پر حضرت خالدؓ نے ترکیب یہ چلی کہ سوید سے کہا دن میں کوچ کے وقت بصرہ سے چلا جاؤں گا۔ لیکن شب میں واپس ہو کر تمہارے لشکر میں آملوں گا۔ اب اگر صبح کے وقت اہل اُبلہ نے حملہ کیا تو ہم ان سے جنگ کریں گے اس قرارداد کے مطابق حضرت خالدؓ اپنے لشکر کو لیکر بصرہ سے نکل گئے جیسا کہ توقع تھی اہل اُبلہ کو اس سے اطمینان ہوا اور انہوں نے سوید بن قطبہ پر حملہ کی تیاری شروع کردی لیکن دوسرے دن صبح کے وقت انہوں نے حملہ کیا تو چونکہ حضرت خالدؓ شب میں واپس آکر سوید کے لشکر میں شامل

[۱] طبری جلد ۲ ص ۵۵۸ و ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۲ [۲] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۳ [۳] فتوح البلدان ص ۳۵۰
[۴] فتوح الشام ص ۴۹ شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ [۵] ابن خلکان کے بیان کے مطابق ابلہ بصرہ سے چار فرسنگ یعنی ایک دن کی مسافت پر تھا۔

ہو گئے تھے۔ اس لیے اب اہل اُبلہ نے مسلمانوں کی خلاف توقع اتنی بڑی تعداد دیکھی تو اوسان خطا ہو گئے اور اُن پر رعب کی کیفیت طاری ہو گئی حضرت خالدؓ نے انکو محصور کرکے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ فوراً تعمیل کی گئی اور اہل اُبلہ شکست کھا گئے ان میں سے جو بھاگ نہیں سکے وہ یا قتل ہو گئے یا دریا میں غرق ہو کر موت کے گھاٹ اتر گئے۔ حضرت خالدؓ نے سوید سے فرمایا کہ ہم نے تمہارے نواح کے ایرانیوں کو اتنا پامال کردیا ہے کہ وہ اب سر نہیں اٹھا سکیں گے۔

بلاذری اور ازدی کی اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُبلہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہی فتح ہو گیا تھا اور قرین قیاس بھی یہی ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ کو روانہ کرتے وقت یہی حکم دیا تھا کہ وہ اپنی کاروائیوں کا آغاز اسی مقام سے کریں۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ سب کچھ فتوحات ہو جاتیں لیکن ایک اُبلہ ہی فتح نہ ہوتا درانحالیکہ فوجی اعتبار سے یہ ایک نہایت اہم مقام تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اُبلہ حضرت عمرؓ کے عہد میں جو فتح ہوا ہے تو اس کے کیا معنی ہوں گے اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے یہاں لوگوں نے ایک مرتبہ فتح ہو جانے کے بعد پھر بغاوت برپا کردی ہو اور اس لیے حضرت عمرؓ کے عہد میں وہ دوبارہ فتح کیا گیا ہو [۱]۔

مذار کی جنگ

حضرت خالدؓ کے حکم کے مطابق مثنیٰ بن حارثہ ایرانیوں کا تعاقب کر رہے تھے اور مدائن

[۱] یہاں ایک شبہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ بلاذری اور ازدی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُبلہ سوید کے ہاتھوں فتح ہوا لیکن طبری اور ابن اثیر کے ہاں معقل بن مقرن کا نام ملتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اُبلہ کی دراصل جنگ تو یہی تھی سوید بن قطبہ ہی کے ساتھ تھا اور انہوں نے ہی اس کو فتح کیا تھا رہے معقل تو غزوہ حفیر کے بعد حضرت خالد نے ابلہ مال غنیمت وغیرہ اکٹھا کرنے اور اس کا انتظام کرنے کیلئے بھیجا تھا اس سے التباس ہو گیا ہے چنانچہ طبری کے الفاظ یہ ہیں۔ وارسل معقل بن مقرن المزنی الی الابلة لیجمع له مالها والسبی فخرج معقل حتی نزل الابلة فجمع الاموال والسبایا۔ ج ۲ ص ۵۵۶۔

تک پہونچنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن جنگ حفیر کے موقع پر ہرمز نے شہنشاہ ایران کے پاس جو سفارت بھیجی تھی اُس کا اثر کہیے یا حفیر میں ایرانیوں کی شکست فاش کی خبر ان دونوں وجوہ کی بنا پر حکومت ایران نے حضرت خالدؓ سے جنگ کرنے کیلئے ایک لشکر جرار روانہ کر دیا تھا جس کے مختلف دستوں کی قیادت ایران کے نامور اشراف و امراء کر رہے تھے۔ حضرت مثنیٰؓ کو اثنائے راہ میں یہ اطلاع ملی تو مدائن کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

ایرانی لشکر نے جس کے ساتھ غزوہ حفیر کے شکست خوردہ بھی مل گئے تھے۔ مذار نامی ایک مقام پر جو دجلہ اور فرات کے سنگم پر واقع ہے پڑاؤ ڈالا۔ حضرت خالدؓ کو اطلاع ملی تو پیش قدمی کرکے وہاں پہونچے جنگ شروع ہوئی ایرانی فوج کی طرف سے ایران کا نامور بہادر قارن نکلا۔ ادھر سے معقل بن الاعشیٰ آگے بڑھے۔ آخر قارن قتل ہوگیا۔ اسی طرح نوشجان، عاصم کے ہاتھ سے اور قباذ حضرت عدی بن حاتمؓ کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ قارن، نوشجان اور قباذ ایران کے اتنے بڑے لوگ تھے کہ پھر آئندہ کسی جنگ میں ایران کا ان جیسا نامور بلند مرتبہ شخص مسلمانوں کے ہاتھوں نہیں مارا گیا[1] طبری اور ابن اثیر کی روایت ہے کہ اس جنگ میں تیس ہزار ایرانی مارے گئے۔ جو بچ گئے تھے وہ کشتیوں میں بیٹھ کر بھاگ گئے اگر دریا درمیان میں حائل نہ ہوتا تو دشمن کی فوج کا ایک سپاہی بھی جان سلامت نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوئے انہیں میں ایک ابوالحسن بصری بھی تھے جو بعد میں مسلمان ہو کر مشہور صاحب معرفت و طریقت ہوئے یہ واقعہ ماہ صفر ۱۲ھ میں پیش آیا[2]

جنگ ولجہ

حضرت خالدؓ اب حیرہ جو خلیج فارس اور بحرین کے وسط میں ہے اس سے قریب تھے اردشیر کو مدائن میں ایرانیوں کی شکستِ فاش کی خبر ملی تو اس نے ایک اور لشکر ایران کے مشہور شہسوار اندرزغر کی سرکردگی میں روانہ کیا اور اس لشکر کے پیچھے پیچھے ایک اور لشکر ایران کے نامور شہسوار جادویہ (جس کو عرب مؤرخین جاذویہ لکھتے ہیں) کی قیادت میں بھیجا۔ اس مرتبہ ایرانیوں نے ایک چال یہ

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۳   [2] طبری ج ۲ ص ۵۵۰۔

یعنی جلی کردہ عرب قبائل جو دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقوں میں بادیہ شام تک آباد تھے اور جن میں سے اکثر عیسائیت اختیار کر چکے تھے[1] ان کو بھی حریت اور آزادی کے نام پر اپنے ساتھ ملا لیا اب ان سب نے مقام ولجہ میں جو مقام دجلہ و فرات کے سنگم کے قریب تھا پڑاؤ ڈالا۔

حضرت خالدؓ کو مذار میں اطلاع ہوئی تو پورے ساز و سامان کیساتھ روانہ ہوئے لیکن مقابلہ آسان نہیں تھا۔ ایرانیوں اور عرب قبائل دونوں کے لشکر الگ الگ تھے اور ہر ایک لشکر کا سردار اسی قوم سے تھے۔ لیکن ان سب کا کمانڈر انچیف ایرانی تھا، جنگ شروع ہوئی فریقین نے داد شجاعت و جوانمردی کے وہ جوہر دکھائے کہ کسی فریق کے متعلق بھی فتح و ظفر کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ابن اثیر کے الفاظ یہ ہیں۔

حتی ظن الفریقان ان الصبر	دونوں فریق نے گمان کیا کہ صبر کا
قد فرغ	پیمانہ لبریز ہوگیا ہے۔

لیکن حضرت خالدؓ نے مذار سے روانہ ہو کر اثنائے راہ میں ایک تدبیر یہ کی تھی کہ اپنے لشکر کے سرداروں کو اپنے سے الگ کر کے حکم دیا تھا کہ وہ دونوں مختلف راستوں سے میدان جنگ میں ایرانی لشکر کے عقب کی طرف سے پہونچیں۔ یہ تدبیر بہت کارگر ہوئی چنانچہ ٹھیک اس وقت جبکہ معرکہ کارزار گرم تھا اور حضرت خالدؓ دشمن پر دباؤ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، ایرانی لشکر کے پیچھے مذکورہ بالا امیر اپنا اپنا دستہ لیکر پہونچ گئے۔ اب دشمن کو تاب مقاومت نہیں رہی، ایرانی بہت بری طرح شکست کھا کر بھاگ پڑے۔ ایک بڑی تعداد قتل ہوگئی اندرزغر جان بچا کر نکل بھاگا تھا۔ لیکن تشنگی کی وجہ سے وہ بھی ہلاک ہوگیا۔ یہاں بھی حضرت خالدؓ نے کسانوں کیساتھ نرمی اور ملاطفت کا معاملہ کیا۔ ان سب کو امن دے دیا۔ اور یہ لوگ ذمی ہوگئے[2]۔

[1] ان عربوں میں اکثریت بنو بکر بن وائل کی مختلف شاخوں کی تھی۔ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۴۔

جنگِ اُلّیس

اس تیسری شکست نے ایرانیوں کو تو بدحواس کیا ہی تھا۔ لیکن سب سے زیادہ اثر عراق کے عرب قبائل پر ہوا جن کو جزیرہ نمائے عرب کے اپنے ہی ہم قوموں کے ہاتھوں اس قدر شدید شکست اٹھانی پڑی تھی۔ ان کے غیظ و غضب کی حد نہ رہی اور ہم مذہبی کے رشتہ سے انہیں عرب قبائل میں جو اور عیسائی تھے وہ بھی مشتعل ہوگئے اور ان سب نے ایرانیوں سے خط و کتابت کر کے بہت بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ حیرہ اور اُبلّہ کے عین وسط میں دریائے فرات کے کنارہ پر ایک مقام الّیس ہے یہ سب وہاں جمع ہوئے۔ اردشیر نے بہمن جادویہ کو جو اس وقت ایک مقام قسینا نامی میں مقیم تھا حکم بھیجا کہ عرب عیسائیوں کی الیس پہونچکر مدد کرے۔ لیکن بہمن خود اردشیر سے بعض معاملات طے کرنے کی غرض سے مدائن چلا گیا اور اپنی طرف سے جابان نامی سردار کو یہ کہہ کر بھیج دیا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں تم جنگ میں پیش قدمی نہ کرنا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ بہمن مدائن پہونچا تو اس وقت اردشیر بیمار تھا۔ اس لیے بہمن کو وہاں قیام کرنا پڑا۔ ادھر یہ ہوا کہ جابان الیس پہونچکر بہمن کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں حضرت خالدؓ پہنچ گئے اور دشمن کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع دیئے بغیر جنگ شروع کر دی۔ مالک بن قیس جو بڑا بہادر تھا آگے بڑھا لیکن حضرت خالدؓ کی تلوار نے اسکو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ منظر دیکھ کر دشمن کی صفوں پر ہیبت طاری ہو گئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنا پکا پکایا کھانا چھوڑ کر بھاگے تھے۔ مسلمانوں نے جب کھانے پر قبضہ کیا تو ان کو میدہ کی سفید روٹیاں بھی ملیں جن کو عربی میں "الرقاق البیض" کہتے ہیں۔ مسلمان عرب اس سے بالکل ناآشنا تھے۔ اس لئے کسی شخص نے پوچھا "یہ کیا ہے" تو دوسرے نے جواب دیا تم نے "رقیق الجیش" تو سنا ہی ہوگا اسی مناسبت سے ان کو "رقاق البیض" کہتے ہیں۔ الیس سے فارغ ہو کر حضرت خالد نے امغیشیا نامی ایک شہر کا رخ کیا جو الیس سے

؎ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۴ - ۲۶۵ -

قریب تھا اور فرات اور نہر بادقلی کے سنگم پر واقع تھا۔ لیکن یہاں جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ اہل شہر نے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ حضرت ابوبکرؓ کو ان پیہم فتوحات کا علم ہوا تو خوش ہو کر فرمایا "عورتیں خالدؓ جیسا کوئی پیدا کرنے سے عاجز ہیں" ؎

ابن جریر طبری۔ ابن اثیر اور ابن کثیر کا بیان ہے کہ جنگ الیس میں فریق ثانی کے ستر ہزار افراد قتل ہوئے تھے۔ سر ولیم میور اسکو مبالغہ کہتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اعداد و شمار کا نظم و ضبط اس زمانہ میں ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج کل ہے اس لیے ممکن ہے کہ پورے ستر ہزار نہ ہوں اور چونکہ ستر کا عدد کثرت کو ظاہر کرنے کیلئے عربی زبان میں عام طور پر بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں "اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً" میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے اس بنا پر ستر ہزار سے کثرت ہی مراد ہو۔

حیرہ کی فتح

ان پیہم شکستوں نے اگرچہ ایرانیوں کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ لیکن الیس کی جنگ میں عراق کے عرب قبائل پیش پیش رہے تھے اور اس وقت ایرانیوں کا بڑا سہارا یہی عرب تھے۔ اس بنا پر فوجی نقطہ نظر سے ضروری تھا کہ حیرہ پر جو عراق عرب کا پایہ تخت تھا قبضہ کیا جائے تاکہ ان عرب قبائل کو قابو میں رکھا جا سکے۔ چنانچہ امغیشیا سے فارغ ہونے کے بعد حضرت خالدؓ نے حیرہ کا رخ کر دیا۔ حکومت ایران کی طرف سے حیرہ کا گورنر اس وقت آزادیا (آزادبہ) نامی ایک ایرانی تھا۔ اس کو اسلامی فوج کی نقل و حرکت کا علم ہوا تو لشکر لیکر آگے بڑھا اور ساتھ ہی چونکہ حضرت خالدؓ دریائی راستہ سے آ رہے تھے اس بنا پر اس نے اپنے بیٹے کو بھیج کر دریا کا پانی منقطع کرا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشتیاں زمین سے لگ گئیں۔ حضرت خالدؓ اپنا ایک دستہ لیکر کشتیوں سے اترے دریائے فرات کے کنارہ پر آزادیا کے لڑکے سے جنگ کی۔ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا اور پھر روانہ ہو گئے۔ آزادیا کیلئے یہ وقت بڑا نازک تھا۔ ایک طرف اردشیر شہنشاہ ایران کے مرنے کی

؎ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۴ - ۲۶۵ -

خیرملی اور دوسری جانب خود اس کا بیٹا اور اس کے ساتھی قتل ہوگئے تھے اس لیے بجز فرار کے اس کیلئے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اہل حیرہ نے یہ رنگ دیکھا تو قلعہ بند ہو بیٹھ گئے۔ حیرہ مختلف اعلیٰ قسم کے محلات کیلئے مشہور تھا جن میں سے خورنق اور سدیر بہت مشہور ہیں اور عربی اشعار میں ان کا ذکر آتا ہے۔ مسلمانوں نے ان سب کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ کو جب ایک دن اور ایک رات گذر گئے تو مسلمان کسی طرح محلات کے اندر گھس گئے۔ اب ان لوگوں کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ صلح کرلیں۔ چنانچہ ایک بڑھے اور تجربہ کار شخص عبد المسیح (طبری نے نام عمرو بن عبد المسیح لکھا ہے) اور ایاس بن قبیصہ کی معرفت صلح کی گفت وشنید ہوئی آخر کار ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ پر صلح ہوگئی اور یہ شرط طے پائی کہ اہل حیرہ مسلمانوں کیلئے ایرانیوں کے برخلاف جاسوسی کی خدمات انجام دیں گے اور مسلمان ان کا کوئی گرجا منہدم کریں گے اور نہ کوئی محل۔ [1]

حضرت خالدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو جب فتح حیرہ کی خبر بھیجی تو ساتھ ہی کچھ ہدایا بھی بھیجے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان ہدایا کو اہل حیرہ کے جزیہ میں محسوب کرلیا اور حضرت خالدؓ کو لکھا کہ جزیہ کی باقی رقم کی وصولیابی بھی کرلیں اور اس کو بھی اہل حیرہ کی طرف سے ہدایا ہی سمجھ لیں۔ [2]

یہ فتح ربیع الاول ۱۲ھ میں ہوئی [3]

بنت بقیلہ کا افسانہ | اس موقع پر طبری، بلاذری، ابن اثیر اور ابن کثیر جیسے مؤرخین تک نے ایک روایت نقل کی ہے جو دراصل ایک غلط افسانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ ہم اصل روایت نقل کرتے ہیں اور پھر اس پر جرح وتنقید کریں گے۔

روایت یہ ہے کہ خریم بن اوس الطائی نے ایک آنحضرتؐ سے عرض کیا تھا کہ اگر اللہ آپ کے ہاتھوں حیرہ فتح کرادے تو آپ بنت بقیلہ (حیرہ کے ایک نامور خاندان کی لڑکی) مجھ کو عطا فرمادیجئے گا۔ چنانچہ اب جب حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ سے صلح کرنی چاہی تو خریم نے ان سے کہا کہ بنت بقیلہ کو آپ صلح میں داخل نہ کریں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مجھے دے چکے ہیں۔ خریم کے اس دعوی کی تصدیق بشیر بن سعد اور محمد بن مسلمہ نے بھی

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۲ - ۲۵۳ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۷ [3] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۷۔

کردی۔ تو حضرت خالدؓ نے اس عورت کو صلح میں شامل نہیں کیا اور وہ خریم کے حوالہ کردی لیکن چونکہ یہ عورت اس وقت اسی برس کی بڑھیا تھی اس لیے خریم نے اس عورت کے اہل خاندان سے ایک ہزار درہم لیکر وہ ان کو واپس کردی۔ جب لوگوں نے خریم سے کہا کہ آپ نے کیا کیا کہ بنت بقیلہ کو اتنے سستے داموں فروخت کردیا تو خریم نے جواب دیا کہ مجھ کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ایک ہزار سے اوپر بھی کوئی عدد اور ہے»۔ [1]

یہ روایت اصول روایت کے اعتبار سے بھی غلط ہے اور درایۃً بھی اور اس کے دلائل یہ ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ واقعہ کس شخص کا ہے اس میں ہی اختلاف ہے۔ بلاذری نے اس کو خریم بن اوس جو قبیلہ بنو طے سے تعلق رکھتے تھے ان کا واقعہ بتایا ہے۔ لیکن ساتھ ہی کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے بنت بقیلہ کو دینے کا وعدہ قبیلہ ربیعہ کے ایک شخص سے کیا تھا۔ [2] حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اس شخص کا نام شویل لکھا ہے اور طبری اور ابن اثیر نے بھی یہی نام لکھا ہے [3]

(۲) طبری نے اس عورت کا نام کرامت نقل کیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر نے اس کا نام شیماء لکھا ہے [4]

(۳) طبری میں آنحضرتؐ نے بنت بقیلہ دینے کا وعدہ اس شرط پر کیا تھا کہ حیرہ بزور شمشیر (عنوۃً) فتح ہو ید هی لك اذا فتحت عنوۃً [5] اور ظاہر ہے کہ یہاں حیرہ جبراً نہیں بلکہ صلحاً فتح ہوا تھا اس لئے نہ خریم یا شویل کو اس کے طلب کرنے کا حق تھا اور نہ حضرت خالدؓ اس مطالبہ کو منظور کرسکتے تھے۔

(۴) روایت میں ہے کہ جب حضرت خالدؓ نے بنت بقیلہ کو شرائط صلح سے مستثنیٰ رکھے اور اس کو مدعی کے حوالہ کردینے کا فیصلہ کرلیا تو بنت بقیلہ کے رشتہ داروں کو اس پر اعتراض

[1] فتوح البلدان ص ۲۵۳ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۳۴۷ [3] طبری ج ۲ ص ۵۶۹ و ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۷ [4] الاصابۃ ج ۴ ص ۲۵۵ ترجمہ محمد بن بشیر و جلد اول ص ۳۲۴ ترجمہ خریم [5] طبری ج ۲ ص ۵۶۹۔

ہوا لیکن بنت نفیلہ نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ مجھ کو روکیں نہیں، جانے دیں، اصل بات یہ ہے کہ اس شخص نے مجھ کو جوانی میں دیکھا تھا اور یہ شاید یہ سمجھتا ہے کہ جوانی ہمیشہ رہتی ہے اب مجھ کو دیکھے گا کہ میں اسی برس کی بڑھیا ہو گئی ہوں تو یہ خود مجھ کو واپس کر دے گا
اب سوال یہ ہے کہ اگر اس شخص نے بنت نفیلہ کو اس کے عہد شباب میں دیکھا تھا اور وہ اس کو دل دے بیٹھا تھا تو یقینی بات ہے کہ یہ خود بھی اس وقت جوان ہوگا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ اس عرصہ میں بنت نفیلہ تو شباب اور کہولت کی منزلیں طے کر کے ہشتاد سالہ عجوزہ بن گئی لیکن یہ شخص جوان کا جوان ہی رہا جو اس جذبہ کے ساتھ بنت نفیلہ کو حضرت خالدؓ سے طلب کرتا ہے اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس شخص کی بے خبری کا عالم یہ ہے کہ وہ خود اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکا کہ اس مدت میں بنت نفیلہ بڑھیا بھی ہو چکی ہوگی۔ بنت نفیلہ اس کے متعلق یہ کہتی ضرور ہے کہ وہ شباب کو پائیدار اور دوامی سمجھتا ہے۔ لیکن درحقیقت دنیا میں ایسا کوئی احمق ہے بھی!

(۵) اس شخص کو جب لوگوں نے سستے داموں بیچ دینے پر برا بھلا کہا تو اس نے کہا کہ میں ایک ہزار کے بعد بھی کوئی عدد ہے یہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس بات کو بھی آخر کون باور کر سکتا ہے حضرت خالدؓ کی فوج میں کتنے مسلمان تھے؟ مال غنیمت کس کثیر مقدار اور تعداد میں مسلمانوں کے ہاتھ پڑ رہا تھا؟ کیا یہ سب چیزیں اس شخص کو معلوم نہیں تھیں؟ اور اگر تھیں تو وہ ان کا شمار کس طرح کرتا تھا۔

حیرہ میں حضرت خالدؓ کا طویل قیام حضرت خالدؓ کے سامنے سب سے بڑا مرحلہ مدائن کے فتح کرنے کا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ نے احکام بھیج دیئے تھے کہ جب تک حضرت عیاضؓ ان سے آکر نہ مل جائیں اور میری اجازت نہ ہو اس وقت تک مدائن کی طرف پیش قدمی نہ کی جائے اس لیے حضرت خالدؓ نے حیرہ کو ہیڈ کوارٹر بنایا اور کم و بیش سال بھر یہاں مقیم رہے اس قیام سے یہ فائدہ ہوا کہ اطراف و جوانب کے بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں (دہاقین) نے جب یہ دیکھا کہ اسلامی فوج کے قائد اعلیٰ کا معاملہ اہل حیرہ کے ساتھ بہت ہی روادارانہ اور منصفانہ ہے تو اب ان لوگوں نے بھی خدمت میں حاضر ہو کر صلح کی پیش کش کی اور یہ سب جزیہ ادا کرنے کا

عہد و پیمان کر کے حضرت خالدؓ کے سایۂ عاطفت میں آ گئے [۱]۔
اب جنوب میں خلیج فارس شمال میں حیرہ۔ مغرب میں بلاد عرب اور مشرق میں دجلہ تک کے وسیع علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ حضرت خالدؓ نے ضرار بن الازور۔ ضرار بن الخطاب قعقاع ابن عمرو اور مثنیٰ بن حارثہ وغیرہم نامور بہادروں کی سرکردگی میں ایک ایک دستہ فوج دیگران کو ان تمام علاقوں میں منتشر کر دیا۔ تاکہ نظم و ضبط قائم رہے اور کسی کو بغاوت و سرکشی کی جرأت نہ ہو۔ اس سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ نے اہل ایران عوام و خواص (مرازبہ) کے نام الگ الگ خطوط روانہ کیے جن میں اُن کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ ایرانیوں کا اس وقت حال یہ تھا کہ شاہ ایران اردشیر کے مر جانے سے طوائف الملوکی کی شکل پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اسلامی فتوحات نے ان کو ایک مرکز پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس بنا پر انھوں نے انبار اور عین التمر میں جو حیرہ سے قریب ہی تھے فوجیں جمع کرنی شروع کر دیں۔

واقعۂ انبار [۲]

حضرت خالدؓ کو علم ہوا تو قعقاع کو حیرہ میں اپنا قائم مقام کر کے دریائے فرات کے کنارے انبار کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ اقرع بن حابس مقدمۃ الجیش کا کام کر رہے تھے۔ ایرانیوں کو اسلامی لشکر کی نقل و حرکت کی اطلاع ہوئی تو قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے قلعہ کے چاروں طرف خندق تھی اس لیے مسلمان قلعوں تک پہنچ نہیں سکتے تھے اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ ایرانی قلعوں کی فصیل سے تیروں کی بارش کر رہے تھے حضرت خالدؓ نے یہ رنگ دیکھا تو اپنے قدر اندازوں کو حکم دیدیا کہ وہ دشمن کی آنکھ کو نشانہ بنا کر تیر چلائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان خدنگ افگنوں نے ایک ہزار آنکھوں کو ٹھکانے لگایا اسی وجہ سے اس جنگ کا نام ذات العیون بھی ہے [۳]۔

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۵۰۰، ۵۰۳ [۲] اس کو انبار کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں غلا اور اناج کے انبار لگے رہتے تھے۔ نعمان بن منذر کے خاص محکمہ اور اس کے دستکاروں کو غلہ فراہم کیا جاتا تھا۔ بلاذری ص ۲۵۵۔ انبار میں بڑی آبادی عربوں کی تھی جن کے آباؤ اجداد بخت نصر کے عہد میں یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ عربی لکھنا بھی جانتے تھے۔ طبری ج ۲ ص ۵۰۱ [۳] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۹۔

ایرانی فوج کا قائد شیرزاد اپنے زمانہ کا مشہور عقلمند اور مدبر تھا۔ اس نے تنگ آکر صلح کی پیش کش کی لیکن شرائط صلح ایسے تھے کہ حضرت خالدؓ منظور نہیں کر سکتے تھے اس لیے اس پیش کش کو رد کر دیا گیا۔ اور اب حکم ہوا کہ مجاہدین کے جتنے کمزور اونٹ ہیں ان کو ذبح کر کے خندق میں پھینک دیا جائے۔ ایسا کرنے سے خندق پُر ہو گئی اور مسلمانوں نے اسے عبور کرنا شروع کر دیا۔ اس منظر کو دیکھ کر شیرزاد پر ایسا خوف طاری ہوا کہ حضرت خالدؓ کی جو شرائط صلح تھیں ان کو بے چون و چرا مان لیا۔ شیرزاد یہاں سے جان سلامت لیکر بہمن جادویہ کے پاس چلا گیا۔ اور انبار پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا[1] شعبی سے روایت ہے کہ ۔

لاھل الانبار عھد و عقد[2] اہل انبار کیساتھ عہد و پیمان ہوا تھا۔

فتح عین التمر

یہاں سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ نے زبرقان بن بدر کو انبار میں چھوڑا اور خود ایک لشکر لیکر عین التمر کیلئے روانہ ہوئے۔ عین التمر عراق اور بادیۂ شام کے درمیان صحرا کے کنارہ پر واقع ہے تین دن کے سفر کے بعد یہاں پہنچ گئے۔ بہرام چوبین کا بیٹا مہران حکومت ایران کی طرف سے اس جگہ کا حاکم تھا، اس کے پاس ایرانیوں کی ایک بڑی فوج کے علاوہ بنو تمر، بنو تغلب اور بنو ایاد یا بادیۂ شام کے عرب قبائل کا بھی ایک عظیم لشکر تھا، عرب قبائل کا سردار عقہ ابن ابی عقہ تھا۔ حضرت خالدؓ کے پہونچنے کی اطلاع ہوئی تو عقہ نے مہران سے کہا کہ عرب لوہا لوہے کو کاٹتا ہے ہم بھی عرب ہیں اور خالد اور اُن کے ساتھی بھی عرب ہیں اس لئے بس ہم ہی دونوں کو لڑنے دو۔ مہران نے اس تجویز کو بخوشی منظور کر لیا۔ جب اس کے لوگوں نے اس پر ملامت کی تو بولا میں نے یہ ایک بڑی چال چلی ہے۔ جو تم لوگوں کیلئے بہت مفید ہوگی۔ اگر عقہ خالدؓ کے مقابلہ میں کامیاب ہو گیا تو ہو المراد، ورنہ مسلمان عقہ اور اس کی فوج سے لڑتے لڑتے کمزور ہو جائیں گے۔ اتنے میں ہم تازہ دم ہوں گے ہی مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے اور اس طرح فتح ہماری ہی ہوگی، چنانچہ عقہ اپنی فوج لیکر حضرت خالدؓ کی طرف بڑھا۔ اس میمنہ پر بجیر بن فلان تھا اور میسرہ پر ہذیل۔

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۹ [2] فتوح البلدان ص ۲۵۵

بن عمران عقہ اور مہران کے درمیان چند میلوں کی مسافت تھی۔ عقہ نے ایک مقام پر پہنچ کر صف بندی شروع کی۔ حضرت خالدؓ بھی اس کے مقابلہ میں اپنی فوج کو ترتیب دینے لگے۔ جب دونوں طرف صفیں آراستہ ہو گئیں تو عقہ نے پیش قدمی کر کے حضرت خالد پر حملہ کیا۔ دونوں ایک دوسرے پر وار کرتے رہے۔ آخر حضرت خالدؓ نے پہلو بچا کر عقہ پر اچانک اس زور کا حملہ کیا کہ عقہ کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا اور اسے گرفتار کر لیا۔ عقہ کی گرفتاری نے اس کی فوج کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ بدحواس ہو کر بھاگے۔ لیکن پھر بھی بہت سے لوگ گرفتار ہو گئے۔

مہران کو عقہ کی اس شکست کی خبر ملی تو اپنے لشکر کو لیکر قلعہ سے نکل بھاگا۔ اب حضرت خالدؓ کیلئے میدان صاف تھا۔ چنانچہ جب قلعہ عین التمر میں پہونچے تو جو لوگ یہاں رہ گئے تھے ان سب کو گرفتار کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا عقہ اور اس کے ساتھی جو سخت قسم کے فتنہ پرداز تھے ان کو قتل کر دیا۔

یہاں یہ ایک واقعہ پیش آیا کہ حضرت خالدؓ نے ایک گرجا دیکھا جس کا دروازہ اندر سے بند تھا حضرت خالدؓ کے حکم سے جب دروازہ توڑا گیا تو اندر سے چالیس لڑکے ملے جو انجیل پڑھ رہے تھے حضرت خالدؓ نے پوچھا "تم کون لوگ ہو؟" انہوں نے کہا ہم یہاں گروی ہیں۔ حضرت نے ان کو وہاں سے نکال کر مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔ ابو موسیٰ بن نصیر جو اندلس کے مشہور فاتح ہیں اور ابو محمد بن سیرین جو بصرہ کے نامور فقیہ ہیں وہ بھی انہیں لڑکوں میں تھے[1]

معرکۂ دومۃ الجندل

دومۃ الجندل عین التمر سے جنوب مغرب میں تین سو میل کی مسافت پر اس راستہ پر واقع ہے جو حیرہ اور عراق کی طرف جاتا ہے بادیہ اور صحرائے نفود دونوں کے درمیان میں حائل ہے۔ ربیع الاول ۵ھ میں آنحضرت ﷺ کو اطلاع ملی کہ دومۃ الجندل میں دشمنوں کی ایک بڑی فوج مجتمع ہو رہی ہے۔ تو ایک ہزار کی جمعیت لیکر مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ان لوگوں کو خبر ہوئی تو بھاگ نکلے اس لئے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد اکیدر بن عبدالملک الکندی ایک عربی سردار تھا۔

[1] طبری ج ۲ ص ۵۷۷ ۔

جو قیصر کے زیر اثر تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے مقابلہ کیلئے حضرت خالدؓ کو ماہ شوال ۹ھ میں بھیجا۔ حضرت خالدؓ اس کو گرفتار کر کے مدینہ لے آئے۔ یہاں اکیدر مسلمان ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے اور اہل دومۃ کیلئے پروانہ امن عطا فرمادیا۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد اس نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا اور عہد شکنی کر کے مرتد ہو گیا [1]۔

ان وجوہ کی بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے جب حضرت خالدؓ کو عراق کی طرف روانہ کیا تو عیاض بن غنم کو دومۃ الجندل بھیجا۔ آپ کو توقع تھی کہ دومۃ کی مہم جلد سر ہو جائیگی لیکن کم و بیش ایک سال گزر گیا۔ اور یہ مورچہ فتح نہیں ہوا۔ بنو کلب۔ بہراء اور غسان کے قبائل جو عراق میں حضرت خالدؓ کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگے تھے۔ انہوں نے بھی دومۃ الجندل میں آکر پناہ لے لی تھی۔ تاکہ حضرت خالدؓ کا بدلہ حضرت عیاض سے لیکر اپنے دل کو تسکین دے سکیں۔ اس بنا پر دشمنوں کی جمعیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اس کی وجہ سے حضرت عیاض کو بڑی دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

عین التمر کی فتح کے بعد حضرت خالدؓ نے مال غنیمت کیساتھ مژدۂ فتح ولید بن عقبہ کے ہاتھ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں مدینہ روانہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ولید بن عقبہ کو مع سازوسامان کے بطور کمک حضرت عیاض کے پاس بھیج دیا۔ ولید نے صورت حال کی نزاکت محسوس کر کے عیاض سے کہا کہ آپ حضرت خالدؓ کی مدد طلب کیجیے۔ ورنہ اس کے بغیر یہ مورچہ فتح نہیں ہوگا۔ عیاض نے فوراً اس مشورہ پر عمل کیا۔ حضرت خالدؓ کو عیاض کا خط ملا تو فوراً ان کو لکھا کہ میں تو خود ہی تمہارے پاس آنے والا تھا اور اس کے بعد یہ رجزیہ اشعار لکھے۔

لبث قلیلاً تأتك الحلائب يحملن آساداً علیها القاشب
كتائب يتبعها كتائب

کچھ اور انتظار کرو۔ تمہارے پاس اونٹنیاں آرہی ہیں جن پر شیر سوار ہیں اور ان پر تلواریں ہیں لشکر پر لشکر آگے پیچھے آرہے ہیں۔

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۶۸ - ۶۹ -

چنانچہ حضرت خالدؓ شام و نفوذ کے بادیہ و صحرا میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے دس روز سے بھی کم کی مدت میں تین سو میل کی مسافت طے کر کے دومۃ الجندل کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہاں بہراء کلب۔ غسان۔ تنوخ اور ضجاعم یہ سب عرب قبائل ان کے مقابلہ میں صف آرا تھے دومۃ الجندل کی ریاست دو شخصوں میں تقسیم تھی۔ ایک اکیدر اور دوسرا جودی بن ربیعہ۔ اکیدر چونکہ حضرت خالدؓ کے پنجۂ شیر افگن سے واقف تھا اس لئے اس کی رائے ہوئی کہ جنگ نہ کرنی چاہیئے۔ لیکن عرب قبائل اور ان کا سردار جودی اس پر رضامند نہیں ہوئے اس لئے اکیدر نے ان سے جدا ہو کر اپنی راہ لی۔ حضرت خالدؓ کو اس کی خبر ہوئی تو عاصم بن عمرو کو تعاقب میں روانہ کیا۔ عاصم نے اکیدر کو گرفتار کر کے پیش کیا۔ چونکہ باغی اور مرتد تھا اس لئے خالدؓ کے حکم سے قتل کر دیا گیا [1]۔

اب حضرت خالدؓ نے صف بندی کی۔ جودی عربوں کا ایک دستہ لیکر مقابلہ کیلئے بڑھا۔ اور ایک دستہ عیاض کی طرف بھیجا۔ حضرت خالدؓ اور عیاض نے دومۃ الجندل کو درمیان میں لے لیا تھا۔ جودی حضرت خالدؓ کے مقابلہ میں شکست کھا گیا اور گرفتار ہو گیا۔ اس کے لشکر کے لوگ بدحواس ہو کر قلعہ کیطرف بھاگے۔ لیکن قلعہ سب کو سما نہیں سکتا تھا۔ اس لیے جتنے آدمی اندر آسکتے تھے انہوں نے گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ ایک بڑی تعداد جو قلعہ سے باہر رہ گئی تھی لقمۂ اجل بن گئی۔ کلب کے قیدیوں کو بنو تمیم ان کے حلیف ہونے کی وجہ سے امن دے چکے تھے۔ اس لئے حضرت خالدؓ نے ان کی جان بخشی کر دی۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ نے قلعہ پر حملہ کیا۔ اور اس کو بزور شمشیر فتح کیا جودی جو عرب قبائل کا سردار تھا۔ قتل کر دیا گیا۔ اور اس کی بیٹی سے جو حسن و جمال میں مشہور تھی۔ گرفتار ہو کر آئی تو حضرت خالدؓ نے پہلے اس کو خریدا اور پھر آزاد کر کے نکاح کر لیا [2]

عراق میں بغاوت

حضرت خالدؓ دومۃ الجندل میں مقیم تھے کہ ایرانیوں اور عراق کے عرب قبائل نے ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ بنو تغلب جن کا سردار عقہ مارا گیا تھا وہ بھی

---

[1] الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۲۴۰ [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۶۹

پیش پیش تھے۔ قعقاع جن کو حضرت خالدؓ حیرہ میں اپنا قائم مقام چھوڑ کر آئے تھے۔ ان باغیوں سے عہدہ برآمد ہونا تنہا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے حضرت خالدؓ بغاوت کی خبر پاتے ہی دومہ سے روانہ ہوگئے۔ اقرع بن حابس مقدمۃ الجیش پر تھے۔ ان باغی ایرانیوں اور عربوں نے اپنی جمعیت کو کئی محاذوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ ایرانی سردار روزمہر اور روزبہ نے انبار کا رخ کیا تھا اور دوسرے فوجی دستے حصید، خنافس وغیرہ مقامات جو انبار کے قرب و جوار میں تھے۔ ان میں بغاوت کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ حضرت خالدؓ نے حیرہ پہنچ کر قعقاع کو حصید کے موقع پر متعین کیا۔ جہاں اس وقت روزمہر اور روزبہ فروکش تھے اور ابولیلیٰ کو خنافس کے محاذ پر روانہ کیا حصید میں جنگ بڑی شدید قسم کی ہوئی لیکن آخر قعقاع غالب آگئے اور روزمہر تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا[1]۔ اب رہا روزبہ اس کو عصمۃ بن عبداللہ الضبی نے ٹھکانہ لگا دیا۔ اور ایرانی شکست کھا گئے۔

یہاں سے بھاگ کر ان لوگوں نے خنافس کے مورچہ پر پاؤں جمائے۔ ایرانی فوج مہبوذان کے ماتحت تھی۔ لیکن مقابلہ کی نوبت نہیں آئی۔ مہبوذان ابولیلیٰ کی خبر آمد سنتے ہی بھاگا اور مصیخ نامی ایک مقام پر پہنچ کر ھذیل بن عمران کے دامن میں پناہ لی۔ حضرت خالدؓ کو ان واقعات کا علم ہوا تو قعقاع، ابولیلیٰ، اعبد اور عروہ جو مختلف محاذوں پر متعین تھے ان کو لکھا کہ فلاں شب میں فلاں وقت سب لوگ مصیخ میں جمع ہو جائیں، جب سب لوگ جمع ہوگئے تو ہذیل پر شبخون مارنے کا حکم ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشتیوں کے پشتے بندھ گئے لیکن ہذیل اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔

دو مسلمانوں کا سہواً قتل

مصیخ کے شبخون میں جو لوگ مارے گئے ان میں عبدالعزیٰ اور لبید بن جریر بھی تھے یہ دونوں مسلمان ہو چکے تھے۔ اور ان کے پاس حضرت ابوبکرؓ کا تصدیق نامہ بھی تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکر کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان دونوں کا خون بہا ادا کیا۔

[1] اس موقع پر قعقاع نے جو شعر کہے تھے یاقوت نے معجم البلدان میں ان کو نقل کیا ہے وہ شعر یہ ہیں۔

الا ابلغا اسماء ان خلیلہا — قضی وطرا من روزمہر الاعاجم

غداۃ صبحنا فی حصید جموعہم — بہندیۃ تفری فراخ الجماجم

اور حکم دیا کہ ان کی اولاد کے ساتھ حسن سلوک برتا جائے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو جس طرح مالک بن نویرہ کے قتل کا مجرم قرار دیا تھا اسی طرح ان دونوں شخصوں کے قتل ناحق کا الزام بھی ان پر لگاتے تھے[1]۔ لیکن حق یہ ہے کہ حضرت خالدؓ کیلئے سب سے بڑا معقول عذر یہ تھا کہ یہ دونوں شخص مسلمان ہونے کے باوجود دشمن کے کیمپ میں موجود اور ہذیل کے ساتھیوں میں تھے چنانچہ جب اس معاملہ میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے گفتگو کی تو حضرت خالدؓ کے خلاف اپنی ناراضگی اور برہمی کا اظہار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے صاف جواب دیا۔

کذالک یلقی من نازل اھل الشرک[2] جو کوئی اہل شرک کے ساتھ قیام کرتا ہے اس کا حشر یہی ہوتا ہے۔

لیکن طبری میں یہ واقعہ اس طرح پر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان شخصوں کا جب خون بہا ادا کیا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا۔

اما ان ذالک لیس علیّ (میں خون بہا ادا کرتا ہوں) لیکن یہ میرے ذمہ واجب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دونوں اذ نازلا اھل الحرب[3] اہل حرب کے ہاں مقیم اور ان کے مہمان تھے۔

چونکہ بغاوت کا یہ سارا فتنہ پیدا کیا ہوا بنو تغلب کا تھا اور ایرانی جو کچھ کر رہے تھے انہی کے بل بوتے پر کر رہے تھے اور ان کی اسلام دشمنی بہت پرانی اور نہایت شدید تھی اس بنا پر حضرت خالدؓ نے قسم کھائی تھی کہ وہ بنو تغلب کو تہس نہس کئے بغیر دم نہیں لیں گے۔ چنانچہ اب وہ مصیخ سے فارغ ہوگئے تو قعقاع اور ابولیلیٰ ان دونوں کو دو مختلف راستوں سے روانہ کیا اور ایک رات مقرر کر دی کہ اس میں بنو تغلب پر حملہ کیا جائے۔ ان دونوں کی روانگی کے بعد خود بھی روانہ ہوئے پہلے مقام ثنی میں اور اس کے بعد مقام زمیل میں (جو بنو تغلب کے خاص مرکز تھے) پہنچ کر تین طرف سے اس قدر شدید حملہ کیا کہ بنو تغلب کا کوئی شخص دوسروں تک ان کی خبر پہنچانے والا بھی نہیں بچا۔ اس حملہ میں جو عورتیں گرفتار ہوئی تھیں انہیں میں ربیعہ بن بجیر التغلبی کی بیٹی بھی تھی[4]

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۲

[2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۲

[3] طبری ج ۲ ص ۵۸۱

[4] ان کا نام صہبا اور کنیت ام حبیب تھی۔

یہ سب مالِ غنیمت اور گرفتار شدہ عورتیں مدینہ پہونچیں تو حضرت علیؓ نے بنت ربیعہ کو جس کا نام الصہباء اور کنیت ام حبیب تھی خرید لیا اور ان کے بطن سے عمر اور رقیہ پیدا ہوئے[1]

یہاں سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ نے رضاب کا رُخ کیا۔ اس جگہ عقبہ کے بیٹے ہلال نے بغاوت برپا کر رکھی تھی لیکن ہلال کے ساتھی حضرت خالدؓ کے پہنچنے کی خبر سنتے ہی اس کو چھوڑ کر بھاگ پڑے۔ اسی لیے جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

جنگ فراض

فراض۔ عراق اور شام کی سرحد پر دریائے فرات کے شمالی حصہ میں واقع ہے۔ حضرت خالدؓ عراق کی بغاوت کا سر قلم کر دینے کے بعد فراض پہونچے اور دریائے فرات کے کنارے پر خیمہ فگن ہو گئے۔ رمضان کا مہینہ آیا، وہ بھی یہیں گذار دیا۔ رومیوں نے اسلامی لشکر کو اس حالت میں دیکھا تو ان کے غصہ کی حد نہ رہی۔ اہلِ ایران کی جو فوجی چھاؤنیاں قرب و جوار میں تھیں ان کے علاوہ جو عرب قبائل قیصر کے باج گذار ان سب سے رومیوں نے مدد طلب کی اور اس طرح مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک نہایت عظیم فوج تیار ہو گئی۔ ۱۵ ذی قعدہ ۱۲ھ تک دونوں فوجیں اسی طرح آمنے سامنے پڑی رہیں کہ صرف ایک دریا ان کے درمیان حائل تھا۔ آخر رومیوں نے پہل کی اور دریا پار کر لیا۔ حضرت خالدؓ نے صفیں آراستہ کیں اور جنگ شروع ہو گئی۔ نہایت گھمسان کا رن پڑا۔ لیکن حضرت خالدؓ نے حکم دیا تھا کہ دشمن کی فوج کو منتشر ہونے دیں اور اسے چاروں طرف سے گھیر کر لڑیں، مسلمانوں نے اس پر عمل کیا اور رومیوں، ایرانیوں اور عرب قبائل کا بالکل دم کے دم میں صفایا ہو گیا۔ مورخین کا عام بیان ہے کہ اس معرکہ میں دشمن کی فوج کے ایک لاکھ سپاہی مارے گئے ہماری رائے میں یہاں بھی مراد صرف کثرتِ مقتولین کا بیان مقصود

---

[1] طبری و ابن اثیر و البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۵۲۔ بلاذری نے اس واقعہ کا ذکر فتوح الشام کے زیر عنوان کیا ہے۔ اور بجائے بنت ربیعہ کے بنت حبیب بن بجیر لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون ربیعہ بن بجیر کی بیٹی نہیں بلکہ بھتیجی تھیں۔ فتوح البلدان ص ۱۰۱۔

ہے۔ ورنہ ظاہر ہے اس زمانہ میں کسی فریق کیلئے اتنی بڑی فوج کا میدانِ جنگ میں انتظام کرنا ممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور تھا۔

حضرت خالدؓ کا حج

فراض کی جنگ سے ۲۵ ذی القعدہ ۱۲ھ کو فراغت ہوئی تھی اب حج میں صرف پندرہ دن باقی تھے۔ حضرت خالد نے حج کا ارادہ کر لیا دشوار گزار طویل مسافت کو ان چند دنوں میں طے کر کے اس رازداری کے ساتھ مکہ معظمہ آئے اور گئے کہ فراض کی جنگ سے فارغ ہو کر پھر اسی فوج سے آملے اور حیرہ میں ساتھ ساتھ داخل ہوئے اور ان لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلا کہ حضرت خالدؓ حج کر آئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک روایت کے مطابق اس سال امیر حج خود حضرت ابوبکرؓ تھے۔ اور دوسری روایت کے مطابق حضرت عمرؓ تھے بہرحال امیر الحج کو بھی ذرا خبر نہ ہوئی کہ ان کے قافلۂ حجاج میں خود خالد بن الولیدؓ بھی ہیں جو شام کی سرحد پر مصروفِ جنگ تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت خالدؓ کا یہ فعل ان کے کمال عزم و ہمت شجاعت و شہامت اور جوانمردی و قوت کی دلیل ہے۔ لیکن چونکہ خلیفہ کی اجازت کے بغیر محاذ جنگ سے اس طرح چلا جانا ڈسپلن کے خلاف تھا اس لیے حضرت ابوبکرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو حضرت خالدؓ کو ایک عتاب نامہ لکھا کہ تم کو اپنی فتوحات پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور سخت تاکید کی کہ آئندہ اس طرح کی کوئی حرکت سرزد نہ ہو[1]۔

عراق میں حضرت خالدؓ کا قیام محرم ۱۲ھ سے صفر ۱۳ھ تک کم و بیش ایک برس اور دو مہینہ رہا۔ لیکن اس قلیل مدت میں انہوں نے جو فتوحات حاصل کیں وہ جنگ و حرب کی تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے۔ ان جنگوں کا دائرہ خلیج فارس سے شام کی سرحد فراض تک وسیع ہے اور پھر جنگ صرف کسی ایک قوم سے نہیں بلکہ ایرانی رومی اور عرب قبائل ان تینوں کے متحدہ لشکروں سے جو تعداد میں ساز و سامان اور اسلحہ میں مجاہدین اسلام سے ہر طرح برتر تھے۔ ان تمام معرکوں میں ایک موقع بھی ایسا نہیں ہے جہاں

---

[1] طبری ج ۴ ص ۳۸۵۔

مسلمانوں کو شکست ہوئی ہو۔

اس کے علاوہ اس پر بھی غور کرو کہ اس زمانہ کے عام قاعدہ کے برخلاف حضرت خالدؓ جس شہر یا قصبہ کو فتح کرتے تھے اس کے نظم و ضبط کا باقاعدہ بندوبست بھی کرتے تھے ایک امیر پورے علاقہ کا نگران اور حاکم ہوتا تھا اور اس کے ماتحت ٹیکس وصول کرنے والے دوسرے لوگ ہوتے تھے۔ کسانوں کے ساتھ ہمیشہ غیر معمولی رعایت اور ملاطفت کا معاملہ کیا جاتا تھا اور زمین داروں اور جاگیرداروں کے ظلم سے ان کو نجات دلائی جاتی تھی اس بنا پر حضرت خالدؓ کی حیثیت ایک فاتح اعظم کی تھی۔ نہ کہ محض ایک حملہ آور کی۔ ان کی فتح کا مقصد تعمیر تھا نہ کہ تخریب۔

فتوحاتِ شام

شام کی فتوحات سے متعلق مؤرخین کے بیانات بڑے مختلف اور پیچیدہ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے پہلا لشکر کب بھیجا؟ اور وہ لشکر کتنا تھا؟ ان لشکروں کے امراء کون کون تھے؟ یہ چند سوالات ہیں جن کا جواب ایک نہیں ہے۔ طبری میں متعدد روایات ہیں جن سے متعدد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بلاذری کے بیانات بہت بے ترتیب اور الجھے ہوئے ہیں جن سے ایک شخص کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکال سکتا۔ ان میں سے بعض بیانات طبری کی روایتوں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور بعض ان کی بالکل ضد ہیں۔ ابو اسماعیل الازدی اور واقدی کے بیانات کا حال یہی ہے۔ ابن اثیر، ابن خلدون اور عماد الدین ابن کثیر نے زیادہ تر طبری کی روایات کا ہی تتبع کیا ہے۔ لیکن ہم نے ان سب مآخذ کو سامنے رکھ کر واقعات شام کو ایک خاص طرز پر مرتب کیا ہے جس سے واقعات میں تاریخی تسلسل بھی باقی رہتا ہے۔ اور منطقی ترتیب بھی قائم رہتی ہے۔ صفحاتِ آئندہ سے قارئین کو خود اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

شام کی سرحد پر لشکر کا تعین

مؤرخین عام طور پر لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ اہلِ ارتداد کے معاملہ سے فارغ ہو گئے تو آپ نے شام کی طرف توجہ کی[1] لیکن ہمارے خیال میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ تبوک اور موتہ کے واقعات نے ہرقل (قیصر روم) کو ہوشیار کر ہی دیا تھا کہ اس کے بعد ہی حضرت اسامہ کو مشارف شام میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اس صورتِ حال نے قیصر روم کو جو ابرانیوں پر اپنی فتوحات کے نشہ میں غرق تھا بوکھلا دیا اور اس نے اپنی سرحدوں پر فوجی دستے متعین کرنے شروع کر دیئے چنانچہ ابن عساکر لکھتے ہیں

---

[1] بلاذری ص ۱۱۲ و تاریخ ابن خلدون جلد ۲ ص ۸۳ -

فبلغ ذالك هرقل وهو بحمص فدعى بطارقته فقال هذا الذي حذرتكم فابيتم ان تقبلوه مني قد صارت العرب تأتي من مسيرة شهر فتغير عليكم ثم تخرج من ساعتها ولم تكلم فقال اخوه نياق فابعث رابطة تكون بالبلقاء فبعث رابطة واستعمل عليهم رجلا من اصحابه فلم يزل مقيما حتى تقدمت البعوث الى الشام في خلافة ابي بكر وعمر ۱؎

ہرقل حمص میں تھا جب اس کو جیش اسامہ کی کامیابی کی خبر پہنچی تو اس نے اپنے پادریوں کو بلایا اور کہا یہی وہ بات ہے جس سے میں تم کو ڈرایا کرتا تھا۔ لیکن تم اس کو ماننے سے انکار کرتے تھے، دیکھو یہ عرب ایک مہینہ کی مسافت پر آتے ہیں تم پر لوٹ مار مچاتے ہیں اور فوراً ہی زخم کھائے بغیر واپس چلے جاتے ہیں۔ ہرقل کے بھائی نیاق نے کہا تو آپ بلقا میں ایک دستۂ فوج متعین کر دیجئے۔ چنانچہ ہرقل نے ایسا ہی کیا، ایک دستہ متعین کر دیا اور اپنا ایک معتمد ان کا چارج آفیسر بنا دیا۔ یہ دستہ اس وقت تک برابر رہا جبکہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں شام کی طرف لشکر آنے شروع ہوئے ہیں۔

ظاہر ہے اور ظفر جب قیصر روم یہ سب کچھ سرحدی انتظامات کر رہا تھا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس طرف حضرت ابوبکرؓ کو اس کی خبر نہ ہوتی اور آپ اس کے جواب میں اپنی سرحدوں پر کوئی فوجی دستہ حفظ ماتقدم کے طور پر متعین نہ فرماتے۔ اس کی ضرورت خاص طور پر اس لیے بھی تھی کہ مسلمان جس زمانہ میں باغیوں کے ساتھ الجھے ہوئے تھے ان کی اس مصروفیت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے قیصر روم اندرون عرب گھس کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کا خیال کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے عین اس زمانہ میں جبکہ حروب ارتداد جاری تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے خالد بن سعیدؓ کو جو السابقون الاولون میں سے تھے شام کی سرحد پر ایک دستۂ فوج کا امیر بنا کر بھیجا۔ چونکہ مؤرخین نے جیسا کہ ہم نے شروع

۱؎ تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۴

میں کہا ہے۔ شام کے واقعات کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیا ہے اس لیے وہ عام طور پر خالد بن سعیدؓ کے تقرر کو حروب ارتداد کے بعد کا واقعہ لکھتے ہیں جبکہ شام کی طرف باقاعدہ فوجیں روانہ ہونی شروع ہوئی ہیں۔ لیکن ہمارا قیاس یہی ہے کہ خالدؓ بن سعیدؓ کا تقرر عام فوجوں کی روانگی سے بہت پہلے دراصل سرحد کی حفاظت کی غرض سے ہوا تھا۔ چنانچہ ابن حجر ایک روایت نقل کرتے ہیں۔

ان ابابكر امّره على مشارف الشام في الردة ۱؎

ابوبکرؓ نے ان کو ارتداد کے دنوں میں شام کی چراگاہوں کا امیر مقرر کیا تھا۔

اس کی تائید طبری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب خالد بن سعیدؓ کو تیما کی طرف روانہ کیا جو شام کی سرحد پر واقع ہے تو ساتھ ہی ہدایت کی کہ وہاں قرب و جوار کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں۔ جو لوگ مرتد نہیں ہوئے تھے صرف ان کی خدمات قبول کریں اور نیز یہ کہ جب تک خود حضرت ابوبکرؓ کا حکم نہ پہنچے اور وہ لوگ خود جنگ میں پہل نہ کریں اس وقت تک وہ جنگ نہ کریں ۲؎

اس کے علاوہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کو خالد بن سعیدؓ کی طرف سے کچھ تکدر تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت خلافت سے ایک یا دو مہینہ کے بعد جب یہ یمن سے جہاں وہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے متعین تھے۔ مدینہ واپس آئے تو انہوں نے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ سے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر اپنی ناگواری کا اظہار کیا تھا لیکن جب حضرت علیؓ نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ ابوبکرؓ کی خلافت صحیح خلافت ہے نہ کہ تغلب تو وہ چپ ہو گئے۔ اس تکدر کی وجہ سے حضرت خالد بن سعیدؓ کو مشارف شام کا امیر مقرر کیا تو حضرت عمرؓ نے اس پر اعتراض کیا اور خالد بن سعیدؓ کو امارت سے معزول کر دینے کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے اس مشورہ کو اس صورت میں قبول فرمایا کہ خالدؓ کو امارت سے تو معزول کر دیا لیکن مسلمانوں کے مددگار کی حیثیت سے ان کو شام بھیج دیا۔

۱؎ الاصابہ ج ۱ ص ۴۰۶ تذکرۂ خالد بن سعیدؓ ۲؎ طبری ج ۲ ص ۵۸۷۔

اصل الفاظ یہ ہیں ۔

"وجعله ردأ للمسلمين بتيماء"[1] اور ان کو تیما میں مسلمانوں کا مددگار بنا رہا ۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ واقعہ کی اصل صورت کیا تھی؟ بہرحال ردأ جس کا انگریزی ٹھیٹ ترجمہ AUXILTARY FORCE ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ خالد بن سعیدؓ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ صرف سرحد کی حفاظت اور اس کی نگہداشت کیلئے بھیجے گئے تھے تاکہ اگر قیصر کی طرف سے کوئی حملہ ہو تو اس کی روک تھام کی جاسکے ۔

جب تک عرب میں ارتداد و بغاوت اور اس کے ساتھ جنگ کا ہنگامہ برپا رہا ۔ غالباً قیصر اس خیال میں رہا کہ اسلام اس سے عہدہ برآ نہ ہوسکے گا اور دو خانہ جنگیوں کی اسی آگ میں جل بھن کر بھسم ہوجائیگا ۔ اس کے علاوہ اس کو یہ خیال بھی ہوگا اگر ان حالات میں اس نے خود حملہ کردیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ متحدہ قومیت عرب کی رگِ حمیت میں جوش پیدا ہو اور اس کی وجہ سے پورا عرب باہمی جنگ کو بالائے طاق رکھ کر خود اس کے مقابلہ پر آجائے ۔ بہرحال یہ یا اسی طرح کے کچھ اور اسباب تھے کہ قیصر نے اپنی سرحدوں پر جو دستے متعین کیئے تھے وہ اسی طرح وہاں پڑے رہے اور انہوں نے کوئی حملہ یا جنگی اقدام نہیں کیا ۔

قیصر روم کی جنگی تیاری | لیکن یمن ۔ حضر موت اور عمان کے علاقوں میں مسلمانوں کو پے در پے جو فتوحات حاصل ہورہی تھیں ۔ انہوں نے قیصر کو بدحواس کردیا ۔ اور اب اس نے بہراء، تنوخ، سلیح، غسان، کلب ۔ لخم ۔ اور جذام وغیرہ عرب قبائل جو حدود شام میں آباد اور قیصر کے باجگذار تھے ان سب کو اپنے ساتھ ملا کر اسلام کیخلاف ایک نہایت عظیم الشان فوج جمع کرلی اور بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاریاں شروع کردیں ۔ ادھر مسلمانوں کو حروب ارتداد میں خاطر خواہ کامیابی ہوچکی تھی یمن اور اس کے آس پاس کے علاقے ان کے قبضہ میں آگئے تھے اور دوسری جانب حیرہ فتح ہوگیا تھا ۔ دومۃ الجندل نے مجاہدین اسلام کیلئے اپنے دروازے کھول دیئے تھے اور اس کی وجہ سے وادی سرحان کے راستے شام میں داخل ہونا آسان ہوگیا تھا ۔ اس لیے اب حضرت ابوبکرؓ کو قیصر روم کی عظیم الشان جنگی تیاریوں کی اطلاع ہوئی ۔ تو آپ نے بھی شام

[1] فتوح الشام للواقدی ۔ شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۔ ص ۲ ۔

پر حملہ کرنے کا ارادہ کرلیا ۔

مشاورت | چونکہ یہ ایک نہایت اہم اقدام اور غیر معمولی مہم تھی اس لئے صحابہ سے مشورہ لینا اور ان کی رائے معلوم کرنا ضروری تھا ۔ چنانچہ ماہ صفر ۱۳ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجلس مشاورت طلب کی جس میں حضرت عمرؓ ۔ عثمانؓ ۔ علیؓ ۔ طلحہؓ ۔ زبیرؓ ۔ عبدالرحمن بن عوفؓ سعد بن ابی وقاصؓ ۔ ابوعبیدہ بن الجراحؓ اور معاذ بن جبلؓ وغیرہم تمام اکابر اور نامور صحابہ اور مہاجرین و انصار شریک تھے ۔ اس مجلس میں پہلے حضرت ابوبکرؓ نے تقریر کی اور فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے شام کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی تھی لیکن اسی درمیان میں اللہ نے آپ کو اپنے پاس بلالیا ۔ عرب ایک ہی باپ اور ماں کی اولاد ہیں ۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو شام روانہ کروں آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟ سب نے یک زبان ہوکر کہا اے خلیفۂ رسولؐ! آپ کی اطاعت ہم پر واجب ہے ۔ آپ جہاں کہیں جانے کا ہم کو حکم کریں گے اس کا بجالانا ہمارا فرض ہوگا[1]

ابو اسماعیل الازدی نے اس موقع پر نقل کیا ہے ۔ کہ اس مجلس مشاورت میں خالد بن سعید الاموی بھی شریک تھے اور انہوں نے ہی سب سے پہلے شام جانے کیلئے اپنا نام پیش کیا تھا ۔ لیکن طبری ۔ ابن اثیر اور ابن خلدون کے بیانات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ اس لیے صحیح وہ ہی ہے جو ہم نے اوپر لکھا ہے یعنی یہ کہ خالد بن سعید اس وقت تیما میں تھے اور یہ مجلس درحقیقت ہوئی ہی تھی اس وقت جبکہ حضرت ابوبکر کو خالد بن سعید کے خط سے ہرقل کی جنگی تیاریوں کا علم ہوا تھا ۔

دعوت نامے | جب سب صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا اور اس پر مہر تصدیق ثبت کردی تو چونکہ قیصر روم کی طاقت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی اور اسی وجہ سے مجلس مشاورت میں حضرت عبدالرحمن نے فرمایا تھا "انها الروم وبنو الاصفر حد حديد وركن شديد"[2] ۔ یہ اہل روم بہت تیز دھار اور مضبوط ستون ہیں ۔ اس بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے حجاز اور یمن کے تمام امرائے قبائل کے نام شرکت جہاد کے دعوت نامے بھیجے

[1] فتوح الشام للازدی ص ۴ [2] فتوح الشام للواقدی ص ۳-۴ و فتوح الشام للازدی ص ۵ و تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۹

قبائل کا جوش و خروش اور ان کی مدینہ میں آمد

قبائل نے بڑی خوش دلی اور جوش و خروش کے ساتھ اس دعوت کو لبیک کہا اور جوق در جوق مدینہ میں آنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ذوالکلاع الحمیری نے حضرت ابوبکرؓ کے خط کا مضمون سنا ہی تھا کہ فوراً ہتھیار سجے۔ گھوڑے پر بیٹھ اپنی قوم اور یمن کے دوسرے لوگوں کو ساتھ لے روانہ ہو گئے۔ اسی طرح قیس بن ہبیرہ المرادی مذحج کو، جندب بن عمرو الدوسی قبیلۂ ازد کو۔ اور حابس بن سعد الطائی قبیلۂ طے کے مجاہدین کو ساتھ لیکر چل پڑے۔ انس ابن مالک جو آنحضرتؐ کے خادم خاص تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے یہ تمام خطوط لیکر گئے تھے۔ انہوں نے واپس آکر حضرت ابوبکرؓ کو مژدہ سنایا کہ آپ کی دعوت جہاد کا یہ اثر ہوا ہے کہ قبائل یمن جس حالت میں تھے اسی میں وہ اپنی عورتوں، بال بچوں اور جمع پونجی کو لیکر روانہ ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر آپ کو بیحد مسرت ہوئی۔ دوسرے دن اہل مدینہ کو ساتھ لیکر ان مجاہدین اسلام کے استقبال کیلئے مدینہ سے باہر تشریف لائے۔ قبائل یمن میں سب سے پہلے قبیلۂ حمیر پہونچا جو ہتھیار بند تھا ذوالکلاع ایک عمامہ باندھے اس قبیلہ کی پیشوائی کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ ابھی ان کا استقبال کر ہی رہے تھے کہ قبیلوں کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ مدینے کے قریب مقام جرف میں ان سب قبائل کیلئے خیمے لگا دیئے گئے تھے وہیں ان کو ٹھہرایا گیا [1]

قیصر روم کے نام ابوبکرؓ کی سفارت

اسی درمیان میں اتمام حجت کرنے کی غرض سے حضرت ابوبکرؓ نے قیصر روم کے پاس ایک سفارت بھیجی تھی جس کے ذریعہ اس کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ حافظ ذہبی نے اس سفارت کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے [2]
ڈاکٹر حمید اللہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"ارمنی مورخ سابیوس (SABEOS) نے بھی ذکر کیا ہے کہ اس زمانہ میں قیصر کے پاس ایک اسلامی سفارت آئی تھی اس کے بیان کا ترجمہ ہیوبشمان نے اپنی کتاب میں کیا ہے

---

[1] فتوح الشام للواقدی ص ۳-۴ و فتوح الشام للازدی ص ۶، و تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۹

[2] تاریخ کبیر حالات ابوبکرؓ مخطوطہ بزم ادب حیدرآباد دکن۔

اور وہ یہ ہے

"انہوں (مسلمانوں) نے تب ایک سفارت بیزنطینی شہنشاہ کے پاس بھیجی اور کہا خدا نے یہ علاقہ ہمارے جد (حضرت ابراہیمؑ) اور ان کی ذریت کو عطا کیا تھا تو اسپر بہت دنوں سے قابض ہے وہ ہمیں صلح اور آشتی کیساتھ واپس کر دے پھر ہم تیرے ملک میں نہیں آئیں گے۔ قیصر نے انکار کیا اور وہ جواب نہیں دیا جس کی سفیر کو توقع تھی۔ قیصر نے کہا "یہ ملک میرا ہے اور تیرا حصہ تو صحرا ہے جا وہاں امن سے رہ" [1]

قبائل کی بے قراری

اس اتمام حجت کے بعد حضرت ابوبکرؓ فوجوں کی ترتیب اور ان کیلئے ساز و سامان کی فراہمی میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ یہ مہم نہایت اہم درپیش تھی اس لیے حضرت ابوبکرؓ جو قدم اٹھاتے تھے کامل غور و فکر اور پورے عزم و احتیاط سے اٹھاتے تھے۔ اسی بنا پر فوجوں کی روانگی میں تاخیر ہو رہی تھی۔ یمن اور حجاز کے جو قبائل جرف میں خیمہ فگن تھے ان کی بیقراری کا یہ عالم تھا کہ جب کچھ زیادہ دن ہو گئے تو قیس بن ہبیرہ المرادی اور چند لوگوں کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ ہمارا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہے یا تو ہمیں شام روانہ کیجیے ورنہ اجازت دیجیے کہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو اطمینان دلایا کہ تم ہی لوگوں کے انتظامات کی تکمیل کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے [2]

اسلامی فوج کے عناصر ترکیبی

شام کیلئے جو فوج روانہ ہونیوالی تھی اس کی یہ خصوصیت خاص طور پر لحاظ میں رکھنے کے قابل ہے کہ اس میں یمن اور حجاز کے ممتاز بہادر اور جنگجو قبائل کے علاوہ اکابر صحابہ جو بدر و اُحد کے معرکوں میں شریک رہ چکے تھے اور اجلۂ مہاجرین و انصار جو اسلام کی عمارت کے ستون اعظم تھے یہ بھی شامل تھے ایسے صحابہ کی تعداد تین سو بیان کیجاتی ہے ان کے علاوہ عکرمہ بن ابی جہل جو حروب ارتداد کے سلسلہ میں کندہ حضرموت اور عمان وغیرہ کی مہم سر کر کے مدینہ پہونچ چکے تھے۔ ان کو بھی ایک تازہ دم فوج

---

[1] منقول از "آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی" ص ۲۸۰

[2] فتوح الشام واقدی ص ۶

دیکر شام کے محاذ پر روانہ کیا گیا۔ عمرو بن العاص مرتدین کے استیصال کے بعد سے قضاعہ میں مقیم تھے، ان سے پوچھا گیا وہ کیا چاہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا اے امیر المؤمنین! میں اللہ کا تیر ہوں جس طرح آپ چاہیں اس کو استعمال کر سکتے ہیں، اس جواب کے بعد ان کو بھی مدینہ طلب کر لیا گیا[1]۔

افواج کی روانگی

اب فوجوں کی روانگی کا وقت آ گیا تھا حضرت ابوبکر نے ایک ٹیلہ پر چڑھ کر مجاہدین اسلام کے اجتماع عظیم کا جائزہ لیا اور ان کے جوش و خروش اور جذبہ کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔ پھر مجاہدین کو چار لشکروں میں تقسیم کیا۔ واقدی نے ان لشکروں کو ایک ایک ہزار افراد پر مشتمل بتایا ہے اور لشکروں کی تعداد تین لکھی ہے[2]۔ لیکن حافظ عماد الدین ابن کثیر نے لشکروں کی تعداد چار بتائی ہے اور ہر ایک لشکر کو تین تین ہزار مجاہدین پر مشتمل لکھا ہے[3] اور ہمارے نزدیک زیادہ صحیح یہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس مسئلہ میں روایات کے اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لشکر آگے پیچھے روانہ ہوئے ہیں اور بعض چھوٹے لشکروں کو کسی ایک بڑے کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ اس بنا پر امراء کی تعداد میں بھی اختلاف ہے اور خود لشکر کی تعداد میں بھی۔ ان چار لشکروں میں سب سے بڑا لشکر یزید بن ابی سفیان کا تھا جس میں اہل مکہ اور اہل یمن دونوں قسم کے حضرات شامل تھے ان کے علاوہ ایک لشکر ابو عبیدۃ بن الجراح، دوسرا عمرو بن العاص اور تیسرا شرجیل بن حسنہ کی سرکردگی میں تھا۔ مورخین نے لشکروں کی تعداد جو تین یا چار لکھی ہے ہماری رائے میں اس سے مراد بڑے اور کسی نہ کسی حیثیت سے اہم لشکر ہیں ورنہ در حقیقت لشکروں کی تعداد چار سے زیادہ تھی۔ چنانچہ عکرمہ بن ابی جہل کی قیادت میں جو لشکر تھا اس کا ذکر اوپر آ ہی چکا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے لشکروں کو الگ الگ روانہ کرتے اور ان کو الوداع کہنے کیلئے مدینہ کے باہر تک پاپیادہ تشریف لاتے تھے رخصت کرنے سے قبل ہر ایک لشکر کو خاص خاص ہدایات اور نصائح تلقین فرماتے جس کا ذکر آگے اپنی جگہ پر آئے گا۔ اور پھر ان کے حق میں بارگاہ ایزدی میں کمال خضوع و خشوع کیساتھ دعا کرنے کے بعد۔ خدا حافظ کہتے تھے

---

[1] واقدی ص ۶ [2] فتوح الشام ص ۷ [3] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۳ ۔

ان لشکروں کو آپ نے جو ہدایات دیں ان میں ایک یہ ہدایت بڑی اہم تھی کہ وہ سب ایک ہی راستے سے نہ جائیں بلکہ مختلف راستے اختیار کریں۔ چنانچہ یزید بن ابی سفیان جن کو دمشق کے محاذ پر بھیجا گیا تھا ان کو حکم ہوا کہ تبوک کے راستہ سے جائیں۔ عمرو بن العاص جو فلسطین کے محاذ کیلئے مقرر کیے گئے تھے۔ وہ ایلہ کی راہ گئے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ ان لشکروں کی روانگی جمعرات کے دن یکم صفر ۱۳ھ کو ہوئی تھی[1]۔

ظاہر ہے شام کے محاذ کیلئے بارہ ہزار مسلمانوں کا لشکر کافی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی کہ قیصر نے بہت بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاریاں کی ہیں تو آپ نے بعد میں اور لشکر بھی آگے پیچھے روانہ کیے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ شدہ شدہ ہر امیر کے ماتحت ساڑھے سات ہزار مجاہدین کا لشکر ہو گیا تھا۔ اور اس طرح کل تعداد چوبیس ہزار تھی[2]۔ لیکن ظاہر ہے یہاں پھر مورخین کو التباس ہو گیا ہے۔ کیونکہ لشکر تین مانے جائیں یا چار، بہر حال اگر ہر لشکر میں ساڑھے سات ہزار کی مساوی تعداد تسلیم کر لی جاتے تو اس حساب سے مجموعی تعداد چوبیس ہزار نہیں ہوتی۔

رومیوں سے پہلا مقابلہ

یاد ہو گا کہ خالد بن سعید پہلے سے تیماء میں متعین تھے ہی۔ ان کو حضرت ابوبکرؓ نے تاکید کر رکھی تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر اقدام جنگ نہ کریں۔ چنانچہ جب انہوں نے قیصر کی فوجوں کا اجتماع عظیم دیکھا تو حضرت ابوبکرؓ کو اس کی اطلاع کی آپ نے حکم بھیجا کہ اچھا اب آگے بڑھو لیکن ساتھ ہی تاکید کی کہ اندرون ملک گھسے مت چلے جانا ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن تم کو پیچھے سے آ دبائے[3]۔ لیکن خالد بن سعید نے جوش میں اس نصیحت کی کچھ پروا نہیں کی انہوں نے اقدام کیا اور رومی اس سے پسپا ہوئے تو یہ اپنی فوج لیے اندرون ملک گھسے چلے گئے۔ رومی فوج کا افسر اعلیٰ باہان تھا جو اپنے عہد کا نامور ماہر جنگ تھا۔ باہان نے دمشق کا رخ کیا۔ خالد بھی اسی طرف اس کے تعاقب میں چل پڑے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ واقوصہ اور دمشق کے درمیان مرج الصفر کے نام سے جو مقام ہے وہاں پہونچ کر دم لیں گے۔ اور اس کو اپنی فوجی قیام گاہ بنائیں گے۔ لیکن در حقیقت باہان کی یہ پسپائی نہیں تھی

---

[1] بلاذری ص ۱۱۴ [2] فتوح البلدان ص ۱۱۵ [3] تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۳۱ و طبری و ابن اثیر۔

بلکہ ایک زبردست جنگی چال تھی۔ چنانچہ ابھی خالد بحیرۂ طبریہ کے شرق کی جانب مرج الصفر کے قریب ہی تھے کہ باہان اچانک راستہ بدل کر اسلامی فوج کے عقب میں آگیا اور اس طرح اس کو گھیر لیا کہ اب لوٹنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ خالد بن سعید کا بیٹا مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ کہیں الگ تھلگ رہ گیا تھا۔ باہان کا قابو چل گیا۔ اور ان سب کو قتل کر دیا۔

خالدؓ کو بیٹے کے اس طرح مارے جانے کا صدمہ اس قدر شدید ہوا کہ پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ پڑے۔ مدینہ کے قریب ایک مقام ذوالمروہ ہے وہاں پہونچ کر دم لیا حضرت ابوبکرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو سخت ملال ہوا۔ اور خالدؓ کو لکھا جو کچھ ہوا سو ہوا۔ لیکن اب اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ بلکہ یہاں تک فرمایا وہ اگر میں خالدؓ کے متعلق عمرؓ اور عبیدہ کی رائے (یہ دونوں خالد کو امیر مقرر کرنیکے خلاف تھے) مان لیتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔[1]

اسلامی لشکر کے مختلف محاذ | یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جبکہ حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ سے جو لشکر روانہ کیے تھے انہوں نے خلیفۂ رسول ﷺ کے حکم کے مطابق مختلف محاذوں پر پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ چنانچہ ابو عبیدۃ دمشق کے راستہ میں شرحبیل بن حسنہ[2] طبریہ اور نہر اردن کے بالائی حصہ میں یزید بن ابی سفیان بلقاء میں جہاں سے وہ بصریٰ پر آسانی سے حملہ کر سکتے تھے اور عمرو بن العاص عربہ میں جبرون کیلئے خطرہ کی گھنٹی بنے پڑے تھے۔ یہ لشکر الگ الگ اور دوسرے سے علیحدہ تھے لیکن ان کے امراء میں باہمی مراسلت و مشاورت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ ان تمام اسلامی لشکروں کی مجموعی تعداد عام روایات کے مطابق تیس ہزار تھی۔

قیصر روم کے لشکروں کی ترتیب | قیصر روم کو ان اسلامی لشکروں کا علم ہوا تو اس نے بہت بڑے پیمانہ پر اپنے لشکر مرتب کیے تھے۔ اس کی بنیادی پالیسی یہ تھی کہ اسلامی لشکروں کو کسی ایک محاذ پر جمع ہونے نہ دے تاکہ وہ سب اجتماعی قوت کیساتھ دشمن کا مقابلہ نہ کر سکیں۔

---

[1] طبری ج ۴ ص ۵۸۹۔ [2] شرحبیل بن حسنہ دراصل حضرت خالد بن الولید کی طرف سے عراق کا مژدۂ فتح لیکر آئے تھے۔ لیکن یہاں شام کی مہم درپیش تھی اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے ان کو ایک لشکر دے کر سیدھا شام بھیج دیا۔[3] ابن اثیر نے لکھا ہے کہ ہرقل (HIERACLINS) نے شروع میں رومی سرداروں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کو مشورہ دیا تھا کہ مسلمانوں کیساتھ صلح کر لیں لیکن ان لوگوں نے جب اس کی ایک نہیں سنی تو مجبور ہو کر اس کو جنگ کی تیاری کرنی پڑی ج ۲ ص ۲۸۲

اور چونکہ اس کے پاس فوج بے شمار تھی اس لیے اس کو یقین تھا کہ مسلمان محاذوں پر بٹ کر اس کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ قیصر پہلے خود حمص آیا جہاں شام کی ایک عظیم الشان فوجی چھاؤنی تھی اور یہاں لشکروں کی ترتیب۔ ان کیلئے ساز و سامان اور اسلحہ وغیرہ کی فراہمی کا کام شروع کر دیا۔ جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو اس نے چار لشکر اسطرح روانہ کیے۔

(۱) ایک لشکر جو سب سے بڑا اور نوے ہزار بہادروں پر مشتمل تھا۔ عمرو بن العاص کے مقابلہ کیلئے روانہ کیا۔ اس لشکر کی قیادت ہرقل کا حقیقی بھائی تھیوڈرس (THE ODDROIES) کر رہا تھا۔ اس نوے ہزار کے مقابلہ میں عمرو بن العاص کے پاس جو لشکر تھا وہ سات آٹھ ہزار سے زیادہ نفوس پر مشتمل نہیں تھا۔

(۲) دوسرا لشکر جو ساٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا ابو عبیدۃ کے مقابلہ پر بھیجا گیا تھا اس لشکر کا قائد پیٹر (PETER) تھا جس کو عرب مورخین فیقار بن نسطورس لکھتے ہیں۔
حضرت ابو عبیدۃ کی فوج بھی سات آٹھ ہزار کے درمیان تھی۔

(۳) تیسرا لشکر جس کا قائد سرجیس (SERGIUS) تھا عرب مورخین اس کو جرجۃ بن توذرا لکھتے ہیں یزید بن ابی سفیان کے مقابلہ میں روانہ ہوا۔

(۴) چوتھا لشکر دراقص کے ماتحت تھا جو شرحبیل بن حسنہ کیساتھ جنگ کرنے کیلئے بھیجا تھا۔ مسلمانوں کو ان لشکروں کے اجتماعِ عظیم اور ان کی تیاریوں کا علم ہوا تو اپنی قلت تعداد کی وجہ سے کچھ اندیشہ ہوا۔ اور عمرو بن العاص کو لکھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ادھر ان لوگوں نے (ازدی نے لکھا کہ خود عمرو بن العاص نے) حضرت ابوبکرؓ کو دشمن کی کثرتِ تعداد کی اطلاع دی تو بارگاہِ خلافت سے جواب آیا کہ تم سب ایک جگہ ہو جاؤ اور ایک لشکر بنا لو اس کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ اپنی قلت تعداد کا غم نہ کرو۔ تم اللہ کے دین کے اعوان و مددگار ہو وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا پھر حکم دیا کہ تم سب لوگ یرموک میں جمع ہو جاؤ۔

اجتماعِ یرموک | یرموک دراصل ایک دریا کا نام ہے جو حوران کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور مختلف پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اردن کے دریا اور بحر منجمد (DEAD SEA) میں جا ملتا ہے۔ یرموک کا یہ دریا اردن کے دریا سے جہاں ملتا ہے اس سے تیس یا چالیس میل کے فاصلہ

پر ایک مقام ہے جس کا نام واقوصہ ہے۔ یہ مقام ایک وسیع نشیبی علاقہ میں ہے اور تین طرف پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ چونکہ یہ بہت وسیع مقام تھا اس لیے قیصر کی فوجوں نے اپنے ہیڈ کوارٹر کیلئے اسی کو منتخب کیا۔

رومی یہاں پہنچکر لشکر انداز ہو گئے۔ مسلمان دریائے یرموک کے دائیں بازو کو عبور کر کے رومیوں کے بالمقابل فروکش ہو گئے۔ اب تین طرف سے رومی پہاڑوں سے گھرے ہوئے تھے اور ان کے روبرو جو راستہ تھا اس پر اسلامی فوج قابض تھی۔ اس طرح وہ محصور ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ عمرو بن العاص نے اس قدرتی صورتِ حال پر اظہارِ مسرت کیا۔ اور مسلمانوں کو مبارکباد دی۔ اس وقت قیصرِ روم کی فوج تذارق (تھیوڈرس) کے ماتحت تھی مقدمۃ الجیش پر سرجیس دونوں بازوؤں پر باہان اور دراقص میدانِ جنگ کا انچارج تھا۔ پیشرتھا۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی نامزدگی | مسلمان اور رومی دونوں ایک دوسرے کے مقابل اسی حالت میں دو ماہ تک پڑے رہے۔ اس مدت میں معمولی جھڑپوں کے علاوہ کھل کر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق کو اس صورتِ حال کی اطلاع ہوئی تو فکر مند ہوئے اور آپ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو حکم بھیجا کہ عراق میں مثنّیٰ کو اپنا قائم مقام بنا کر فوراً شام کیلئے روانہ ہو جائیں۔

اگرچہ حضرت خالدؓ یہاں حیرہ میں مدائن پر حملہ کرنے کا خیال کر رہے تھے۔ لیکن اول تو خلیفۂ رسولؐ کا حکم اور پھر اس وقت شام کے محاذ کی اہمیت بہت زیادہ تھی اس لئے شام کیلئے روانہ ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا[1]۔

اس موقع پر بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ حضرت خالدؓ صرف لشکرِ شام کی مدد کیلئے بھیجے گئے تھے اور ان کو وہاں کی افواج کا سپہ سالارِ اعظم مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔

---

[1] مورخین کا اس میں بھی بڑا اختلاف ہے کہ شام کیلئے روانگی کے وقت حضرت خالدؓ کے ساتھ فوج کتنی تھی۔ کسی نے نو ہزار کسی نے چھ ہزار، کسی نے آٹھ سو، چھ سو یا پانچ سو تعداد بتائی ہے۔ (ابن اثیر ج ۲ ص ۲۰۹) لیکن بلاذری نے آٹھ سو سے پانچ سو تک کی تعداد لکھی ہے (ص ۱۱۶) اور ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے۔ کیونکہ شام کے محاذ پر صرف حضرت خالدؓ جیسا سپہ سالار درکار تھا۔ فوج تو ان کی کافی تھی اور مدینہ سے دستے برابر آ رہے تھے اس کے علاوہ اب جبکہ حضرت خالدؓ عراق سے جا رہے تھے ضروری تھا کہ وہاں فوج کافی تعداد میں رہے۔

کیونکہ شام کے محاذ پر کیا کچھ نہیں تھا۔ کمی تھی تو خالد ایسے سپہ سالار کی تھی اور اسی کمی کو پورا کرنے کیلئے ان کو عراق سے ہٹا کر شام جانے کا حکم ہوا تھا چنانچہ طبری میں ہے کہ اس حکم نامہ میں حضرت ابوبکرؓ کے الفاظ یہ تھے

سر حتی تاتی الجموع من المسلمین	تم روانہ ہو یہاں تک کہ یرموک میں جو مسلمان مجتمع
بالیرموک فانہم قد شجوا و اشجوا۔	ہیں ان سے ملو، کیونکہ وہ مضطرب ہیں۔

اس کے علاوہ ابو اسماعیل الازدی نے حضرت خالدؓ کے نام حضرت ابوبکرؓ کا جو خط نقل کیا ہے اس میں اس کی تصریح ہے کہ وہ جب تم وہاں پہنچ جاؤ اور لوگوں سے ملو تو پھر امیر جماعت تم ہی ہو گے[1]۔ اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ واقدی کی فتوح الشام (ص ۴۰) میں ہے۔ اسمیں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ کو تمام لشکرِ شام اور خود حضرت ابو عبیدہؓ ابن الجراح پر امیر بنا کر بھیجا تھا۔ طبری کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس اہلِ شام کا خط پہنچا جس میں مدد بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی تو اسے پڑھتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "خالد لہا" یہ معرکہ تو خالدؓ سے ہی سر ہو گا[2]۔

حضرت خالدؓ کی روانگی | اب حضرت خالدؓ عراق سے ہو کر پہلے تدمر آئے۔ جو صحرائے شام کے کنارے وادیٔ فرات سے متصل ہے اور دمشق سے ڈیڑھ سو میل دور اس کے شمال مشرق میں واقع ہے راستہ میں پانی کی قلت کے باعث بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ اس اثناء میں بعض قبائل سے مڈ بھیڑ بھی ہوئی حضرت خالدؓ ان سب کو پسپا کرتے بڑھتے چلے گئے۔ تدمر سے ثنیۃ العقاب[3] اور وہاں سے مرج راہط پہنچے جو غوطہ دمشق کے مشرق میں ہے۔ یہاں سے جنوبی سمت میں روانہ ہو کر بصری پہونچے۔

مرج راہط جو دمشق سے پندرہ میل کی مسافت پر ہے غسانیوں کا جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں حضرت خالدؓ نے جنگ کے بعد ان لوگوں کو مغلوب کیا۔ اس کے بعد بصری پہونچے تو یہاں حضرت ابوبکرؓ کے حکم کے مطابق شرحبیل بن حسنہ اور یزید بن ابی سفیانؓ اس شہر کا محاصرہ کیے پڑے تھے مگر وہ فتح نہیں ہوا تھا۔ لیکن حضرت خالدؓ نے آتے ہی اس زور کا حملہ کیا کہ رومیوں کا سپہ سالار رومانس (ROMANUS) پسپا ہو کر بصری شہر کے اندرونی حصہ میں

---

[1] فتوح الشام ص ۵۱ ج ۲ ۔ [2] طبری ج ۴ ص ۵۹۱ [3] عقاب حضرت خالدؓ نے علم کا نام تھا۔ آپ نے اس جگہ پہونچکر یہ علم نصب کیا تھا اس لیے اس جگہ کا نام ثنیۃ العقاب ہو گیا۔

گھس کر پناہ گزین ہو گیا اور شہر فتح ہو گیا ۔

واقدی نے رومانس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شخص کتب قدیمہ کا عالم تھا اور اس بنا پر اس کو معلوم تھا کہ رومیوں کا زوال ایک پیغمبر عرب کے ہاتھوں یقینی تھا اس لئے وہ مسلمان ہونا چاہتا تھا لیکن اس کی قوم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ اس کو قتل کر دینے کے درپے ہو گئے ۔ انکو جان کے ڈر سے مجبوراً رومیوں کے ساتھ حضرت خالدؓ کے مقابلہ میں آ نکلا لیکن بعد میں مسلمان ہو گیا اور اسلام کی حمایت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ۔

ابو اسمٰعیل الازدی نے بصریٰ میں رومی فوج کے سپہ سالار کا نام دربخار لکھا ہے ۔ اور رومیوں کی تعداد پانچ ہزار اور مسلمانوں کی ایک ہزار بتائی ہے ۔ اس کے علاوہ بصریٰ کی فتح سے قبل جو جنگ ہوئی اس کی تفصیل بھی لکھی ہے [۱]

معرکۂ اجنادین

بصریٰ کی فتح کے بعد حضرت خالدؓ کا ارادہ تھا کہ دمشق کی طرف پیش قدمی کریں ۔ لیکن اچانک اطلاع ملی کہ قیصر روم نے ایک لاکھ کا لشکر جرار اجنادین میں جمع کر دیا ہے اور اس کے علاوہ چونکہ عیسائی مذہب کے پیشواؤں ۔ پادریوں اور لشبیوں نے تمام ملک کا دورہ کر کے مسلمانوں کے خلاف آگ لگا دی ہے اس لیے اطراف اکناف سے بھی چھوٹے چھوٹے لشکر برابر آ رہے ہیں ، یہ خبر سن کر خالدؓ نے پہلی تدبیر یہ کی اسلامی لشکر جو مختلف حصوں میں بٹے ہوئے اور مختلف محاذوں پر تھے ان سب کے امیروں کو خط لکھا کہ اجنادین کے محاذ پر آ کر جمع ہو جائیں اس حکم کی تعمیل میں حضرت ابو عبیدہؓ اپنے چند ساتھیوں کیساتھ روانہ ہوئے تو اہل دمشق نے بڑی کی تعداد میں عقب سے آ کر حملہ کر دیا ۔ حضرت خالدؓ کو اس کا علم ہوا تو فوراً ایک لشکر لیکر موقع پر پہنچے اور رومیوں کو پسپا کر کے دمشق کی طرف جانے پر مجبور کر دیا ۔ اس سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ جس وقت اجنادین کے مقام پر پہونچے ہیں ٹھیک اسی وقت وردان جو ایک نامور رومی سپہ سالار تھا ایک لشکر جرار لیے ہوئے اجنادین پہنچ گیا لیکن دوسری طرف اس وقت تک حضرت عمرو بن العاص ۔ یزید بن ابی سفیان اور شرحبیل بن حسنہ

---

[۱] فتوح الشام ص ۷۱ ۔ ۷۲ ۔

بھی حضرت خالدؓ کی دعوت پر اپنی اپنی سپاہ کے ساتھ پہونچ چکے تھے ۔ حضرت خالدؓ نے اب پوری اسلامی فوج کا جائزہ لیا ۔ اُن کی صف بندی کی اور ایک ایک دستہ کے پاس پہونچ کر ان کو جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کی اہمیت یاد دلائی ۔ خواتین اسلام بھی اس جنگ میں شامل تھیں ۔ ان کو مردوں کی صفوں کے پیچھے کھڑا کر دیا اور فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگتا ہوا تمہارے پاس سے گزرے تو اس کو غیرت دلانا اور شرمندہ کرنا ۔

آنحضرت صلعم کا معمول تھا کہ عموماً جنگ ظہر کی نماز کے بعد شروع کرتے تھے ۔ حضرت خالدؓ نے اس اسوۂ نبیؐ پر عمل کرنے کے خیال سے نماز ظہر کے وقت تک کیلئے جنگ کو ٹالنا چاہا ۔ لیکن رومیوں نے پیش قدمی کر کے حملہ کر دیا ۔ اسلامی فوج کے میمنہ پر معاذ بن جبل اور میسرہ پر حضرت عمرؓ کے بھتیجے سعید بن زیدؓ تھے ۔ رومیوں نے اسلامی لشکر کے ان دونوں بازوؤں پر اس زور کی تیر باری کی کہ مجاہدین کے گھوڑے بدکنے لگے اور خود مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو گیا ۔ حضرت خالدؓ نے یہ رنگ دیکھا تو شہسواروں کو حکم دیا کہ حملہ کریں اور خود اس میں پیش قدمی کی ۔ حضرت خالدؓ کا حملہ کرنا تھا کہ پوری اسلامی فوج ایک سیل رواں کی طرح آگے بڑھی اور دشمنوں پر چھاگئی ۔ اب دشمن کیلئے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا ۔ حمص اور دمشق میں جا کر پناہ لی ۔ تھیوڈرس جو رومی افواج کا سپہ سالار اعظم تھا اس نے بھاگ کر حمص میں جہاں قیصر پہلے سے موجود تھا ۔ پناہ لی ۔ قیصر نے بڑی ذلت و خواری کیساتھ اس کو معزول کر دیا اور آخر اسی حالت میں وہ مر گیا ۔ ابو اسمٰعیل الازدی کے بیان کیمطابق تین ہزار رومی مارے گئے اور مسلمانوں کا بھی نقصان کافی ہوا [۱] ۔ بلاذری کا بیان ہے کہ یہ جنگ ۱۸ جمادی الاولیٰ یا ۲ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳ھ کو ہوئی ہے [۲] لیکن ابو اسمٰعیل الازدی نے لکھا ہے کہ اجنادین کی جنگ جو شام میں سب سے پہلی بڑی جنگ تھی ہفتہ کیدن ۲۸ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳ھ کو دوپہر کیوقت ہوئی

حضرت خالدؓ کا خط حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نام

فتح کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید نے عبدالرحمٰن بن حنبل الجمحی کے ہاتھ حضرت ابوبکرؓ کے نام ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ ہم میں اور مشرکوں میں [۳] جنگ ہوئی ۔ ان لوگوں نے ہمارے مقابلہ میں بڑے بڑے لشکر مقام اجنادین میں جمع کر

---

[۱] فتوح الشام از صفحہ ۸۳ تا ۹۰ ، [۲] فتوح البلدان ص ۱۲۰ [۳] اہل روم درحقیقت عیسائی تھے لیکن حضرت خالدؓ نے ان کو مشرک اس لیے کہا ہے کہ یہ لوگ اصل عیسائیت سے گمراہ ہو کر حضرت عیسیٰ (باقی بر صفحہ ۲۸۸)

رکھے تھے یہ لوگ اپنی صلیبیں اور کتابیں اٹھائے ہوئے تھے اور اس بات کی قسم کھائی تھی کہ میدان جنگ سے فرار اختیار نہیں کریں گے اور ہم کو اپنے ملک سے باہر نکال کر ہی دم لیں گے۔ ہم اللہ پر بھروسہ کرکے ان کے مقابلہ کو آگے بڑھے۔ پھر ہم نے تیروں سے کام لیا۔ اس کے بعد تلواروں کی نوبت آئی اور شمشیر کی جنگ ہوئی۔ آخر اللہ نے ہم پر اپنی مدد نازل کی اور اپنا وعدہ پورا فرمایا۔

یہ واقعہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات سے چوبیس دن پہلے کا ہے۔ آپ کو حضرت خالدؓ کا مکتوب ملا تو پڑھ کر بے حد مسرور ہوئے اور فرمایا "جمیع حمد ثابت ہے اس اللہ کے لئے جس نے مسلمانوں کی مدد اور میری آنکھیں اس مژدہ فتح سے ٹھنڈی کیں۔"

جنگ اجنادین کے بعد کیا ہوا؟ اس باب میں بھی روایات مختلف ہیں۔ ابو اسمٰعیل الازدی کا بیان ہے کہ حضرت خالدؓ نے دمشق کا رُخ کیا۔ اور فوج نے جاکر شہر کا محاصرہ کرلیا ابھی تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات ہوگئی۔ لیکن بلاذری کی روایت یہ ہے کہ اجنادین کے بعد رومیوں کا اجتماع واقوصہ (بلاذری میں یاقوصہ لکھا ہوا ہے) میں ہوا۔ حضرت خالدؓ کو اطلاع ہوئی تو واقوصہ پہونچکر جنگ کی رومی شکست کھاکر بھاگے اور شام کے بڑے بڑے شہروں میں پھیل گئے۔ بلاذری لکھتے ہیں کہ مسلمان ابھی واقوصہ میں ہی تھے کہ خلیفۂ رسولؐ کی وفات کی اطلاع ملی۔[2]

ایک بحث | جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ خلافت صدیقیؓ کے عہد میں شام میں جو فتوحات ہوئی ہیں اُن سے متعلق بڑے بڑے شدید اختلاف ہیں یہاں تک کہ خود اس میں بھی اختلاف ہے کہ یرموک کا واقعہ عہد صدیقی میں پیش آیا یا خلافت فاروقی میں؟ طبری اور ابن اثیر یرموک کے اس واقعہ کو اجنادین سے پہلے ملتے ہیں۔ لیکن ازدی۔ واقدی اور بلاذری کے ہاں سب سے بڑا معرکہ جو شام میں خلافت صدیقی میں ہوا ہے وہ اجنادین ہے۔ اور یرموک کا واقعہ ۱۵ھ میں پیش آیا ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ابن اللہ کہتے تھے اور بجائے توحید کے تثلیث کے قائل ہوگئے تھے اس لیے وہ مشرک ہوگئے تھے۔

[1] فتوح الشام الازدی ص ۸۱ [2] فتوح البلدان ص ۱۲۱

ہمارے نزدیک غالباً شکل یہ پیش آئی ہے کہ حضرت خالدؓ کی عراق سے روانگی سے قبل قیصر روم نے اپنی فوجیں مقام واقوصہ میں جو یرموک سے متصل تھا جمع کردی تھیں تاکہ یہاں ایک فیصلہ کن جنگ شام کی قسمت کا آخری فیصلہ کرے۔ اسلامی اور رومی دونوں فوجیں آمنے سامنے تقریباً دو ماہ تک پڑی رہیں۔ لیکن معمولی جھڑپوں کے علاوہ کوئی باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی۔

حضرت ابوبکرؓ صورت حال کے اس جمود سے جس کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں خطرناک ہو سکتا تھا اکتا گئے تو حضرت خالدؓ کو حکم بھیجا کہ عراق کا محاذ مثنیٰؓ کے سپرد کرکے شام کیلئے روانہ ہوجائیں وہاں تعمیل حکم میں کیا دیر ہوسکتی تھی۔ راستہ میں متعدد مقامات پر حرب و ضرب کی نوبت آئی اور حضرت خالدؓ کامیاب رہے۔ ہر ایک مقام پر کامیابی کیساتھ ان سب سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے جنوب مشرق کی سمت سے حدود شام میں داخل ہوئے۔ یہاں انہوں نے فوراً محسوس کرلیا کہ جنگی نقطۂ نظر سے واقوصہ (یا یرموک) کو میدان جنگ بنانا مناسب نہیں ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ مقام تین طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک طرف سے کھلا ہوا تھا اسی کو دیکھ کر حضرت عمروؓ بن العاص نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور فرمایا تھا کہ دشمن محصور ہوگیا ہے۔ یہ حضرت عمرو بن العاص کی ذاتی رائے تھی لیکن حضرت خالدؓ جانتے تھے کہ دشمن کو اس طرح گھیر کر علی الخصوص اس وقت جبکہ وہ بڑی شان و شوکت اور ساز و سامان کیساتھ آیا ہو جنگ کرنا دانشمندی نہیں ہے بلکہ جنگ ہمیشہ دشمن کیلئے راہ فرار رکھ کر کرنی چاہیے اس بنا پر حضرت خالدؓ نے واقوصہ کے بجائے دمشق کا رخ کیا۔ اب اسلامی فوجیں جو اس وقت تک واقوصہ میں رومیوں کا راستہ روکے بیٹھی تھیں وہاں سے ہٹیں تو رومیوں نے اجنادین میں مورچہ جما دیا اور تمام فوجیں لاکر یہاں جمع کردیں۔ حضرت خالدؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو دمشق کا ارادہ ترک کرکے اجنادین پہنچ گئے۔ اور وہاں جو کچھ ہوا تم اس کا حال پڑھ ہی آئے ہو۔ اس تقریر کی روشنی میں دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح ہوجاتی ہے کہ درحقیقت حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں یرموک میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ وہاں صرف دونوں طرف کی فوجوں کا اجتماع ہوا ہے۔ اس عہد میں سب سے بڑی جو جنگ ہوئی ہے وہ اجنادین کی ہے۔ چنانچہ طبری جو واقعۂ یرموک کو خلافت صدیقی سے منسوب کرتے ہیں انہوں نے بھی علی بن محمد کی

اسناد سے صفحہ ۱۱۶ پر لعینہ یہی بات لکھی ہے جن لوگوں نے واقوصہ میں افواج کے اجتماع کو ہی جنگ یرموک سمجھ لیا ہے انہوں نے یرموک کو اجنادین پر مقدم کیا ہے۔ لیکن جن کی نظر اصل جنگ پر ہے انہوں نے یرموک کے واقعہ کو ۱۵ھ کا واقعہ لکھا ہے [1] واللہ اعلم۔

عراق میں بغاوت

حضرت خالدؓ کے عراق سے روانہ ہو جانے کے بعد مثنیٰ بن حارثہؓ نے ادھر ادھر چھاؤنیاں قائم کر دیں اور جاسوس جگہ جگہ متعین کر دیے اور خود حیرہ میں مقیم ہو گئے۔ ایرانیوں نے میدان حضرت خالدؓ سے خالی پایا تو ان کا حوصلہ بڑھا اور ادھر کچھ دنوں تک طوائف الملوکی کے بعد شہر براز [2] بن اردشیر بن شہریار کی بادشاہت پر سب ایرانیوں کا اتفاق ہو جانے کے باعث ایران میں ایک مضبوط حکومت قائم ہو گئی تھی اس بنا پر شہنشاہ ایران نے دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ ہرمز جاذویہ کو حضرت مثنیٰ کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ اس لشکر کیساتھ ہاتھی بھی تھا جس کے ساتھ جنگ کرنا عربوں کا پہلا تجربہ تھا۔ مثنیٰ کو اس فوج کی نقل و حرکت کا علم ہوا تو مختلف چھاؤنیوں پر جو فوج منتشر تھی ان سب کو یکجا کر لیا۔ اپنے بھائی معنیٰ اور مسعود کو فوج کے دونوں بازوؤں پر مقرر کیا اور بابل میں خیمہ زن ہو گئے۔ یہاں حضرت مثنیٰ کو کسریٰ کا خط ملا جس میں اس نے بڑے گھمنڈ اور غرور کے لہجہ میں لکھا تھا کہ تم لوگوں کی طرف جو لشکر بھیج رہا ہوں یہ مرغیاں اور خنازیر

---

[1] اب جبکہ شام کی فتوحات کا باب ختم ہو رہا ہے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس باب کو لکھتے وقت جو فتوح الشام واقدی کی طرف منسوب ہے وہ بھی ہمارے پیش نظر رہی ہے اس کتاب کو سر ولیم نسو لیس (SIR WILLIAM NASS AALEES) نے جو لے اسپرنگر کے بعد ۱۸۵۴ء سے ۱۸۷۰ء تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے تھے بڑی تحقیق اور قابلیت سے ایڈٹ کیا اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس کو شائع کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہم اپنی کتاب میں اس سے کچھ زیادہ استفادہ نہیں کر سکے کیونکہ اول تو اس بات کا قطعی ثبوت نہیں کہ یہ کتاب واقدی کی ہے اگر اس کا ثبوت ہو بھی جائے تو اس میں افسانہ طرازی کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ وہ دلچسپ داستان کا کام تو دیتی ہے تاریخ کا سرمایہ نہیں بن سکتی۔

[2] اس نام کو مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے۔ شہر باذان، شہر باذ، شہر براز اور شہر یران یہ سب روایات ہیں۔

چرانے والوں کا لشکر ہے۔ اور تمہاری حیثیت یہ ہے کہ میں تمہارے مقابلہ میں اسی درجہ کے لوگ بھیجوں۔ مثنیٰ نے جواب لکھا تو یا تو باغی ہے یا کاذب ہے۔ اگر باغی ہے تو اس کا انجام تیرے حق میں برا ہوگا۔ اور ہمارے لیے اچھا۔ اور اگر کاذب ہے تو جن کاذبوں کو اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عذاب اور دنیا میں سب سے زیادہ رسوائی ہوگی وہ بادشاہ ہیں۔ اس کے بعد لکھا کہ رہی مرغیاں اور خنازیر چرانے والوں کی بات! تو معلوم ہوتا ہے کہ اب کے دیکھے تیرے پاس اسی درجہ کے لوگ رہ گئے ہیں ہم کو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

کسریٰ کو یہ جواب ملا تو بڑا گھبرایا اور بادھوا ایرانیوں کو کسریٰ کے خط کا علم ہوا تو انہوں نے ناراض ہو کر کسریٰ سے کہا کہ خدا آپ ایسا خط لکھے اور نہ اس کے جواب میں ایسی باتیں سنئے۔ آئندہ کے لئے ان لوگوں نے کسریٰ کو تاکید کی کہ اب جس کسی کو بھی وہ خط لکھے ان سے پوچھ کر لکھے۔

بابل میں دونوں لشکر آمنے سامنے صف آرا ہوئے اور جنگ شروع ہوئی۔ لیکن ہرمز کا ہاتھی جس طرف رخ کرتا تھا مسلمانوں کی فوج کے بازو پھٹ جاتے تھے۔ حضرت مثنیٰ کیلئے یہ صورت حال بڑی تشویش انگیز تھی۔ آخر انہوں نے جو مسلمان ان کے ساتھ تھے ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر کے حکم دیا کہ بیک وقت حملہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھی قتل ہو گیا اور ایرانی شکست خوردہ ہو کر بھاگے۔ مسلمانوں نے مدائن تک ان کا تعاقب کیا۔ جو ایرانی ان کے ہاتھ لگے انہیں تلوار کے گھاٹ اتار دیا ایک شاعر عبدۃ ابن الطبیب السعدی اسی واقعہ کو اشعار ذیل میں بیان کرتا ہے

حلت خویلة فی حی عهد تهم | دون المدائن فیها الدیك والفیل
یقارعون رؤس العجم ضاحیة | منهم فوارس لا عزل ولا میل

فرزدق کا بھی ایک شعر جس میں اس نے مثنیٰ کے ہاتھوں ہاتھی کے قتل ہونے کا ذکر خصوصیت کیساتھ کیا ہے۔

وبیت المثنیٰ قاتل الفیل عنوةً | ببابل اذ فی فارس ملك بابل

شہر براز کو اس شکست کی اطلاع ملی تو بیمار پڑ گیا اور چند روز کے بعد ہی مر گیا۔ اب ایرانیوں نے کسریٰ کی بیٹی دخت کو بادشاہ بنایا۔ لیکن تاج و تخت اس کے سازگار نہیں آیا جلد ہی معزول کر دی گئی اس کے بعد سابور بن شہر براز بادشاہ ہوا۔

سابور نے فرخ زاد کو وزارت کیلئے منتخب کرلیا۔ اور اس پر اس درجہ مہربان ہوا کہ کسریٰ کی بیٹی آزرمیدخت سے اس کی شادی کر دینے کا ارادہ کرلیا۔ آزرمیدخت کو اس کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئی۔ اور برملا کہا اے بھائی (ابن عم) آپ میرے ہی غلام سے میرا نکاح کرنا چاہتے ہیں"، لیکن سابور نے ذرا پروانہ کی اور آزرمیدخت کو برا بھلا کہہ کر خاموش کر دیا سیاد خش الرازی نام کا ایک بڑا مشہور جملہ باز ایرانی تھا۔ آزرمیدخت نے اس سے ساز باز کرلی۔ چنانچہ شب عروسی میں جب فرخ زاد۔ آزرمیدخت کے کمرہ میں داخل ہوا تو سیاد خش نے اچانک کمین گاہ سے نکل کر حملہ کر دیا اور فرخ زاد کو موت کے گھاٹ اتار دیا اس کے بعد سیاد خش آزرمیدخت اور ان کے ساتھیوں نے سابور کے محل میں گھس کر اُسے قتل کیا اور اس کی جگہ آزرمیدخت کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔

حضرت مثنیٰ کو اس افراتفری اور طوائف الملوکی کی خبریں پہنچیں تو اطمینان ہوا تاہم اگر آج یہ حالت تھی تو ضروری نہیں کہ کل بھی یہی رہے گی۔ اس لیے اس موقع کو غنیمت جان کر انہوں نے اپنی فوج کے ساتھ پیش قدمی شروع کر دی اور مدائن جو ایران کا دارالسلطنت تھا اس کے دروازوں تک پہنچ گئے۔ لیکن ان کے پاس جو فوج تھی وہ مدائن فتح کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ کو خط پر خط لکھے کہ کمک روانہ فرما دیں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ اس وقت کیا کر سکتے تھے۔ پورا اسلامی لشکر تو شام کے محاذ پر کارزار تھا اس لیے بارگاہ خلافت کی طرف سے کوئی جواب نہیں گیا۔ حضرت مثنیٰ کو اس خاموشی سے تشویش ہوئی اور وہ خود مدینہ پہنچ گئے۔ یہاں دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ سخت علیل ہیں اور صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس کے باوجود مثنیٰ کو شرف باریابی عطا فرمایا۔ عراق کے محاذ کی پوری روئیداد سنی اور فوراً حضرت عمرؓ کو طلب فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ اس وقت حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین منتخب فرما چکے تھے۔ اب حضرت عمرؓ آئے تو ارشاد ہوا۔ اے عمرؓ! جو کچھ میں کہتا ہوں تم اس کو سنو اور اس پر عمل بھی کرو۔ میں خیال کرتا ہوں کہ میں آج دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اگر واقعی ایسا ہو تو تم شام ہونے سے پہلے پہلے لوگوں کو مثنیٰ کے ساتھ روانہ کر دو۔ اور اگر میں نے شام پکڑ لی تو تم صبح ہونے سے پہلے ایسا

کر گزرو۔ اس کے بعد تاکید کی کہ کوئی مصیبت خواہ کتنی ہی بڑی ہو۔ بہر حال تم کو دین کے کام اور حکم خداوندی کی بجاآوری سے باز نہ رکھے۔ پھر خود حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علین وفات کے دن بیعت خلافت کے بارے میں جو کچھ کیا تھا اسے یاد دلایا۔ اور آخر میں وصیت کی کہ شام کا معرکہ سر ہو جائے تو خالدؓ کو پھر عراق واپس بلالینا [1]

اس کے بعد عراق میں جو فتوحات ہوئیں ان کا تعلق حضرت عمرؓ کے عہد خلافت سے ہے اس لیے وہ اس کتاب کے دائرہ بحث سے خالی ہے یا خارج ہے۔

فتوحات کے اسباب

عراق اور شام کی فتوحات کا حال پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر تاریخ کے ایک طالبعلم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا چاہیے کہ ایرانی اور رومی یہ دونوں اس عہد کی نہایت عظیم الشان اور ترقی یافتہ سلطنتیں تھیں۔ مال و دولت۔ جاہ و حشم۔ فوج و سپاہ۔ ان چیزوں کے اعتبار سے مسلمانوں کو ان دونوں حکومتوں کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ شام کے معرکہ میں تم نے پڑھا ہے کہ مسلمان افواج کی کل تعداد مل ملا کر چالیس ہزار تھی اور اسکے مقابلہ میں کم و بیش دو لاکھ انسانوں کا پہاڑ تھا جو ان کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر آلات حرب کے اعتبار سے دونوں میں یہ فرق تھا کہ ایک ایک ایرانی اور رومی فوجی خود۔ زرہ۔ مکبتر۔ جلیت۔ جوشن چار آئینہ۔ آہنی دستانے۔ موزے۔ جہلم۔ برگستوان۔ گوپال۔ گرز۔ تیغ۔ سپر۔ درقہ۔ خنجر ژوبین۔ تیر۔ خدنگ۔ کمند۔ سنان وغیرہ سے آراستہ ہوتا تھا۔ ان تمام آلات و اسلحۂ جنگ کی تفصیل فردوسی کے شاہنامہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا کیا حال تھا۔ اُن کے پاس زرہ ہوتی تھی وہ بھی چمڑے کی۔ رکاب لوہے کے بجائے لکڑی کے ہوتے تھے۔ آلات حرب میں عرب تلوار نیزہ اور چھوٹے چھوٹے خنجر کے علاوہ کسی اور چیز کو جانتے تک نہیں تھے۔ گھوڑے تھے لیکن اکثروں کے گھوڑوں کو زین تک میسر نہیں تھی۔ پس جب ان حکومتوں کے جاہ و جلال۔ تہذیب و تمدن۔

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۶۔

نظم و ترتیب اور ترقی و وسعت کا یہ عالم تھا تو پھر یہ کس طرح ممکن ہوا کہ چند ہزار بے سروسامان صحرا نشینوں نے ریگستان عرب سے نکل کر دونوں حکومتوں کا تختہ الٹ دیا ہے کہ قیصر و کسریٰ کے قصرِ عظمت و جلال میں خاک اڑنے لگی۔ ان کے صحیفۂ اقتدار و حکومت کا ورق ورق پریشان ہو گیا۔ اور وہ بھی صرف چند مہینوں کی مدت میں [1]

مغربی مصنفین کے نزدیک ان فتوحات کے اسباب

مغربی مصنفین نے اپنے مذاق کے مطابق اس سوال کے جو مختلف جوابات دیئے ہیں ان کا خلاصہ ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں ۔

وان کریمر لکھتا ہے :-

"عرب اور عراق و شام کی سرحدوں پر جو عرب قبائل آباد تھے انہوں نے اپنا فائدہ اس میں دیکھا کہ وہ اپنے حلیف و سرپرست حکومتوں سے تعلق منقطع کر کے اپنے ہم قوم عربوں کے ساتھ مل کر ان کا مذہب قبول کر لیں اور اس طرح مال غنیمت میں ان کے شریک ہو جائیں اس طرح مدینہ کا چھوٹا سا لشکر جو عراق و شام میں گھس آیا تھا۔ یک بیک ایک کوہِ آتش فشاں بن گیا اور اس کے راستہ میں جو رکاوٹیں تھیں ان کو پارہ پارہ کر دیا [2]

ول ڈورنٹ (WILL DURANT) لکھتا ہے ۔

عربوں کی فتوحات کے اسباب بہت سارے ہیں۔ ان کا اقتصادی سبب ہیں۔ پیغمبر اسلام سے ایک صدی پہلے عربوں کا نظام آبپاشی بہت خراب ہو گیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے پیداوار بہت کم ہو گئی تھی اس لیے ان میں عراق و شام کی سرسبز زمینوں کو فتح کرنے کا جذبہ پیدا ہوا ۔ اس کے علاوہ سیاسی سبب یہ تھا کہ رومی اور ایرانی دو حکومتیں اپنی باہمی جنگوں کے باعث تباہ و برباد ہو گئی تھیں ۔

---

[1] فتوحات کی تکمیل اگرچہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ہوئی ہے ۔ جس میں کئی برس لگے ۔ لیکن درحقیقت ایران و روم کو ضرب کاری حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہی لگ چکی تھی جس سے ان کا پنپنا آسان نہیں تھا ۔

[2] THE ORIENT UNDER THE CALIPHS - P. 97 -

نظم و نسق حکومت اور امن و امان مفقود تھے۔ لیکن اس کے باوجود مملکت میں بھاری بھاری ٹیکس لگے ہوئے تھے ۔ پھر جو نسلی تعلقات حجاز کے اور شام و عراق کی سرحدوں پر آباد قبائل کے درمیان تھے ان کا بھی اس میں بڑا دخل تھا ان پر مزید یہ ہوا بازنطینیوں نے ۔ موحدین ۔ نسطوری اور دوسرے فرقوں کے ساتھ تعصب اور تشدد کی جس پالیسی پر عمل کیا تھا اس کی وجہ سے شام کی ایک بہت بڑی اقلیت تھی جو ان سے بیزار تھی ۔ یہ بیزاری صرف شہری باشندوں میں نہیں تھی بلکہ شاہی فوج کے دستے تک اس سے متاثر تھے ۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان کے لیڈر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار پیرو تھے ۔ جتنا وہ لڑتے تھے اس سے زیادہ دعائیں کرتے تھے ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مقدس جنگ میں جو مارا جاتا ہے اس پر جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ عرب مسلمان اخلاقی اعتبار سے بھی بہت بلند تھے ۔ مسیحی اخلاق اور عقیدہ تثلیث نے مشرق قریب میں جنگ کیلئے وہ آمادگی اور مستعدی باقی نہیں رکھی تھی جو اسلام کی تعلیمات اور عربوں کے جوہر فطری کا خاصہ تھی عرب فوجیں ڈسپلن اور جفاکشی میں ممتاز تھیں اور ان کے قائد بڑے قابل اور لائق تھے یہ لوگ بھوکے پیٹ جنگ کر سکتے تھے ۔ لیکن یہ وحشی نہیں تھے [1] پروفیسر فلنلی اور ویچ (PROF: FLEULEY, WEECH) لکھتے ہیں ۔

"ایک نئے مذہب (اسلام) نے عربوں میں باہمی اتحاد، جذبہ، قیادت اور فتوحات کیلئے ایک زبردست محرک پیدا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ان فتوحات کے کچھ اور بھی اسباب ہیں مثلاً شام کے عربوں کا حجاز کے عربوں کے ساتھ نسلی تعلق اور عین اس وقت جبکہ عرب پھیل جانے کیلئے تیار کھڑے تھے مشرقی رومی سلطنت اور ایرانی حکومت کا مسلسل باہمی جنگوں کی وجہ سے شکستہ حال ہو جانا مشرقی رومی سلطنت نے اپنے دشمن دیرینہ ایران کو شکست فاش ضروری تھی ۔

---

[1] THE AGE OF FAITH P. 188 -

لیکن اس کا بہت بڑا خمیازہ اس صورت میں بھگتنا پڑا کہ خود رومی سلطنت میں مذہبی اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے علاوہ عرب بڑے بہادر، جنگ آزمودہ اور جفاکش زندگی کے عادی تھے "[1]

عہدِ حاضر کا مشہور مصنف ایچ۔ جی۔ ویلز لکھتا ہے

"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اسلام کا سیلاب۔ ایرانی۔ رومی۔ یونانی یا مصری بہتر تہذیب کو بہا کر لے گیا تو تم جس قدر جلد اس غلط خیال کو دماغ سے نکال دو اتنا ہی اچھا ہے اسلام کو جو غلبہ اور اقتدار حاصل ہوا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس زمانہ کا ایک بہترین معاشرتی اور سیاسی نظام تھا۔ اسلام جہاں کہیں پہنچا اس کو ایسے لوگ نظر آئے جو سیاسی اعتبار سے اپنی حکومتوں سے نفرت رکھتے تھے۔ یہ لوگ لٹے کھسٹے تھے۔ مظلوم و پامال تھے۔ احمق بنائے ہوئے تھے۔ غیر تعلیم یافتہ اور غیر منظم تھے اور جن کی خود غرض اور فاسد حکومتیں ان کیساتھ کوئی رابطہ و تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ اسلام وسیع ترین۔ تازہ ترین اور سب سے زیادہ صاف ستھرا اور پاکیزہ سیاسی فکر تھا جو دنیا میں آیا اور جس نے پوری انسانیت کو ایسا بہتر نظام دیا جو آج تک کسی نے نہیں دیا تھا۔ رومی شہنشاہیت کا سرمایہ دارانہ اور غلام ساز نظام۔ اور یورپ لٹریچر، کلچر اور اس کی سوشل روایات یہ سب کے سب اسلام کے عروج و ارتقاء کے سامنے شکست کھا کر پارہ پارہ ہو گئے۔ [2]

پروفیسر فلپ۔ کے۔ ہٹی لکھتے ہیں۔

"اسلام کا نعرۂ جنگ بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ دنیا کی بعد عظیم جنگوں میں نعرۂ جنگ جمہوریت تھا۔ اس کے علاوہ اسلام نے ان قبائل میں اتحاد پیدا کر دیا تھا جو اب سے پہلے کبھی متحد نہیں ہوئے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کا یہ جوش اور ولولہ بڑی حد تک اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اس کے نتیجہ میں حصولِ جنت کے جذبہ پر مبنی تھا

---

[1] ورلڈ ہسٹری [2] HISTORY OF THE WORLD P 329 (بقیہ صفحہ ۲۹۷)

تاہم ہلالِ خصیب کی سرسبز زمین کے عیش و آرام سے لطف اندوز ہونے کی خواہش بھی بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھی اور ان کے جذبۂ جہاد کی محرک تھی [1]

فتوحات کے اصل اسباب مغربی مصنفین نے مذکورہ بالا سطور میں جو کچھ لکھا ہے اگرچہ وہ سب صحیح نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ صداقت سے بالکل دور بھی نہیں ہے مسلمان مصنفین اور خاص کر وہ حضرات جو قدیم طرزِ تعلیم کے حامل ہیں ان کا خاصہ ہے کہ اگر کوئی مغربی مصنف مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی میں کسی اقتصادی اور معاشی وجہ کو دخیل مانتا ہے تو وہ چڑ سے جاتے ہیں حالانکہ خود صحابہ کے طرزِ عمل سے ثابت ہے کہ نوآبادکاری میں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل ہونے میں اقتصادی وجوہ کو بڑا دخل ہوتا تھا۔

چنانچہ جنگ ولجہ کے موقع پر حضرت خالدؓ نے جو تقریر کی تھی اس کے متعلق طبری کے الفاظ یہ ہیں۔

وقام خالد فی الناس خطیباً	حضرت خالد لوگوں کو خطبہ دینے کیلئے کھڑے
یرغبھم فی بلادِ العجم و	ہوئے تو انہوں نے لوگوں کو بلاد عجم کی طرف رغبت
یزھدھم فی بلادِ العرب۔	دلائی اور بلاد عرب کی طرف سے ان میں بے رغبتی پیدا کی۔

آپ نے عراق کی سرسبزی و شادابی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کیا تم نہیں دیکھتے۔ یہاں مٹی کے تودوں کی طرح کھانے کے انبار لگے ہوئے ہیں! خدا کی قسم! اگر جنگ سے ہمارا مقصد اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا اور لوگوں کو اس کے دین کی طرف بلانا نہ ہوتا۔ اور صرف معاش ہوتا تب بھی صائب رائے کی بات یہی ہوتی کہ ہم ان سرسبز و شاداب علاقوں کیلئے جنگ کرتے۔ تاکہ ہم ان کے مالک بن جاتے اور بھوک اور قلت طعام اُن لوگوں کیلئے چھوڑ دیتے جو سستی اور کاہلی کی وجہ سے تمہاری جدوجہد میں تمہارے شریک نہیں ہیں" [2]

---

[1] HISTORY OF SYRIA PAGE 419 مغربی مصنفین کے جو حوالے اوپر گزرے ہیں ان کو ڈاکٹر محی الدین نے اپنی قابل قدر کتاب "عالم عرب" میں جو انگریزی زبان میں ہے اور جس کو فیروز سنز لاہور نے شائع کیا ہے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ ہم نے یہ حوالے اختصار کیساتھ اسی کتاب سے اخذ کیے ہیں

[2] طبری ج ۲ ص ۵۵۰۔

اسی طرح ایک مرتبہ جریر بن عبداللہ البجلی اپنے قبیلے کے سات سو آدمیوں کو لیکر حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم سب لوگ شام میں آباد ہونا چاہتے ہیں جہاں ہمارے آباؤ اجداد پہلے سے موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا نہ تم لوگ شام میں آباد ہو کر کیا کرو گے۔ اللہ نے اس کی شان و شوکت کم کر دی ہے۔ ہاں البتہ عراق جاؤ اہل عراق اور اس قوم سے جہاد کرو جو زندگی کی تمام راہوں پر خود قابض ہو کر بیٹھ گئے ہیں، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو انصاف پسندی سے عراق کے اسباب معیشت میں تم کو بھی ان لوگوں کا شریک بنا دے اور تم بھی اس کے ساتھ ساتھ زندگی بسر کر سکو۔[۱]

اس کے علاوہ اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ میں ایران اور روم دونوں کی اخلاقی حالت انتہا درجہ سقیم اور زبوں تھی۔ حکمران طبقہ عوام پر ظلم و ستم کرتا اپنے عیش و آرام کیلئے ان پر بھاری بھاری ٹیکس لگانا اپنا موروثی اور طبعی حق سمجھتا تھا۔ ایران میں مزدک کی تعلیم نے اور شام میں عیسائیت کی محرف شکل اور مذہبی پیشواؤں کی اقتدار پسندی نے ملک بھر میں منکرات و فواحش کو عام کر دیا تھا اور اس کے بالمقابل ہر ہر مسلمان عرب اخلاق و مکارم کا نمونہ تھا اس بنا پر بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے قانون فطرت کے مطابق مسلمانوں کے سامنے ان دونوں کا شکست کھانا یقینی امر تھا قرآن مجید میں ہے

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۔ فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۔ ہر قوم کی ایک مدت ہوتی ہے جب وہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو پھر ذرا ایک گھڑی آگے ہوتی ہے نہ پیچھے

ان اقتصادی اور اخلاقی اسباب کے علاوہ جہاں تک مادی اسباب کا تعلق ہے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ ان فتوحات میں حضرت خالد بن الولید کی غیر معمولی شجاعت و بسالت۔ حیرت انگیز فوجی تدبر اور جنگی فراست و دور اندیشی کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ تم پڑھ آئے ہو کہ واقوصہ میں مسلمان اور رومی فوجیں کم و بیش تین ماہ تک ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں اور معمولی جھڑپوں کے علاوہ کسی طرف سے بھی کوئی بڑا اقدام نہیں ہوا۔ لیکن حضرت خالدؓ نے پہنچتے

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۶۴۷ ذکر واقعۃ البویب۔

ہی میدان کارزار کا نقشہ بدل دیا اور کل چھیالیس ہزار فوج سے دو لاکھ سے زائد رومیوں کی صفیں اُلٹ کر رکھ دیں۔

یہ جو کچھ کہا گیا اپنی جگہ سب مسلّم اور درست ہے۔ لیکن درحقیقت فتوحات کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی جنگ اللہ کیلئے۔ اور ایک اعلیٰ ترین مقصد حیات کی تکمیل کی غرض سے تھی۔ اس بنا پر جو بے نفسی، بے غرضی، اور مخلصانہ جوش اور ولولہ ان میں ہو سکتا تھا کسی اور میں نہ تھا۔ پھر قرآن مجید کی آیات اور آنحضرتؐ کے ارشادات جو عراق و شام کی فتوحات سے متعلق تھے ان سب نے مسلمانوں میں اسد درجہ یقین و اطمینان اور اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ بڑے سے بڑے خطرات میں بھی محصور ہو کر گھبراتے نہیں تھے لیک انسان کو سب سے زیادہ خوف موت کا ہو سکتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے عقیدہ میں یہ موت جو اللہ کے راستہ میں آئے موت نہیں بلکہ عین حیات اور اصل زندگی تھی۔ پھر فطرتاً و طبعاً جو جفا کشی۔ سخت کوشی اور مصائب میں نہ گھبرانے کا ملکہ عربوں میں تھا۔ ایران اور روم کے خوش عیش سپاہیوں سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

مرض الموت اور وفات

اتوار کا دن تھا جمادی الآخری ۱۳ھ کی ساتویں تاریخ تھی، اس روز سردی شدید تھی حضرت ابوبکرؓ نے غسل کیا اور اس کے بعد ہی بخار ہو گیا جو وفات کے روز تک مسلسل پندرہ دن چڑھا رہا۔ ہر چند معالجہ کیا گیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لوگ حضرت ابوبکرؓ سے دریافت کرتے تھے کہ آپ نے طبیب کو بھی دکھایا؟ فرماتے وہاں اس نے مجھ کو دیکھا ہے،، پھر پوچھتے وہ کیا کہتا ہے،، جواب دیتے وہ کہتا ہے کہ ”افعل ما اشاء،، جو میں چاہتا ہوں کرتا ہوں۔ ضعف اتنا شدید ہو گیا کہ باہر نماز کیلئے بھی نہیں جا سکتے تھے تو حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ نماز پڑھائیں۔

بعض روایتوں میں مرض کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ حارث بن کلدہ کیساتھ حضرت

ابوبکرؓ کو ایک یہودی نے چاول میں زہر ملا کر کھلا دیا تھا۔ یہ سال بھر کے بعد اس زہر کا اثر تھا لے حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ دراصل حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کا غم اس قدر شدید ہوا تھا کہ وہ اندر ہی اندر گھلتے اور پگھلتے رہے اُن کو اس سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوا۔ تمام صحابہ کرام کو اس سے سخت تشویش تھی۔ عیادت کیلئے آتے رہتے تھے۔ لیکن چونکہ حضرت عثمانؓ پڑوس میں ہی رہتے تھے اس لیے صحابہ میں سب سے زیادہ تیمارداری کا شرف انہیں کو حاصل ہوا۔ ۲ے

جانشینی کے لیے مشورہ

لیکن بیماری کی اس شدت کے باوجود کیا مجال تھی کہ امورِ خلافت و امامت اور مسلمانوں کے اہم معاملات کی طرف سے بے توجہی برتی جاتی۔ اس وقت سب سے اہم معاملہ آپ کی جانشینی تھا۔ آپ کے سامنے وقت کا اہم سوال تھا کہ اگر خود کسی کی نامزدگی نہیں کرتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ نہ معلوم لوگ کس کو نامزد کریں تو کس کی ہو۔ ایک سے بڑھ کر معدن اسلام کا لعل و گوہر تھا۔ اگرچہ آپ کا ذاتی رجحان حضرت عمرؓ کی طرف تھا۔ لیکن اکابر صحابہ سے مشورہ کیے اور ان کی رائے معلوم کیے بغیر اس کا اعلان نہیں کر سکتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آئے تو ان سے یہ گفتگو ہوئی۔

حضرت ابوبکرؓ :۔ عمرؓ کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے ؟

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ :۔ آپ مجھ سے ایک ایسی بات پوچھتے ہیں جس کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

ابوبکرؓ :۔ پھر بھی آخر تمہاری رائے بھی تو معلوم ہو۔

عبدالرحمٰنؓ :۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ وہ بہترین آدمی ہیں۔ لیکن مزاج میں سختی اور تشدد ہے۔

ابوبکرؓ :۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مجھ کو نرم دیکھتے ہیں جب انکو خلافت مل جائے گی تو وہ خود سختی چھوڑ دیں گے۔

اس کے بعد حضرت عثمان بن عفانؓ آئے تو ان سے گفتگو اس طرح ہوئی۔

لے طبری ج ۲ ص ۶۱۱   ۲ے طبری ۶۱۲۔

ابوبکرؓ :۔ عمرؓ کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے ؟

عثمانؓ :۔ اس بات کو آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

ابوبکرؓ :۔ اے ابوعبداللہ! میں تم سے تمہاری اپنی رائے پوچھتا ہوں مجھ کو بتاؤ۔

عثمانؓ :۔ مجھ کو اتنی بات معلوم ہے کہ عمرؓ کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور ان جیسا ہم میں کوئی نہیں ہے۔

پھر حضرت اسید بن حضیر آئے اور ان سے اُن کی رائے دریافت کی تو انہوں نے جواب دیا "میں آپ کے بعد عمرؓ کو بہترین آدمی سمجھتا ہوں، وہ خوش ہونے کی باتوں میں خوش اور ناخوش ہونے کی باتوں پر ناراض ہوتے ہیں۔ ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہتر ہے آپ کے بعد خلافت کا مستحق ان سے زیادہ قوی اور مضبوط دوسرا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

ان کے علاوہ سعید بن زید اور اکابر مہاجرین و انصار سے بھی آپ نے مشورہ کیا اور سب نے حضرت عمرؓ کے حق میں رائے دی لیکن باہر لوگوں میں اس کا چرچا ہوا کہ حضرت عمرؓ خلیفہ ہونے والے ہیں تو طلحہ بن عبداللہؓ آئے اور بولے "اے ابوبکرؓ! آپ کو معلوم ہے کہ عمرؓ کے مزاج میں کس قدر تشدد اور سختی ہے اس کے باوجود آپ ان کو اپنا جانشین نامزد کر رہے ہیں تو کل اپنے پروردگار کو جب وہ آپ سے بازپرس کرے گا کیا جواب دیں گے۔"

حضرت ابوبکرؓ لیٹے ہوئے تھے۔ طلحہ کی زبان سے یہ بات سن کر آپ کو طیش آ گیا بولے "ذرا مجھ کو بٹھا دو"، لوگوں نے بٹھا دیا تو فرمایا "کیا تم مجھ کو میرے پروردگار سے ڈراتے ہو؟ میں جب اپنے رب سے ملوں گا اور وہ مجھ سے سوال کرے گا تو میں کہوں گا اے خدا! میں نے تیرے بندوں پر ایک تیرے بہترین بندہ کو خلیفہ مقرر کیا ہے۔" لے

حضرت عمرؓ کی نامزدگی

جب سب لوگ چلے گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا حضرت عمرؓ کی جانشینی کا پروانہ لکھیں، وہ قلم دوات لیکر بیٹھے تو حضرت نے کہا لکھو۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما عھد ابوبکر بن ابی قحافۃ الی المسلمین۔

لے ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۲

امابعد ۔ یہیں تک بولنے پائے تھے کہ غشی طاری ہوگئی۔ حضرت عثمانؓ کو پہلے سے معلوم تو تھا ہی۔ انہوں نے اس خیال سے کہ اگر اسی بے ہوشی کے عالم میں حضرت ابوبکرؓ کی وفات ہوگئی اور یہ پروانہ یونہی ناکمل رہا تو کہیں ملک میں کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو جائے اما بعد کے بعد از خود استخلف علیکم عمر بن الخطاب ولم آل لکم خیرًا - (میں نے تم پر عمر بن الخطاب کو خلیفہ بنادیا ہے۔ اور میں نے اس معاملہ میں تمہاری خیر خواہی میں کوئی کوتاہی نہیں کی) کی عبارت لکھ دی۔ اب حضرت ابوبکرؓ کو غشی سے افاقہ ہوا اور حضرت عثمانؓ نے ان کو یہ عبارت پڑھ کر سنائی تو حضرت ابوبکرؓ نے خوشی میں اللہ اکبر کہا اور حضرت عثمان کو دعا دی۔ پھر حضرت عثمانؓ کو ہی حکم ہوا کہ لوگوں کو سنادیں۔ حضرت عثمان کی دعوت پر سب جمع ہوگئے۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ایک خاص غلام کے ہاتھ یہ پروانہ بھیجا۔ حضرت عمرؓ بھی ساتھ تھے مجمع میں شور و غل تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر کہ مسلمانو! خلیفہ رسول کا ارشاد سنو مجمع کو خاموش کردیا تو حضرت عثمان نے پروانہ پڑھ کر سنایا۔ سب نے بطیب خاطر اسے قبول کیا اتنے میں خود حضرت ابوبکرؓ بالا خانہ پر تشریف لے آئے۔ اور پوچھا دوستو! میں نے تم پر جس کو خلیفہ مقرر کیا ہے وہ میرا عزیز قریب نہیں بلکہ عمرؓ ہیں۔ تم ان کو قبول کرتے ہو؟ سب نے بیک آواز کہا "سمعنا واطعنا"

حضرت عمرؓ کو وصایا و نصائح اس سے فارغ ہو کر حضرت عمرؓ کو بلایا اور فرمایا میں نے تم کو رسول اللہؐ کے اصحاب پر خلیفہ مقرر کیا ہے اس کے بعد ان کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی وصیت کی اور پھر حسب ذیل تقریر کی جو فصاحت و بلاغت، جوشِ خطابت اور علم و حکمت کا گنجینہ ہے اس لیے ہم اصل تقریر مع ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

يا عمر ان لله حقًا بالليل لا يقبله في النهار وحقًا في النهار لا يقبله بالليل وانه لا يقبل نافلة حتى تؤدي الفريضة الم تر يا عمر انما ثقلت موازين من ثقلت موازينه

اے عمرؓ! یقین جانو کہ اللہ کا جو حق شب میں ہے وہ اس کو دن میں قبول نہیں کرے گا اور جو حق دن سے متعلق ہے اللہ اس کو شب میں قبول نہیں کرے گا (یعنی ہر عمل اس کے وقت پر کرنا چاہیے) اور اللہ نفل اس وقت تک

يوم القيامة باتباعهم الحق وثقله عليهم، وحق الميزان ان لا يوضع فيه غدًا الا حق ان يكون ثقيلا، الم تر يا عمر انما خفت موازين من خفت موازينه يوم القيامة باتباعهم الباطل؟ وخفته عليهم وحق للميزان ان لا يوضع فيه الا باطل ان يكون خفيفًا الم تر يا عمر انما نزلت الرخاء مع الشدة وآية الشدة مع الرخاء ليكون المؤمن راغبًا راهبًا لا يرغب رغبة يتمنى فيها على الله ما ليس له ولا يرهب رهبة يلقى فيها بيديه الم تر يا عمر انما ذكر الله اهل النار باسوأ اعمالهم فاذا ذكرتهم قلت اني لارجو ان لا اكون منهم، وانه انما ذكر اهل الجنة باحسن اعمالهم لانه تجاوز لهم عما كان من شيء فاذا ذكرتهم قلت اين عملي من اعمالهم؟ فان حفظت وصيتي فلا يكون غائب احب اليك من حاضر من الموت ولست تعجزه۔[1]

نہیں کرے گا جب تک تم فرض ادا نہ کرو۔ اے عمرؓ! کیا تم نہیں دیکھتے کہ دراصل ترازو ان ہی لوگوں کی بھاری ہے جنکی ترازو قیامت کے دن حق کی پیروی کرنے کی وجہ سے بھاری ہو۔ اور حق بھی یہی ہے کہ کل قیامت کے دن جس ترازو میں حق کے سوا کچھ اور نہ ہو اس کو ہی بھاری ہونا چاہیے اس کے برعکس اتباع باطل کی وجہ سے جن لوگوں کی ترازو قیامت کے دن ہلکی ہوگی ان کی ترازو ہلکی ہوگی اور جس ترازو میں باطل کے سوا کچھ اور نہ ہو اس کو ہلکا ہی ہونا چاہیے اے عمرؓ! کیا تم نہیں دیکھتے کہ دنیا میں تنگی اور فراخی کی آیات ایک ساتھ اتری ہیں تاکہ مومن میں خوف بھی ہو اور رجا بھی مگر ہاں مومن کو اللہ سے ایسی ہی چیز کی تمنا اور اس کی رغبت کرنی چاہیے جو اس کا حق ہو اور اسی طرح اس کو ایسا خوف نہیں کرنا چاہیے کہ پھر وہ خود کو اپنے ہاتھوں اس میں واقع ہو جائے (یعنی آدمی خوف کرے تو اسے چاہیے کہ اس سبب بچے بھی) اے عمرؓ! کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے اہل دوزخ کا ذکر انکے بدترین اعمال کیساتھ کیا ہے جب تم انکو یاد کروگے تو کہو گے میں امید کرتا ہوں کہ میں ان میں سے نہیں ہوں گا۔ اللہ نے اہل جنت کا ذکر انکے بہترین اعمال کیساتھ کیا ہے کیونکہ ان کے جو برے اعمال تھے اللہ نے ان سے درگزر فرمایا جب تم ان لوگوں کو یاد کروگے تو کہوگے میرا عمل ان جیسا کہاں ہے اگر تم نے میری وصیت یاد رکھی تو ایسا غائب جو تم کو حاضر کی نسبت زیادہ محبوب ہو موت کے سوا اور کچھ نہ ہوگا یعنی موت تم کو سب سے زیادہ محبوب ہوگی در آں حالیکہ تم موت کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۲ - ۲۹۳ -

حضرت مثنیٰ جب عراق سے مزید امدادی فوج طلب کرنے کی غرض سے مدینہ آئے تو حضرت ابوبکرؓ
اس وقت تک حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کر چکے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مثنیٰ کی طلب پر حضرت
عمرؓ سے درخواست کی کہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر عراق مزید فوج بھیجنے کا بندوبست کیا جائے۔

ذاتی معاملات کی طرف توجہ: قوم وملت کے ان مسائل سے فارغ ہو چکنے کے بعد ذاتی اور خانگی امور و معاملات
کی طرف توجہ فرمائی۔ آپ نے حضرت عائشہؓ کو ایک جاگیر دی تھی۔ اب خیال آیا کہ اس سے دوسرے
وارثوں کی حق تلفی ہوگی اس لئے فرمایا "بیٹی! امیری اور غریبی دونوں حالتوں میں تم مجھ کو سب سے
زیادہ عزیز رہی ہو۔ میں نے تم کو جو جاگیر دی تھی کیا تم اس میں اپنے بھائی بہنوں کو شریک کر سکتی ہو؟
حضرت عائشہ نے اس کو بخوشی کر لیا۔

اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ پوچھا "مجھ کو (خلیفہ ہونے کے بعد سے) اب تک بیت المال میں سے
کل وظیفہ کتنا ملا ہے؟ حساب کر کے بتایا گیا "چھ ہزار درہم" (ہندوستانی سکہ کے حساب سے کم و بیش
ڈیڑھ ہزار روپیہ) حکم فرمایا کہ میری فلاں زمین فروخت کر کے یہ روپیہ بیت المال کو واپس کر دیا
جائے۔ پھر دریافت کیا "میرے مال میں بیعت کے بعد سے کتنا اضافہ ہوا؟" پتہ چلا کہ
(۱) ایک حبشی غلام جو بچوں کو کھلاتا ہے مگر ساتھ ہی مسلمانوں کی تلواروں پر صیقل کرتا ہے
(۲) ایک اونٹنی جس پر پانی لایا جاتا ہے اور (۳) ایک چادر جو سوا روپیہ کے لگ بھگ دام کی ہوگی
ارشاد ہوا کہ یہ تینوں چیزیں وفات کے بعد خلیفۂ وقت کی خدمت میں بھیج دی جائیں۔ اس حکم
کی تعمیل میں جب یہ چیزیں حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہونچیں تو بیساختہ جی امنڈ آیا۔
روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے "اے ابوبکرؓ! تم اپنے جانشینوں کیلئے کام
بہت دشوار چھوڑ گئے"[1]

معیقیب دوسی ابوبکرؓ کے گھر کے منتظم تھے وہ خود بیان کرتے ہیں: حضرت ابوبکرؓ کے
مرض وفات میں حاضر ہوا تو میں نے سلام کیا اس وقت حضرت ابوبکرؓ استخلاف کے معاملہ
میں مصروف تھے۔ اس سے فارغ ہو گئے تو مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا "اے معیقیب
تم ہمارے گھر کے منتظم تھے۔ بتاؤ میرا اور تمہارا کیا حساب ہے؟ میں نے عرض کیا "میرے

[1] طبقات ابن سعد قسم اول ج ۳ ص ۱۳۹

پچیس درہم آپ کے ذمہ باقی ہیں وہ میں نے آپ کو معاف کئے" فرمایا "چپ رہو اور میرے توشہ
آخرت کو قرض سے مت تیار کرو" یہ سن کر میں رونے لگا۔ صدیق اکبر نے فرمایا "معیقیب!
آنسو نہ بہاؤ اور گھبراؤ نہیں۔ صبر کرو میں امید کرتا ہوں کہ میں اس جگہ جا رہا ہوں جو میرے لیے
بہتر اور پائیدار رہے گی" اس کے بعد عائشہ صدیقہ کو بلا کر حکم دیا کہ مجھ کو پچیس درہم ادا کر دیئے جائیں[1]

تجہیز و تکفین کے متعلق وصیت: حضرت عائشہ سے پوچھا کہ رسول اللہ کو کتنے کپڑوں میں کفنایا گیا تھا؟
بولیں "تین کپڑوں میں" حضرت ابوبکرؓ اس وقت جو دو پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے ان کی طرف
اشارہ کر کے فرمایا "تو بس میرے یہ دونوں کپڑے ہیں ہی اور ایک تیسرا کپڑا بازار سے خرید کر مجھ
کو کفن دے دینا" ام المومنین نے کہا "ابا جان! ہم تینوں نئے کپڑے بازار سے خرید سکتے ہیں"
ارشاد ہوا "بیٹی نئے کپڑوں کے زندہ لوگ بہ نسبت مردوں کے زیادہ مستحق ہیں۔ یہ کفن کے
دونوں کپڑے تو لہو اور پیپ کیلئے ہیں (خراب ہونے کیلئے ہیں)[2]۔

اپنی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس کو وصیت کی کہ مجھ کو غسل تم ہی دینا۔ انہوں نے کہا
"مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا" فرمایا "تمہارا بیٹا عبدالرحمن بن ابی بکر تمہاری مدد کرے گا وہ پانی
ڈالتا رہے گا"[3]

اس کے بعد دریافت کیا کہ آج کون سا دن ہے؟ لوگوں نے کہا "دوشنبہ" پھر پوچھا
رسول اللہ کی وفات کس روز ہوئی تھی؟ جواب ملا "دوشنبہ کے روز" ارشاد ہوا "تو پھر
میں امید کرتا ہوں کہ میری بھی آج کے دن ہی موت ہوگی"[4] پھر وصیت کی کہ میری قبر رسول
اللہ کے پہلو میں بنائی جائے۔

ان وصیتوں سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سکرات موت شروع ہو گئے عین اس وقت
جبکہ جانکنی کا وقت تھا حضرت عائشہ جو سرہانے بیٹھی تھیں حسرت سے یہ شعر پڑھنے لگیں

وابیض یستسقی الغمام بوجهه　　ثمال الیتامی عصمة للارامل

وہ پرنور صورت جس کے چہرہ کا صدقہ دیکر بادلوں سے بارش مانگی جائے جو یتیموں پر مہربان ہو اور فقیروں کی پناہ ہو
حضرت ابوبکرؓ کے کان میں یہ شعر پڑا تو چونکہ شاعر نے یہ شعر آنحضرتؐ کی شان

[1] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۴۰ [2] طبری ج ۲ ص ۶۱۲ [3] ایضاً [4] طبقات ابن سعد قسم اول ج ۳ ص ۱۴۲

میں کیا تھا اس لیے ان کے جذبہ احترام وادب نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ وہی شعر ان کیلئے بھی پڑھا جائے۔ فوراً آنکھیں کھول دیں اور بولے " یہ شان تو صرف رسول اللہ کی تھی۔

اسی شدت و کرب کے عالم میں ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کی زبان پر بیساختہ یہ شعر جاری ہو گئے۔

وکل ذی ابل موروث	وکل ذی سلب مسلوب
وکل ذی غیبۃ یؤوب	وغائب الموت لا یؤوب

(اور ہر اونٹ والے کو ایک دن اپنا مال وراثت کو سونپنا ہے اور ہر لوٹنے والے کو خود لٹنا ہے اور ہر غائب ہونے والا واپس آجاتا ہے۔ لیکن موت کا غائب واپس نہیں ہوتا)

حضرت ابوبکرؓ نے یہ شعر سنے تو فوراً فرمایا "نہیں بیٹی! بلکہ اصل وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ — اور موت کی جانکنی حق کیساتھ آ گئی یہ وہی

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ — ہے جس سے تو کتراتا تھا۔

آخر وہ گھڑی بھی آگئی جو مقدر تھی۔ ایک ہچکی آئی اور خلافت وامامت کا آفتاب عالمتاب دنیا سے روپوش ہو گیا۔ آخر وقت زبان مبارک پر یہ دعا تھی۔

رَبِّ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ — اے رب تو مجھ کو مسلمان اٹھا اور صالحین کیساتھ حشر کر۔

۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳ھ بروز دوشنبہ مغرب اور عشاء کے درمیان وفات ہوئی تھی۔ شب میں ہی وصیت کے مطابق حضرت اسماء بنت عمیس نے غسل دیا۔ حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر حضرت عمرؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے قبر میں اتر کر اس طرح آنحضرت ﷺ کے مرقد انور کے پہلو میں لٹا دیا کہ آپ کا سر حضور اقدس ﷺ کے شانہ مبارک تک آتا تھا اللہ اکبر آقائے دو عالم شہنشاہ کونین کا ادب واحترام کا مرنے کے بعد بھی یہ اہتمام ہے کہ برابر نہ ہوں بجائے ہمدوش ہونے کے زیر سایہ دوش ہی جگہ میں لے [1]

[1] طبری ج ۲ ص ۶۱۴

رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ وفات کے وقت عمر ۶۳ برس تھی۔ مدت خلافت دو برس تین مہینے اور گیارہ دن ہے۔

صحابہ کرام میں صفِ ماتم

خلیفۂ رسول کی وفات آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد پہلا حادثہ تھا جس نے مدینہ کے بام و در پر لرزہ ڈال دیا اور پورے جزیرہ نمائے عرب میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ جو شخص حضرت ابوبکرؓ کے جتنا قریب تھا ان کی خوبیوں کے براہ راست علم کی وجہ سے اسی قدر اس کو زیادہ ملال تھا۔ اس سلسلہ میں ہم چند اکابر صحابہ کی تقریروں کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی تقریر طویل ہے۔ لیکن ہم بعینہ اس کو اس لیے درج کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کے باہمی تعلقات کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی ہے اس تقریر سے ان کے خیال کی اصلاح ہو گی۔

حضرت علیؓ کا تعزیتی خطبہ

حضرت علیؓ کو خلیفۂ رسول ﷺ کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی تو فوراً اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن ۔ پڑھتے ہوئے مکان سے باہر تشریف لے آئے اور فرمایا۔

الیوم انقطعت خلافۃ النبوۃ — آج خلافت نبوت کا انقطاع ہو گیا۔

اور پھر جس مکان میں حضرت ابوبکرؓ کی نعش تھی اس کے دروازہ پر کھڑے ہو کر حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا جو فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہونے کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ کی حیاتِ طیبہ کا ایک نہایت حسین وجمیل اور ایمان افروز مرقع بھی ہے آپ نے فرمایا

یرحمک اللہ یا ابابکر کنت الف رسول اللہ وانسہ ومستراحہ وثقتہ وموضع سرہ ومشاورتہ۔ کنت اول القوم اسلاماً واخلصھم ایماناً واشدھم یقیناً واخوفھم للہ واعظمھم غناءً فی دین اللہ واحوطھم علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واحدبھم ...	اے ابوبکر! اللہ تم پر رحم کرے تم رسول اللہ کے محبوب مونس۔ راحت۔ معتمد اور ان کے محرم راز ومشیر تھے اور تم سب سے پہلے اسلام لائے اور تم سب سے زیادہ مخلص مومن تھے تمہارا یقین سب سے زیادہ مضبوط تھا تم سب سے زیادہ اللہ کا خوف کرنے والے تھے اللہ کے دین کے معاملہ میں سب سے زیادہ بے نیاز یعنی دوسری چیزوں کی پرواہ نہ کرنے والے رسول اللہ کے نزدیک سب

على الاسلام وآمنهم على اصحابه و
احسنهم صحبة واكثرهم مناقبا و
افضلهم سوابق وارفعهم درجة
واقربهم وسيلة واشبههم برسول الله
هديا وسمة ورأفة وفضلا واشرفهم
منزلة واكرمهم عليه واوثقهم
عنده فجزاك الله عن الاسلام وعن
رسوله خيرا كنت عنده بمنزلة
السمع والبصر صدقت رسول الله
حين كذبه الناس فسماك الله عزوجل
في تنزيله صديقا فقال والذي جاء
بالصدق وصدق به الذي جاء
بالصدق محمد وصدق به ابوبكر
واسيته حين بخلوا وقمت به على
المكاره حين عنه قعدوا
وصحبته في الشدة اكرم الصحبة
ثاني اثنين وصاحبه
في الغار والمنزل
عليه

سے زیادہ معتبر، اسلام پر سب سے زیادہ
مہربان۔ رسول اللہ کے ساتھیوں کیلئے سب
سے زیادہ بابرکت رفاقت میں اُن سب سے بہتر
مناقب اور فضائل میں سب سے بڑھ چڑھ کر
پیش قدمیوں میں سب سے انفس درجہ
میں سب سے اونچے اور وسیلہ کے اعتبار سے
آنحضرتؐ سے سب سے زیادہ قریب اور آنحضرتؐ
سے سب سے زیادہ مشابہ سیرت میں عادت میں
مہربانی اور فضل میں، صحابہ میں سب سے
زیادہ اونچے مرتبہ والے اور حضورؐ کے نزدیک
سب سے زیادہ مکرم اور معتمد تھے۔ پس اللہ
اسلام اور اپنے رسولؐ کی طرف سے تم کو جزائے
خیر عطا فرمائے تم آنحضرتؐ کیلئے بمنزلہ گوش
و چشم تھے تم نے حضورؐ کی تصدیق اس وقت کی جبکہ
لوگوں نے آپ کی تکذیب کی۔ اس لئے اللہ
تعالیٰ نے اپنے کلام میں تم کو صدیق کہا ہے چنانچہ
فرمایا والذی جاء بالصدق وصدق بہ سچائی
لانے والے محمدؐ ہیں اور اس کی تصدیق کرنے والے ابوبکرؓ
تم نے حضورؐ کیساتھ غمخواری اس وقت کی جبکہ لوگوں
نے بخل کیا اور تم ناگوار باتوں کے وقت حضورؐ کیساتھ اس وقت بھی کھڑے رہے جبکہ لوگ آپ سے
بچھڑ گئے۔ تم نے سختیوں میں بھی حضورؐ کے ساتھ صحبت و رفاقت کا حق باحسن وجوہ ادا
کیا۔ تم ثانی اثنین اور رفیق غار (ثور) تھے اور تم پر سکون نازل ہوا تھا۔

السكينة ورفيقه في الهجرة وخلفته
في دين الله وامته احسن الخلافة
حين ارتد الناس وقمت بالامر
ما لم يقم به خليفة نبي فنهضت
حين وهن اصحابك وبرزت
حين استكانوا وقويت حين
ضعفوا ولزمت منهاج رسول
الله صلى الله عليه وسلم اذا
هموا وكنت خليفة حقا لم
تنازع ولم تصدع
برغم المنافقين وكبت
الكافرين وكره الحاسدين
وغيظ الباغين وقمت بالامر
حين فشلوا وثبتَّ اذ تتعتعوا
ومضيت بنور الله اذ وقفوا
فاتبعوك فهدوا وكنت اخفضهم
صوتا واعلاهم فوقا واقلهم
كلاما واصوبهم منطقا و
اطولهم صمتا وابلغهم قولا
واشجعهم نفسا واعرفهم بالامور
واشرفهم عملا كنت والله للدين
يعسوبا اولا حين نفر

تم ہجرت میں آپ کے رفیق تھے اور اللہ کے
دین میں اور رسول اللہ کی امت پر تم آپؐ کے لیے
خلیفہ بنے جنہوں نے اس وقت خلافت کا حق ادا کر دیا جبکہ
لوگ مرتد ہو گئے تھے اور تم نے خلافت کا وہ حق ادا
کیا جو کسی نبی کے خلیفہ نے نہیں کیا تھا۔ چنانچہ تم نے
اس وقت مستعدی دکھائی جبکہ تمہارے ساتھی سست
ہو گئے اور تم نے اس وقت جنگ کی جب کہ وہ عاجز ہو گئے
تھے جب وہ کمزور تھے تو تم قوی رہے اور تم نے رسول
اللہ کے راستہ کو اس وقت تھامے رکھا جبکہ لوگ پست
ہو گئے تھے تم بلا نزاع و تفرقہ خلیفہ برحق تھے اگرچہ
اس سے منافقوں کو غصہ، کفار کو رنج، حاسدوں
کو کراہت اور باغیوں کو غیظ تھا۔ تم امر حق پر ڈٹے
رہے جبکہ لوگ بزدل ہو گئے اور تم ثابت قدم رہے
جب وہ ڈگمگا اٹھے تم اللہ کے نور کو لیے بڑھتے
رہے۔ جب لوگ کھڑے ہو گئے آخر کار انہوں
نے آپ کی پیروی کی اور ہدایت پائی۔ آپ کی آواز
ان سب سے زیادہ پست تھی مگر آپ کا مرتبہ
ان سب سے اونچا تھا۔ تمہارا کلام سب سے زیادہ
سنجیدہ تھا۔ سب سے زیادہ تمہاری گفتگو درست
تھی آپ سب سے زیادہ خاموش رہنے والے تھے
آپ کا قول سب سے زیادہ بلیغ تھا۔ شجاعت میں
آپ سب سے بڑھے ہوئے تھے معاملات کو سب سے زیادہ سمجھنے
والے تھے اور بخدا آپ دین کے اولین سردار تھے۔ جب لوگ دین سے ہٹے تو آپ آخری سردار تھے جب وہ دین کی طرف متوجہ

رہے گو کمزور لیکن اللہ
ن کے اعتبار سے متواضع
تھے اور دلوں میں
منسبت نہ کوئی طمع کرتا تھا
ن کسی کو طمع تھی اور نہ
ادر پست آدمی تمہارے
تھے اور قوی تمہارے
سے حق لیتے تھے اور دور
ان نگاہ میں یکساں تھے
حق ہوتا تھا دین تمہارا سب
ان حق بسچائی اور نرمی
امر بردباری اور دوراندیشی
تھا اب آپ دنیا سے رخصت
مشکل آسان ہو گئی آگ بجھ
ی ہو گیا اسلام اور مسلمان
ب آ گیا۔ اگرچہ کافروں کو
ت پیش قدمی کی اور
زم ہو سے کامیاب ہوئے تم
بکا گیا تمہاری موت کی
ی طرح محسوس کی جا
بت سنے تو تمام دنیا

فی السماء وھدت مصیبتک الانام	ہم سب اللہ کیلئے ہیں اسی کی طرف لوٹنے والے
فانا للہ وانا الیہ راجعون ورضینا	ہیں اللہ کی قضا پر ہم راضی ہیں ہم اپنا معاملہ اس کے سپرد
عن اللہ قضاہ وسلمنا لہ امرہٗ	کرتے ہیں بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے
فواللہ لن یصاب المسلمون بعد	بعد تمہاری موت جیسا کوئی حادثہ مسلمانوں پر کبھی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	نازل نہیں ہوا۔ تم دین کی عزت۔ جائے پناہ اور حفاظت
بمثلک ابداً کنت للدین عزاً وحرزاً و	گاہ تھے مومنوں کیلئے ایک گروہ۔ قلعہ اور دارالامن
کھفاً وللمؤمنین فئۃ وحصناً وغیثاً	تھے۔ منافقوں کے واسطے تشدد اور غضب
وعلی المنافقین غلظۃ وغیظاً فالحقک	تھے۔ پس اللہ تم کو تمہارے نبی سے ملادے
اللہ بنبیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ولا	اور ہم کو تمہارے بعد تمہارے اجر سے
حرمنا اجرک ولا اضلنا بعدک فانا	محروم اور گمراہ نہ کرے
للہ فانا الیہ راجعون۔ [1]	فانا للہ وانا الیہ راجعون [2]

جب تک حضرت علیؓ یہ خطبہ پڑھتے رہے سب لوگ جو وہاں موجود تھے خاموش رہے لیکن خطبہ ختم ہوتے ہی سب بے تحاشا اس طرح روئے کہ چیخیں نکل گئیں اور سب نے بیک آواز کہا "ہاں بیشک اے رسول اللہ کے داماد آپ نے سچ فرمایا"

حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔

"اے ابا! اللہ آپ کو سرسبز و شاداب کرے اور آپ کو آپ کی بہترین کوششوں کا بدلہ عطا فرمائے۔ آپ نے دنیا سے منہ موڑ کر اس کو ذلیل کردیا۔ اور آخرت کا رخ کیا تو آپ نے اس کو عزت بخشدی اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کا حادثۂ وفات سب سے بڑا حادثہ ہے لیکن بہرحال اللہ کی کتاب ہم کو حکم کرتی ہے کہ ہم صبر کریں اور یہ صبر ہی آپ کی وفات کا سب سے اچھا عوض ہے اور میں اللہ سے امید کرتی ہوں کہ وہ مجھ کو میرے صبر کا بدلہ دے کر اپنا وعدہ پورا کرے گا۔

[1] الریاض النضرہ والمحب الطبری ج ۱ ص ۱۸۳/۲/۱۸

[2] حضرت علیؓ کا یہ خطبہ تھوڑے سے بہت لفظوں کے اختلاف کیساتھ منتخب کنزالعمال برمسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۴۶۲ پر بھی ہے

اے ابا! آپ اپنی اس بیٹی کا آخری سلام قبول کیجئے جس نے آپ کی زندگی میں کبھی آپ کے ساتھ پر خاش نہیں رکھی اور اب آپ کے مرنے پر وہ جزع وفزع نہیں کر رہی ہے"

حضرت عمرؓ فاروق گھر میں داخل ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ کی نعش کو خطاب کرکے فرمایا

"اے خلیفۂ رسول اللہ! آپ نے دنیا سے رخصت ہوکر قوم کو سخت محنت و مشقت میں مبتلا کردیا۔ آپ کا ساہونا تو درکنار۔ اب تو کوئی ایسا بھی نہیں جو آپ کی گرد تک پہنچ سکے"

آنحضرتﷺ کی بشارت | یہ نوحہ و ماتم تو اس عالم آب وگل میں برپا تھا۔ لیکن عالم ملکوت میں اس وقت کیا ہو رہا تھا؟ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ خود حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ کے سامنے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی۔

یَا أَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي	اے نفس مطمئنہ تو اپنے پروردگار کی طرف
إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً	ہنسی خوشی چلا آ۔

اور پھر عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیا خوب ارشاد ربانی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں! اے ابوبکر! جب تم کو موت آئیگی تو اس وقت جبرئیل امین تم سے یہی کہیں گے [1]

نظام حکومت

آج کل کا سب سے ترقی یافتہ اور مہذب طرز حکومت جمہوری ہے۔ اس لیے ہمارے مسلمان مصنفین اور ارباب قلم بھی عام طور پر یہی کہنے لگے ہیں کہ اسلام خود جمہوری طرز حکومت کا قائل ہے اور خلفائے راشدین کا طرز حکومت بھی جمہوری تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید، سنت رسول۔ اور خلفائے راشدین کے عمل سے جو طرز حکومت ثابت ہوتا ہے وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے آجکل کی دستوری اصطلاح میں نہ جمہوری ہے اور نہ شخصی۔ وہ نہ دینی (THEOCRATIC) ہے اور نہ اشرافی و خواصی (ARISTOCRATIC) ہے بلکہ وہ یہ سب کچھ ہے اور ان سب سے الگ بھی ہے۔

[1] کنزالعمال برمسند امام احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۴۵

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دینی حکومت (THEOCRATIC GOVARNMENT) میں بادشاہ کو خدا مانا جاتا ہے۔ جیسا کہ فراعنہ مصر کے ہاں دستور تھا یا اس کو ظلِ خداوندی تسلیم کیا جاتا ہے جیسا کہ یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں رواج پایا جاتا تھا ان دونوں صورتوں میں بادشاہ مطلق العنان ہوتا ہے۔ اس کا ہر لفظ فرمودۂ الٰہی ہوتا ہے اور اس بنا پر اس سے انحراف کرنا تو کجا کوئی شخص اس پر تنقید بھی نہیں کر سکتا۔

اسلام میں اس تخیل کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حکمران وزیر یا نرول۔ یا ایک خلیفہ۔ تو الگ رہا خود پیغمبر جس کے متعلق معصوم ہونیکا عقیدہ ہوتا ہے وہ بھی حقوق العباد یا دنیوی معاملات میں انہیں قوانین کا پابند ہوتا ہے جو عام لوگوں کیلئے ہوتا ہے اور ان امور میں بھول چوک کا احتمال دوسروں کی طرح پیغمبر کے ساتھ بھی لگا رہتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ؐ نے فرمایا انتم اعلم بامور دنیاکم "اور اس کے علاوہ احادیث و سیر کی کتابوں میں متعدد واقعات مذکور ہیں جن میں آپ نے خود اپنے خلاف مقدمات سُنے اور ان کے بارہ میں منصفانہ فیصلہ کیا[1] پس جب خود رسول اللہؐ کے متعلق الوہیت کا عقیدہ نہیں ہو سکتا تو خلیفہ رسول اللہؐ کی نسبت یہ عقیدہ کیونکر ہو سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ بیعت کے بعد جب لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو "یا خلیفۃ اللہ" کہہ کر مخاطب کیا تو آپ نے فوراً اس کی تردید کی اور فرمایا۔ لست بخلیفۃ اللہ ولکنی خلیفۃ رسول اللہ "میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں البتہ خلیفۂ رسول اللہ ہوں۔

بنو سقیفہ میں بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جو خطبہ دیا تھا اور جس کو ہم بیعت کے موقع پر پڑھ آئے ہیں اس میں صاف صاف کہا تھا کہ اے لوگو! میں تم سے بہتر آدمی نہیں ہوں میری تمنا تھی کہ یہ ذمہ داری کسی اور کو سپرد کی جاتی۔ لیکن بہر حال اب جبکہ تم نے مجھ کو منتخب کر لیا ہے تو اگر میں ٹھیک ٹھیک چلوں تو میری اطاعت کرو ورنہ اگر غلط راستہ پر گامزن ہوں تو تم مجھ کو ٹھیک اور درست کر دو۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آج کل کی مروجہ دستوری اصطلاح میں جس طرزِ حکومت کو دینی

[1] دیکھو سیرت ابن ہشام ص ۴۴۴۔ سیرت شامی میں بھی اس طرح کے متعدد واقعات مذکور ہیں۔

حکومت کہا جاتا ہے۔ اس کے اعتبار سے اسلامی طرزِ حکومت ہرگز دینی نہیں ہے۔ البتہ ہاں اس حیثیت سے بے شبہ وہ دینی حکومت ہے کہ اس حکومت کا منشور اور دستور قانون الٰہی ہے۔ منزل من اللہ ہے جس کی رو سے فرماں روا اور سب مسلمان ابتداً وہ اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کرتے ہیں اور آداب و امر و نواہی شریعت کے پابند رہتے ہیں۔

اسی طرح بطرز حکومت اشرافی یا خواص طرز حکومت بھی نہیں ہے کیونکہ یہ حکومت اونچے طبقہ والوں کی ادنیٰ طبقہ کے لوگوں پر خواص کی عوام پر یا امراء کی غریبوں پر ہوتی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے خلافت کی حقیقت کی بحث میں بتایا ہے۔ اسلام میں سرے سے طبقاتی تقسیم کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ ہر وہ مسلمان جو فرائض و واجبات خلافت کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خلافت کیلئے منتخب کیا جا سکتا ہے۔ حضرت حذیفہؓ کے غلام سالم کیلئے حضرت عمرؓ کا یہ فقرہ پہلے گزر چکا ہے۔ کہ آج سالم زندہ ہوتے تو میں ان کو والی بناتا۔

اسلام میں شخصی حکومت کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ آنحضرت ؐ نے اپنے اہل بیت میں سے کسی کی خلافت و نیابت کی وصیت نہیں کی۔ اور یہی عمل خلفائے راشدین کا بھی رہا۔ پھر قرآن مجید میں مسلمانوں کی تو شان ہی یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ وہ کسی ایک معاملہ میں بھی استبداد کو راہ نہیں دیتے اور باہمی مشورہ سے اپنے معاملات انجام دیتے ہیں۔

والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوٰۃ وامرھم شوریٰ بینھم ومما رزقنٰھم ینفقون ۝ اور جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہا نماز قائم کی ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوتے ہیں اور وہ خدا کے بخشے ہوئے رزق سے خرچ کرتے ہیں

عبداللہ یوسف علی صاحب اپنے مشہور انگریزی ترجمہ قرآن مجید میں اس آیت پر اپنے ایک نوٹ میں لکھتے ہیں۔

اس آیت میں مشاورت باہمی کا جو اصول بیان کیا گیا ہے اس پر آنحضرت ؐ نے اپنے خانگی اور پبلک دونوں قسم کی زندگی میں پورے طور پر عمل کیا اور آپ کے بعد جو ابتدائی دور کے حکمران تھے انہوں نے بھی اسکی مکمل پیروی کی۔ موجودہ نمائندہ حکومت "ریاستی امور میں اسی اصول پر عمل کرنے کی ایک نامکمل سی کوشش ہے۔[1]

[1] ص ۱۳۱۶۔ مطبوعہ شیخ محمد اشرف لاہور۔

اس کے علاوہ خاص آنحضرتؐ کو خطاب کر کے حکم دیا گیا۔

وشاورھم فی الامر فاذا — اور آپ معاملات میں لوگوں سے مشورہ لیجئے

عزمت فتوکل علی اللہ — لیکن جب عزم کر لیں تو پھر اللہ پر توکل کیجئے۔

ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ پیغمبر برحق تھے اس لئے آپ کو کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن چونکہ آپ کو نمونہ قائم کرنا۔ اور اسوہ بننا تھا۔ اسلئے قرآن میں آپ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور آپ برابر اس پر عمل کرتے رہے یہاں تک کہ عمال اور امراء کا تقرر بھی آپ مشورہ سے ہی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود کی نسبت فرمایا۔

لو کنت مؤمرا احدا بغیر مشورۃ — اگر میں کسی شخص کو مشورہ کے بغیر امیر بناتا تو

لامرت ابن ام عبد [1] — ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) کو بناتا۔

آپ کے بعد حضرت ابوبکر کا عمل بھی یہی رہا۔ معمولی سے معمولی کوئی معاملہ بھی جس کا تعلق نظم و نسق اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے ہوتا تو مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔

بحرین میں بزاخر نام کا ایک مقام ہے یہاں کے لوگ بھی مرتد ہو گئے تھے۔ بعد میں ان کو پشیمانی ہوئی تو حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہو کر عفو خواہ ہوئے اور اپنے گزشتہ اعمال سے توبہ کی۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا " تم اب (جنگلوں میں جا کر اونٹ چراؤ) میں مہاجرین سے مشورہ کر کے تم کو جواب دوں گا"، چنانچہ آپنے ایک اجتماع طلب فرمایا اور جو کچھ ان کے اور آپکے درمیان گفتگو ہوئی تھی وہ پبلک کے سامنے رکھا۔ [2] مشورہ کے بعد مسلمانوں کی شان یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ مشورہ سے جو بات طے پائے اس کی پابندی کی جائے۔

طاعۃ وقول معروف فاذا — اطاعت اور قول معروف ہے۔ اور جب ایک بات

عزم الامر فلو صدقوا اللہ — طے ہو جائے تو پھر جو لوگ اللہ سے سچے ہوں گے

[1] سنن ترمذی ج ۲ کتاب المناقب [2] صحیح بخاری ج ۲ ص [illegible] باب من نکث بیعتہ۔

لکان خیرا لھم — ان کے لئے یقیناً بہتر ہوگا۔

اب رہا طرز جمہوری حکومت! تو اس میں شبہ نہیں کہ اپنی اصل اسپرٹ اور روح کے اعتبار سے اسلامی طرز حکومت جمہوری ہی ہے۔ چنانچہ:-

(۱) خلیفہ کا انتخاب رائے عامہ سے ہوتا ہے، خلیفہ کی بیعت کی نوعیت بالکل وہی ہے جو آج کل ووٹ کی ہوتی ہے۔

(۲) ہر شخص کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ خلیفہ کے کسی عمل یا فعل پر نکتہ چینی کرے۔

(۳) خلیفہ اپنے آپ کو لوگوں سے ممتاز یا برتر نہیں جانتا۔ بلکہ ان کا خادم سمجھتا ہے اور اسوجہ سے اس تک پہنچنے میں کسی کو دشواری نہیں ہوتی [1]

(۴) خلیفہ جب کبھی کوئی اہم کام کرتا ہے، تو رائے عامہ ضرور طلب کر لیتا ہے ارباب فکر و نظر سے مشورہ کرتا ہے۔ اور قطعاً استبداد نہیں برتتا۔

(۵) لیکن ہاں اس مشورہ کے بعد وہ اس کا پابند نہیں ہے کہ اکثریت کی رائے پر عمل بھی کرے بلکہ اگر چاہے تو اپنا فیصلہ اسکے خلاف بھی دے سکتا ہے۔ آنحضرتؐ کا معمول یہی تھا۔ قرآن میں بھی یہی فرمایا گیا ہے۔

وشاورھم فی الامر فاذا — اور آپ معاملات میں لوگوں سے مشورہ کیجئے

عزمت فتوکل علی اللہ — لیکن جب ارادہ کر لیں تو پھر اللہ پر توکل کیجئے

تم پڑھ آئے ہو کہ آنحضرتؐ کی وفات کے فوراً بعد ہی صحابہ کرام کی عظیم اکثریت اسکے حق میں نہیں تھی کہ حضرت اسامہ کو عرب و شام کی سرحد پر بھیجا جائے لیکن حضرت

[1] اسی سلسلہ میں حضرت عمر نے ایک مرتبہ بڑی عمدہ بات کہی۔ ایک مرتبہ آپنے اپنے مشیر خاص سے پوچھا میں ایک شخص کو امیر بنانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کس کو بناؤں؟ لوگوں نے دریافت کیا آپ کو کس قسم کا آدمی چاہئے۔ حضرت عمر نے جواب دیا۔ رجل اذا کان امیرھم کانہ رجل منھم واذا لم امیرھم کانہ امیرھم" (مجھ کو ایسا شخص چاہئے کہ جب مسلمانوں کا امیر ہو تو ایسا معلوم ہو کہ گویا انہیں میں کا ایک ہے۔ لیکن جب امیر نہ ہو تو (اپنے کمالات و اوصاف کی وجہ سے ان کو) امیر ہی معلوم ہوتا ہو) (منتخب کنز العمال بر مسند امام احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۴۳)

ابوبکرؓ نے اسکو نہیں مانا ۔ اسی طرح اکثر صحابہ مانعین زکوٰۃ سے قتال کرنے کے حامی نہیں تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس رائے کی مخالفت کی اور آخر وہی کیا جو خود ان کے نزدیک حق تھا اسکے بعد شام پر لشکر کشی کا ارادہ ہوا تو تمام صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا صحابہ پس وپیش میں تھے ۔ لیکن حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے موافق رائے دی لہٰذا آخر آپ نے یہی کیا۔

لیکن آج کل کی اصطلاح میں جس کو جمہوری نظام حکومت کہتے ہیں اسمیں اور اسلامی جمہوریت میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں عددی اکثریت ہی تمام فیصلوں کا دار ومدار ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی طرف اکاون ووٹ ہوں اور وہ سب کے سب جاہل، خود غرض اور معاملہ نافہم لوگوں کے ہوں اور اس کے برخلاف دوسری طرف صرف ایک ووٹ کم یعنی انچاس ہوں، لیکن وہ سب معاملہ فہم اور صاحب الرائے لوگوں کے ہوں تو فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا جس کو ایک ووٹ کی اکثریت حاصل ہے۔ اسلامی جمہوریت میں اس عددی اکثریت کی کوئی اہمیت نہیں ہے جیسا کہ خلیفہ کے انتخاب کے عنوان کے ماتحت گزر چکا ہے۔

علاوہ بریں موجودہ جمہوریت میں جتنے کام ہوتے ہیں پارٹی کی بنیاد پر ہوتے ہیں پارٹی کا ہر فرد مجبور ہوتا ہے کہ ہر معاملہ میں اپنی پارٹی کے حق میں ووٹ دے اور اس کی حمایت کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاتی ہے[1] لیکن اسلامی جمہوریت میں اس پارٹی عصبیت کا کہیں وجود نہیں ہے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں خود صحابہ میں پارٹیاں تھیں۔ ایک مہاجرین کی دوسری انصار کی اور تیسری بنو ہاشم کی لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ محض پارٹی عصبیت کی بنیاد پر کسی نے کوئی رائے دی ہو جس بات کو جو شخص حق جانتا تھا اس کی حمایت میں رائے دیتا تھا۔

غرض کہ اسلام کا طرز حکومت کچھ اس قسم کا ہے کہ آج کل کے مروجہ طرزہائے حکومت میں

[1] انہیں وجوہ کی بنا پر ہمارے زمانہ کی جمہوریت بھی درحقیقت ڈکٹیٹرشپ کی ہی ایک قسم ہو کر رہ گئی ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ ڈکٹیٹرشپ میں فردِ واحد کی مطلق العنان حکومت ہوتی ہے اور اس جمہوریت میں ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے جو پارلیمنٹ یا اسمبلی میں اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر جو چاہتی ہے آزادی کے ساتھ کرتی ہے۔

سے ہر طرز میں جتنی خوبی اور عمدگی ہے وہ اسلام نے لے لی ہے اور اس میں جو حصہ مفاسد و لائقِ مذمت تھا اس کو ترک کر دیا گیا ہے۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک اسلامی طرز حکومت کے لیے موزوں نام "شورائی حکومت" کا نام ہوگا۔

حضرت ابوبکرؓ کا دستورِ حکومت

اسلامی طرز حکومت پر ایک عام اجمالی تبصرہ کرنے کے بعد اب ہم کو بتانا چاہئے کہ حضرت ابوبکرؓ کا دستور و آئین حکومت کیا تھا؟ چونکہ اسلامی حکومت یا خلافت کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہوتی ہے اس بنا پر حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو سب سے پہلے اس کا حکم قرآن مجید میں تلاش کرتے تھے اگر وہاں نہ ملتا تو حدیث کی طرف رجوع فرماتے۔ اگر اس خاص معاملہ کے متعلق حدیث میں بھی کچھ نہ ملتا تو مسلمانوں کا ایک جلسہ طلب فرماتے ان میں سے اگر کسی کو کوئی حدیث یاد ہوتی اور وہ پڑھ کر سنا دیتا تو آپ کو بڑی خوشی ہوتی اور خدا کا شکر ادا کرتے کہ سنتِ رسول کے جاننے والے ان کی مدد کو موجود ہیں۔ اگر کسی کو کوئی حدیث بھی یاد نہ ہوتی تو پھر اہل رائے سے مشورہ لیتے تھے۔

مجلس شوریٰ

صحابہ کرام میں جو حضرات معاملہ فہمی اور تدبر و سیاست میں امتیاز رکھتے تھے حضرت ابوبکرؓ نے ان کو اپنا مشیر خاص بنا رکھا تھا جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا ان حضرات سے مشورہ کرتے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے۔

ان ابابکر الصدیق کان اذا نزل به امر یرید فیه مشاورة اهل الرای واهل الفقه ودعا رجالا من المهاجرین والانصار دعا عمر وعثمان وعلیا و عبد الرحمن بن عوف ومعاذ بن جبل وابی بن کعب وزید بن ثابت[1]

ابوبکر صدیقؓ کو جب کوئی واقعہ پیش آتا تھا جس میں اہل رائے و فقہ سے مشورہ کی ضرورت ہوتی تو اس مقصد کے لئے وہ مہاجرین اور انصار میں سے کچھ لوگوں کو بلاتے تھے تو حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ کو بلاتے تھے۔

ملکی نظم ونسق

یہ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی مدتِ خلافت کل دو برس[2] تین مہینے اسی مدت

[1] طبقات ابن سعد قسم ثانی جزء ثالث ص ۱۲۹

[2] دو برس تین مہینے گیارہ دن ہے۔

بھی اسلامی مملکت کے اندرونی اور بیرونی استحکام اور فتوحات میں بسر ہو گئی لیکن اسکے باوجود حضرت ابوبکرؓ نظم و نسق سے غافل نہیں تھے اور اسلامی مملکت کا رقبہ جتنا وسیع ہوتا جاتا تھا اسی قدر نظم و نسق کے دائرہ کو وسعت بھی دی جاتی تھی حضرت ابوبکرؓ نے آجکل کی مہذب اور ترقی یافتہ حکومتوں کی طرح پوری مملکت کو مختلف صوبوں اور ضلعوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ان میں سے ہر ایک کے لئے جدا جدا حاکم مقرر کئے تھے جیسا کہ نقشۂ ذیل سے اسکی وضاحت ہوگی -

مقام حکومت	حاکم کا نام	کیفیت
(۱) مکہ (حجاز)	حضرت عتاب بن اُسید	
(۲) طائف "	حضرت عثمان بن ابی العاص	
(۳) صنعاء (یمن)	مہاجر بن ابی امیہ	
(۴) حضرموت "	زیاد بن لبید انصاری	
(۵) خولان	یعلی بن منیہ	
(۶) زبید و رمع	ابوموسیٰ اشعری	(یمن میں ایک علاقہ کا نام ہے)
(۷) جند	معاذ بن جبل	
(۸) بحرین	علاء بن الحضرمی	
(۹) نجران	جریر بن عبداللہ البجلی	
(۱۰) دومۃ الجندل	عیاض بن الغنم	
(۱۱) عراق	مثنیٰ بن حارثہ	
(۱۲) جرش	عبداللہ بن ثور	
(۱۳) حمص (شام)	ابوعبیدہ بن الجراح	
(۱۴) اردن "	شرحبیل بن حسنہ	
(۱۵) دمشق "	یزید بن ابی سفیان	
(۱۶) فلسطین "	عمرو بن العاص	
(۱۷) مدینہ		(یہ دارالحکومت تھا جو براہ راست خلیفہ کے ماتحت تھا)

عہدہ داران حکومت کا انتخاب

ایک حکومت کے بہترین نظم و نسق کا دار و مدار بنیادی طور پر اس بات پر ہے کہ جس عہدہ کیلئے جس شخص کا انتخاب کیا جائے وہ ہر وجوہ اسی کیلئے موزوں ہو اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ فرماں روائے وقت میں مردم شناسی کا جوہر ہونا چاہئے۔ مالک بن نویرہ کے واقعہ میں تم پڑھ آئے ہو کہ حضرت خالد کے متعلق حضرت عمرؓ کو کس قدر شدید اصرار تھا کہ ان کو معزول کیا جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ایک نہ سنی۔ آخر جب حضرت خالد کے جوہر کھلے تو حضرت عمرؓ کو خود اقرار کرنا پڑا کہ صحابہ میں حضرت ابوبکرؓ کے برابر کوئی مردم شناس نہیں تھا۔

انتخاب کے معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ کے اصول

اس سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کے دو اصول تھے۔

(۱) جو شخص جس عہدہ پر آنحضرت ﷺ کے عہد میں مقرر تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اس کو اسی عہدہ پر رکھتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت ﷺ سے زیادہ صحیح انتخاب کس کا ہو سکتا تھا چنانچہ جیش اسامہ کی روانگی کے وقت حضرت اسامہ کی امارت پر سب ہی نے اعتراض کیا مگر آپ نہ مانے۔ حضرت عمرؓ نے جب حضرت خالد کی معزولی کا مطالبہ کیا تو آپ نے صاف فرمایا کہ "جس تلوار کو رسول اللہ ﷺ نے نیام سے باہر کیا ہو میں اس کو کیونکر نیام میں رکھ سکتا ہوں" مکہ میں عتاب بن اسید، طائف میں عثمان بن ابی العاص، صنعاء میں مہاجر بن ابی امیہ، حضرموت پر زیاد بن لبید اور بحرین پر علاء الحضرمی۔ آنحضرت ﷺ کے عہد میں عامل تھے تو عہد صدیقی میں بھی اسی عہدہ پر رہے[1]

(۲) دوسرا اصول جس کی طرف حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں متعدد مواقع پر اشارہ کیا ہے یہ تھا کہ وہ اس شخص کا انتخاب کرتے تھے جس کو آنحضرت ﷺ کی فیضان تربیت سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہونے کا موقع ملا ہو۔ چنانچہ جو لوگ فتح مکہ سے قبل مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کو ترجیح دیتے تھے۔

[1] طبری ج ۴ ص ۲۱۶۲

اقربا نوازی سے اجتناب ایک فرماں روا کیلئے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ عہدوں کی تقسیم کے معاملہ میں اقربا نوازی اور جنبہ داری سے اجتناب کرے اور عہدہ اس شخص کو سپرد کرے جو بہر وجوہ اس کا اہل ہو، حضرت ابوبکرؓ کا خود بھی اس پر بڑی سختی کے ساتھ عمل تھا اور اپنے عمال کو بھی اس کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔

یزید بن ابی سفیان کو شام کی امارت پر روانہ کیا تو فرمایا۔

یا یزید ان لک قرابة
عسیت ان تؤثرهم بالامارة
وذالک اکبر ما اخاف علیک
فان رسول اللہ ﷺ قال من ولی
من امر المسلمین شیئاً فامر علیهم
احداً محاباة فعلیه لعنة اللہ
لا یقبل اللہ منه صرفاً ولا عدلاً
حتی یدخله جهنم ۔[1]

اے یزید! وہاں تمہارے عزیز قریب ہیں ممکن ہے کہ تم ان کو امارت کے دینے میں ترجیح دو یہ وہ سب سے بڑی چیز ہے جس کا میں تم سے اندیشہ کرتا ہوں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مسلمانوں کے کسی کام کا ذمہ دار ہوا اور وہ محض رشتہ کی وجہ سے انپر کسی شخص کو امیر بنادے تو اس پر اللہ کی لعنت ہوگی اور اللہ اس کی طرف سے کسی قدر بدلہ و کفارہ کو قبول نہیں کریگا یہاں تک کہ اس کو جہنم میں بھیج دیگا۔

عمال کے تقرر میں عالی ظرفی ایک طرف اقربا نوازی سے یہ اجتناب اور دوسری جانب عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی شخص کی نسبت یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ آپ کی ذات کے ساتھ رنجش رکھتا ہے لیکن آپ جو عہدہ اس کو دینا چاہتے اسکے لئے وہ آپکے رائے میں موزوں ہوتا تو اسکی ذاتی رنجش کا خیال اس کو عہدہ دینے میں مانع نہیں ہوتا تھا۔ شام کی مہم روانہ کرنے کے وقت خالد بن سعید کو بھی آپ نے ایک علم عنایت فرمایا تو اگرچہ حضرت عمرؓ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ خالد آپ کی خلافت سے خوش نہیں تھے اور انہوں نے آپ کی برخلاف بنو ہاشم کو بھڑکایا تھا لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس کی ذرا پرواہ نہیں کی اور تقرر بحال رکھا۔[2]

۱؎ مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۶ ۲؎ طبری ج ۴ ص ۲۰۸۴

عمال حکومت کی دلجوئی اور انکا احترام ایک حکومت کی شائستگی اور اسکے مہذب ہونیکی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ عمال حکومت کا ان کے مرتبہ و منصب کے لحاظ سے پورا احترام ملحوظ رکھا جائے اور ان کے ساتھ جبر و تحکم کا برتاؤ نہ کیا جائے، حضرت ابوبکرؓ ان دونوں باتوں کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے۔ جیش اسامہ کو روانہ کرنے کے وقت حضرت ابوبکرؓ چاہتے تھے کہ حضرت عمرؓ اس جیش میں نہ جائیں اور مدینہ میں رہ کر ان کے خصوصی مشیر کار کی حیثیت سے کام کریں لیکن چونکہ امیر الجیش حضرت اسامہؓ تھے اسلئے آپ نے حضرت عمرؓ کے متعلق خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے اسامہ سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو حضرت عمرؓ کو ان کے پاس ہی چھوڑ جائیں، پھر دلجوئی کا یہ عالم تھا کہ حضرت اسامہ کا لشکر روانہ ہوا تو اسامہ سواری پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن خلیفۂ رسول دور تک ان کی مشایعت کو پیدل گیا اور حضرت اسامہ کے سخت اصرار کے باوجود نہ خود سواری پر بیٹھے اور نہ اسامہ کو سواری سے نیچے اترنے دیا۔ اسی طرح یزید بن ابی سفیان شام کی مہم پر روانہ ہوئے تو آپ نے دور تک ان کی پاپیادہ مشایعت کی۔

انتخاب میں احتیاط عربی کا مشہور مقولہ ہے "سل المجرب ولا تسأل الحکیم" اسکے مطابق جن لوگوں نے کسی وجہ سے اپنا اعتماد کھو دیا تھا حضرت ابوبکرؓ تائب ہو جانے کے بعد بھی انکو ذمہ داری کا کام سونپنا پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت خالد کو عراق کی مہم پر روانہ کیا تو انکو جہاں اور ہدایات دیں ایک ہدایت یہ بھی کی کہ جو لوگ مرتد ہو گئے تھے ان کو فوج میں بھرتی نہ کیا جائے ان لوگوں کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کا یہ معاملہ اس وقت تک رہا جب تک کہ ان کے صدق و خلوص اور ایمان کی پختگی کا آپ کو یقین نہیں ہو گیا یہی وجہ ہے کہ عراق کی مہم کے زمانہ میں ان لوگوں پر جو رکاوٹ تھی شام کی مہم کے زمانہ میں باقی نہیں رہی تھی۔

آزمائشی تقرر آج کل کے عام قاعدہ کے مطابق جب تک کسی شخص کے متعلق اسکی حسن کارگزاری کی وجہ سے یقین نہیں ہو جاتا تھا کہ وہ اس عہدہ کا اہل ہے اس کا تقرر عارضی طور پر کرتے تھے مستقل ہونے اور ترقی پانے کی شرط حسن کارکردگی ہوتی تھی۔ یزید بن ابی سفیان

کو شام کی مہم پر ایک دستہ فوج کا امیر مقرر کر کے روانہ کیا تو ان کو بہت سی ہدایات دیں جن کا ذکر آگے آرہا ہے ان ہدایات کا آغاز اس طرح کیا تھا۔

انی قد ولیتك لابلوك	میں نے تم کو اس لئے والی بنایا ہے کہ میں تمہیں آزماؤں
واجربك واخرجك	تمہارا تجربہ کروں اور تمہیں ٹریننگ دوں اگر تم نے
فان احسنت رددتك الی	اچھا کام کیا تو میں اس عہدہ پر تم کو برقرار رکھوں گا
عملك وزدتك وان	اور ترقی کر دوں گا۔ اور اگر تم نے برا کام کیا تو میں
اسأت عزلتك [1]	عہدہ سے الگ کر دوں گا۔

عمال کی معزولی تقرر کے بعد اگر کوئی عہدہ دار نا اہل ثابت ہوتا تھا تو حضرت ابوبکرؓ اس کو فوراً معزول بھی کر دیتے تھے اور اس میں تاخیر روا نہیں رکھتے تھے۔ گزر چکا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے خالد بن سعید کو عرب و شام کی سرحد پر اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کیلئے مقرر کیا تھا اور حکم دیا تھا کہ جب تک ان کو اجازت نہ ملے پیش قدمی نہ کریں لیکن خالد بن سعید نے سرحد پر رومی افواج کا اجتماع دیکھا اور ادھر خالد کی مدد کیلئے مدینے سے تازہ دم فوج پہونچ گئی تو انہوں نے پیش قدمی کی اجازت کا انتظار نہیں کیا اور حملہ کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فوج پسپا ہوگئی۔ حضرت ابوبکرؓ کو اطلاع ہوئی تو خالد بن سعید کو سخت تہدیدی خط لکھا اور اُن کے عہدہ سے ان کو معزول کر دیا۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:

اقم مکانك - فلعمری انك مقدام	تم اپنی جگہ ہی رُکے رہو۔ تم بڑے پیش قدمی کرنے والے
محجام نجاء من الغمرات لاتخوضها	ہو لیکن گہرائیوں میں گھسنے سے بھاگتے ہو۔ نہ تم ان
الی حق ولا تصبر علیه [2]	میں درست طریقے پر گھستے ہو اور نہ ان پر صبر کرتے ہو۔

پھر جب خالد مدینہ آئے تو اُن سے زبانی کہا کہ تم لڑائی کے موقع پر بڑی بزدلی دکھاتے ہو۔ جب خالد چلے گئے تو اس وقت جو لوگ آپ کے پاس تھے ان سے فرمایا کہ عمر اور علی خالد سے اچھی طرح واقف تھے اگر میں ان کی بات مان لیتا تو خالد سے پہلے ہی بچتا [3] یعنی ان کو عامل نہ بناتا۔

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۶ [2] طبری ج ۴ ص ۵۹۔

گورنروں کے فرائض آج کل کی اصطلاح میں حضرت ابوبکرؓ کی حکومت کو فوجی حکومت کہہ سکتے ہیں یعنی جو گورنر یا والی ہوتا تھا وہی فوج کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا چنانچہ ایک گورنر کے فرائض حسب ذیل تھے۔

(۱) مسجد میں جماعت کی امامت اور خصوصاً جمعہ کے روز خطبہ دینا۔
(۲) فوج کی نگرانی اور ان کی تنخواہ وغیرہ کا بندوبست کر کے اسے تقسیم کرنا۔
(۳) تمام محصولات کا جمع کرنا اور درآمد و برآمد اشیاء کی نگرانی کرنا۔
(۴) اپنے علاقہ میں امن و امان کی حفاظت کرنا اور لوگوں کی اخلاقی حالت سدھارنے کی کوشش کرنا۔
(۵) حدود اللہ جاری کر کے مجرموں کو سزا دینا۔
(۶) فتنہ پردازوں کے خلاف جنگ کرنا اور اس میں جو مال غنیمت ہاتھ آئے اس کو مسلمان فوجیوں میں تقسیم کرنا۔ اور اس کا خمس مرکز کو بھیجنا۔
(۷) ہر سال حج کیلئے جانے والے مسافروں کے قافلوں کا بندوبست کرنا اور ان کو حفاظت کے ساتھ سہولت سے پہونچانا۔
(۸) ضعیف العمر سپاہیوں کی پنشن اور ان کے متعلقین کی معاشی مدد کا انتظام و انصرام کرنا۔
(۹) کسانوں کا خاص طور پر خیال رکھنا اور جہاں تک ممکن ہو علاقہ کی زراعت کو ترقی دینا۔

عہدوں کی تقسیم لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک گورنر ہی تن تنہا سب کام انجام دیتا تھا بلکہ انتظامی امور کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے ہر شعبہ کو الگ الگ ذمہ دار افسروں کی نگرانی میں دیدیا جاتا تھا۔ خود آنحضرت ﷺ کے عہد میں یہی دستور تھا اور آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بھی اسی پر عمل کیا۔ چنانچہ خلافتِ صدیقی میں عمال و ولات کے علاوہ اور جن عہدوں کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہیں۔

عہدۂ قضاء عام طور پر مشہور ہے کہ قضا کا محکمہ سب سے پہلے حضرت عمر فاروقؓ نے قائم کیا مولانا شبلی نے الفاروق[1] میں اور پروفیسر ہٹی[2] نے "تاریخ عرب" میں یہی لکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود عہد نبوت میں قائم ہو چکا تھا۔ کتب حدیث میں "کتاب الاقضیہ"

[1] مطبوعہ نحو المطابع حصہ دوم ص ۴۸ [2] چوتھا ایڈیشن ص ۱۷۳

کے عنوان سے جو باب ہے اس میں ایسی احادیث و روایات منقول ہیں جن سے صاف
معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قاضی کے فرائض و واجبات۔ عہدہ کے شرائط و آداب، شہادت
کے احکام وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان فرمائے تھے۔ اگرچہ معاملات خصومت میں
آخری فیصلہ آپ ہی کا نافذ ہوتا تھا، لیکن مملکت میں توسیع کے باعث ہر معاملہ اور مقدمہ
آپ خود فیصل نہیں کر سکتے تھے اس لئے مختلف علاقوں میں اپنی جانب سے قاضی بھی
مقرر فرما دیتے تھے۔ اور ان کو اس سلسلہ میں خاص خاص ہدایات دی تھیں چنانچہ حضرت
علیؓ کو یمن کا قاضی مقرر فرمایا تو حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ میں تو کم عمر ہوں اور مجھ کو قضا
کا کوئی علم نہیں ہے آنحضرت ﷺ نے جواب دیا "اللہ تمہارے قلب کو راہ دکھلائیگا اور
تمہاری زبان کو استواری بخشے گا جب تم دو آدمیوں کا جھگڑا چکانے بیٹھو تو
جس طرح تم نے پہلے فریق کی بات سنی ہے اسی طرح جب تک دوسرے
کی نہ سن لو کوئی فیصلہ نہ کرو۔ یہی طریقہ ہے جس سے فیصلہ کرنا تمہارے لئے آسان ہوگا۔[1]
اسی طرح حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا جب تمہارے سامنے
خصومات آئیں تو تم کیونکر حکم (قضا) کروگے انہوں نے کہا کہ کتاب اللہ کی روشنی میں پھر
دریافت فرمایا۔ لیکن اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو؟ عرض کیا سنت رسول اللہ کی روشنی میں
اب سوال ہوا اور اگر سنت رسول اللہ میں بھی نہ پاؤ گے؟ انہوں نے جواب دیا، ایسی صورت میں
اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا اور اسمیں کوئی کوتاہی نہ ہونے دونگا۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ
نے مسرت سے حضرت معاذ کا سینہ تھپتھپایا اور فرمایا "جمیع حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے
رسول اللہ کے رسول کو اس کی توفیق دی جو رسول اللہ کا پسندیدہ ہے۔[2]

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے عہد میں حضرت علیؓ اور حضرت معاذ اور بعض اور صحابہ
کو جن کے نام آگے آتے ہیں، اس خدمت قضا پر مامور رکھا، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے
کہ کتب تاریخ و سیر میں ان حضرات کو عہد صدیقی کے ارباب افتا کہا گیا ہے اور جیسا
کہ علامہ سرخسی نے تصریح کی ہے۔ صدر اول میں قاضی کو بھی مفتی کہتے تھے۔ یہ حضرات[3]

[1] سنن ابی داؤد باب کیف القضاء [2] سنن ابی داؤد باب اجتہاد الرای فی القضاء [3] المبسوط ج ١١ ص ١٠٩

لیکن حضرت عمر فاروقؓ قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس کے عہدہ پر مامور تھے اور
اہم معاملات کا فیصلہ آپ ہی کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ تاریخوں میں حضرت
عمر کے لئے افتاء کا نہیں بلکہ صرف قضا کا لفظ آتا ہے۔
طبری میں ہے کہ جب حضرت ابو بکر خلیفہ ہوئے تو حضرت عمر نے خود فرمایا "انا اکفیک
القضاء" میں آپ کیلئے قاضی کا کام کروں گا۔ لیکن چونکہ وہ خیر القرون کا دور تھا
اس لئے سال بھر تک باہمی خصومت کا کوئی معاملہ ہی حضرت عمر کے سامنے پیش نہیں آیا۔[1]

طبری کے علاوہ ابن اثیر میں ہے ۔

وفیها استقضی ابوبکر عمر بن الخطابؓ	اور اس سال ابوبکر نے عمر بن الخطاب کو قاضی بنایا
کان یقضی بین الناس خلافته کلها[2]	اور خلافت صدیقی بھر قضا کا کام کرتے رہے۔

حضرت عمر اپنے اس حق قضا کو آزادی کے ساتھ استعمال کرتے تھے اور حضرت ابوبکر
کی رائے کی بھی پروا نہیں کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن
حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور ایک بے کار زمین جو ان کی طرف پڑی ہوئی تھی
اس کا مطالبہ کیا چونکہ یہ دونوں مؤلفۃ القلوب میں سے تھے اس لئے حضرت ابوبکر
نے ان کی درخواست منظور کر لی اور زمین کا پٹہ انکے نام لکھ دیا۔ اب یہ دونوں
حضرت عمر کے پاس آئے تاکہ یہ دستاویز خلافت کی ان سے توثیق کرالیں لیکن حضرت عمر نے
دیکھتے ہی سخت غضبناک ہوئے اور یہ دستاویز ان کے ہاتھوں سے لے کر چاک کر دیا
اور فرمایا رسول اللہ ﷺ اس زمانہ میں تمہاری دل جوئی کرتے تھے جبکہ اسلام کمزور تھا اب
اسلام کافی مضبوط ہے۔ تم سے جو کچھ ہو سکے کر دیکھو۔ یہ دونوں وہاں سے لوٹ کر پھر
حضرت ابوبکر کی خدمت میں آئے اور بولے خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ "حضرت ابوبکر
نے جواب دیا خلیفہ تو عمر ہی ہوتے اگر وہ چاہتے۔" یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حضرت
عمر بھی غصہ میں بھرے ہوئے آ پہنچے اور حضرت ابوبکر سے بازپرس کرنے لگے کہ آپ
نے یہ زمین کا قطعہ ان دونوں کو کس طرح دیا؟ یہ آپ کی ملکیت ہے یا مسلمانوں کی

[1] طبری ج ٣ ص ٦١٧ [2] ابن اثیر ج ٢ ص ٢٦ [3] الاصابہ ج ٣ ص ٥٥ ذکر عیینہ بن حصن الفزاری۔

حضرت ابوبکرؓ بولے "مسلمانوں کی" حضرت عمرؓ نے کہا "تو پھر آپ کو کیا حق تھا کہ ان دو آدمیوں کو بخشدیں" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اس وقت جو لوگ میرے پاس موجود تھے میں نے ان سے مشورہ کر لیا تھا۔ آخر حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور حضرت عمرؓ کے فیصلہ کو بحال رکھا بلکہ ایک روایت میں تو یہاں تک ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی تحریر چاک کر دی تھی۔ اس کے بعد عیینہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں آیا اور درخواست کی کہ ایک دوسری تحریر لکھ دیں تو آپ نے فرمایا "لا اجدد شیئاً ردّہ عمرؓ" میں اس کی تجدید نہیں کروں گا جس کو عمرؓ نے رد کر دیا ہے [1]

ایک نکتہ | اس واقعہ سے ایک یہ نکتہ بھی ہاتھ آتا ہے کہ اگرچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جس طرح صیغۂ عدالت (GUDICIAL) محکمہ امر و تنفیذ (EXECATIVE) سے باقاعدہ الگ قائم کر دیا گیا تھا حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایسا نہیں تھا۔ لیکن جہاں تک اصل اسپرٹ اور احساس کا تعلق ہے کہ یہ دونوں صیغے الگ الگ ہونے چاہئیں جیسا تہذیب و تمدن کے دورِ ترقی میں ہوتا ہے وہ بہر حال عہد صدیقی میں بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔

وزارت عظمیٰ | اگرچہ اس زمانہ میں وزارت کا عہدہ باقاعدہ نہیں تھا لیکن جہاں تک وزارت کے فرائض کا تعلق ہے وہ بھی حضرت عمرؓ سے متعلق تھے۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کے مشیر خصوصی اور امور مملکت میں دست راست تھے اور اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ ان کو اپنے ساتھ مدینہ میں ہی رکھتے تھے کسی مہم پر نہیں بھیجتے تھے۔ آنحضرتؐ نے جیش اسامہ میں شرکت کیلئے جن کو نامزد کیا تھا ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے لیکن لشکر کی روانگی سے قبل حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہ سے درخواست کی کہ اگر وہ عمر فاروقؓ کو مدینہ ہی میں چھوڑ جائیں تو بہتر ہے تاکہ وہ امور خلافت میں ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھا سکیں [2]

وزارت خزانہ | بیت المال کا قیام آنحضرتؐ کے عہد میں ہی عمل میں آگیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کا اہتمام و انتظام حضرت عبیدہؓ کے سپرد کیا جو بیت المال کی آمدنی اور خرچ کا پورا حساب رکھتے اور اس کی نگرانی کرتے تھے۔ چنانچہ خلیفۂ اول کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے ابوعبیدہ

---

[1] کتاب الاموال ابو عبیدہ ص ۲۷۰ [2] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۲۷ [3] طبقات ابن سعد قسم اول جلد ۳ ص ۱۵۱

سے پوچھا کہ شروع سے اس وقت تک خزانہ میں مال کس قدر آیا ہوگا۔ انہوں نے جواب دیا "دو لاکھ دینار" [1]

عہدۂ کتابت | چونکہ اہم فرامین و احکام کاتب کو ہی لکھنے ہوتے ہیں اس لئے کتابت کا عہدہ بھی بڑا اہم ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اس عہدہ کا کام وقتی طور پر ان لوگوں سے بھی لے لیتے تھے جو ضرورت کے وقت ان کے پاس موجود ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ جو حضرات خاص اسی کام پر متعین تھے۔ وہ حضرت زید بن ثابت اور حضرت عثمان بن عفانؓ ہیں

عمال کے نام احکام بھیجنے کا طریقہ | عمال کو حضرت ابوبکرؓ کوئی حکم بھیجتے تھے تو آپ کا طریقہ وہی ہوتا تھا جو خود آنحضرتؐ کا تھا۔ یعنی "من ابی بکر الی فلاں" سے آغاز کرتے تھے۔ یہ طریقہ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کے ابتدائی دور تک قائم رہا۔ جب ولید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اس نے اس کو بدل دیا۔ اور حکم دیا کہ لوگ ہم کو اس طرح خطاب نہ کریں۔ جس طرح وہ آپس میں ایک دوسرے سے خطاب کرتے ہیں۔ [2]

عہدۂ افتاء | افتاء یعنی شرعی حکم بتانے کے لئے تقویٰ و طہارت کے علاوہ تفقہ کی ضرورت ہے۔ اور یہ محض ایک وہبی دولت ہے خدا جس کو چاہے بخشدے۔ ہر عالم دین اس سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جو حضرات فقیہ سمجھے جاتے تھے اور اس بنا پر افتاء کا عہدہ ان کے سپرد تھا ان کے نام یہ ہیں۔ حضرت علی۔ حضرت معاذ بن جبل۔ ابی بن کعب۔ زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود [3]

پولیس | روزمرہ کے انتظام کیلئے غالباً مستقل پولیس کی شکل میں کوئی خاص محکمہ نہیں تھا اور حق یہ ہے کہ اس زمانہ خیر القرون میں اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تاہم ضرورت پیش آتی تھی تو فوری طور پر چند بہادر مردوں کو اس کام پر مامور کر دیا جاتا تھا چنانچہ جیش اسامہ کی مدینہ سے روانگی کے بعد بعض قبائل کی طرف سے مدینہ پر حملہ کا خطرہ ہوا تو حضرت علی اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ کام لیا گیا۔

عمال کو ہدایات | حضرت ابوبکرؓ جب کسی شخص کو کوئی ذمہ داری سونپتے یا کسی عہدہ پر

---

[1] طبری ج ۲ ص ۶۱۷ [2] العقد الفرید باب التوقیعات فصل استفتاح الکتب [3] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص [illegible]

انکو مقرر فرماتے تو اس سے متعلق فرائض ایک ایک کرکے بیان کرتے اور آپ عہد لیتے کہ وہ ان پر عمل کریگا۔ حضرت اسامہ کی قیادت میں آپنے جو لشکر عرب و شام کی سرحد پر روانہ کیا تھا جب وہ چلنے لگا۔ تو آپنے اس کو روک کر دس ہدایتیں دیں، آپنے فرمایا۔

ایها الناس قفوا اوصیکم بعشر فاحفظوها عنی ولا تخونوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا طفلا صغیراً ولا شیخاً کبیراً ولا امرأة ولا تعقروا نخلاً ولا تحرقوه ولا تقطعوا شجرةً مثمرةً ولا تذبحوا شاةً ولا بقرةً ولا بعیراً الا لمأکلة وسوف تمرون باقوام قد فرغوا انفسهم فی الصوامع فدعوهم وما فرغوا انفسهم له وسوف تقدمون علی قوم یأتونکم بآنیة فیها الوان الطعام فاذا اکلتم منها شیئاً بعد شیء فاذکروا اسم الله علیها وتلقون اقواماً قد فحصوا اوساط رؤسهم وترکوا حولها مثل العصائب فاخفقوهم بالسیف خفقاً اندفعوا باسم الله افناکم الله بالطعن والطاعون [1]

لوگوں! ذرا ٹھہرو میں تم کو دس باتوں کی وصیت کرتا ہوں تم ان کو یاد رکھو دیکھو خیانت نہ کرنا فریب نہ کرنا، سرکشی نہ کرنا۔ دشمن کے ہاتھ پاؤں مت کاٹنا۔ چھوٹے بچے کو بوڑھے کو اور عورت کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درخت کو نہ اکھاڑنا اور نہ اس کو جلانا۔ پھلدار درخت کو مت کاٹنا بکری گائے یا اونٹ کھانے کے سوا ذبح نہ کرنا۔ اور ہاں تم ایسے لوگوں سے دوچار ہونگے جنہوں نے اپنی زندگی عبادت خانوں کیلئے وقف کردی ہے تم ان لوگوں کو کچھ نہ کہنا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ اور تم کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو تمہارے پاس الوان نعمت لیکر آئیں گے تم ان کھانوں میں سے یکے بعد دیگرے جب کچھ کھاؤ تو ان کھانوں پر اللہ کا نام لو۔ اور تم کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کے سر بیچ میں سے منڈے ہوں گے تم ان کو تلوار سے کھٹکھٹانا۔ جاؤ اللہ کا نام لیکر خدا کرے اللہ تعالیٰ تم کو دشمن کے نیزوں سے اور طاعون سے بچائے

اسی طرح شام کی طرف لشکر روانہ کئے تو ایک لشکر کے قائد حضرت یزید بن ابی سفیان کو مفصل ہدایات دیں۔ یہ اگرچہ طویل ہیں لیکن آئین دوستی دنیا کا شاہکار ہیں اسلئے ہم ذیل میں تماماً نقل کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا۔

[1] طبری ج ۲ ص ۴۶۳

علیک بتقوی الله فانه یری من باطنک مثل الذی من ظاهرک وان اولی الناس بالله اشدهم تولیاً له واقرب الناس من الله اشدهم تقرباً الیه بعمله وقد ولیتک عمل خالد فایاک وعبیة الجاهلیة فان الله یبغضها ویبغض اهلها واذا قدمت علی جندک فاحسن صحبتهم وابدأهم بالخیر وعدهم ایاه واذا وعظتهم فاوجز فان کثیر الکلام ینسی بعضه بعضاً واصلح نفسک یصلح لک الناس وصل الصلوات لاوقاتها باتمام رکوعها وسجودها والتخشع فیها واذا قدم علیک رسل عدوک فاکرمهم واقلل لبثهم حتی یخرجوا من عسکرک وهم جاهلون به ولا ترینهم فیروا خللک ویعلموا علمک وانزلهم فی ثروة عسکرک وامنع من قبلک من محادثتهم وکن انت المتولی لکلامهم ولا تجعل سرک لعلانیتک فیختلط امرک واذا استشرت فاصدق الحدیث

تم اللہ سے تقویٰ کو لازم پکڑو کیونکہ وہ تمہارے باطن کو تمہارے ظاہر کی طرح دیکھتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ بہتر آدمی وہی ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتا ہے۔ اور اللہ کا سب سے زیادہ مقرب بندہ وہی ہے جو اپنے عمل کے ذریعہ سب سے زیادہ اللہ کے قریب ہے۔ میں نے تم کو خالد کا کام سپرد کیا ہے اسلئے تم جاہلیت کی باتوں سے بچو۔ کیونکہ اللہ ان باتوں کو اور ایسے لوگوں کو مبغوض رکھتا ہے اور تم جب اپنے لشکر کے پاس پہونچو تو خوش خلقی کے ساتھ پیش آؤ اور بھلائی کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کرو اور ان سے اس کا وعدہ بھی کرو۔ اور جب ان کو نصیحت کرو تو اختصار سے کام لو کیونکہ کثرت کلام میں آدمی بھول جاتا ہے کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اپنے نفس کی اصلاح کرو تو لوگ تمہارے لئے ٹھیک رہیں گے اور نمازیں مع مکمل رکوع و سجود اور خشوع کے انکے اوقات میں ادا کرو اور جب دشمن کے قاصد تمہارے پاس آئیں تو ان کا اکرام کرو۔ اور ان کا قیام مختصر رکھو تاکہ وہ تمہارے لشکر سے جائیں تو اس سے بے خبر ہوں اور ان کو اپنا لشکر مت دکھاؤ ورنہ وہ تمہارا خلل دیکھ لیں گے۔ اور تمہارے حال سے واقف ہوجائیں گے۔ ان قاصدوں کو لشکر کی اچھی جگہ میں اتارو

تصدق المشورة ولا تخزن عن المشير
خبرك فتؤتى من قبل نفسك واسمر
بالليل في أصحابك تأتك الأخبار
وتنكشف عندك الأستار وأكثر
حرسك وبددهم في عسكرك
وأكثر مفاجأتهم في محارسهم بغير
علم منهم بك فمن وجدته
غفل عن محرسه فأحسن أدبه
وعاقبه في غير إفراط وأعقب بينهم
بالليل واجعل النوبة الأولى أطول
من الآخرة فإنها أيسرهما لقربها
من النهار ولا تخف من عقوبة
المستحق ولا تلجن فيها ولا تسرع
إليها ولا تخذلها ولا تغفل
عن أهل عسكرك فتفسده ولا
تجسس عليهم فتفضحهم ولا تكشف
الناس عن أسرارهم واكتف بعلانيتهم
ولا تجالس العباثين وجالس أهل
الصدق والوفاء، واصدق اللقاء ولا
تجبن فيجبن الناس، واجتنب الغلول فإنه
يقرب الفقر ويدفع النصر وستجدون أقواما
حبسوا أنفسهم في الصوامع - فدعهم
وما حبسوا أنفسهم له [1]

اور اپنے لوگوں کو ان سے بات چیت کرنے سے منع کرو۔ تم خود ہی ان سے گفتگو کرو۔ اپنے بھید کسی پر نہ کھولو ورنہ سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائیگا۔ بات سچ کہو تو مشورہ بھی سچ ہوگا۔ اور اپنی کوئی بات اپنے مشیروں سے نہ چھپاؤ ورنہ بات تمہارے ہی سر آ پڑے گی۔ اور رات کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ بات چیت کیا کرو۔ تاکہ تم کو خبریں معلوم ہوں اور پوشیدہ باتوں کا تم کو علم ہو۔ اپنے محافظین کی تعداد زیادہ رکھو اور اپنے لشکر میں ان کو پھیلا دو۔ اور بسا اوقات ان کی بے خبری میں ان کی چوکیوں پر پہنچ جایا کرو۔ پھر جس شخص کو اپنی چوکی سے غافل پاؤ اسکی اچھی طرح سرزنش کرو۔ اور بغیر زیادتی کے اس کو سزا دو۔ اور رات کو انکے درمیان باری مقرر کرو۔ اور پہلی باری کو بہ نسبت دوسری کے زیادہ طویل کرو۔ کیونکہ دن سے قریب ہونے کے باعث یہ زیادہ آسان ہوگی۔ مستحق سزا کو سزا دینے میں نہ جھجکنا۔ اسکے معاملہ میں نہ زیادہ تردد کرو اور نہ جلدی کرو۔ اور نہ اسکو بے اثر کرو۔ اور اہل لشکر سے غافل نہ بیٹھو ورنہ تم اسکو خراب کر دوگے اور زیادہ انکی کھوج کرید بھی نہ کرو ورنہ تم انکو رسوا کر دوگے۔ لوگوں کے بھید معلوم کرنیکی کوشش نہ کرو۔ اور جو ان کے ظاہری احوال ہوں ان پر بس کرو۔ بیکار آدمیوں کے پاس نہ بیٹھو اور سچ کر دکھاؤ اور بزدلی نہ دکھاؤ ورنہ لوگ بزدلی دکھائیں گے۔ خیانت سے بچو کیونکہ خیانت فقر کا باعث ہوتی ہے اور مدد کو دور کرتی ہے اور تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو عبادت گاہوں میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے ہیں تم انکو انکے حال پر چھوڑ دو۔

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۰۰

تقویٰ وطہارت کی عام تاکید یہ ہدایات وہ ہیں جو ہر شخص کو الگ الگ اس کے عہدہ اور منصب کے اعتبار سے دی جاتی تھیں ان کے علاوہ تقویٰ وطہارت۔ خوف خدا۔ فرائض کی انجام دہی میں امانت ودیانت ان چیزوں کی تاکید وہدایت تو آپ ہر خطبہ میں، ہر فرمان اور خط میں، ہر مجلس اور محفل میں کرتے رہتے تھے۔

مثلاً عمرو بن العاص اور ولید بن عقبہ کو قبیلۂ بنو قضاعہ پر عامل صدقات مقرر کر کے روانہ کیا تو انکی مشایعت کے لیے کچھ دور تک خود تشریف لائے اور رخصت ہوتے وقت ہر ایک کو یہ ہدایت کی۔

اِتَّقِ اللّٰهَ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ
فَإِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ
مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا
يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ
عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا
فإن تقوى الله خير ما تواصى به
عباد الله - إنك في سبيل من سبل
الله لا يسعك فيه الإدهان و
التفريط والغفلة عما فيه قوام [1]
دينكم وعصمة أمركم - فلا تن ولا تفتر

باطن وظاہر میں اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے۔ اللہ اس کیلئے سہولتیں پیدا کر دیتا ہے اور جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا وہاں سے اس کو رزق دیتا ہے۔ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اسکے گناہ معاف کر دیتا ہے اور اس کا اجر بڑھاتا ہے۔ بے شبہ اللہ سے تقویٰ بندگان خدا کی آپس میں بہترین نصیحت ہے تم اللہ کے ایسے راستہ میں ہو جس میں افراط وتفریط اور مداہنت کی گنجائش نہیں ہے جس میں دین کا استحکام اور خلافت کی حفاظت کا راز مضمر ہے۔ پس تم سستی اور کاہلی مت اختیار کرو۔

یزید بن ابی سفیان کو ہدایات دیتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے لکھا

ومن أعطى أحدا حمى الله فقد
انتهك في حمى الله شيئا بغير حقه
فعليه لعنة الله [2]

اور جو شخص کسی کو اللہ کی چراگاہ عطا کرے (کوئی عہدہ دے) اور وہ بغیر کسی حق کے اس چراگاہ میں ارتکاب محرمات کرے (عہدہ میں خیانت کرے) تو اس پر اللہ کی لعنت ہوگی۔

عمال وامراء سے احتساب مفصل ہدایات اور احکام دینے کے بعد کوئی عہدہ دار خواہ کتنی ہی دور اور نظروں سے اوجھل ہوتا حضرت ابو بکر بہرحال اسکی ایک ایک حرکت پر کڑی نگاہ رکھتے تھے

[1] طبری ج ۳ ص ۸۸ ۵
[2] مسند امام احمد ج ۱ ص ۶

اور جہاں اور جب کوئی نقص نظر آتا فوراً اس پر متنبہ فرماتے یا باز پرس کرتے تھے۔ چنانچہ مہاجر بن ابی امیہ کی نسبت معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک عورت جو مسلمانوں پر سب وشتم کرتی تھی اس کے دانت اکھڑوا دیئے ہیں۔ تو فوراً ان کو سخت سرزنش کا خط لکھا جس میں دلائل سے یہ ثابت کیا تھا کہ ان کا یہ عمل صریح ظلم اور ناجائز ہے اور آخر میں تحریر کیا کہ چونکہ یہ تمہارا پہلا جرم ہے اس لیے معاف کرتا ہوں۔ ورنہ سزا دیتا[1]

حضرت ابو بکرؓ حضرت خالد کے کس درجہ قدر داں اور مداح تھے؛ یہ صفحاتِ گزشتہ سے معلوم ہو چکا ہے بایں ہمہ جنگِ یمامہ کے فوراً بعد ہی انہوں نے مجاعۃ کی لڑکی سے نکاح کر لیا تو حضرت ابو بکرؓ نے اُن کو سخت تہدیدی خط لکھا کہ۔

لعمری یا ابن ام خالد انک — بے شبہ اے خالد کی ماں کے بیٹے! تیرا دل بڑا

لفارغ تنکح النساء وبفناء بیتک — بے رحم ہے تو عورتوں سے نکاح اس وقت کرتا ہے

دم الف ومائتے رجل من المسلمین — جبکہ تیرے گھر کے صحن میں بارہ سو مسلمانوں کا

لم یجفف بعدُ[2] — خون ابھی تک خشک نہیں ہوا ہے۔

طبری بیان ہے یہ خط اس درجہ غضب آلود تھا کہ گویا اس سے خون ٹپک رہا تھا۔

اسکے بعد عراق میں جنگِ فراض کے ختم ہوتے ہی حضرت خالد حضرت ابو بکر کی اجازت کے بغیر چھپ چھپا کر حج کر آئے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کو اطلاع ہوئی تو سخت عتاب کا خط لکھا۔

طبری کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت خالد کو شام کی مہم پر جو روانہ کیا تھا وہ حضرت خالد کے اسی جرم کی پاداش میں تھا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ آئندہ وہ اس کا ارتکاب نہ کریں[3]

<u>معمولی غلطیوں سے اغماض</u> | ایک فرمانروا کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ عمال وکار کنانِ حکومت کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے اور جب ان سے کوئی غلطی ہو تو احتساب کرے ساتھ ہی اس میں اس درجہ تحمل ہونا چاہیئے کہ معمولی بھول چوک سے چشم پوشی کرے اور اگر ضرورت ہو تو تھوڑی بہت تنبیہ کر دے۔ معمولی معمولی باتوں پر سرزنش کرنا اصول حکمرانی کے خلاف ہے حضرت ابو بکرؓ میں احتساب کی قوت کے ساتھ یہ وصف بھی بدرجۂ اتم تھا۔ طبری میں ہے۔

---

[1] طبری ج ۴ ص ۵۰۰۵ [2] طبری ج ۴ ص ۵۱۹ [3] ایضاً ص ۸۰۰

وکان ابو بکرٍ لا یقید من عماله ولا وزعته[1] — ابو بکر اپنے عمال اور کار پردازانِ حکومت پر زیادہ دارو گیر اور خردہ گیری نہیں کرتے تھے۔

<u>عمال کی تنخواہ</u> | عمال وکار پردازانِ حکومت کی تنخواہ کا رواج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ تنخواہ کی مقدار کی تعیین میں عہدہ کی حیثیت اور اس کے ضروری اخراجات ولوازم کی رعایت بھی ہوتی تھی مثلاً گھوڑا۔ ہتھیار۔ خادم وغیرہ۔ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے۔ "ہم میں سے جو کوئی شخص بھی والی ہو" اگر اس کے بیوی نہ ہو تو بیوی کرے نوکر نہ ہو تو نوکر رکھے۔ گھر نہ ہو تو گھر بنائے یا کرایہ پر لے۔ سواری کا جانور نہ ہو تو وہ لے اس سے زیادہ جو لے گا وہ یا خائن ہے یا چور[2]

گورنر یا کوئی اور عہدہ دار تو الگ رہا۔ خود خلیفہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ اللہ کے مال میں سے خلیفہ کے لیے صرف دو پیالے لینا جائز ہیں ایک پیالہ اہل وعیال کیلئے اور دوسرا لوگوں کی خاطر مدارت کے لیے[3]

عتاب بن اسید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مکہ کے عامل تھے اور عہد صدیقی میں بھی اسی عہدہ پر فائز رہے۔ انکو تیس درہم ماہانہ تنخواہ ملتی تھی[4] ظاہر ہے یہ قلیل تنخواہ ناگزیر ضروریاتِ زندگی کی ہی کفیل ہو سکتی تھی اس میں اتنی گنجائش کہاں تھی کہ وہ پس انداز کر سکیں چنانچہ اس منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد اس زمانہ کی کمائی کی یادگار جو چیز ان کے پاس بچی تھی وہ صرف دو کپڑے تھے جو انہوں نے اپنے غلام کے ساتھ کو پہنا دیئے تھے[5]

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں بہ نسبت عہدِ نبویؐ کے ریاستی آمدنی بڑھ گئی تھی۔ اس بنا پر تنخواہوں کی مقدار میں بھی اضافہ ہوا ہوگا۔ بہر حال حضرت ابو بکر کا اصول یہ تھا کہ تنخواہیں (اصل ضروریات زندگی کے لحاظ سے) سب کی برابر رکھتے تھے۔ مؤرخ یعقوبی کا بیان ہے۔

وقسم ابو بکر بین الناس بالسویة لم یفضل احدًا علی احد[6] — اور ابو بکر لوگوں میں برابر سرابر تقسیم کرتے تھے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۰۰ [2] کنز العمال برحاشیہ مسند امام احمد بن حنبل ج ۳ ص ۱۲۲ [3] کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۲ [4] ترتیب الاداریۃ الکتانی ج ۱ ص ۲۴۹ [5] الاصابہ ج ۴ ص ۴۴۴ تذکرۂ عتاب بن اسید [6] الاصابہ

ایک مرتبہ مال آیا اور آپ نے اس کو حسب معمول برابر برابر تقسیم کر دیا اور فرمایا "مجھ کو یہ پسند ہے کہ میں بقدرِ ضرورت لینے پر اکتفا کروں۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو جہاد کیا ہے وہ خالص اللہ کے لیے رہے" [1]

حضرت ابوبکرؓ کی تنخواہ حضرت ابوبکرؓ شروع میں تو کوئی تنخواہ لیتے ہی نہیں تھے سُنح میں جو تجارت ان کا ذریعہ معاش تھی اسی پر گزر بسر کرتے تھے۔ لیکن جب امورِ خلافت میں انہماک بڑھا تو اب چونکہ تجارت میں مشغولیت فرائضِ خلافت کی بجاآوری میں رخنہ انداز ہو سکتی تھی اس لیے حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کے کہنے پر آپ نے بقدرِ ضرورت اپنی تنخواہ بھی مقرر کر لی لیکن اس تنخواہ کی مقدار کیا تھی؟ اس میں مختلف روایات ہیں۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ آپ تین درہم یومیہ لیتے تھے [2] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ ہزار درہم سالانہ لیتے تھے اور ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے کل مدتِ خلافت میں بیت المال سے اپنے گھر کے خرچ کے لیے صرف چھ ہزار درہم لیے تھے۔ لیکن وفات کے وقت اپنی بیٹی حضرت عائشہؓ کو وصیت کی کہ یہ رقم بھی ان کی جائیداد کو فروخت کر کے بیت المال میں جمع کر دی جائے [3]

اس بنا پر ہمارا خیال ہے کہ شروع میں حضرت ابوبکر نے صحابہ کے کہنے سننے سے اپنا وظیفہ مقرر ضرور کر لیا تھا لیکن اس کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ زندگی بہت سادہ اور گھر کی ضرورتیں مختصر تھیں۔ اس لیے صرف بقدرِ ضرورت لیتے تھے اور اگر کبھی گنجائش دیکھی اور کوئی غیر معمولی ضرورت اچانک پیش آگئی تو مقررہ رقم سے زیادہ بھی لے لیتے تھے اور یہ جو کچھ کرتے تھے اہلِ شوریٰ کے مشورہ اور ان کی اجازت سے کرتے تھے۔

غور کرو! کیا اس سے بڑھ کر جمہوری سوشلسٹ گورنمنٹ دنیا کی تاریخ میں کوئی اور بھی ہوئی ہے۔

---

[1] کتاب الاموال ص ۲۶۲ [2] یعقوبی ج ۲ ص ۱۵۴ [3] کتاب الاموال ص ۲۶۷۔

مالی نظام

ریاست کے ذرائع آمدنی اور مصارف

حضرت ابوبکرؓ کا مختصر عہدِ خلافت جو کچھ بھی تھا تمام تر جزیرہ عرب کے اندر ملی استحکام قومی وحدت اور بیرونی حملوں سے اس کی حفاظت کے کاموں میں مصروف رہا اس لیے آپ کو اتنی فرصت نہیں ملی کہ حضرت عمرؓ فاروق کی طرح حکومت کے مختلف کاموں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے ہر ایک شعبہ کیلئے جدا جدا محکمہ قائم کرتے ہر محکمہ کے الگ الگ عہدہ دار مقرر فرماتے اور اس کیلئے آئین و ضابطہ کی حد بندی کرتے۔ اس بنا پر عہدِ صدیقی کے نظم و نسق اور معاملات و مسائلِ حکومت و ریاست میں وہی سادگی پائی جاتی ہے جو آنحضرتؐ کے عہدِ مبارک میں پائی جاتی تھی۔ اس بنا پر حضرت ابوبکرؓ کے مالی انتظامات کو سمجھنے کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ خود عہدِ نبوت میں مالی نظام کیا تھا۔

عہدِ نبوت میں نظامِ مالی دوسرے احکام کی طرح انفاقِ مال سے متعلق احکام دفعۃً نازل نہیں ہوئے بلکہ تدریجی طور پر حسبِ موقع و ضرورت نازل ہوئے یا زبانِ حق ترجمانِ نبوت سے ادا ہوتے رہے اس سلسلہ میں سب سے پہلی منزل تو ترغیبِ دعوت کی تھی۔ یعنی اس وقت تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آنحضرتؐ مکہ میں تیار رکھتے تھے اور مختلف عزیزوں کے لئے روپیہ درکار تھا چنانچہ آپ نے فرمایا: "اپنے آپ کو دوزخ سے بچانے کیلئے تم کو خرچ کرنا چاہیے خواہ وہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی ہو" [1] اس کے علاوہ قرآن میں بھی

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۳۲۰۔

بہت سی ترغیبات ہیں اس کے بعد جب آپ نے ہجرت کی اور صحابہ کرام اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ آنے لگے تو اب سب سے بڑا مسئلہ ان مہاجرین کی آبادکاری کا تھا اور ظاہر ہے روپیہ کے بغیر یہ حل نہیں ہو سکتا۔ آپ نے اس پیچیدہ ترین گتھی کو اس خوبی کے ساتھ حل کیا کہ تاریخ میں اس جیسی نظیر مشکل سے ہی مل سکتی ہے آپ نے انصار اور مہاجرین میں مواخات کرا دی۔ اس مواخات میں یہ شرط تھی کہ مہاجر اور انصار دونوں ایک ساتھ مل کر کام کریں گے اور وراثت تک میں ایک دوسرے کے شریک رہیں گے۔ اس طرح مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ لیکن دوسرے کاموں کیلئے روپیہ کی بھی ضرورت تھی۔ اس لئے اب صدقات و خیرات کے کار خیر ہونے کا اعلان ہوا آنحضرتؐ نے اس کا یہ نظم قائم کیا کہ تمام صدقات و خیرات خود وصول فرماتے اور ارباب حوائج پر تقسیم فرما دیتے، لیکن یہ خیرات خود آپ کے اور بنو ہاشم کیلئے حرام تھی۔ اس طرح آنحضرتؐ نے ان بدعنوانیوں کا خاتمہ کر دیا جو عام طور پر پبلک فنڈ کے حوالوں سے صادر ہوتی ہے بلکہ دنیا کی عظیم الشان بادشاہتوں کا تو تخیل ہی یہ رہا ہے کہ ملک کا جو روپیہ خزانہ میں آتا ہے وہ بادشاہ کی ملک ہے اور اس کو حق ہے کہ اس روپیہ کو اپنی ذات اور اپنے متعلقین پر جس طرح چاہے خرچ کرے

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا اس کے بعد صدقہ و خیرات کا عام حکم نازل ہوا۔ لوگوں نے پوچھا حضور! ہم کیا خرچ کریں؟ ارشاد ہوا ضروریات زندگی پوری کرنے سے جو کچھ بچ رہے۔ "یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ" پھر جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں اور تجارتی کاروبار کو فروغ ہوا تو اب حکم ہوا،

یا ایہا الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم و مما اخرجنا لکم من الارض۔ (بقرہ)
اے ایمان والو اچھی چیزیں جو تم کماؤ اور جن کو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہے اس میں سے خرچ کرو

لیکن اس وقت تک چونکہ تمام عرب مطیع نہیں ہوا تھا اسلام صرف ایک تحریک کی صورت میں تھا اور باقاعدہ کوئی ریاست (STATE) قائم نہیں ہوئی تھی۔

اس لیے انفاق مال اور اس کے جمع و خرچ کا کوئی باقاعدہ نظم قائم نہیں ہوا۔ ۸ھ میں مکہ کی فتح کے بعد آخر اس کا بھی وقت آگیا اور اس کا پورا انتظام قائم کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ آیت نازل ہوئی۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔
اے محمدؐ آپ ان لوگوں کے مالوں سے صدقہ (زکوۃ) وصول کیجئے تاکہ آپ ان کو اس ذریعہ سے پاک و صاف بنا دیں۔

اس کے بعد ۹ھ کے آخر میں سورۂ توبہ کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں زکوۃ کے احکام اس کی اہمیت و ضرورت۔ اس کے مصارف اور ساتھ ہی جزیہ کا حکم۔ یہ سب کچھ نازل ہوا ان کی روشنی میں ۹ھ میں آنحضرتؐ نے باقاعدہ عمال و محصلین کا تقرر فرمایا۔ زکوۃ کے احکام و قوانین مرتب فرمائے اور ان احکام کیساتھ عمال کو زکوۃ وصول کرنے کی غرض سے مختلف علاقوں اور قبیلوں میں روانہ کیا یہ وہ وقت ہے جب زکوۃ کی حیثیت ایک ریاستی ٹیکس (STATE TAX) کی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بیت المال کا قیام بھی عمل میں آیا۔

زکوۃ کی شرح دولت کے سرچشمے دراصل تین ہی ہیں۔ سونا۔ چاندی۔ جانور اور زمین کی پیداوار آنحضرتؐ نے ان میں سے ہر ایک کی شرحیں الگ الگ مقرر فرمائیں۔ سونے چاندی میں ۱/۴۰ حصہ جانوروں کی زکوۃ کی شرح ان کی مختلف قسموں کے لحاظ سے جدا جدا متعین ہوئی اور بڑی تفصیل کیساتھ۔ مثلاً اونٹ کیلئے نصاب زکوۃ پانچ مقرر کیا گیا۔ اس سے کم پر زکوۃ نہیں ہے۔ پانچ اونٹ ہوں تو ایک بکری نو اونٹوں تک، دس سے چودہ تک دو بکریاں، پندرہ سے انیس تک تین بکریاں بیس سے چوبیس تک چار بکریاں۔ پچیس سے پینتیس تک اونٹ کا ایک سال کا بچہ۔ چھتیس سے پینتالیس تک دو سال کا بچہ۔ چھیالیس سے ساٹھ تک تین سال کا۔ اکسٹھ سے پچھتر تک چار سال کا۔ چھہتر سے نوے تک دو برس کے دو بچے۔ اکیانوے سے ایک سو بیس تک تین سال کے دو بچے۔ ایک سو بیس کے بعد ہر چالیس پر دو سال کا بچہ اور پھر ہر پچاس پر تین برس کا بچہ اسی طرح کے مفصل احکام بکری، گائے، بھینس وغیرہ کے متعلق ہیں۔

یہ تمام شرحیں وہ ہیں جو آنحضرتؐ نے اپنے ایک فرمان خصوصی میں درج فرما دی تھیں۔ لیکن ابھی ان کو عمال کے ہاتھ روانہ نہیں کیا گیا تھا کہ دنیا سے تشریف لے گئے آپ کے بعد

حضرت ابوبکرؓ نے اس پر عمل کیا اور اس کی نقول عمالِ صدقات کے پاس بھیج دیں۔ عبداللہ بن انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے والد انسؓ کو عامل صدقہ (مصدق) بنا کر روانہ کیا تو انہیں اپنی ایک تحریر عنایت فرمائی جس پر آنحضرتؐ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ حضرت انسؓ نے اس کو کھول کر دیکھا تو اس میں جانوروں کی زکوٰۃ کے متعلق مفصل احکام و ہدایات تھے۔

زمین پر محصول زمین اگر مسلمانوں کی مملوکہ ہے تو وہ دو قسم کی ہو سکتی ہے ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے میں نہروں کے ذریعے آبپاشی یا موسمی خصوصیات کے باعث کاشتکار کو محنت نسبتاً کم کرنی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس کی آبیاری کیلئے کاشتکار کو کنویں سے پانی نکالنا ہوتا ہے اس لیے اس کو مشقت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ پہلی قسم کی زمین پر عشر یعنی پیداوار کا ۱/۱۰ حصہ دینا ہوگا خواہ وہ روپیہ کی شکل میں ہو یا جنس کی صورت میں، دوسری قسم کی زمین کا محصول عشر کا آدھا یعنی ۱/۲۰ ہے۔

لگان اجارہ حکومت کی آمدنی کا ایک ذریعہ لگان اجارہ یا ٹھیکہ بھی تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ زمین کا کوئی ٹکڑا کسی کاروبار کیلئے ایک شخص کو دے دیا جاتا ہے اور یہ شرط ہوتی تھی کہ وہ اس کاروبار کے منافع میں سے ایک متعین رقم بیت المال میں داخل کرے گا۔ چنانچہ بنو متعان کا ایک شخص جس کا نام ہلال تھا اس نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ ایک وادی جس کا نام سلبہ تھا۔ اس کیلئے مخصوص کر دی جائے تاکہ وہ اس میں شہد کی مکھیوں کی پرورش کر سکے۔ آنحضرتؐ نے اس شرط پر کہ وہ شہد جو کچھ پیدا ہوگا اس کا عشر بیت المال میں جمع کرے گا اس کی درخواست منظور فرمائی۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں طائف کے گورنر سفیان بن وہب نے خلیفہ دوم سے ایک مرتبہ اس کی بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا اگر یہ شخص شہد کا عشر اب بھی اسی طرح ادا کرے جس طرح وہ آنحضرتؐ کو ادا کرتا تھا تو یہ وادی اس کیلئے مخصوص رہنے دو۔ ورنہ اس وادی کی مکھیاں جنگل کی مکھیوں کی طرح ہیں جو شخص چاہے ان کا شہد کھا سکتا ہے

خراج آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ جو اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ خراج بھی تھا۔ خراج مال یا زمین کی پیداوار کی اس مقدارِ معین کو کہتے ہیں جو مفتوحین کی زمین پر بطور محصول مقرر کر دی گئی ہو

چنانچہ جب آنحضرتؐ نے خیبر فتح کیا تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم ان زمینوں کے مالک ہیں اور ان کو جوتنا بونا ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں، اس لئے ہمارے ساتھ بٹائی پر معاملہ کر لو۔

آنحضرتؐ نے ان کی یہ درخواست منظور کر لی اور نصفا نصف پر معاملہ ہو گیا، فدک کے لوگوں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے بھی ایسا ہی معاملہ کرنا چاہا۔ آنحضرتؐ نے ان لوگوں کی درخواست بھی قبول کر لی حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں ان لوگوں کیساتھ یہی معاملہ مقاسمت یعنی بٹائی کا رکھا [۲] لیکن حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں عراق اور شام کے جو حصے فتح ہوئے تھے۔ آپ نے ان پر سرسری طور پر کچھ رقم متعین کر دی تھی اس سے یہ ثابت ہوا کہ امام کو اختیار کلی ہے وہ اگر چاہے تو مفتوحہ زمین پر بٹائی کا معاملہ کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو ایک خاص رقم مقرر کر دے۔ بہر حال یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ حکم اس وقت ہے جبکہ زمین بزورِ شمشیر فتح کی گئی ہو۔ اور امام نے اسکو مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہ کیا ہو

جزیہ یہ ٹیکس بھی غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن اس میں اور خراج میں فرق یہ ہے کہ خراج کیلئے کوئی قرآنی نص نہیں ہے بلکہ آنحضرتؐ کی سنت اور آپ کے عمل سے ثابت ہے۔ اس کے برخلاف جزیہ کا ذکر خود قرآن میں ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ خراج زمین کا ٹیکس ہے۔ بعد میں اگر مالک زمین مسلمان بھی ہو جائے تو زمین خراجی ہی رہتی ہے لیکن جزیہ فرد کا ٹیکس ہے اور اس حیثیت سے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ مسلمان پر زکوٰۃ اگر یہ شخص مسلمان ہو جائے تو جزیہ اس سے ساقط ہو جائیگا۔

اگرچہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں جزیہ کی شرح متعین کر دی تھی لیکن عہد نبوی اور اس کے بعد عہد صدیقی میں اس کی کوئی شرح مقرر نہیں تھی۔ بلکہ سہولت کیساتھ جو شخص جتنا دے سکتا تھا اس سے اتنا ہی لیا جاتا تھا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے۔

لیس فی اموال اھل الذمۃ	اہل ذمہ کے مالوں میں سے اتنا ہی لیا جائیگا جو ان کی
الا العفو۔ [۳]	ضرورتوں سے زائد ہو۔

اہل یمن تجارت پیشہ ہونیکے باعث مالدار اور خوش حال تھے اس لیے آنحضرتؐ نے ان پر فی کس ایک دینار جزیہ مقرر کیا تھا [۴] نجران اور بحرین کے لوگوں کو آپ نے مکتوب گرامی ارسال فرمایا تھا اس کی تصریح تھی کہ اگر اسلام قبول نہیں کیا تو انہیں جزیہ دینا ہوگا۔

---

[۱] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۵۰ ر ا ۵ [۲] کتاب الخراج ص ۵ [۳] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۲۲ [۴] کتاب الاموال ابو عبید ص ...

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں حیرہ صلحاً فتح ہوا تھا اس لیے خراج کا تو سوال ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ حضرت خالدؓ نے ان لوگوں سے فی کس دس درہم کے حساب سے جزیہ وصول کیا اور اس کو مدینہ روانہ کیا[1]

فے اور غنیمت | آمدنی کا ایک ذریعہ فے اور غنیمت بھی تھا۔ دونوں میں یہ فرق ہے کہ فے اس مال کو کہتے تھے جو فریق محارب سے بغیر قتال و جدال کے حاصل ہوتا تھا اور بحالت جنگ جو مال ملتا تھا وہ غنیمت کہلاتا تھا۔ آنحضرت صلعم کے عہد میں اس کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی کہ اس کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ چار حصے مجاہدین پر تقسیم ہو جاتے تھے اور ایک حصہ کو پھر پانچ حصوں پر تقسیم کر کے اس طرح بانٹ دیا جاتا تھا کہ ایک حصہ اللہ اور اس کے رسول کا۔ دوسرا آنحضرت صلعم کے ذوی القربیٰ کا۔ تیسرا یتیموں کا۔ چوتھا مسکینوں کا اور پانچواں مسافروں کا۔ عہد نبویؐ میں اسی پر عمل ہوتا تھا۔

جاگیر بخشی | عہد نبوت میں جاگیر بخشی کا رواج تھا اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شخص کو زمین کا ایک ٹکڑا اس شرط پر عطا فرما دیتے تھے کہ وہ اس کو جوت بو کر آباد کرے گا اور اس کی آمدنی کا ایک حصہ بیت المال میں داخل کرے گا۔ ایک مرتبہ آپ نے قبیلہ مزینہ کے چند لوگوں کو ایک زمین عطا فرمائی۔ لیکن ان لوگوں نے اس کو جوتنے بونے کی زحمت گوارا نہ کی۔ کچھ دوسرے لوگوں نے اسمیں کاشتکاری کر لی۔ اب مزینہ والوں نے اس زمین کو پھر واپس لینا چاہا۔ معاملہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا۔ آپ نے فیصلہ دیا جو شخص تین برس تک زمین کو یونہی ڈالے رکھے اور پھر کوئی شخص اس کو آباد کر دے تو یہ دوسرا ہی زمین کا زیادہ حقدار ہو گا[2]

حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس طریقہ کو اسی طرح قائم رکھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے یمامہ کے مجاعہ نامی ایک شخص کو ایک درخواست پر اپنے ایک فرمان خصوصی کیساتھ یمامہ کو کچھ زمینیں عطا فرمائی تھیں اور فرمان میں یہ بھی لکھا تھا کہ "اگر تم سے کوئی شخص جھگڑا کرے تو میرے پاس آنا"، آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد مجاعہ بن مرارہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

[1] کتاب الاموال ص ۲۷ [2] کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۲۷۲ [3] الخطط ج ا ص ۹۲، ۹۸ اسکے علاوہ احکام السلطانیہ للماوردی میں از صفحہ ۱۸۰ تا ۱۸۵ ایسی زمینوں کا ذکر تفصیل کیساتھ مذکور ہے۔

اور مزید ایک زمین کی درخواست کی تو حضرت ابوبکرؓ نے ایک زمین جس کا نام خضرامہ تھا اس کو عطا فرمادی[1]

ایک مرتبہ آپ نے طلحہ بن عبداللہ کو ایک جاگیر عطا فرما دی اور اس کیلئے ایک تحریر بھی لکھ دی طلحہ یہ تحریر لیکر حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ اس پر مہر لگا دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے انکار کیا اور بولے کہ کیا اور لوگوں کو چھوڑ کر یہ ساری زمین تم کو ہی ملے گی؟" طلحہ کو یہ سن کر غصہ آگیا۔ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس واپس لوٹے اور کہا بخدا میں نہیں جانتا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "نہیں عمرؓ ہی خلیفہ ہیں" لیکن انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا[2]۔

لیکن اس موقع پر یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عہد نبوت میں اور اس کے بعد عہد خلفاء میں بھی جو زمین جاگیریں کسی کو دی جاتی تھیں وہ اس کی اپنی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ ان زمینوں کو جوت بو کر کار آمد بنایا جائے اور ان سے وہ شخص اور اس کے متعلقین فائدہ اٹھائیں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ان زمینوں کو بیکار چھوڑ دیتا تھا تو وہ اس سے واپس لے لی جاتی تھی اور کسی اور کو دیدی جاتی تھیں، جاگیر اور زمین چونکہ کسی کی ملکیت نہیں ہوتی تھی اس بناء پر خلیفہ کے عہد میں پٹہ کی تجدید کی ضرورت بھی ہوتی تھی چنانچہ آنحضرت صلعم نے تمیم بن اوس الداری کو حبرون اور بیت عینون نام کے دو قریے عنایت فرمائے تھے اور ایک فرمان کے ذریعہ اس کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ جب آپ کی وفات ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں پھر اس کی تجدید ہوئی اور آپ نے بھی قریب قریب اسی مضمون کا ایک فرمان صادر کیا"[3]

معادن پر ٹیکس | عہد نبوت میں یہ تو ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم نے معادن بعض لوگوں کو دیئے ہیں مثلاً بلال بن المزنی کو قبلیہ (ساحل سمندر پر مدینہ سے پانچ دن کی مسافت پر ایک علاقہ کا نام ہے) کے معادن عنایت فرمائے۔ اسی طرح صحیح حدیث میں حضرت ابوہریرۃؓ سے مروی ہے کہ رکاز (مدفون خزانہ یا معدن) پر ٹیکس ایک خمس واجب ہے۔ لیکن یہ ٹیکس خود آپؐ نے وصول کیا ہو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ابن سعد کا بیان ہے کہ بنو سلیم کی معدن حضرت ابوبکرؓ کے

[1] کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۲۸۱ [2] کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۲۷۶ [3] کتاب الاموال ابوعبیدہ حاشیہ ص ۲۷۵

عہد میں فتح ہوئی تو اس کی آمدنی بیت المال میں داخل کی گئی۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے پاس قبیلہ اور جہینہ کی معدنوں سے بھی کثیر مال آتا تھا۔[1]

بعض اور آمدنیاں مذکورۂ بالا ذرائع کے علاوہ آمدنی کے دوسرے ذرائع اور بھی تھے مثلاً کوئی شخص اگر لاوارث ہوتا تھا یا اس کا وارث تو ہوتا تھا لیکن غلامی یا وجوب قتل وغیرہ کوئی چیز اسکے لیے مانع وراثت ہوتی تھی تو متوفی کی پوری املاک وجائیداد حکومت کے قبضہ میں چلی جاتی تھی اس کے علاوہ تجارتی اموال ونصائع پر بھی ٹیکس لگتا تھا اور اس سے حکومت کو آمدنی ہوتی تھی۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں آمدنی کے بعض نئے ذرائع پیدا ہوئے جو عہد نبوت اور عہد صدیقی میں نہیں تھے۔ مثلاً اسلامی مملکت میں باہر کے ملکوں کا جو مال آتا تھا اس پر محصول درآمد[2] (IMPORT DUTY) کی وصولیابی عہد فاروقی کا کارنامہ ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ رحمت عالم کی شان اسی کی مقتضی تھی کہ بین المملکتی تجارت کو آزاد رکھا جائے اور اس پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے اور چونکہ عہد صدیقی درحقیقت عہد نبوت کا ہی آئینہ تھا اس لیے جو چیز آنحضرتؐ نے اختیار نہیں کی حضرت ابوبکرؓ اسے کیونکر مروّج کر سکتے تھے اور حضرت عمرؓ نے اپنے یہاں اس کو رائج کیا بھی تو اس مجبوری سے کہ دوسرے ممالک کی حکومتیں مسلمان تاجروں سے یہ ٹیکس وصول کرتی تھیں۔

البتہ ہاں سمندروں سے جو منافع حاصل ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس پر بھی ٹیکس لگایا لیکن عہد نبوت اور عہد صدیقی میں اس کا پتہ نہیں چلتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں کا قبضہ سمندروں پر نہیں ہوا تھا۔

یہ وہ ریاستی آمدنی کے ذرائع تھے جو آنحضرتؐ کے عہد میں پائے جاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو جوں کا توں باقی رکھا اور اس میں جہاں کہیں کوئی رخنہ پڑتا نظر آیا اس کو پوری قوت کے ساتھ روکا اور بند کیا۔

زکوٰۃ کی حیثیت اسٹیٹ ڈیوٹی کی ہے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد منکرین زکوٰۃ کا جو فتنہ اٹھا تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے اس کا جس طرح قلع قمع کیا اس کا ذکر گزر چکا ہے اس سلسلہ میں یہاں

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۵۱ [2] فقہا کی اصطلاح میں اس کو عشور کہتے ہیں۔

یہ جان لینا ضروری ہے کہ مانعین زکوٰۃ دراصل دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو سرے سے زکوٰۃ کی فرضیت کے ہی قائل نہیں رہے تھے اور دوسرے وہ لوگ تھے جو زکوٰۃ کو فرض تو مانتے تھے لیکن اس بات کیلئے آمادہ نہیں تھے کہ ان کی زکوٰۃ مدینہ بھیجی جائے۔ آنحضرتؐ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا " تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِهِمْ وَتُرَدُّ اِلٰى فُقَرَائِهِمْ "، دوسرا گروہ اس ارشاد نبویؐ سے استدلال کرتا تھا کہ زکوٰۃ جس قبیلے کے امیروں سے وصول کیجائے گی اسی قبیلے کے غریبوں پر خرچ ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ چونکہ آنحضرتؐ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اس بنا پر آپ کو توبیشک اس بات کا حق تھا کہ سب قبائل کی زکوٰۃ وصول کریں۔ لیکن آپؐ کے بعد یہ حق کسی اور کو نہیں پہونچتا۔ اس لیے ان پر ضروری نہیں کہ وہ اپنی زکوٰۃ مدینہ بھیجیں۔ زکوٰۃ کو مدینہ بھیجنا ان کے نزدیک ایک طرح کا ڈانڈ یا تاوان تھا۔ جیسا کہ قرۃ بن ہبیرہ اور حضرت عمرو بن العاص کی گفتگو سے ظاہر ہے جس میں قرۃ نے زکوٰۃ کیلئے " اتاوہ " کا لفظ استعمال کیا ہے۔[1]

حضرت ابوبکرؓ کا جہاد ان دونوں گروہوں کے خلاف تھا آپ نے فرمایا کہ جس طرح آنحضرتؐ زکوٰۃ لیتے تھے اسی طرح میں بھی لوں گا۔ اور اگر انہوں نے اونٹ کی ایک رسی جس کو عہد نبوی میں دیتے تھے مجھ کو اس کے دینے سے بھی انکار کیا (لو منعونی عقالا) تو میں ان سے جہاد وقتال کروں گا۔ حضرت ابوبکرؓ کا یہ ارشاد فقہی اعتبار سے نہایت اہم ہے جس کی طرف کم لوگوں کی نگاہ گئی ہے۔ آپ نے یہ فرما کر جہاں پہلے گروہ کی خام خیالی کا رد کر کے یہ حقیقت واضح کر دی کہ زکوٰۃ بھی اسی طرح فرض اور عبادت ہے جس طرح کہ نماز ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ساتھ ہی دوسرے گروہ کی تردید کر کے صاف بتلا دیا کہ زکوٰۃ دراصل اسٹیٹ ڈیوٹی یعنی اسلامی حکومت اگر قائم ہو تو یہ اس کا ٹیکس ہے۔ اس لیے جب تک آنحضرتؐ رہے آپ وصول فرماتے رہے اب صدر ریاست میں ہوں تو میں وصول کروں گا۔ پس زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت یہی ہے۔ کسی شخص یا کسی قبیلہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پر زکوٰۃ نکالدے اور حکومت کے خزانے میں اس کو جمع نہ کرے۔

[1] طبری ج ۲ ص ۴۸۸۔

حضرت ابوبکرؓ کا یہ فیصلہ چونکہ نہایت اہم تھا اور دقیق و غامض بھی اسی لیے حضرت عمرؓ جیسے نکتہ سنشناس شریعت نے اس کی داد دی اور صاف طور پر فرمایا۔

فعرفت انہ الحق[2] پھر مجھ کو معلوم ہو گیا کہ واقعی حضرت ابوبکرؓ کی رائے ہی درست تھی۔

حکومت کے مصارف مذکورہ بالا ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ خلیفہ کے اختیار اور اس کی رائے سے حکومت کے تمام شعبوں پر خرچ کی جاتی تھی۔ عمال صدقات کا روزینہ تو انہی کے جمع کیے ہوئے صدقہ سے دیا جاتا تھا اس کے علاوہ باقی تمام کارپردازان حکومت کی تنخواہیں خلیفہ کی تنخواہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے فوج کیلئے سامان رسد، آلات حرب کی فراہمی انکی دیگر ضروریات سماجی اور معاشرتی کام۔ دینی اور مذہبی امور، رفاہ عامہ ان سب کی تکمیل بیت المال سے ہوتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدوں کی تکمیل چونکہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جو علاقے فتح ہوئے ان میں سے بعض وہ تھے جن کی فتح کی پیشگوئی آنحضرتؐ کر چکے تھے اس لیے اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضورؐ کا کسی سے وعدہ بغیر تکمیل کے رہ جائے آپ نے اعلان عام کرا دیا تھا کہ جس کسی شخص سے آپ نے کوئی وعدہ کیا ہو وہ میرے پاس آئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ بحرین کا مال آیا تو ایک شخص ابن ابی بجیج نے حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھ سے آنحضرتؐ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر بحرین کا مال آیا تو (دونوں ہاتھوں سے اشارہ کر کے) میں تم کو اتنا اور اتنا دونگا حضرت ابوبکرؓ نے کہا اچھا تو یہ دونوں ہاتھوں سے اٹھالو، اس شخص نے اٹھایا اور گنا تو پانچسو درہم تھے۔ چونکہ اس شخص نے ہاتھوں سے دو مرتبہ اشارہ کیا تھا اور ایک مرتبہ کی مٹھی بھرنے میں پانچسو درہم آئے تھے اس لئے اس رقم کو دگنا کر کے حضرت ابوبکرؓ نے اس کو ایک ہزار درہم عطا فرما دیئے[2]

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ حکم اسی وقت تک کیلئے ہے جبکہ مسلمانوں کی اپنی کوئی حکومت اور اجتماعی نظام قائم ہو اور حکومت کی جانب سے زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے عمال و محصلین مقرر ہوں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت تک یہی نظام قائم رہا اور اسی کی ضرورت بھی تھی۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب حکومت بہت مستحکم ہو گئی اور روپیہ کی ریل پیل بڑھ گئی تو زکوٰۃ کو انفرادی طور پر ادا کر دینے کی اجازت دیدی گئی[2] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۴۲

تقسیم میں مساوات آنحضرتؐ کے وعدوں کی اس طرح تکمیل کرنے کے بعد باقی جو رقم بچتی تھی حضرت ابوبکرؓ اس کو عورت مرد، چھوٹا بڑا، غلام اور آزاد سب پر برابر تقسیم کر دیتے تھے کیونکہ یہی دستور آنحضرتؐ کا بھی تھا۔ ایک مرتبہ بحرین سے مال آیا آپ نے اس کو علی السویہ تقسیم کیا تو فی کس سوا سات درہم آگر پڑا۔ دوسرے سال مال زیادہ آیا اور حسب سابق برابر تقسیم کیا گیا تو فی کس بیس درہم حصہ میں آئے بعض لوگوں نے ازراہ نکتہ چینی کہا کہ اے خلیفۂ رسولؐ آپ نے مال برابر تقسیم کر دیا ہے حالانکہ لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کو دوسروں پر تقدم اور تفوق حاصل ہے اگر آپ ان کے سبقت الی الاسلام اور فضیلت کی رعایت رکھتے تو بہتر ہوتا آپ نے جواب دیا تم نے جن فضائل و سوابق کا ذکر کیا ہے ان کو مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے؟ لیکن یہ چیزیں وہ ہیں جن کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ یہ بہر حال معاش کا معاملہ ہے اس میں برابری کا معاملہ کرنا ترجیح دینے سے بہتر ہے[1]

خمس مال غنیمت کی تقسیم پہلے گزر چکا ہے کہ عہد نبوت میں جو مال غنیمت آتا تھا اس کا خمس پانچ حصوں پر تقسیم کر لیا جاتا تھا اور اس میں سے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا اور دوسرا حصہ آنحضرتؐ کے ذوی القربیٰ کا ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی خمس کی تقسیم کے اسی قاعدہ کو باقی رکھا اور اسمیں ذرا کمی بیشی یا قطع برید نہیں کی۔ عہد نبوت میں حضرت علیؓ پورا خمس خود لیتے تھے اور پھر اس کو ذوی القربیٰ پر حسب مراتب و مدارج تقسیم کر دیتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ چنانچہ خود حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ میں خمس آنحضرتؐ کی حیات میں تقسیم کرتا تھا اس لئے ابوبکرؓ نے بھی مجھ کو اس کا متولی بنا دیا اور ان کی زندگی میں بھی خمس میں ہی تقسیم کرتا تھا[2] ابو عبیدہ نے ابن شہاب الزہری کا ایک قول نقل کیا ہے اس سے بھی اس کی تصدیق و تائید ہوتی ہے انہوں نے فرمایا

وکان ابوبکر یقسم من الخمس نحو قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[3]	ابوبکرؓ خمس کو اسی طرح تقسیم کرتے تھے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے

ایک غلط روایت اس پر یہ جتا دینا بھی ضروری ہے کہ قاضی ابو یوسف نے ایک روایت نقل کی ہے

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۴۲ اصل کتاب میں "الأسوۃ" چھپا ہوا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے صحیح السویۃ ہے اور اصل فقرہ یوں ہے "التسویۃ خیر من الاثرۃ" [2] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۲ [3] کتاب الاموال ص ۲۲۱ باب سهم ذی القربیٰ من الخمس۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے خمس میں سے رسولؐ اور ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط کر دیا تھا۔ اور صرف تین حصہ باقی رکھے تھے [1] لیکن یہ روایت بالکل لغو ہے۔ کیونکہ اس کا راوی محمد بن السائب الکلبی ہے اور وہ محدثین کے نزدیک مجروح اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ حضرت سفیان الثوری کہا کرتے تھے

اتقوا الکلبی ______ کلبی سے بچو

لوگوں نے کہا "تو پھر آپ اس سے کیوں روایت کرتے ہیں؟" فرمایا "میں اس کے جھوٹ سچ کی پرکھ رکھتا ہوں" یزید بن زریع جو مشہور امام حدیث ہیں انہوں نے ایک مرتبہ کلبی سے کوئی روایت کی تو ساتھ ہی فرمایا کہ کلبی سبائی تھا حضرت اعمش نے یہ سنکر کہا کہ سبائیوں سے بچنا چاہئیے میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں جنہیں لوگ ان کو کذاب کہتے ہیں"۔

کلبی کا یہ حال تو عام ہے پھر روایت زیرِ بحث کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اسناد یہ ہے۔ عن ابی صالح عن ابن عباس اور محمد بن السائب الکلبی کی اس خاص اسناد کے متعلق ائمہ حدیث کا اتفاق ہے کہ اس اسناد سے جو روایت ہوگی وہ جھوٹی ہوگی۔ چنانچہ خود حضرت سفیان جنہوں نے کلبی سے روایت کی ہے فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک مرتبہ کلبی نے کہا تھا کہ میں ابوصالح سے جو روایت بھی کروں گا وہ جھوٹی ہوگی ابن عدی کا قول ہے۔

واما فی الحدیث فعنده مناکیر	حدیث کے سلسلہ میں کلبی سے بہت سی منکر
وخاصة اذا روی عن ابی	احادیث مروی ہیں اور خاص طور پر وہ روایت
صالح عن ابن عباس	جو ابن عباس سے بواسطہ ابوصالح مروی ہیں۔

حدیث کے علاوہ اس شخص کا تفسیر میں یہی حال تھا کسی نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا کیا محمد بن السائب الکلبی کی تفسیر کو دیکھنا جائز ہے؟ فرمایا "نہیں"۔ [2]

غیر مسلموں کا سماجی تحفظ

غیر مسلم جب جزیہ دے کر اسلامی حکومت کی اطاعت

[1] کتاب الخراج ص ۱۹ باب قسمۃ الغنائم [2] کلبی کے متعلق یہ تمام معلومات میزان الاعتدال فی نقد الرجال حافظ ذہبی ج ۳ ص ۶۱، ۶۲ حرف المیم سے ماخوذ ہیں۔

قبول کر لیتا ہے تو وہ ذمی کہلاتا ہے اور اس کے لیے اسلام کا صاف حکم یہ ہے "لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين" ان کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہوں گے اور ان پر وہ سب کچھ واجب ہوگا جو مسلمانوں پر ہوتا ہے اسی مساواتِ حقوق کی بنا پر جس طرح مسلمان محتاجوں اور اپاہجوں کی خبرگیری اور ان کا معاشی تکفل اسلامی بیت المال کا فرض ہے ٹھیک اسی طرح از کار رفتہ غیر مسلموں کی حفاظت اور ان کے روزینہ کا انتظام بیت المال کے ذمہ ہے۔ چنانچہ حیرہ کی فتح کے موقع پر خالد بن الولید نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کی طرف سے اہل حیرہ کے نام جو عہد نامہ لکھا تھا اور جو دنیا کی تاریخ جنگ و صلح میں اپنی نظیر نہیں رکھتا اس میں اور چیزوں کے ساتھ ایک اہم دفعہ یہ بھی تھی۔

ايما شيخ ضعف عن العمل او	جو کوئی (غیر مسلم) بوڑھا از کار رفتہ ہو جائے یا جس کسی غیر مسلم
اصابته آفة من الآفات او غنيا	کو کوئی آفت پہونچے یا وہ مالدار ہو اور پھر فقیر ہو جائے اور
فافتقر وصار اهل دينه يتصدقون	اس کے اہل مذہب اس کو خیر خیرات دینے لگیں تو اس کا
عليه طرحت جزيته وعيل من	جزیہ معاف ہو جائیگا اور مسلمانوں کے بیت المال میں سے اس کا
بيت المال المسلمين وعياله ما اقام	اور اس کے متعلقین کا اس وقت تک برابر تکفل کیا جائے
بدار الهجرة ودار الاسلام	گا جب تک وہ لوگ مدینہ اور اسلامی قلمرو میں رہیں گے۔

عہد نامہ کے آخر میں یہ بھی تحریر تھا، جو بوڑھے، جوان، غریب اور امیر، تندرست اور بیمار سب غیر مسلموں کیلئے عام تھا۔

فان طلبوا عونا من المسلمين	یہ لوگ مسلمانوں سے اگر کوئی مدد طلب کریں گے تو ان کی
اعينوا به ومؤنة العون من	مدد کی جائے گی اور اس مدد کے سلسلہ میں جو اخراجات
بيت مال المسلمين [1]	ہوں گے وہ بیت المال کے ذمہ ہوں گے

جن چیزوں پر ٹیکس نہیں ہے

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو عطیۂ فطرت، سمجھا گیا ہے۔ یعنی یہ چیزیں خود پیدا ہوتی ہیں یا وہ انسانی محنت کو

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۴۴

اس میں دخل نہیں۔ [1] ابن خلدون نے ان کو "الفلاحة" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے [2]۔ مثلاً گھاس۔ بانس۔ لکڑی۔ نمک۔ پانی۔ جنگلی جانور۔ جنگل وغیرہ۔ اگرچہ ہمارے زمانہ کی مہذب حکومتوں تک نے ان پر ٹیکس لگایا ہے۔ لیکن اسلام نے ان چیزوں کو ٹیکس سے بالکل آزاد رکھا ہے اور ہر شخص کو خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم پوری آزادی ہے کہ وہ حسب ضرورت ان سے استفادہ کرے۔ اس سے کسی قسم کا کوئی محصول نہیں لیا جائیگا۔ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف اور کتاب الاموال ابو عبیدہ میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ عہد نبوت اور اس کے بعد عہد صدیقی میں اسی پر عمل ہوتا تھا۔

[1] مشکوٰۃ مجتبائی پریس ص ۲۵۹ مالم تعمل ید الملک

[2] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۲۱ - ۳۲۲

فوجی نظام

یوں تو عرب پیدائشی جنگجو تھے لیکن ان کا باقاعدہ کوئی فوجی نظام نہیں تھا، وہ گریزیا جنگ جس کو آج کل کی اصطلاح میں گوریلا وار کہتے ہیں۔ اسکے عادی تھے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبۂ زندگی کی بھی تنظیم کی، اسی تنظیم کا نتیجہ تھا کہ ان لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق کے عہد میں اس زمانہ کی سب سے زیادہ مہذب، متمدن اور طاقتور حکومتوں ایران اور روم کی فوجوں کو اپنی قلت تعداد اور سامان کی کمی کے باوجود شکست پر شکستیں دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ یونہی بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ [1]

ہم نے عربوں کے جس طریقۂ جنگ کو گریزیا جنگ کہا ہے۔ علامہ ابن خلدون نے اس کو کر و فر کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔ اس طریقہ کے برخلاف عجم میں صف بستہ ہو کر لڑنے کا (جس کو عربی میں زحف کہتے ہیں اور قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی آیا ہے) طریقہ رائج تھا۔ آنحضرت ﷺ نے حسب موقع و محل دونوں طریقے اختیار کیے [2] لیکن

[1] میجر جنرل محمد اکبر خاں صاحب نے حال ہی ایک بڑی قابل قدر کتاب "حدیث دفاع" کے نام سے لکھی ہے جو بڑی تقطیع کے ۴۳۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور فیروز سنز لاہور نے اسکو شائع کیا ہے۔ جدید فن حرب کے ماہر کی حیثیت سے میجر صاحب نے اس کتاب میں شائع کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ خالص فنی نقطہ نظر سے بھی دنیا کے سب سے بڑے فاتح جنرل اور اصول حرب و ضرب کے ماہر تھے۔ آپ نے جنگ کے جو اصول و ضوابط تھے صحابہ کو جنگ کرنیکی جسطرح تربیت دی اور پھر خود جسطرح فوج کی قیادت کی اور اسکے لئے جو طریقے اختیار کئے، چودہ سو برس سے زیادہ گذرنے کے باوجود علوم و فنون کے اس دور ترقی میں بھی اس پر ایک حرب کا اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل لاثانی اور لائق مطالعہ ہے۔

جہاں دشمن کی فوجیں صف بستہ ہوتی تھیں وہاں زحف کا طریقہ بھی اختیار کرتے تھے قرآن مجید نے اسی کو "کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ" "گویا وہ لوگ ایک مضبوط بنیاد ہیں" کہا ہے۔[1]

لشکر کے مختلف حصے | عربی میں لشکر کو خمیس بھی کہتے ہیں جو خمس (پانچ) سے مشتق ہے یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لشکر پانچ حصوں میں تقسیم ہوتا ہے ایک دستہ فوج جس میں امیر لشکر ہوتا تھا قلب کہلاتا تھا۔ امیر لشکر کے دائیں جانب والے حصہ کو میمنہ اور بائیں جانب والے حصہ کو میسرہ کہتے تھے۔ لشکر کا پچھلا حصہ ساقہ اور اگلا حصہ مقدمۃ الجیش یا طلیعہ کہلاتا ہے۔ لشکر کی ترتیب دو قسم کی ہوتی تھی ایک ترتیب قریب جس میں لشکر کے سب حصے پاس پاس ہوتے تھے اس کو تعبیہ کہتے تھے اور دوسری ترتیب بعید جس میں لشکر کے مختلف حصے ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوتے تھے اس وقت لشکر کے ہر حصہ کو کردوس کہتے تھے۔ آنحضرت ؐ کے عہد میں تعبیہ کا رواج تھا لیکن حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں حضرت خالدؓ نے شام پہونچکر جب دیکھا کہ دشمن کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار ہے اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف چھتیس ہزار ہے۔ تو آپنے اسلامی فوج ۳۶ سے ۴۰ تک دستوں (کرادیس) میں بانٹ دیا۔ اسطرح گویا ہر دستہ میں ایک ایک ہزار مجاہد تھے۔ اور ہر دستہ کا ایک ایک امیر مقرر کر دیا۔ قلب کے جو دستے تھے اُن کے امیر ابوعبیدۃ بن الجراح، میمنہ کے دستوں کے امیر عمرو بن العاص اور شرجبیل بن حسنہ، میسرہ کے دستوں کے امیر یزید بن ابی سفیان تھے اور پھر ہر دستہ کا الگ الگ بھی ایک امیر تھا جو شجاعت اور بہادری میں نامور تھا مثلاً قعقاع بن عمرو، عبداللہ بن مسعود، قباث بن اشیم۔ کسی نے دشمن کی کثرت تعداد کو دیکھ کر کہا کہ ہائے رومیوں کی تعداد کس قدر زیادہ ہے اور انکے مقابلہ میں مسلمان کس قدر کم ہیں۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا "نہیں بلکہ مسلمان کس قدر زیادہ ہیں اور رومی کتنے تھوڑے ہیں" اس کے بعد کہا کہ کثرت و قلت کا دار و مدار کامیابی اور ناکامی پر ہے۔[2]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون باب القسم السابع فی الحروب [2] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۲

یعنی ان کو یقین تھا کہ نتیجۂ جنگ انہیں کے حق میں ہوگا۔[1]

لشکر میں وعظ گو | حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اس کا بھی اہتمام ہوتا تھا کہ چند ایسے حضرات لشکر کے ساتھ بھیجے جاتے تھے جو اپنے ولولہ انگیز خطبوں اور قرآن مجید کی آیات جہاد کی تلاوت سے مجاہدین میں جوش پیدا کر دیتے تھے چنانچہ شام کی جنگ کے موقع پر یہ خدمت ابو سفیان بن حرب کے سپرد تھی ان کے علاوہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے مقرر تھے طبری نے روایت کی ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد سے آنحضرت ؐ کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ دشمن کے بالمقابل صف آرا ہونے کے بعد آپ سورۂ انفال کی آیات تلاوت فرماتے تھے آپ کے بعد بھی یہ دستور باقی رہا۔[2]

جنگ کے ہتھیار | لشکر میں شہسوار اور پیادہ دونوں قسم کے لوگ ہوتے تھے اور جنگ میں یہ لوگ جو ہتھیار استعمال کرتے تھے ان کے نام یہ ہیں۔ زرہ۔ تلوار، رمح یعنی بڑا نیزہ، حربہ (چھوٹا نیزہ)، الخط البحرین کا ایک ساحلی علاقہ ہے یہاں نیزے بہت عمدہ بنتے تھے اور الرمح الخطی کہلاتے تھے۔ اسی طرح ہند میں تلواریں بہت عمدہ بنتی تھیں اور السیف الھندی کہلاتی تھیں۔ یہ اسلحہ تو وہ ہیں جو عام طور پر معروف ہیں انکے علاوہ آنحضرت ؐ سے جن اور دوسرے اسلحہ کا استعمال مروی ہے انکے نام یہ ہیں۔

منجنیق، اس کی شکل توپ یا کمان کی سی ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ دشمن پر پتھر پھینکے جاتے تھے جو گولہ باری کا کام کرتے تھے۔ ابن ہشام کی روایت ہے کہ اسلام میں منجنیق کا استعمال سب سے پہلے آنحضرت ؐ نے کیا ہے۔[3]

دبابہ۔ اس کا ایک بڑا خول ہوتا تھا۔ فوجیوں کی ایک بڑی تعداد اس کے اندر بیٹھ جاتی تھی اور اس کو دھکیلتے ہوئے دشمن کے قلعہ کی دیوار تک لے جاتے تھے، اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ان فوجیوں پر دشمن کے قلعہ کے اوپر سے اگر تیر بھی برستے تھے تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور اسطرح وہ محفوظ طریقہ پر قلعہ کی دیوار تک پہنچ جانے کے بعد قلعہ پر حملہ کر سکتے تھے۔

---

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۳ [2] طبری ج ۲ ص ۵۹۴ [3] سیرت النبی ج ۲ ص ۳۰۳

الضبور: یہ بھی دبابہ کی طرح ہوتا ہے اور ایسی لکڑی سے تیار ہوتا تھا جس پر کھال چڑھی ہوتی تھی۔ اس کا فائدہ بھی یہی تھا کہ حملہ آور سپاہی اس کے خول میں چھپ کر بیٹھ جاتے تھے اور حفاظت سے دشمن کے قلعہ تک پہونچکر حملہ کر دیتے تھے۔ یہ دونوں ہتھیار خود آنحضرت ؐ نے استعمال کئے تھے۔ [1]

فوجی لباس جہاں تک لباس کا تعلق ہے اگرچہ اس کا پتہ نہیں چلتا کہ خاص جنگ کے وقت کوئی لباس ملٹری یونیفارم کی طرح ہوتا تھا یا نہیں تاہم حفاظت کیلئے زرہ اور خود پہننے کا عام رواج تھا اور سپر بھی رکھنے کا دستور تھا۔ البتہ ڈاکٹر محمد حسن ابراہیم نے نقل کیا ہے کہ پا پیادہ سپاہی چھوٹی قبائیں جو گھٹنوں تک دراز ہوتی تھیں پہنتے تھے اور تہمد کی بجائے پاجامے اور جوتے جو ہمارے زمانہ میں اہل افغان کا شعار ہے پہنتے تھے۔ [2]

عورتیں بھی ساتھ ہوتی تھیں فوج کے ساتھ عورتیں بھی ہوتی تھیں جن کا کام زخمیوں کا مرہم پٹی کرنا اور پانی پلانا وغیرہ ہوتا تھا۔ دف اور طبل جنگ بھی بجاتی تھیں تاکہ فوج میں جوش پیدا ہو۔ اگر کوئی نازک موقع آتا تھا تو جنگ میں بھی حصہ لیتی تھیں چنانچہ عہد نبوت میں اور پھر عہد صدیقی میں اس قسم کے بعض مواقع پیش آئے تھے۔ [3]

فوج کا معائنہ آنحضرت ؐ کا طریقہ جس کو آپ نے غزوۂ بدر کے موقع پر خاص طور سے برتا تھا یہ تھا کہ جنگ شروع ہونے سے قبل اسلامی لشکر کو قطاروں میں تقسیم کر کے باقاعدہ صف بندی کرتے اور ان کا معائنہ کرتے تھے اور جہاں کوئی آدمی آگے پیچھے نظر آتا تھا چھڑی کے اشارے سے اس کو درست کر دیتے تھے۔ اس کے

[1] عربوں کے جنگی ہتھیاروں کی مفصل معلومات کیلئے دیکھو ابن قتیبہ کی عیون الاخبار ج ۱ ص ۱۲۹ - ۱۳۲

[2] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ ص ۴۸۳۔ حضرت خالد بن الولید نے حضرت ابوبکر کی طرف اہل حیرہ کیلئے جو عہد نامہ لکھا تھا اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ذمی جو لباس پہنتے ہیں وہ پہنیں اور ان پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ البتہ وہ مسلمانوں کا سا جنگی لباس (زی الحرب) نہیں پہنیں گے۔ دیکھو کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۴۴) اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنگ کا لباس ضرور کوئی تھا جس میں پہننے والا چست اور چاق و چوبند رہتا تھا۔ [3] فتوح الشام للواقدی ذکر عہد صدیقی۔

ساتھ ہی آپ فوج کے مختلف حصوں پر افسر تعینات کرتے اور ان کے الگ الگ علمبردار بھی مقرر فرماتے تھے۔ اس کے بعد فوج کو ہدایات دیتے کہ جب تک اجازت نہ ملے صف بندی ہرگز نہ توڑیں۔ خود اپنی طرف سے لڑائی شروع کرنے میں پہل نہ کریں۔ دشمن اگر فاصلہ پر ہو تو تیر چلا کر اس کو ضائع نہ کریں۔ نزدیک آئے تو تیر چلائیں۔ قریب ہو تو منجنیق استعمال کریں اور زیادہ نزدیک آئے تو نیزوں سے روکیں۔ اور سب سے آخر میں تلوار نکالیں۔ لڑائی میں شور و غل عام بات ہے لیکن آپ نے منع فرما دیا تھا کہ منہ سے آواز تک نہ نکلے۔ [1]

کمانڈر انچیف کا عہدہ عہد نبوت میں چونکہ آنحضرت ؐ غزوات میں خود شریک رہتے تھے اس لئے فوج کی اعلیٰ قیادت۔ اس کا معائنہ اور اس کو ہدایات دینا یہ سب کام آپ ہی کرتے تھے لیکن عہد خلافت میں حضرت ابوبکر خود جنگوں میں شرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اسلئے آپ کی حیثیت جنگ کے معاملہ میں وزیر جنگ کی سی تھی اور خاص محاذ جنگ کے لئے آپ نے یہ انتظام کیا کہ ایک کمانڈر انچیف کا عہدہ قائم کیا جو پورے میدان جنگ کا سب سے بڑا افسر ہوتا تھا اور تمام فوج کی نقل و حرکت اس کے زیر حکم و قیادت ہوتی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ گزر چکا ہے محاذ شام پر حضرت ابوبکر نے ہر دستہ فوج کا الگ الگ ایک امیر مقرر کیا تھا لیکن ان سب کے امیر حضرت خالد بن ولید مقرر کئے گئے تھے۔ [2]

حضرت ابوبکر کو حضرت خالد پر کس قدر اعتماد تھا جو بالکل حق بجانب ثابت ہوا، اسکا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب محاذ شام پر مسلمانوں کی اور رومیوں کی فوجیں بہت دنوں تک آمنے سامنے پڑی رہیں اور کسی طرف سے کوئی اقدام نہیں ہوا تو حضرت ابوبکر نے فرمایا۔

واللہ لانسین الروم وساوس الشیطان بخالد [1]	خدا کی قسم! رومیوں کے دلوں میں جو وسوسے ہیں وہ سب میں خالد کو (عراق سے شام) بھیجکر بھلا دونگا

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر [2] طبری ج ۲ ص ۲۰۱

فوج کیلئے انتخاب میں احتیاط عہدِ نبوت اور عہدِ صدیقی میں فوج کا کوئی مستقل
ادارہ الگ محکمہ نہیں تھا۔ اور نہ فوجی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام تھا بلکہ پوری قوم
ہی ایک فوج تھی، ضرورت پڑنے پر اعلان کر دیا جاتا تھا اور جو لوگ رضا کارانہ طور
پر اپنی خدمات پیش کرتے تھے ان کو لے لیا جاتا تھا۔ البتہ حضرت ابوبکر صدیقؓ
انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ مشتبہ لوگوں کو شریک فوج نہ ہونے
دیں۔ چنانچہ شام کی مہم کو سر کرنے کیلئے آپ نے جو فوج ترتیب دی اس میں
ابتداءً ان لوگوں کو شرکت کی اجازت نہ تھی جن کے دامانِ اطاعت پر بزدلی
پر ارتداد کا داغ لگ چکا تھا، خالد بن سعید بن العاص کو روانہ کرتے وقت حکم دیا

وان یدعوهن حولک من العرب
الا من ارتد۔ ؎

کہ تمہارے ادھر اُدھر جو عرب ہیں ان کو جنگ میں شرکت کی دعوت دینا مگر جو لوگ مرتد ہو گئے تھے ان کو نہیں

مجاہدینِ اسلام کی قدر اندازی اگرچہ مسلمانوں کی فوجی تعلیم و تربیت کا اس وقت کا باقاعدہ
انتظام نہیں تھا۔ لیکن درحقیقت اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ عرب فطرتاً جنگجو
ہوتے تھے اور شمشیر زنی اور تیر اندازی ان کا خاص فن تھا، چنانچہ عراق میں انبار کی
جنگ کے موقع پر ایرانیوں کا لشکر جو ایک نہایت تجربہ کار اور آزمودہ جنرل شیرزاد
کے ماتحت تھا بڑی شان و شوکت اور طمطراق کے ساتھ تھا۔ اور اس کو اپنی طاقت
کا بڑا گھمنڈ تھا، لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو حضرت خالد بن ولید نے خندق کا
چکر لگایا، اتنے میں گھمسان کا رن پڑنے لگا تو آپ تیر اندازوں کے دستے کے پاس
پہونچے اور ان سے کہا کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ (دشمن) طریقۂ جنگ سے
ناواقف ہیں تم ان لوگوں کی آنکھوں کو نشانہ بنا کر تیر چلاؤ، تیر اندازوں نے اس
حکم کی اس طرح تعمیل کی کہ دشمن کی فوج کے ایک ہزار سپاہیوں کی آنکھوں کو
تیروں سے چھید دیا دشمن نے یہ منظر دیکھا تو چیخ اٹھا اور خبر اڑا دی گئی کہ اہلِ انبار سب
کے سب اندھے ہو گئے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اس جنگ کو "ذات العیون" آنکھوں

؎ طبری ج ۲ ص ۲-۶

والی جنگ بھی کہتے ہیں۔ شیرزاد نے گھبرا کر صلح کی پیشکش کی۔ ؎

سامانِ جنگ کی فراہمی اسلحہ اور سامانِ جنگ کا یہ حال تھا کہ لوگ اپنے اپنے اسلحہ لیکر
آتے تھے اور جو خود ان کا انتظام نہیں کر سکتے تھے، ان کا انتظام چندہ کے ذریعہ کر دیا
جاتا تھا، تاہم حضرت ابوبکرؓ نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ مختلف ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی
اُس کا ایک حصہ اسلحہ اور دوسرے سامانِ جنگ کی خریداری کیلئے وقف کر دیتے تھے، قرآن
نے مالِ غنیمت میں اللہ اور اُس کے رسول کا جو حصہ مقرر کیا تھا، اسکو بھی اسی کام میں لاتے تھے۔ ؎
مدینہ میں ایک جگہ نقیع تھی۔ آنحضرتؐ نے اسکی چراگاہ کو جنگی گھوڑوں کے لئے مخصوص
کر دیا تھا ؎ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس کو اسی طرح باقی رکھا، بعد میں البتہ حضرت عمرؓ نے ربذہ
کی چراگاہ کو بھی صدقہ اور زکوٰۃ کے اونٹوں اور گھوڑوں کیلئے اس غرض سے مخصوص کر دیا تھا۔
اگرچہ اتنا کام حضرت ابوبکرؓ بھی کرتے تھے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کے جو اونٹ مہیا ہوتے
تھے ان کو ربذہ اور اس کے قرب و جوار میں بھیج دیتے تھے ؎

امرائے فوج کو ہدایات لیکن یہ سب فوج کے ظاہری اور مادی انتظامات تھے، اصل چیز
جس پر فوج کی کامیابی کا انحصار ہے وہ ہے اعلیٰ نصب العین زندگی اور بلند اخلاقی
کردار اور کیرکٹر حضرت ابوبکرؓ کو اس چیز کا خاص اہتمام رہتا تھا، اور جب فوج روانہ ہوتی
تھی تو آپ پا پیادہ اس کو رخصت کرنے کیلئے مدینہ سے باہر دور تک تشریف لاتے تھے
امرائے فوج کی سخت اصرار کے باوجود ان کو سواری سے اترنے نہیں دیتے تھے اور خود
سواری پر بیٹھتے نہیں تھے۔ اور جب فوج روانہ ہوتی تھی تو آپ اس کو مفصل احکام و
ہدایات دیتے تھے جن میں جہاد کا مقصد، اس کی اہمیت و ضرورت خلوص و للّٰہیت اجر
عظیم، رضائے الٰہی و ثواب اخروی دنیا اور اس کی زندگی کی بے حقیقی وغیرہ جیسی چیزوں پر بڑے
موثر انداز میں روشنی ڈالتے تھے اور ساتھ ہی ایسے جنگی احکام دیتے تھے جن سے
آپ کی مہارتِ فنِ حرب، حسنِ تدبیر، بیدار مغزی اور دشمن اور اسکے ملک سے کمال
واقفیت کا ثبوت ملتا تھا۔

؎ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۲۱ ؎ کتاب الاموال ابو عبیدہ ص ۲۹۰ ؎ کنز العمال ج ۳ ص ۳۰۹ رقم ۳۰۲ ؎ طبری ج ۲ ص ۴۶۹

حضرت اسامہ اور یزید بن ابی سفیان کو آپ نے جو ہدایات دی تھیں انکا ذکر گزر چکا ہے حضرت خالد خود ایک نامور جرنل تھے۔ لیکن جب ان کو ذوالقصہ کی طرف مرتدین سے جنگ کرنے کیلئے روانہ کیا ہے تو ان کو بھی ہدایات دیں اور فرمایا۔

"تمہارے ادھر ادھر قبیلہ طے پڑیگا، اگرچہ تمہارا رخ بزاخہ ہی کی طرف ہوگا لیکن تم ابتداء طے ہی سے کرنا۔ بزاخہ سے فارغ ہو کر بطاح جاؤ، بطاح کا معرکہ سر کر لو تو اس وقت تک وہاں سے نہ ہٹو جب تک میں تم کو کمک نہ بھیجدوں"

حضرت ابوبکر نے ایک طرف تو حضرت خالد کو یہ ہدایت دیکر روانہ کیا۔ دوسری طرف تدبیر یہ کی کہ مشہور کر دیا کہ وہ خود خیبر جا رہے ہیں اور وہاں سے پلٹ کر وہ اکناف سلمی میں خالد بن الولید کے لشکر سے آملیں گے۔ اس خبر کے اڑنے سے دشمنوں پر دہشت بیٹھ گئی اور قبیلہ طے کے سرکش لوگ رام ہونے لگے ۱؎

عراق کی مہم پر حضرت خالد اور عیاض بن غنم کو روانہ کیا تو حضرت خالد کو حکم دیا کہ وہ عراق کے حصہ زیریں سے جائیں اور عیاض کو ہدایت دی کہ وہ بالائی علاقہ سے گزریں اور پھر فرمایا کہ تم دونوں میں سے جو شخص بھی حیرہ پہلے پہنچ جائیگا وہی حیرہ کی مہم کا امیر ہوگا اس کے بعد آپ نے کہا کہ حیرہ پہونچ کر تم لوگ عرب اور ایران کے درمیان جو فوجی چھاؤنیاں ہیں۔ ان کو برباد کر چکے ہوگے اور اب تم کو اس بات کا اطمینان ہو چکا ہوگا کہ مسلمانوں پر پشت کی جانب سے حملہ نہیں ہو سکتا اس بنا پر حیرہ پہنچنے کے بعد تم دونوں میں سے ایک شخص حیرہ میں ہی قیام کرے اور دوسرے آگے بڑھ کر دشمن سے جنگ آزما ہوں۔

یہ ہدایات تو خاص جنگی ہدایات تھیں۔ اس کے بعد ارشاد ہوا۔ کہ!

"دوا دوبان! اللہ سے مدد مانگنا۔ اس سے ڈرنا۔ آخرت کو دنیا پر مقدم رکھنا۔ تم ایسا کرو گے تو دنیا اور آخرت تم کو دونوں چیزیں ملیں گی، اور دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دینا ورنہ دونوں کا خسارہ ہوگا۔ اور خدا نے تم کو جن چیزوں سے بچنے کا حکم کیا ہے ان سے بچتے رہنا

۱؎ طبری ج ۲ ص ۴۸۲ ۲؎ طبری ج ۲ ص ۵۸۳ - ۵۸۴ -

معاصی سے الگ رہنا۔ اگر کوئی معصیت ہو جائے تو فوراً توبہ کرنا اور کبھی گناہ پہ اصرار مت کرنا ۱؎

حضرت ابوبکر کی بیدار مغزی اور واقفیت کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ خود مدینہ میں ہوتے تھے لیکن سینکڑوں میل دور کلمیدان جنگ نگاہ میں رہتا تھا اور حسب موقع و مصلحت اس کے لئے احکام بھیجتے رہتے تھے۔ خالد بن سعید کو تیار روانہ کیا تو تاکید کر دی کہ جب تک ان کا حکم نہ پہونچے اقدام نہ کریں۔ لیکن خالد بن سعید اس کی پابندی نہ کر سکے تو ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا ۲؎۔ حضرت خالد بن ولید حضرت ابوبکر کی ان معاملات میں اصابت رائے سے واقف تھے اسلئے حضرت ابوبکر کا کوئی حکم ان کی طبیعت کے خلاف بھی ہوتا تھا تو بھی اسکی پابندی کرتے تھے، چنانچہ حیرہ کی فتح کے بعد حضرت ابوبکر نے حکم بھیجا کہ اب پیش قدمی نہ کریں حضرت خالد اس حکم کی تعمیل کیلئے سال بھر تک معطل پڑے رہے اور اس سے اسقدر اکتا گئے تھے کہ اس سال کو وہ خود عورتوں کا سال کہتے تھے۔ لیکن ان کی مجال نہ تھی کہ بارگاہ خلافت کے حکم کے خلاف عمل کر سکیں۔ ایک اور موقع پر بھی ایسا ہی ہوا اور اس کی وجہ سے بعض لوگوں میں کچھ چہ میگوئی ہوئی تو حضرت خالد نے ان لوگوں سے کہا کہ خلیفہ کی رائے یہی ہے، اور ان کی رائے پوری قوم کی رائے کے برابر ہے ۳؎

اسطرح شام کی طرف آپ نے متعدد لشکر بیک وقت روانہ کئے تو چونکہ آپکو معلوم تھا کہ رومیوں کی جنگی چالیں کیا ہیں اور انہوں نے کہاں کہاں محاذ بنایا ہے اسلئے امرائے عساکر اسلام کو ہدایت کی کہ کون کس راستے سے جائے۔ اس سلسلہ میں طبری کا بیان ہے کہ وسمی لھم امصار الشام۔ ان لوگوں کے لئے شام کے شہر تک متعین کر دئے۔ اسکے بعد فرمایا۔

ان الروم ستشغلھم فاحب ان یصعد	رومی تمکو ایک محاذ پر جمع کر کے تم سے ٹکر لینا چاہیں گے
المصوب ویصوب المصعد لئلا	اسلئے میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے نشیبی علاقہ سے جانیوالا بالائی
یتواکلوا ۳؎	راستے سے جائے اور بالائی راستہ سے جانیوالا نشیبی راستے سے

۱؎ فتوح البلدان بلاذری ص ۱۱۲ ۲؎ طبری ج ۲ ص ۵۷۴ ۳؎ طبری ج ۲ ص ۵۸۹ اسی طرح حضرت خالد جب عراق پہونچ گئے تو ان کو حکم لکھا کہ وہ کاروائی اور سندھ کی سرحد یعنی ابلہ سے شروع کریں اور طرفہ یہ کہ اس کاروائی کو شروع کرنے کیلئے دن تک کا تعین بھی خود ہی کر دیا تھا۔ (طبری ج ۲ ص ۵۵۴)

(یعنی راستے بدل بدل کر جاؤ) تاکہ رومی دستوں کو مجتمع ہونے کا موقع نہ ملے۔

حضرت عروہ جو اس روایت کے راوی ہیں ان کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو کچھ فرمایا تھا حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔[1]

فوجی مراکز کا معائنہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ فوج کو صرف ہدایات بھیجدینے پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ وقتاً فوقتاً خود بھی چھاؤنیوں اور فوجی مرکزوں کا معائنہ کرتے تھے اور جہاں کہیں کوئی خرابی نظر آتی تھی اس کا فوراً تدارک کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک مہم کے سلسلہ میں مقام جرف میں فوجیں اکٹھی تھیں آپ معائنہ کیلئے پہونچ گئے بنو فزارہ کے کیمپ میں پہونچے تو یہ لوگ سرو قد کھڑے ہو کر تعظیم بجا لائے حضرت ابوبکرؓ نے انکو خیر مقدم کہا اس کے بعد ان لوگوں نے کہا "یا خلیفۂ رسول اللہ! ہم لوگ گھوڑے کی سواری بہت عمدہ جانتے ہیں، اس لئے گھوڑے بھی ساتھ لائے ہیں، آپ بڑا جھنڈا ہمارے ساتھ کر دیجئے۔ ارشاد ہوا، خدا تم کو اور ہمت اور برکت عطا فرمائے۔ لیکن بڑا جھنڈا تم کو نہیں مل سکتا۔ وہ بنو عبس کے حصہ میں آچکا ہے۔ ایک فزاری کھڑا ہو کر بولا "ہم لوگ بنو عبس سے بہتر ہیں" حضرت ابوبکرؓ نے خفا ہو کر کہا "چپ بدتمیز تجھ سے ہر عبسی بہتر ہے۔ ایک عبسی شخص بھی کچھ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس کو بھی جھڑک کر خاموش کر دیا۔ اور فرمایا فقد کفیت یعنی میں تمہاری طرف سے کہہ چکا ہوں۔[1]

حضرت ابوبکرؓ کے احکام و ہدایات کا اثر

حضرت ابوبکرؓ کی اس بیدار مغزی، روشن ضمیری احکام و ہدایات اور غلطیوں پر بروقت تنبیہ کا نتیجہ یہ تھا کہ پوری فوج اور اسکے امراء ہر وقت ہوشیار رہتے تھے۔ ان میں ڈسپلن قائم رہتا تھا۔ بلند ترین نصب العین زندگی نظر کے سامنے رہتا تھا اور ان میں کبھی اخلاقی پست ماندگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اور حقیقت یہی ہے کہ مادی آلات و اسباب سے قطع نظر یہی چیزیں ایک فوج کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، چنانچہ۔

[1] کنز العمال ج ۵ ص ۲۶۱ رقم ۲۳۱۰

مغربی مصنفین کی رائے

مغربی مصنفین نے بھی اسکا اعتراف کیا ہے، پروفیسر ہٹی لکھتے ہیں

"مسلمان عرب فوجوں کی طاقت کا اصل راز نہ تو انکی اسلحہ و جنگ کی برتری میں ہے اور نہ انکی اعلیٰ درجہ کی تنظیم میں ہے، بلکہ درحقیقت اس اعلیٰ کیرکٹر اور اخلاقی کردار میں ہے جس کے پیدا کرنے میں بے شبہ ان کے مذہب کا بہت بڑا حصہ تھا اور اس صبر و تحمل کی طاقت میں ہے جس کو ریگستانی زندگی سے بڑا سہارا ملا تھا،،[1]

مشہور ولندیزی مستشرق دخویٔ (DR. GOUEGE) اقرار کرتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے فوجوں کو جو ہدایات دی تھیں ان میں اعتدال اور معقولیت کی جو روح کار فرما ہے۔ اسکے باعث ان کی بجا طور سے داد دینی پڑتی ہے۔[2] یہی مستشرق اپنی کتاب فتوحات شام میں (از صفحہ ۱۰۴ تا صفحہ ۱۰۶) لکھتا ہے کہ:۔

"درحقیقت شام میں لوگ عربوں کی جانب بہت مائل ہو گئے تھے، اور ایسا ہونا بھی چاہئیے تھا۔ کیونکہ عربوں نے مفتوحین سے جو برتاؤ کیا اگر اسکا مقابلہ وہاں کے سابق مالکوں کے بے اصول ظلم سے کیا جائے تو بڑا ہی سخت فرق نظر آتا ہے۔ شام کے جو عیسائی فیصلہ کالسی ڈون (CHALCEDON) کو نہیں مانتے تھے، قیصر روم کے حکم سے ان کے ناک کان کاٹے جاتے اور ان کے گھر ڈھائے جاتے تھے، اس کے برخلاف عرب مسلمان جو حضرت ابوبکرؓ کی ہدایتوں پر عمل کرتے تھے وہ مقامی باشندوں کا دل موہ لیتے تھے اور سب سے زیادہ اپنی بات کا پاس کرتے رہے، ان فتوحات کے پندرہ سال بعد ایک نسطوری پادری لکھتا ہے کہ یہ عرب جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں۔ مگر وہ عیسائی مذہب سے بالکل بر سر پیکار نہیں۔ اسکے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور قدیسیوں کا احترام کرتے ہیں۔ اور ہمارے گرجاؤں اور

[1] ہسٹری آف دی عربس چوتھا اڈیشن ص ۱۴۲ [2] بحوالہ رسول اللہ ﷺ کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ ص ۲۹۱

عبادت خانوں کو جاگیریں (DON) عطا کرتے ہیں"۔ [1]

مشہور پادری کارالیفس (C. KARALEVSKS) فرانسیسی انسائیکلوپیڈیا میں شہر انطاکیہ کے حالات لکھتے ہوئے رقم طراز ہوتا ہے۔

"مسلمان عربوں کو یعقوبی عیسائیوں (JACOBITES) نے بھی اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا، یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا جائے۔ اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیوی عدالتی اقتدار عطا کیا جائے" [2]

کسانوں کا خاص خیال ہدایات میں حضرت ابوبکرؓ کی جہاں یہ تاکید ہوتی تھی کہ مذہبی پیشواؤں اور عبادت گزاروں سے تعرض نہ کیا جائے، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں پر تلوار نہ اٹھائی جائے، درخت نہ کاٹے جائیں، نخلستان برباد نہ کئے جائیں، ساتھ ہی جس ملک میں جنگ ہوتی تھی اس کے کسانوں اور اربابِ زراعت کی نسبت اس بات کی سخت تاکید ہوتی تھی ان لوگوں کو ذرا ہاتھ نہ لگایا جائے۔ چنانچہ غزوات السلاسل کے ذکر میں طبری لکھتے ہیں۔

ولم یحرك خالدٌ وأمراؤہٗ الفلاحین فی شیءٍ من فتوحھم لتقدم ابی بکر الیہ فیھم [3]	اور خالد اور ان کے امرا نے اپنی فتوحات کے دوران میں کسانوں کو ذرا ہٹیں چھیڑا کیونکہ ابوبکر ان لوگوں کے بارہ میں پہلے ہی حکم بھیج چکے تھے۔

اہلِ دیہات کے ساتھ معاملہ قاعدہ ہے کہ جب کسی ملک پر حملہ ہوتا ہے تو شہری آبادی کی بہ نسبت اہلِ دیہات پر اس کا زیادہ برا اثر ہوتا ہے کیونکہ وہاں حفاظت اور بچاؤ کے سامان ایسے نہیں ہوتے جیسے کہ شہروں میں ہوتے ہیں۔

---

[1] بحوالہ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ ص ۲۸۲ [2] ایضاً ۲۸۳

[3] طبری ج ۲ ص ۵۵۲

لیکن حضرت ابوبکرؓ اس بات کا برابر خیال رکھتے تھے کہ دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ ہو۔ چنانچہ حضرت عیاض بن غنم نے جب حران کو صلحاً فتح کیا تو اس شہر کے دیہات والوں نے کہا "نحن اسوة اهل مدينتنا وروسائنا" ہم سے وہی معاملہ کیجئے جو آپ نے اہل شہر اور ہمارے رؤسا سے کیا ہے"۔ حضرت عیاض بن غنم نے اس کا کیا جواب دیا۔ قاضی ابو یوسف نے اس سے لاعلمی ظاہر کی ہے لیکن اسکے بعد ہی لکھا ہے کہ:

فامامن ولی من خلفاء المسلمین بعد فتحھا فانھم قد جعلوا اھل الرساتیق اسوة اھل المدائن [1]	مسلمانوں کے جو خلفا اسکی فتح کے بعد اس کے والی ہوئے انہوں نے گاؤں والوں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو اہلِ شہر کے ساتھ کیا تھا۔

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عیاض بن غنم کا جواب کیا ہوگا۔

فریقِ محارب سے برتاؤ ایک قوم کی اخلاقی بلندی اور اس کے کردار کی عظمت کا اندازہ زیادہ صحیح طور پر اس سے ہوتا ہے کہ فریقِ محارب کے ساتھ جنگ میں اسکا برتاؤ کیا ہوتا ہے، اس پر اس کو بزورِ شمشیر فتح حاصل ہوتی ہے تو اس وقت وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے اور اگر فریقِ محارب مغلوب ہو کر صلح کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو اس کی طرف سے صلح کی شرائط کی نوعیت کیا ہوتی ہے اور وہ ان شرائط کی پابندی کس حد تک کرتی ہے، قدیم زمانہ میں ایران اور روم کی حکومتیں دشمنوں کے ساتھ جنگ میں کیا معاملہ کرتی تھیں۔ اسکو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے یہ دیکھو کہ اس دور تہذیب و تمدن میں بھی گذشتہ دو عالمگیر جنگوں میں دُوَلِ متحدہ نے جرمنی کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اٹلی اور جاپان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا؟ اور جب ان سے صلح کی گئی تو اس کے شرائط کیا تھے؟ ان مفتوح اقوام کی شہری آزادی کس حد تک باقی رکھی گئی، اُن کی قومی انفرادیت کہاں تک آزاد رہی؟ اور ان کے انسانی حقوق کا احترام کس درجہ تک ملحوظ رکھا گیا۔

---

[1] کتاب الخراج ص ۴۰

حضرت خالد کی شجاعت و دلیری، اُن کی حربی قابلیت اور جنگی قیادت کی اعلیٰ صلاحیت کا حال تم پڑھ چکے ہو۔ اب یہ بھی سن کر یہی شیر بیشۂ شجاعت بحالت جنگ یا بحالت صلح دشمنوں کے ساتھ کس طرح پیش آتا تھا۔ سواد (عراق) کے دیہات بانقیا باریما اور الیس کا سردار ابن صلوبا تھا حضرت خالد سے وہ صلح کرنے پر مجبور ہوا تو حضرت خالد نے جو صلحنامہ لکھا اس کا مضمون یہ تھا۔

انك آمن بامان الله اذ حقن دمك باعطاء الجزية وقد اعطيت عن نفسك وعن اهل خرجك وجزيرتك ومن كان في قريتك بانقيا وباروسما الف درهم فقبلتها منك ورضي من معي من المسلمين على ذلك ولك ذمة الله وذمة محمد صلى الله عليه وسلم وذمة المسلمين على ذلك ۔[1]

تو اللہ کی پناہ میں ہے، جزیہ ادا کرنے کے بعد تیری جان محفوظ ہو گئی اور تو نے اپنی طرف سے اپنی رعایا اپنے جزیرہ اور بانقیا اور بارسما کے لوگوں کی طرف سے ایک ہزار درہم جو دینے وہ میں نے قبول کئے اور جو میرے ساتھ مسلمان ہیں وہ بھی اس پر راضی ہیں۔ اور اب تو اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کی ذمہ داری میں آگیا ہے۔

صلح نامہ حیرہ: اہل حیرہ کے نام جو عہد نامہ حضرت ابوبکر کے حکم سے لکھا گیا تھا وہ کافی طویل تھا۔ اُس کے اہم دفعات یہ ہے۔

(۱) ان لوگوں کا گرجا یا عبادت گاہ یا کوئی قصر جس میں یہ لوگ جنگ میں قلعہ بند ہوتے تھے، منہدم نہیں کیا جائے گا۔

(۲) ناقوس بجانے سے ان کو نہیں روکا جائے گا۔

(۳) نیز تہوار کے موقع پر صلیب کا جلوس نکالنے سے انکو منع نہیں کیا جائے گا۔

(۴) یہ لوگ جزیہ ادا کرتے رہے تو ان کے ساتھ معاہدے کا سا معاملہ کیا جائے گا۔ اور ان کی حفاظت ہمارا فرض ہو گا۔

(۵) ان لوگوں کے مذہبی پیشوا اور عابد و زاہد جزیہ ادا کرنے سے مستثنیٰ ہوں گے۔

[1] طبری ج ۲ ص ۵۵۱

(۶) ان میں جو بڈھے اور ناکارہ اور اپاہج ہونگے ان کا خرچ بیت المال کے ذمہ ہو گا۔

(۷) ان کو مسلمانوں کے فوجی لباس کے علاوہ اپنا ہر قسم کا لباس پہننے کی آزادی ہو گی۔

(۸) ان کا کوئی غلام اگر مسلمان ہو جائے گا۔ تو بازار میں اس کی زیادہ سے زیادہ جو قیمت ہو سکتی ہے اُس قیمت میں بغیر عجلت کے اور بغیر کسی گھاٹے کے اسکو فروخت کیا جائے گا اور وہ قیمت اس کے مالک کے حوالہ کر دی جائے گی۔

(۹) یہ لوگ اگر مسلمانوں سے کسی قسم کی امداد طلب کریں گے تو ان کو وہ مدد بیت المال سے دی جائے گی۔

ان دفعات و شرائط صلح کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ یہ سب کچھ کتنی رقم کے بدلہ میں ہوا تھا؟ ان لوگوں کی اصل تعداد سات ہزار تھی، ایک ہزار ان میں وہ تھے جو اپاہج، معذور یا مذہبی پیشوا تھے۔ ان کو خارج کر کے اب صرف چھ ہزار بچے ان پر جو جزیہ لگایا گیا وہ ساٹھ ہزار درہم سالانہ تھا یعنی دس درہم فی کس[1] غور کرو۔ فیاضی اور دشمن کے ساتھ حسن معاملہ کی اس سے بہتر کوئی اور بھی مثال ہو سکتی ہے۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ صلح یا امان بخشی کا یہ معاملہ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی دونوں حالتوں میں یکساں ہوتا تھا۔

اسلامی فوج کے اس فیاضانہ سلوک کا اثر یہ تھا کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی اصل شہری زندگی پورے امن و اطمینان کے ساتھ لوٹ آتی تھی کھیتی باڑی، باغات و نخلستان کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا مقامی باشندے آزادی کے ساتھ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اور ان کو مسلمانوں کی طرف سے کسی قسم کا خوف و ہراس یا بے اطمینانی نہیں ہوتی تھی۔

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۴۳ - ۱۴۴

تعزیرات وحدود

تعزیرات وحدود (سزائیں) کا اصل مقصد انسدادِ جرائم ہے لیکن مجرم مجرم میں فرق ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے جرم کی نوعیت بدل جاتی ہے بعض اوقات ایک شریف اور نیک نفس انسان سے بحالتِ اضطراب کسی جرم کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں عدالت وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مجرم خود اپنے جرم پر نادم اور پشیمان ہے اور سچے دل سے وہ اس سے توبہ کر رہا ہے تو حاکم کو چاہیے کہ اس سے اغماض کرے، اور سزا دیکر اس کو ارتکابِ جرم پر مزید جری نہ کرے۔ گویا ایسے مجرم کو سزا نہ دینا ہی تعزیرات وحدود کے مقصد کو پورا کر دیتا ہے۔ اور اس کے برعکس سزا دینے سے اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ بات ڈھکی چھپی ہو۔ اور اگر جرم فاش ہو جائے تو پھر سزا دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

چنانچہ آنحضرت ؐ کا معمول یہی تھا جیسا کہ آپ نے ماعز بن مالک اور بعض دوسرے اشخاص کے بارے میں کیا اس کے علاوہ خود آپ کا ارشاد یہی ہے کہ!

تعافوا الحدود فیما بینکم فما بلغنی من حد فقد وجب۔	تم حدود کو آپس میں نمٹا دیا کرو۔ لیکن جب بات مجھ تک پہونچے گی تو حدود واجب ہو جائیں گے۔

مجرم سے اغماض اس ارشادِ نبوی کے مطابق حضرت ابوبکرؓ کا دستور تھا کہ جب تک جرم فاش نہیں ہوتا تھا۔ وہ کوشش کرتے کہ مجرم سزا سے بچ جائے، خود ان کا بیان ہے کہ ماعز بن مالک نے جب تیسری مرتبہ بھی اعترافِ جرم کر لیا۔ اور آنحضرت ؐ نے اس کو بھی رد کر دیا تو اب خود حضرت ابوبکرؓ نے ماعزؓ سے کہا کہ اگر تم نے چوتھی مرتبہ بھی اعترافِ جرم کر لیا تو پھر رسول اللہ ؐ تم کو رجم کر دیں گے۔ [۲] اس کہنے کا بالواسطہ منشا یہی تھا کہ ماعز چوتھی مرتبہ اقرار نہ کریں تاکہ سنگسار ہونے سے بچ جائیں۔ لیکن ان پر خوفِ خدا غالب تھا وہ نہ مانے اور آخر رجم ہونا پڑا۔

---

[۱] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۴۰ مصری [۲] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۸

مرتدین کے احوال میں تم پڑھ چکے ہو کہ اشعث بن قیس جب گرفتار ہو کر آیا ہے اور اس نے صدقِ دل سے توبہ کر لی تو حضرت ابوبکرؓ نے نہ صرف یہ کہ اس کی جان بخشی کی بلکہ اسکی درخواست پر اپنی بہن ام فروہ کا اس سے نکاح بھی کر دیا۔

عبرتناک سزا لیکن اگر جرم کی نوعیت شدید ہوتی اور بجائے ذاتی ہونے کے قومی جرم ہوتا ہے تو پھر حضرت ابوبکرؓ اس کو معاف نہیں کرتے تھے بلکہ بے حد سخت سزا دیتے تھے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ ایاس السلمی جس نے ارتداد سے توبہ کرنے کے بعد بد عہدی کی اور مسلمانوں کو قتل کرنا اور لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے نہایت سخت حکم بھیجا کہ اس کو گرفتار کر کے آگ میں جلا دیا جائے [۱]

حد شرب خمر آنحضرت ؐ کے عہد میں شارب خمر کے لئے کوئی خاص سزا متعین نہیں تھی، بلکہ حسب موقع ومصلحت کبھی اس کو پٹوا دیتے تھے تاکہ وہ نادم ہو کر آئندہ کیلئے توبہ کر لے۔ اور کبھی کوڑے لگواتے تھے۔ ان کوڑوں کی تعداد چالیس تھی حضرت ابوبکرؓ نے بھی بعینہ اسی کو جاری رکھا۔ اور اس میں کوئی تغیر وتبدیل نہیں کیا لیکن جب حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں اس طرح کے واقعات زیادہ ہونے لگے تو آپ نے کوڑوں کی تعداد دوگنی یعنی چالیس سے اسّی کر دی۔

صحیح بخاری میں ایک روایت ہے۔

عن السائب بن یزید قال کنا نوتی بالشارب علی عھد رسول اللہ ؐ وامرۃ ابی بکر وصدرا من خلافۃ عمر فنقوم الیہ بایدینا	سائب بن یزید سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت ؐ کے عہد میں اور ابوبکرؓ کے عہد خلافت اور عہد فاروقی کے آغاز میں کوئی شرابی ہمارے پاس لایا جاتا تو ہم اپنے ہاتھوں جوتوں اور

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۱۹۰۳ - لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت ابوبکرؓ نے بمقتضائے سیاست ومصلحت اسوقت تو ایاس کو یہ سزا دلوا دی، لیکن چونکہ کسی انسان کو آگ میں زندہ جلانا خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجرم ہو اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ کو اس کا برابر ملال رہا۔ اور وفات کے وقت آپنے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ اے کاش آپنے ایسا نہ کیا ہوتا۔ اس کا مفصل ذکر آگے اپنے موقع پر آئے گا۔

ونعالنا وارديتنا حتى كان آخر امرة عمر فجلد اربعين حتى اذا عتوا وفسقوا جلد ثمانين [1]

چادروں کے ساتھ اسکی طرف کھڑے ہو جاتے تھے لیکن آخر عہد فاروقی میں حضرت عمر اس کو چالیس کوڑے مارنے لگے اس کے بعد جب ان لوگوں میں سرکشی اور فحش بڑھ گیا تو پھر اسی کوڑے مارنے لگے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس کوڑوں کی سزا حضرت عمر نے ایجاد کی تھی حالانکہ یہ سزا خود عہد نبوت اور عہد صدیقی میں بھی دیجاتی تھی، چنانچہ عثمان بن عفان کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ولید بن عقبہ گرفتار ہو کر آیا اور دو شخصوں کی گواہی سے اس کا شراب نوشی کا جرم ثابت ہو گیا تو حضرت عثمان نے حضرت علی سے کہا کہ آپ اس پر حد جاری کیجئے، حضرت علی نے عبداللہ بن جعفر کو حکم دیا۔ انہوں نے ولید کے کوڑے مارنے شروع کئے، حضرت علی انہیں شمار کرتے جاتے تھے، جب پورے چالیس ہو گئے تو حضرت علی نے فرمایا۔ بس ختم کرو۔ کیونکہ رسول اللہؐ نے چالیس ہی کوڑے مارے ہیں۔ اور میں نے ان کو شمار کیا ہے اور اس کے بعد ابوبکر کے عہد میں بھی چالیس ہی کوڑے مارے گئے ہیں۔ البتہ عمر نے اسی کوڑوں کی سزا دی ہے۔ لیکن مجکو یہ اور اس کے علاوہ رسول اللہؐ کی دوسری سنتیں زیادہ محبوب ہیں [2] اور یہی روایت زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ لوگوں کا ہاتھوں یا جوتوں سے پیٹنا ایک ہنگامی تعزیر ہو سکتی ہے اس کو حد نہیں کہہ سکتے اسکے علاوہ اگر کوڑوں کی سزا عہد نبوی میں بالکل نہ ہوتی تو حضرت ابوبکر اپنے مذاق طبعی کے مطابق خود یہ بدعت ایجاد نہیں کر سکتے تھے۔

حد سرقہ | سرقہ کی حد قرآن میں منصوص ہے اس لئے اسکی نسبت اختلاف نہیں ہو سکتا البتہ حاکم کو اس بات کا اختیار ہے کہ اگر وہ یہ سمجھے کہ سارق نے بحالت اضطرار سرقہ کیا ہے تو اسکو معاف کر سکتا ہے چنانچہ حضرت عمر فاروق کے عہد میں اسطرح کے متعدد واقعات پیش آتے تھے جن میں سارق پر حد سرقہ جاری نہیں کی گئی تھی حضرت ابوبکر کا بھی معمول یہ تھا نابالغ چور پر حد جاری نہیں کرتے تھے [3]

[1] بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۲ [2] ابوداؤد باب الحد فی الخمر ج ۲ ص ۲۴۲ [3] کتاب الخراج قاضی ابویوسف ص ۱۰۵

حد زنا | آنحضرتؐ نے ایک غیر شادی شدہ شخص کو جس سے زنا صادر ہو گیا تھا کوڑے لگانے اور اس کے بعد جلا وطنی کی سزا دی تھی حضرت ابوبکر نے بھی اسپر عمل کیا اور ان کے عہد میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تو یہی سزا دی [1]

ذاتی معاملہ میں مسامحت | اگرچہ حضرت ابوبکر قومی و اجتماعی جرم کے باب میں کسی قسم کی نرمی اور ملاطفت کو روا نہیں رکھتے تھے لیکن اگر کوئی جرم خود ان کی ذات یا شخصیت سے متعلق ہوتا تھا تو اس میں چشم پوشی یا اغماض سے کام لیتے تھے، ایک مرتبہ ایک شخص نے کوئی ناگوار حرکت کی۔ تو ابوبکر اس پر سخت غضبناک ہوئے۔ ایک شخص نے کہا "اے خلیفۂ رسول اللہ حکم دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں، یہ سنتے ہی حضرت ابوبکر کا غصہ بالکل فرو ہو گیا۔ اور اس شخص سے تعجب سے کہا کہ اگر میں تم کو حکم کرتا تو کیا واقعی تم اس کی گردن اڑا دیتے"، اس کے بعد فرمایا "یاد رکھو! آنحضرتؐ کے بعد یہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے [2]"

[1] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۲۸ بحوالہ نجس [2] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۹۔

دینی خدمات

اصلاح عقائد اگرچہ حضرت ابوبکرؓ کا مختصر عہدِ خلافت اندرونی اور بیرونی استحکام کی مہمات میں مصروف رہا اور یہ جو کچھ بھی تھا دین کیلئے ہی تھا، تاہم عام اصطلاح میں جس کو دینی خدمات کہا جاتا ہے، آپ اس سے بھی غافل نہیں رہے، اس سلسلہ میں آپکی بڑی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں میں اسلام اپنی اصلی شکل و صورت میں قائم رہے۔ اور اس کے سرخ روشن پر غلط افکار و توہمات اور بدعات کی گرد نہ پڑنے پائے چنانچہ وفاتِ نبوی کے وقت آپنے جو خطبہ دیا اس سے یہ حقیقت ثبت کر دی کہ پیغمبر صاحبِ شریعت ہوتا ہے۔ اس پر وحی نازل ہوتی ہے اور اس حیثیت سے اسکا ہر عمل اسوہ اور اس کا ہر قول واجب الاتباع ہوتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ ہوتا ہے بشر ہی اور اس کے لئے بشری حوائج و ضروریات کا جہاں تک تعلق ہے اس میں اور دوسرے انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس لئے اگر حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے۔ جو خلاف توقع ہو۔

پھر خلیفہ منتخب ہونے کے بعد آپنے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں صاف صاف یہ بتا دیا کہ خلیفہ بھول چوک اور غلطی سے مبرا نہیں ہوتا۔ کیونکہ پیغمبر کی طرح اس کے پاس وحی نہیں آتی۔ اس بنا پر اگر خلیفہ سے غلطی ہو جائے تو اسلامی جماعت کا فرض ہے کہ وہ اس پر خاموش نہ رہے اور خلیفہ کی اصلاح کرے۔ آپنے صاف فرمایا۔

" وان زغت فقوموني " بتاؤ اس آزادیٔ ضمیر و قول کی مثال کسی جمہوریت میں مل سکتی ہے، کسی نے آپ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو اس کی بھی اصلاح کر دی کہ نہیں میں اللہ کا نہیں بلکہ رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔

تعیین زکوٰۃ کے خلاف آپ نے جو جہاد کیا وہ اس بات کی دلیل تھا کہ فرض فرض سب برابر ہیں۔ شریعت میں قطع و برید نہیں ہو سکتا جو اسکو قبول کریگا، کُل کو قبول کریگا

اور ایک جز کا انکار کرنا کل کے انکار کے مترادف ہو گا۔

امر بالمعروف قرآن مجید میں ایک آیت ہے۔

يا ايها الذين امنوا عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم ۔

اے ایمان والو تم اپنی خبر لو، اگر کوئی گمراہ ہوتا ہے تو وہ تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا بشرطیکہ تم ہدایت یافتہ ہو۔

اس آیت سے غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ جب معاملہ اپنی اپنی فکر کرنے کا ہے تو پھر اب امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تبلیغ و دعوت الی الحق کی ضرورت ہی نہیں ہے، حضرت ابوبکرؓ نے ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے یہ آیت پڑھی اور اس کے بعد فرمایا "تم لوگ یہ آیت پڑھتے ہو اور اس کی مراد صحیح نہیں سمجھتے، میں نے آنحضرتؐ سے سنا ہے کہ اگر لوگ اپنے درمیان منکرات و فواحش ہوتے دیکھیں اور اس پر اپنی طرف سے ناراضگی کا اظہار نہ کریں تو بعید نہیں کہ ان گناہوں کی پاداش میں مرتکب اور غیر مرتکب دونوں ہی شامل کر لئے جائیں [1]

بدعات پر تنبیہ ایک مذہب کے لئے سب سے بڑا فتنہ بدعات ہیں، حضرت ابوبکرؓ کو اس کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اور جب ان کے علم میں کوئی بدعت آتی تھی تو فوراً اس پر تنبیہ فرماتے تھے ایک مرتبہ حج کے موقع پر آپ کو معلوم ہوا کہ قبیلہ احمس کی ایک عورت جس کا نام زینب تھا حج کر رہی ہے اور اس دوران میں کسی سے بات نہیں کر رہی ہے آپ فوراً اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کو بتایا کہ حج کے اثنا میں گفتگو نہ کرنا اور خاموش رہنا جاہلیت کا طریقہ ہے۔ [2]

تبلیغ و اشاعت اسلام حضرت ابوبکرؓ جو فوج یا دستہ کہیں بھیجتے تھے اس کو یہ تاکید ہوتی تھی کہ محض اعلاءِ کلمۃ اللہ اور اشاعتِ اسلام ان کا مقصد ہونا چاہئے۔ چنانچہ حضرت عدی بن حاتم کی کوشش سے بنو طے خود بخود ارتداد سے تائب ہو کر مسلمان ہو گئے مثنی بن حارثہ کی دعوت پر بنو وائل کے بہت سے بت پرست اور عیسائی حلقہ بگوش اسلام

---

[1] مسند امام احمد ابن حنبل ج ۱ ص ۹ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۴۵ باب ایام الجاہلیہ

ہوئے، حضرت خالد کی مساعی سے عراق عرب اور حدود شام کے اکثر قبائل نے اسلام قبول کیا۔ طلیحہ جو خود مدعیِ نبوت تھا۔ شام میں پناہ گزین ہو کر مسلمان ہو گیا اور بطور معذرت یہ شعر لکھ کر بھیجے ؎

فهل یقبل الصدیق انی مراجع	کیا ابوبکر صدیق اس کو قبول کریں گے کہ میں
ومعط بما احدثت من حدث یدی	واپس آجاؤں، اور جو کچھ میں نے گناہ کئے ہیں
وانی من بعد الضلالة شاهد شهادة	ان کی تلافی کر دوں، اور گمراہی کے بعد میں سچی
حق لست فیها بملحد [1]	گواہی دیتا ہوں جس میں بھٹکنے والا نہیں ہوں۔

اس کے علاوہ حیرہ کے متعدد عیسائی راہبوں نے خود بخود اسلام قبول کیا۔

جمع قرآن

اس سلسلہ میں آپ کا سب سے زیادہ اہم اور بنیادی کام قرآن مجید کا جمع کرنا ہے۔ اس کی تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ جنگ یمامہ میں ایک ہزار دو سو مسلمان شہید ہوئے تھے جن میں انتالیس (۳۹) کبار صحابہ اور حفاظِ قرآن شامل تھے، یہ صرف ایک جنگ کا حال تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اور دوسری جنگوں میں جو نقصان ہوا اگر اس کو بھی ملا لیا جائے تو تعداد کہاں تک پہونچتی ہے اس کا احساس یقیناً حضرت ابوبکر کو ہوگا لیکن وہ اپنے مذاقِ طبعی کی بنا پر کسی ایسے کام کو کرنے کیلئے آمادہ نہیں تھے۔ جو خود آنحضرت نے نہ کیا ہو۔ حضرت عمر نے جرأت کی اور خدمتِ صدیقی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یمامہ کی جنگ میں قراء وحفاظِ قرآن کا شدید نقصان ہوا ہے۔ اس لئے اگر آپ نے قرآن کو جمع کرنے کا بندوبست نہیں کیا تو اندیشہ ہے کہ قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ حضرت ابوبکر کا جواب وہی تھا کہ جس کام کو آنحضرت ﷺ نے نہیں کیا میں اسے کیسے کر سکتا ہوں۔ حضرت عمر نے کہا یہ کام تو خیر ہے، انہوں نے بار بار یہی بات کہی تو حضرت ابوبکر کو اطمینان اور شرح صدر ہو گیا،

[1] یعقوبی ج ۲ ص ۱۲۵

اب انہوں نے حضرت زید بن ثابت کو بلایا اور ان سے کہا "تم جوان آدمی ہو سمجھدار ہو، ہم تم کو متہم نہیں کر سکتے، تم رسول اللہ کے کاتب وحی تھے، اس لیئے قرآن کا تتبع (ادھر ادھر سے فراہم) کرو اور اس کو یکجا کر دو"۔ زید بن ثابت کا بیان ہے کہ اگر حضرت ابوبکر مجھ کو کسی ایک پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا دینے کا حکم کرتے تو وہ اس حکم سے زیادہ گراں نہ ہوتا۔ اس کے بعد انہوں نے بھی وہی اشکال ظاہر کیا جو شروع میں حضرت ابوبکر نے کیا تھا، لیکن ان کے جواب میں حضرت ابوبکر نے وہی بات کہی جو حضرت عمر نے خود آپ سے کہی تھی یعنی یہ کام تو خیر ہی کا ہے۔ آخر کچھ رد و کد کے بعد زید بن ثابت کو بھی اطمینان ہو گیا۔ اور انہوں نے قرآن مجید کے مختلف اجزا جو کپڑوں کے ٹکڑوں، درخت کی چھالوں اور کھجور کے پتوں پر لکھے ہوئے، یا سینوں میں محفوظ تھے ان سب کو بکمال احتیاط یکجا کر دیا۔ یہاں تک کہ خود زید بن ثابت کہتے ہیں کہ سورۂ توبہ کی دو آیتیں "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ" اور "فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ" خزیمۃ الانصاری کے پاس ہی محفوظ تھیں وہ بھی ان سے لے لیں اس کے علاوہ سورۂ احزاب کی ایک اور آیت تھی جسکو زید بن ثابت آنحضرت سے سن چکے تھے، جب مصحف کی تدوین ہو چکی تو دیکھا کہ اس میں وہ آیت نہیں ہے آخر وہ بھی حضرت خزیمہ کے پاس ملی۔ دو آدمیوں کی شہادت لے کر اس کو بھی قرآن میں شامل کر دیا گیا۔ یہ تمام صحیفے جن میں قرآن یکجا کیا گیا تھا حضرت ابوبکر کے پاس محفوظ تھے، آپ کے بعد حضرت عمر نے ان کی حفاظت کی، جب آپ کی بھی وفات ہو گئی تو یہ امانت حضرت حفصہ کے حصہ میں آئی [1]

ایک غلط روایت ایک روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے جمع قرآن کا کام حضرت عمر بن خطاب نے کیا ہے [2] لیکن جیسا کہ ابھی معلوم ہوا یہ روایت صحیح نہیں ہے، اسمیں شک نہیں ہے کہ جمع قرآن کی سب سے پہلے تحریک کرنیوالے حضرت عمر ہی ہیں لیکن اس کی تکمیل خلافتِ صدیقی کا کارنامہ ہے، راوی نے غلطی سے تحریک جمع قرآن کو خود جمع قرآن سمجھ لیا۔

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۶ [2] کتاب المصاحف لابن ابی داؤد (طبع اول المطبعۃ الرحمانیہ مصر) ص ۱۰

چنانچہ خود حضرت علیؓ سے منقول ہے، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ابو بکر پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ جمعِ مصاحف کے باب میں ان کا اجر سب سے زیادہ ہے کیونکہ پہل انہوں نے ہی کی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد صحابہ کی شہادتیں اسی مضمون کی ہیں جو حدِ تواتر کو پہونچی ہیں۔ [1]

جمع قرآن کی اصل حقیقت اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

قرآن مجید کی جمع و ترتیب کے متعلق عام طور پر خیال یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات تک قرآن کی آیات منتشر تھیں، وہ ایک دوسرے سے مربوط نہ تھیں اور نہ سورتوں میں کسی قسم کی ترتیب تھی اور نہ ان سورتوں کے نام متعین ہوئے تھے، اس لئے عہدِ صدیقی میں جو کام ہوا وہ انہیں آیات و سُوَر کی ترتیب تھی۔ اس خیال کو بعض مستشرقین اور خصوصاً سر ولیم میور اور آرتھر جیفری نے جس نے کتاب المصاحف لابن ابی داؤد کو بڑی محنت سے ایڈٹ کر کے مصر سے شائع کیا ہے۔ بہت زیادہ پھیلا کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ موجودہ قرآن اس قرآن سے مختلف ہے۔ جو آنحضرت صلعم کے عہد میں تھا۔

اس قسم کا خیال کرنا صرف علمی گمراہی نہیں بلکہ علمی بددیانتی بھی ہے کیونکہ قوی دلائل و براہین سے یہ ثابت ہے کہ قرآن کی آیات و سُوَر کی ترتیب خود عہدِ نبوت میں ہو چکی تھی۔ اور آنحضرت صلعم کے حکم اور آپ کے ارشاد کے مطابق ہی ہوتی تھی زید بن ثابت کا بیان ہے کہ میں نے پورا قرآن رسول اللہ صلعم کے سامنے پڑھا ہے بخاری وسلم میں حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ چار شخصوں نے آنحضرت صلعم کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا اور یہ چاروں انصار تھے۔ ان کے نام یہ ہیں: ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید [2] محمد بن اسحاق نے الفہرست میں سات صحابہ کے نام لکھے ہیں۔ جنہوں نے عہدِ نبوت میں قرآن جمع کیا تھا۔ دراصل آنحضرت صلعم کا معمول یہ تھا کہ آپ کے خاص خاص کاتب تھے جن پر آپ کو اعتماد تھا جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آپ ان کاتبین وحی سے فرما دیتے تھے کہ

[1] کتاب المصاحف ابن ابی داؤد ص ۵ - [2] بخاری ج ۲ ص ۷۴۸

اس آیت کو فلاں سورت میں شامل کر لو مذکورہ بالا روایت میں جن چار انصار کا ذکر آیا ہے۔ ان کا کام درحقیقت قرآن کی کتابت کر کے اپنے پاس محفوظ کرنا تھا۔ اسی حقیقت کو جمع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت انسؓ نے چار شخصوں کی جو تخصیص کی ہے تو اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص بھی اس شرف کے حامل تھے، اس بنا پر حضرت انسؓ کی روایت کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ انصار میں بھی چار کاتب تھے، غیر انصار دوسرے بھی تھے۔

اس کے علاوہ روایات متواترہ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم سال میں ایک مرتبہ قرآن مجید حضرت جبرئیل کو سنایا کرتے تھے۔ اور جس سال آپ کی وفات ہوئی ہے اس مرتبہ آپ نے دو مرتبہ قرآن سنایا ہے۔ [1]

سطور بالا سے یہ صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلعم کے عہد میں منتشر اور پراگندہ نہیں تھا بلکہ مرتب تھا۔ چنانچہ خود قرآن بھی اپنے متعلق یہی کہتا ہے۔ قرآن کو جگہ جگہ الکتاب کہا گیا ہے جس کے معنی مرتب اور نوشتہ کے ہیں۔ سورۃ المزمل میں فرمایا گیا۔

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۔ اور آپ قرآن ترتیل کے ساتھ تلاوت کیجئے

ظاہر ہے اگر قرآن مرتب ہی نہیں تھا تو پھر ترتیل کس چیز کی ہوگی۔

ترتیب سُوَر عہدِ نبوت میں

اب رہی یہ بات کہ سورتوں کے نام بھی عہدِ نبوت میں متعین ہو گئے تھے تو اس کے ثبوت میں ایک دو نہیں متعدد روایات صحیحہ پیش کی جا سکتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔ میں نے آنحضرت صلعم کے دہانِ مبارک سے تیس سورتیں پڑھی تھیں [2]

حضرت عمر فاروقؓ کے اسلام لانے کے واقعہ میں مذکور ہے کہ جب وہ اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر پہونچے تو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک صحیفہ ہے اور اس میں سورۂ

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۴۸ - [2] بخاری ج ۲ ص ۷۴۸

لطہ لکھی ہوئی ہے۔

بعض اوقات کئی کئی آیات اکٹھی نازل ہوتی تھیں اور آنحضرتؐ ان آیات کو تلاوت فرمانے کے بعد کاتبین وحی کو حکم دیتے تھے کہ فلاں آیت فلاں سورت میں لکھی جائے۔

اس کے علاوہ متعدد احادیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نماز میں اور نماز کے علاوہ یوں بھی مکمل سورتیں پڑھتے تھے۔ مثلاً البقرہ، آل عمران، النساء وغیرہا پھر متعدد احادیث میں بعض خاص خاص سورتوں مثلاً سورۃ بقرہ، الکہف، سورۃ الرحمن اور سورۂ یٰسین کے فضائل بیان کئے گئے ہیں ان کے علاوہ بعض خاص خاص سورتوں کا ذکر ہے کہ آنحضرتؐ ان کو خاص خاص نمازوں میں پڑھتے تھے۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے مغرب میں اعراف پڑھی، سورۂ اخلاص پڑھی، اور دوسری نمازوں میں آل عمران اور نساء تلاوت کی۔ یہ روایات اس کثرت سے منقول ہیں کہ حدیث کی کوئی کتاب مشکل سے ہی ان کے ذکر سے خالی ہوگی[1]

امید ہے جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے امور ذیل صاف طور پر ثابت ہوگئے۔

(۱) قرآن کی کتابت آنحضرتؐ کے عہد میمنت مہد میں ہوئی تھی اور اس شد و مد کے ساتھ کہ آپ نے فرمایا تھا۔

لا تکتبوا عنی غیر القرآن — قرآن کے علاوہ مجھ سے تم کچھ اور نہ لکھو۔

(۲) ایک سورۃ میں آیات کی ترتیب بھی عہد نبوت میں اور آپ کے حکم سے ہو گئی تھی۔ (۳) سورتوں کے نام کی تعیین بھی آنحضرتؐ کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔

صدیقی کارنامہ کی نوعیت | اب دیکھنا چاہئے کہ جب یہ سب کچھ عہد نبوت میں ہی ہو چکا تھا تو پھر حضرت ابوبکر کے عہد میں جو جمع قرآن ہوا اس کی کیا حقیقت ہے۔

اصل یہ ہے کہ اگرچہ عہد نبوت میں نفس قرآن مرتب تھا، لیکن اس کے اجزاء منتشر تھے، کسی کے پاس کوئی جز تھا اور کسی کے پاس کوئی اور جز۔ کسی کے

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۹، ۷۵۰ و رسالہ فضائل القرآن ابن کثیر

پاس سورت کامل تھی اور کسی کے پاس ناقص اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس وقت تمام کاتبین وحی تو موجود ہوتے نہیں تھے جو قرآن کی آیات کو براہ راست آپ سے ہی سن سکتے تھے۔ اس لئے ان تک وہ سورۃ یا آیات بالواسطہ پہونچتی تھیں اور وہ بھی کبھی پوری اور کبھی آدھی۔ غرض کہ آنحضرتؐ کی وفات تک قرآن ایک مصحف کی شکل میں بین الدفتین موجود نہ تھا، وہ خود مرتب تھا، لیکن اس کے اجزاء یکجا نہیں تھے۔ متفرق حفاظ و قراء کے پاس متفرق اجزا تھے، اسی وجہ سے یمامہ کی جنگ میں حافظ اور قاری کثرت سے شہید ہوئے تو حضرت عمر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں قرآن ضائع نہ ہوجائے یعنی یہ ممکن تھا کہ جو حضرات شہید ہو جائیں قرآن کے بعض اجزاء صرف انہیں کے پاس ہوں اور کسی دوسرے کے پاس نہ ہوں اگر ایسا ہوا تو ان حضرات کی شہادت کے بعد وہ اجزا پھر کہیں اور ملیں گے ہی نہیں اور دنیا ہمیشہ کے لئے ان سے محروم ہوجائے گی۔

یہاں ایک یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ حضرت زید بن ثابت کو حضرت خزیمہ کے پاس سورۂ توبہ کی دو آیتیں یا سورۂ احزاب کی جو ایک آیت ملی تو آخر انہوں نے یہ کس طرح پہچانا کہ یہ آیات توبہ اور احزاب کی سورتوں کی تھیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورتوں کی ترتیب اور ان کے ناموں کی تعیین خود آنحضرتؐ کی حیات میں ہی ہو گئی تھی[1]

بہر حال عہد صدیقی میں جو کام انجام پایا وہ یہی تھا کہ قرآن مجید کے متفرق اجزا کو ایک مصحف کی شکل میں یکجا کر دیا گیا، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

قد اعلم اللہ تعالیٰ فی القرآن — اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ پہلے ہی بتا دیا تھا کہ

[1] یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت زید بن ثابت نے دو آدمیوں کی گواہی لیکر ان آیتوں کو جو مصحف میں داخل کر دیا، تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ بس یہ دو گواہ تھے یقیناً اور بھی بہت سے لوگ اسکے شاہد ہونگے اور خود حضرت زید کو ان کے قرآنی آیات ہونیکا پورا علم تھا، اسی وجہ سے تو وہ انکی تلاش کر رہے تھے لیکن چونکہ قانون کا منشا دو آدمیوں کی گواہی پورا ہو جاتا ہے اسلئے صرف دو کی گواہی پر بس کیا گیا تھا

بانہ مجموع فی الصحف فی قولہ تیلوا صحفا مطہرۃ الآیۃ وکان القرآن مکتوباً فی الصحف لکن کانت متفرقۃ فجمعھا ابوبکر فی مکان واحد[1]

وہ صحیفوں میں جمع ہے، چنانچہ اس نے فرمایا تیلوا صحفاً مطہرۃ۔ اور قرآن صحیفوں میں لکھا ہوا تھا، لیکن وہ صحیفے (مختلف اجزاء جو الگ الگ لکھے ہوئے تھے) متفرق تھے پس ابوبکرؓ نے ان کو ایک جگہ جمع کر دیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے تأمل کی وجہ

غور کرو حافظ صاحب نے کیا عجیب نکتہ پیدا کیا ہے، یہ خیال ہو سکتا تھا کہ جب جمع قرآن کی حقیقت اتنی ہی تھی تو پھر آخر حضرت ابوبکرؓ کو اس میں پس و پیش کیوں ہوا؟ اور انہوں نے یہ کیسے فرمایا کہ "جس کام کو آنحضرت صلعم نے نہیں کیا۔ میں اس کو کیونکر کر سکتا ہوں! حافظ صاحب کی تقریر بالا سے واضح ہو گیا کہ حضرت ابوبکرؓ کے تأمل کی وجہ سے یہ تھی کہ قرآن نے آنحضرت صلعم کی صفت یہ بیان کی ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے صحف (نہ کہ مصحف) کی تلاوت کرتے ہیں اور قرآن آپ کی وفات تک رہا بھی صحف کی ہی شکل میں نہ کہ مصحف کی صورت میں اب حضرت ابوبکرؓ اسکو مصحف کی شکل میں جمع کرائیں گے تو وہ کہیں بدعت اور اسوۂ رسول سے تجاوز تو نہیں ہو جائیگا۔ پس یہ خیال تھا جس کے باعث حضرت ابوبکرؓ کو تأمل ہوا۔ لیکن بعد میں حضرت عمرؓ کے بار بار کہنے سے آپ کو اطمینان ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے جمع قرآن میں فرق

اگرچہ جمع قرآن دراصل حضرت ابوبکرؓ کا کارنامہ ہے لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ شہرت حضرت عثمان خلیفۂ سوم کی ہے اور عام طور پر اُن کو ہی جامع قرآن سمجھا جاتا ہے لیکن دونوں کے کارناموں میں بڑا فرق ہے۔

حضرت عثمانؓ کے جمع قرآن کی حقیقت یہ ہے کہ شام اور عراق کی فتح کے بعد جب اسلامی مملکت کے حدود وسیع ہو گئے تو مختلف مصاحف جو مختلف صحابہ کے پاس محفوظ تھے وہ تمام مملکت میں پھیل گئے اور ہر شہر کے لوگوں نے اپنے اپنے علاقائی

[1] فتح الباری ج ۹ ص ۱۰

حفاظِ قرآن کی قرأت کے مطابق اس کو پڑھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اہل کوفہ عبد اللہ بن مسعودؓ کے نسخہ مصحف کے مطابق قرأت کرتے تھے۔ اہل بصرہ ابوموسیٰ اشعریؓ اہل دمشق مقداد بن الاسود، اور اہل شام ابی بن کعب کے نسخوں کے مطابق قرأت کرتے تھے یہ اختلاف اگرچہ قرأت کا تھا۔ لفظ اور عبارت کا نہیں تھا۔ لیکن قرأت کا یہ وسیع اختلاف لفظوں کے الٹ پھیر تک بھی وسیع ہو سکتا تھا۔ اور ضرورت تھی کہ اسکی حدبندی کی جائے۔ اور اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کوئی قدم اٹھایا جائے۔ اسی اثنا میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ آرمینیہ اور آذربائیجان کی سرحد پر جنگ ہو رہی تھی۔ وہاں حضرت حذیفہ بن الیمان نے دیکھا کہ اہل عراق اور اہل شام کی قرأت میں بڑا شدید اختلاف ہے یہ دیکھ کر ان کو بڑی تشویش ہوئی حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے امیر المومنین قبل اسکے کہ یہ امت گمراہ ہو اور وہ اپنی کتاب (قرآن) میں ایسے ہی باہمدگر مختلف ہوں جیسے کہ یہود و نصاریٰ ہیں آپ اس کا سدِّباب کیجیے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہ بنت عمرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکرؓ کا جمع کردہ) جو مصحف ہے اس کو بھیج دیجئے۔ ہم اس کے متعدد نسخے تیار کرا لیں گے اور پھر آپ کے پاس آپ کا نسخہ واپس بھیج دیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے تعمیل کی اب حضرت عثمانؓ نے مصحف ابی بکرؓ کی نقل پر حضرت زید بن ثابت، سعید بن العاص، عبد الرحمٰن بن الحارث اور عبد اللہ بن زبیرؓ کو مقرر فرما دیا۔ اور ان حضرات میں تین جو قریشی تھے ان کو حکم دیا کہ جس قرأت کے متعلق تم میں اور زید بن ثابت میں اختلاف ہو اس میں قریش کی زبان کی پیروی کرو۔ کیونکہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے جب یہ سب نسخے تیار ہو گئے تو خلیفۂ ثالث نے ایک ایک نسخہ ایک ایک صوبہ میں بھیج دیا۔ ان کے علاوہ جتنے نسخے اور تھے ان کو سپرد آتش کرنے کا حکم دیا۔[1] اس تقریر سے معلوم ہوا ہوگا کہ حضرت ابوبکرؓ نے قرآن مجید کے مختلف اجزا

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۶ باب جمع القرآن [2] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۱۰۲

کو جو پراگندہ اور بکھرے ہوئے تھے ان کو ایک جگہ بین اللوحین میں جمع کیا تھا اور اختلافِ قرأت سے تعرض نہیں کیا تھا۔ اس کے برخلاف حضرت عثمان نے اسی مصحف ابی بکر پر اعتماد کر کے اور اس کو بنیاد قرار دے کر قرأتیں متعین کر دی تھیں جو سبعہ قرأت کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ باقی قرأتوں کو غیر مستند قرار دیا گیا۔ اور ان قرأتوں کے حامل جو نسخے تھے ان کو جلا دیا گیا۔

چنانچہ علامہ جلال الدین السیوطی نے قاضی ابوبکر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا

لم یقصد عثمان قصد ابی بکر فی جمع نفس القرآن بین اللوحین وانما قصد جمعھم علی القرأت الثابتۃ المعروفۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم والغاء مالیس کذالک [1]	ابوبکر نے نفس قرآن کو لوحین کے درمیان جمع کرنے کا جو کام کیا تھا۔ عثمان نے اسکا ارادہ نہیں کیا بلکہ ان کا منشا صرف یہ تھا کہ جو قرأتیں آنحضرت صلعم سے ثابت اور معروف ہیں ان پر مسلمانوں کو جمع کریں اور ان کے علاوہ جو دوسری قرأتیں ہیں ان کو ضائع کریں۔

صدیقی کارنامہ کی اہمیت | حضرت ابوبکر کے اس عظیم الشان کارنامہ کی اہمیت اور عظمت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں۔

یہی جمع قرآن در مصاحف ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ منطبق ہوتا ہے اور جس کی بشارت "اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ" میں موجود ہے [2]

جب تک دنیا میں قرآن اور ایک کلمہ گو بھی موجود ہے حضرت ابوبکر کے احسان سے امت مسلمہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

عہدِ صدیقی میں تمدنی حالت

آنحضرت صلعم کے عہد میں ہی اگرچہ عربوں کی تمدنی زندگی پر بداوت

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۱۰۳۔ [2] ازالۃ الخفاء حصہ دوم ص ۵

کی جگہ حضارت کا رنگ چڑھنا شروع ہو گیا تھا، چنانچہ زمانۂ قبل اسلام میں گھروں کے اندر بیت الخلا کا رواج نہیں تھا۔ مدینہ کی ہجرت کے بعد اسکا رواج ہوا اور اسمیں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ بیت الخلا گھر کے اندر تو نہ ہوں مگر ان سے متصل ہوں [1] اسکے علاوہ لباس میں وضع قطع میں، نشست و برخاست میں، تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی تاہم سادگی برابر قائم رہی اور تکلفات کا کبھی کوئی دخل نہیں ہوا۔ سادگی کا یہ انداز عہد صدیقی میں بھی رہا۔ تاہم عراق اور شام میں اس زمانہ کی دو مہذب اور ترقی یافتہ قوموں ایرانیوں اور رومیوں کے ساتھ اختلاط کے باعث کچھ کچھ تکلفات کا عمل دخل ہونا شروع ہو گیا تھا چنانچہ حضرت ابوبکر اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان اول الذکر کے مرضِ وفات میں جو مکالمہ ہوا ہے اس میں حضرت ابوبکر نے استخلافِ حضرت عمر کے سلسلہ میں بطور طنز و تعریض فرمایا ہے کہ تم لوگ دیبا کے گدے بچھونے اور ریشمین پردے استعمال کرنے لگے ہو اور آذربائیجانی اون کے بنے ہوئے کپڑوں سے تم کو تکلیف ہوتی ہے [2]۔

عرب زمانۂ قبل از اسلام سے ہی ایک درمیانی منزل تھے جس کے ذریعہ چین، ہندوستان اور ایران کے مصنوعات اور پیداوار چیزیں مصر اور مغربی ممالک میں آتی جاتی تھیں۔ اس تقریب سے عربی شاعری میں ہندی تلواروں، ہندسالوں عود مندل، کافور اور زنجبیل وغیرہ کا ذکر ملتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ چیزیں عرب میں مستعمل تھیں۔

لباس | عربوں کا لباس شروع میں عموماً ایک رداء اور ایک ازار پر مشتمل ہوتا تھا لیکن بعد میں جب تمدن نے ترقی کی تو درع (کرتہ) قمیص۔ پاجامہ (سراویل) اور بنیان وغیرہ بھی مستعمل ہونے لگا۔ جس پر عربی زبان کے الفاظ شعار اور دثار دلالت کرتے ہیں اس کے علاوہ مرد باہر نکلتے تھے تو سر پر عمامہ باندھتے اور جبہ پہنتے تھے اور عورتیں سر پر رومال باندھتی تھیں یا اوڑھنی اوڑھتی تھیں جس کو خمار یا معجر کہتے ہیں

[1] صحیح بخاری ج ۲ حدیث الافک [2] الکامل طبری ج ۱ ص ۵

زیورات میں بازو بند کڑے، بالی اور انگوٹھی اور چھلّے کا استعمال کرتی تھیں اور
لونگ کا بھی استعمال ہوتا تھا جسے سخاب کہتے ہیں غزوۂ بنی مصطلق کے سفر
میں حضرت عائشہ رض کا جو ہار گم ہو گیا تھا، مہرۂ یمانی کا تھا[1] سرمہ اور مہندی کا
استعمال بھی ہوتا تھا۔ ورس ایک قسم کی سرخ گھاس ہے جو کہ بطور غازہ چہرہ پر ملتی
تھیں، خوشبو میں مشک، عنبر اور زعفران کا استعمال ہوتا تھا۔

غذا | غذا عام طور پر سادہ ہوتی تھی، دودھ، کھجور اور گوشت عربوں کی مرغوب غذا تھی
گوشت مختلف ترکیبوں سے پکایا جاتا تھا جس کا ثبوت ان کثیر التعداد الفاظ سے
ہوتا ہے جو عربی میں گوشت کیلئے اس زمانہ میں مروج تھے، اور جن کی فہرست
ثعالبی کی کتاب فقہ اللغۃ میں یکجا مل سکتی ہے، اسی طرح کھجور اور دودھ کو بھی
متعدد طریقوں پر استعمال کیا جاتا تھا۔ مکھن اور پنیر کا بھی رواج تھا۔ حریرہ بھی مستعمل
تھا۔ ترکاریوں میں کدو چقندر کا ذکر احادیث میں بھی ہے، کدو حضور کو بھی بہت
مرغوب تھا۔ باقلا کا بھی ذکر آیا ہے۔ سرکہ کو آنحضرت ص نے بہترین سالن فرمایا ہے
مزید تفصیلات بخاری کے باب کتاب الاطعمۃ اور زاد المعاد ابن قیم سے معلوم ہو سکتی ہے

ذرائع معاش | یورپین مصنفین کا عام خیال ہے کہ اسلام کے بعد مسلمانوں کی معاش
کا سب سے بڑا ذریعہ مال غنیمت تھا، یہ بالکل غلط خیال ہے کیونکہ مال غنیمت میں حصہ دار
صرف وہی لوگ ہو سکتے تھے جو جہاد میں شریک ہوتے تھے اور ظاہر ہے ان کی تعداد
عام آبادی کی تعداد کے مقابلہ میں بہت تھوڑی ہوتی تھی عہد نبوی اور اس کے بعد
عہد صدیقی میں بھی اصل اسلامی معاشرہ کے عناصر ترکیبی مہاجرین
اور انصار یہی دو گروہ تھے اور ان میں سے ہر ایک کا طبقاتی ذریعہ معاش الگ الگ
تھا۔ مہاجرین تجارت کرتے تھے اور انصار کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے چنانچہ
حضرت ابوہریرہ پر جب کثرت روایت کی وجہ سے بعض لوگوں نے نکتہ چینی کی تو
آپ نے فرمایا کہ میرے مہاجرین بھائی تجارتی کاروبار میں مصروف رہتے تھے

---

۱ سنن ابوداؤد باب التیمم۔ ۲ صحیح بخاری کتاب البیوع

اور میرے انصاری بھائی کھیتی باڑی کرتے تھے اور میں آنحضرت ص کی خدمت میں ہمہ
وقت موجود رہتا تھا نہ مہاجرین میں جو حضرات تجارت میں نامور تھے ان میں
حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت
سعد بن ابی وقاص خاص طور پر مشہور ہیں۔ مہاجرین کا اصل پیشہ اگرچہ تجارت تھا لیکن
مدینہ میں انصار کے ساتھ مواخات کے باعث ان میں سے بعض کھیتی باڑی کرنے
لگے تھے۔

آزاد تجارت | اسلام سے پہلے عرب کے مشہور بازار عکاظ، ذوالمجنہ اور ذوالمجاز
تھے جہاں مختلف قبائل کے لوگ اپنا اپنا تجارتی مال لے کر آتے تھے اور بیچتے
تھے لیکن ان کی یہ تجارت آزاد نہیں تھی ان سے محصول لیا جاتا تھا۔ لیکن آنحضرت
نے مدینہ میں ایک اور بازار قائم کیا تھا۔ اور اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں کوئی ٹیکس
نہیں دینا پڑتا تھا۔ آپ نے جب اس کو قائم کیا تو فرمایا۔
ھذا سوقکم لا خراج علیکم فیہ[1] یہ تمہارا بازار ہے اس میں کاروبار کرنے پر کوئی ٹیکس نہیں ہے

گھریلو دستکاری اور آزاد پیشے | تجارت اور فلاحت کے علاوہ صحابہ کرام کا ذریعہ معاش
گھریلو دستکاری اور دوسری قسم کے محنت مزدوری کے کام بھی تھے، اسلامی
تعلیمات کے زیر اثر کسب حلال کا ادنیٰ ذریعہ اختیار کرنے میں بھی ان کو ذرا جھجک
نہیں ہوتی تھی اور اس میں ان کو عار نہیں آتی تھی چنانچہ حضرت سلمان فارسی چٹائی
بنتے تھے[2] حضرت سعد الانصاری پتھر پر پھاوڑا چلاتے تھے[3] بعض صحابہ شہد کی
مکھیوں کی پرورش اور ان کی نگہداشت کا کام کرتے تھے حضرت سودہ طائف
کے چمڑہ کا کاروبار کرتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی مالی حالت تمام ازواج مطہرات
سے بہتر تھی، کچھ صحابہ حدادی اور نجاری کا پیشہ کرتے تھے بعض نے معادن کا
ٹھیکہ لے لیا تھا۔ جس کا ذکر قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج میں ہے۔

---

۱ فتوح البلدان بلاذری ص؟ ۲ استیعاب تذکرہ حضرت سلمان فارسی ۳ اسد الغابہ
تذکرہ سعد الانصاری ۴ سنن ابی داؤد باب زکوٰۃ العسل۔

عہد صدیقی میں وظائف نہ ہونے کی وجہ حضرت عمر فاروق نے اپنے عہد خلافت میں سب لوگوں کے حسب مراتب وظیفے مقرر کر دیئے تھے۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکر اس نکتہ سے واقف تھے کہ وظائف کی وجہ سے لوگوں میں تن آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور محنت و جفاکشی کی عادت باقی نہیں رہتی، اس لئے آپ نے کسی تندرست آدمی کا وظیفہ مقرر نہیں کیا جو کچھ آیا اس کو اسی وقت تقسیم کر کے برابر کر دیا۔ چنانچہ جب حضرت عمر نے سب مسلمانوں کے وظائف مقرر کرنے کا ارادہ کیا تو اس پر حضرت ابو سفیان بن حرب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ

ان فرضت للناس اتكلوا على الديوان وتركوا التجارة ۱ — آپنے اگر سب کا وظیفہ مقرر کر دیا تو لوگ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے اور کاروبار کرنا چھوڑ بیٹھیں گے

عام سماجی حالت اسلامی معاشرہ بہترین معاشرہ تھا جس میں عورتوں کو پورے حقوق حاصل تھے۔ غلاموں اور باندیوں کے ساتھ نہایت شریفانہ اور فیاضانہ معاملہ کیا جاتا تھا ملک میں مکمل امن و امان تھا حضرت عمر صدیقی دور میں چیف جسٹس تھے لیکن دو برس تک ان کے پاس کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا خلیفہ عمال حکومت اور عام مسلمان ان کے طرز رہائش میں کوئی فرق ہی نہیں تھا۔ ایک معمولی حیثیت کا مسلمان بھی بلا تردد خلیفہ وقت کے کسی فعل پر برسر عام نکتہ چینی اور خردہ گیری کر سکتا تھا، غیر مسلموں کو مکمل طور پر مذہبی آزادی حاصل تھی اور مسلمانوں کے اور انکے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار اور ہمدردانہ تھے، اور ان کو ترقی کرنے، علم حاصل کرنے کے پورے مواقع حاصل تھے۔

اجتہاد و قیاس

قیاس عہد نبوت میں قرآن و سنت میں اگرچہ اصول و کلیات کے علاوہ سینکڑوں جزئی مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ تمدن اور اجتماع کی ترقی کے

۱ فتوح البلدان بلاذری ص ۴۶۳

ساتھ ساتھ سینکڑوں ہزاروں ایسے مسائل پیش آتے رہتے ہیں۔ جن کا ذکر قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ ایسے مسائل کو حل کرنے کا طریقہ اسکے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ اجتہاد اور قیاس سے کام لیا جائے، چونکہ شریعت کی جامعیت اور عالمگیری کے ساتھ اس چیز کا بہت گہرا تعلق ہے اس لئے خود آنحضرت ؐ کے عہد میں اسکو صاف طور پر بتا دیا گیا تھا۔ چنانچہ تم پہلے پڑھ آئے ہو کہ آنحضرت ؐ نے حضرت معاذ بن جبل کو جب قاضی بنا کر یمن بھیجا تھا تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں کے درمیان کس طرح فیصلہ کرو گے؟ متعدد سوال و جواب کے آخر میں انہوں نے کہا کہ اگر میں حکم کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں نہیں پاؤں گا تو اجتهد برائی" میں اپنی رائے استعمال کرونگا"۱ ظاہر ہے اس اجتہاد بالرائی کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جو معاملہ پیش آئیگا اس پر قیاس کر کے اس کا حکم قرآن و سنت میں تلاش کرونگا اور معاملہ زیر بحث کو اس پر قیاس کر کے اس کا حکم اسپر لگا دوں گا۔ اور یہی تعریف قیاس شرعی کی ہے جو استنباط احکام کے اصول اربعہ میں سے ایک اصل ہے۔ ورنہ کتاب و سنت سے قطع نظر محض رائے زنی کوئی دلیل شرعی نہیں ہو سکتی۔ آنحضرت ؐ نے معاذ بن جبل کا یہ جواب سن کر ان کو آفریں کہی اور خوشی سے ان کے سینہ پر دست مبارک رکھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قیاس کا وجود خود آنحضرت ؐ کے عہد میں پایا جاتا تھا اور اسکے دلیل شرعی ہونے کی توثیق خود آپنے کر دی تھی ۲

استنباط احکام کے اصول ثلاثہ آنحضرت ؐ کے بعد حضرت ابوبکر کا معمول تھا کہ جب کوئی مسئلہ ان کے سامنے آتا تھا تو کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے، اگر اس میں مل گیا تو اس پر عمل کرتے تھے۔ ورنہ سنت رسول اللہ سے مراجعت کرتے تھے اگر اسمیں کامیابی نہ ہوتی تو پھر مسلمانوں کو جمع کر کے دریافت کرتے کہ کیا تم میں سے

۱ مسند امام احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۳۰ ۲ لیکن افسوس ہے مولانا شبلی محض اس شوق میں کہ قیاس کی ایجاد اور اسکو حجت شرعیہ بنانے کا سہرا حضرت عمر فاروق کے سر باندھتے ہیں اسکو تسلیم نہیں کرتے اور ساتھ ہی اسکے منکر ہیں کہ حضرت ابوبکر کے عہد میں قیاس کا وجود پایا جاتا تھا۔

کسی کو اسکے متعلق آنحضرتؐ کا کوئی عمل معلوم ہے۔ اگر ایسا کوئی شخص مل جاتا تو اس
پر اللہ کا شکر ادا کرتے اور اگر اس میں بھی ناکامی ہوتی تو منتخب اور اعاظم
صحابہ کو جمع کرکے ان سے مشورہ لیتے اور جس پر سب متفق ہوجاتے اسی کا حکم دیتے
چنانچہ ایک مرتبہ دادی کی وراثت کا مسئلہ پیش آیا، قرآن مجید میں اس کے متعلق
کوئی حکم تھا نہیں اس لئے آپ نے سنت کیطرف رجوع کیا، حضرت مغیرہ بن شعبہ نے بتایا
کہ آنحضرتؐ جدہ (دادی) کو ایک سدس یعنی ۱/۶ حصہ دلاتے تھے حضرت ابوبکرؓ نے
اس پر شہادت طلب کی۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے حضرت مغیرہ کی تصدیق کی اور
آپ نے یہی حکم نافذ کردیا [1]

اصل رابع یعنی قیاس | ان روایتوں سے استنباط احکام کے اصول ثلاثہ یعنی قرآن
و سنت اور اجماع کا عہد صدیقی میں معمول بہا ہونا ثابت ہوتا ہے، رہی اصل رابع
یعنی قیاس تو حضرت ابوبکرؓ اجماع نہ ہونے کی صورت میں قیاس سے کام لیتے تھے۔
اور جو بات حق معلوم ہوتی تھی اس کا اعلان کردیتے تھے، چنانچہ کلالہ کے متعلق
آپ سے پوچھا گیا تو چونکہ قرآن و سنت میں اس کا مفہوم واضح نہیں تھا اسلیئے
آپ نے فرمایا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اگر صواب ہوا تو اللہ کی طرف
سے ہوگا۔ ورنہ شیطان کی طرف سے، [2] پھر مانعین زکوٰۃ کے معاملہ میں ایسا ہی ہوا۔
حضرت عمر فاروق تک کی رائے خلاف تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ نے زکوٰۃ کو نماز پر قیاس
کیا، کیونکہ فرضیت و اہمیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا اور
پھر جس طرح نماز کا منکر مرتد ہے اسی طرح مانعین زکوٰۃ کو مرتد قرار دے کر ان
سے قتال کو واجب قرار دیا۔ غور کرو کیا یہ صورت بعینہٖ قیاس کی نہیں ہے؟ شاہ
ولی اللہ حضرت ابوبکرؓ کے طرز استدلال کے متعلق فرماتے ہیں۔
"آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ جب لوگ لا الہ الا اللہ کہہ دیں گے تو انکی جانیں
اور مال محفوظ ہوجائیں گے۔ الا بحقہا۔ مگر ہاں اسوقت نہیں جب کہ وہ

[1] سنن ابی داؤد کتاب الفرائض باب فی الجدۃ [2] سنن الدارمی ج ۱ ص ۱۵۵ مطبوعہ دمشق

کسی ایسی چیز کا ارتکاب کریں جس کی وجہ سے ان سے قتال کرنا ضروری ہوجائے۔
اس حدیث کو حضرت عمرؓ جو مانعین زکوٰۃ کیساتھ قتال کرنے کے حق میں نہیں تھے
اپنے استدلال میں پیش کرتے تھے اور ان کے استدلال کی تقریر یہ تھی کہ
نماز کا الا بحقہا کے ماتحت شامل ہونا مسلم ہے اور چونکہ زکوٰۃ بھی نماز کی ہی
طرح ایک اہم فرض اور دین کی بنیاد ہے اس لئے زکوٰۃ کے منع کرنے والوں
کا حکم بھی وہی ہوگا۔ شاہ صاحب کے آخر الفاظ یہ ہیں۔
"و زکوٰۃ مقیس است بر وے بقیاس جلی [1]"
اسی طرح حضرت ابوبکرؓ سے ایک مرتبہ جد (دادا) کی وراثت کا حکم جو قرآن میں مذکور
نہیں ہے اور جس کے متعلق آنحضرتؐ کا کوئی عمل بھی معلوم نہیں تھا پوچھا گیا تو آپ نے
اس کو اب (باپ) پر قیاس کرکے فرمایا کہ میراث کے معاملہ میں دادا کا حکم وہی ہے
جو باپ کا ہے۔ اس کی مزید تشریح آگے آتی ہے۔ مالک بن نویرہ کے واقعہ میں
حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد کی طرف سے جو خونبہا ادا کیا تھا وہ بھی بربنائے
قیاس تھا کیونکہ آنحضرتؐ نے خود حضرت خالد کے اسی طرح کے ایک واقعہ میں ایسا کیا تھا [2]

خیبر و فدک کا مسئلہ | اسی ذیل میں خیبر و فدک کا مسئلہ آتا ہے، یہ مسئلہ ایک مدت
تک مسلمانوں میں بحث و تکرار کا موضوع بنا رہا ہے اس سلسلہ میں حضرت علی اور
حضرت عباس کو جو اصرار رہا اور جو ناگواری پیش آئی اس نے واقعہ کی اہمیت بڑھا
دی ہے اس لئے ہم اس پر تفصیل سے کلام کرتے ہیں۔

اصل واقعہ | اصل واقعہ یہ ہے کہ خیبر کی فتح کے بعد آنحضرتؐ نے اس کو ۳۶ حصوں پر
تقسیم کیا، ان میں سے ۱۸ حصے اپنے لئے مخصوص کئے اور باقی حصص دوسرے
لوگوں پر تقسیم کردیئے۔ اس سے فراغت کے بعد جب آپ واپس ہوئے تو
محیصہ بن مسعود الانصاری کو دعوت اسلام کی غرض سے اہل فدک کے پاس بھیجا
یوشع بن نون ان کا سردار تھا، اہل فدک نے صلح کی درخواست کی اور نصف زمین

[1] ازالۃ الخفاء حصہ دوم ص ۸۴ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۹۸

معاہدہ میں زمین منظور کی۔ آنحضرت ؐ نے اس کو قبول فرمالیا اس وقت سے یہ زمین آپ کے لئے مخصوص ہوگئی [1] آپ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہ اور حضرت عباس حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خیبر و فدک کی زمینوں میں آنحضرت ؐ کا جو حصہ تھا اس کا بحیثیت وارث مطالبہ کیا، اسکے جواب میں حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ میں نے آنحضرت ؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوگا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا۔ اور آل محمد ؐ اس مال میں سے کھائیں گے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے کہا کہ آنحضرت ؐ جس کام کو جس طرح کرتے تھے میں اس کو اسی طرح کروں گا۔ حضرت فاطمہ یہ سنکر کبیدہ خاطر واپس چلی گئیں اور جب تک زندہ رہیں حضرت ابوبکر سے کلام نہیں کیا [2]

اصل واقعہ اسی قدر ہے لیکن طبری اور بلاذری نے اس سلسلہ میں جو اور چند روایات نقل کی ہیں ایک فن کا نکتہ شناس پہچان سکتا ہے کہ وہ دقت کی رنگ آمیزی سے خالی نہیں بہرحال ہم کو اس وقت ان کی تنقید مقصود نہیں ہے صرف اسپر بحث کرنا ہے۔ کہ اس مسئلہ میں حضرت ابوبکر نے جو فیصلہ کیا وہ کہاں تک حق بجانب تھا اور کیوں تھا؟

حضرت ابوبکر کے فیصلہ کے وجوہ اس میں شک نہیں کہ خیبر اور فدک میں آنحضرت ؐ کا جو حصہ تھا وہ آنحضرت ؐ کے لئے مخصوص تھا چنانچہ حضرت عمر کے سامنے جب یہ معاملہ آیا تو آپ نے آیت ذیل پڑھی۔

وما افاء اللّٰہ علیٰ رسولہ منھم فما	اور اللہ نے اپنے رسول کو جو چیز بطور فے کے دی ہے
اوجفتم علیہ من خیل ولا رکاب	تو تم نے اسپر اپنے گھوڑے یا سواریاں نہیں دوڑائی
ولکن اللّٰہ یسلط رسلہ علیٰ من یشاء	تھیں لیکن اللہ جس پر چاہتا ہے اپنے رسولوں کو
واللّٰہ علیٰ کل شیئٍ قدیر۔	مسلط کر دیتا ہے اور اللہ ہر شے پر پوری قدرت والا ہے

خالصۃً رسول ہونے کا مطلب اور اس آیت میں جس شے کا ذکر ہے اور جس سے خیبر اور فدک

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۳۴ و ۲۶ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۱۱ کتاب الفرائض یہی روایت بخاری میں تھوڑے بہت الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ باب الخمس اور باب المغازی میں بھی ہے۔

مراد ہے اور ساتھ ہی فرمایا فکانت ھذہ خالصۃً لرسول اللّٰہ ؐ [1] لیکن ایک پیغمبر ایک بادشاہ اور ایک صدر ریاست کے لئے کسی چیز کے خاص ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز اس کی ملکیت ذاتی ہو۔ اور دوسری یہ کہ صدر ریاست ہونے کی حیثیت سے وہ اس کے اخراجات کے لئے وقف ہو۔ پہلی صورت میں صدر ریاست کے انتقال کے بعد وہ شے اس کے ورثہ میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسری صورت میں چونکہ وہ ذاتی نہیں ہوتی اس لئے وارثوں میں تقسیم نہیں ہوتی، بلکہ اس کے بعد جو شخص صدر ریاست ہوتا ہے اس کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوبکر (اور حضرت عمر بھی) خیبر اور فدک کو بے شبہ آنحضرت ؐ کے لئے خاص مانتے تھے، لیکن پہلی صورت کا خاص ہونا نہیں جسمیں وراثت چلتی ہے بلکہ دوسری صورت کا جس کو لازمی طور پر خلیفۂ رسول کی طرف منتقل ہونا چاہیئے مسند امام احمد بن حنبل میں بسند صحیح مروی ہے کہ حضرت فاطمہ نے حضرت ابوبکر کے پاس پیغام بھیجا کہ رسول اللہ ؐ کے وارث آپ ہیں یا ان کی اولاد؟ حضرت ابوبکر نے جواب دیا "میں نہیں بلکہ آپ کے متعلقین (اھل)!" اب حضرت فاطمہ نے کہلایا کہ اچھا! تو پھر رسول اللہ ؐ کا حصہ کہاں ہے؟ اس کا جواب حضرت ابوبکر نے یہ دیا کہ میں نے رسول اللہ ؐ سے سنا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو کھلاتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کو دنیا سے اٹھا لیتا ہے تو جو اس نبی کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ اس شخص کی تحویل میں چلا جاتا ہے جو اس کا قائم مقام ہوتا ہے" [2]

اس کے علاوہ حضرت عروۃ بن الزبیر سے بھی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ؐ کی وفات کے بعد ازواج مطہرات حضرت عائشہ کے پاس آئیں اور خیبر و فدک میں سے اپنے حصہ کا مطالبہ کیا۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا "کیا تمکو خوف خدا نہیں ہے؟ کیا تم نے آنحضرت ؐ سے نہیں سنا کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوگا۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا۔

[1] صحیح بخاری ج ۱ باب الخمس [2] ج ۱ ص ۴

جب میں دنیا میں نہ رہوں تو میرا حصہ اس شخص کیلئے ہوگا جو میرا خلیفہ ہو۔ حضرت عائشہ کی یہ تقریر سن کر ازواجِ مطہرات نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا۔ [1]

حضرت ابوبکر کے بعد جب یہ معاملہ حضرت عمر کے سامنے آیا تو آپ نے بھی یہی فرمایا۔

ما صدقة رسول الله ﷺ كانتا لحقوقه التي تعروه ونوائبه وامرهما الى من ولي الامر قال وهما على ذالك اليوم [2]

خیبر اور فدک دونوں رسول اللہ ﷺ کے صدقہ (وقف) تھی اور آپ کے ذمہ جو حقوق تھے ان کے لئے اور آپ کی ضرورتوں کیلئے تھے اور ان کا معاملہ اس شخص کے سپرد ہے جو خلیفہ ہو اور یہ دونوں آج تک اسی حالت اور حیثیت میں ہیں۔

خیبر و فدک کے مصارف | خیبر و فدک کی اس حیثیت کے متعین ہو جانے کے بعد حضرت ابوبکر کو حق تھا کہ صدرِ ریاست اور خلیفۂ رسول کی حیثیت سے خیبر و فدک کی آمدنی کو اپنی ذات اور اپنے بال بچوں کے اخراجات کیلئے مخصوص کر لیں۔ لیکن ادب و احترام نبوی اور اہلبیت اطہار کے ساتھ آپ کو جو محبت و عقیدت تھی۔ اس کا تقاضا تھا کہ آپ نے ان دونوں کی آمدنی کے مصارف بعینہٖ وہی قائم رکھے جو آنحضرت ﷺ کے عہد میں تھے۔ اور اس کا حبہ بھی اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لیے روا نہیں رکھا۔ عہدِ نبوی میں خیبر و فدک کا مصرف یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ اپنے متعلقین کا سال بھر کا خرچ اسی میں سے پورا کرتے تھے اور اس کے علاوہ مسلمانوں کی ضرورتوں پر خرچ کرتے تھے [3]

حضرت ابوبکر کا بھی یہی معمول رہا۔ جہاں تک اہل بیت کا تعلق ہے آپ نے فرمایا۔

والذی نفسی بیدہ لقرابۃ رسول اللہ ﷺ احب الی من ان اصل من قرابتی [4]

جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اسکی قسم رسول اللہ کے رشتہ دار مجھ کو اس سے زیادہ عزیز ہیں کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کروں

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۳۲ — [2] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۷

[3] صحیح بخاری ج ۲ کتاب الفرائض — [4] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۰

مزید ارشاد فرمایا۔

سمعت ان النبی لا یورث ولکنی اعول من کان رسول اللہ ﷺ یعول وانفق علی من کان رسول ﷺ ینفق [1]

میں نے سنا ہے کہ نبی کا کوئی وارث نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود میں اُن سب کی سرپرستی کرونگا جن کی سرپرستی آنحضرت ﷺ کرتے تھے اور ان سب پر خرچ کروں گا جن پر آپ خرچ کرتے تھے۔

غور کرو فرض اور محبت کے درمیان حسنِ توازن و تناسب کی مثال کیا کوئی اس سے بہتر بھی ہو سکتی ہے۔؟

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں۔

"مشکل آنکہ اگر میراث دہند مخالف قاعدہ شرع باشد و اگر نہ دہند ملال خاطر اہلِ بیت لازم آید۔ حضرت صدیق دریں باب حدیثے روایت کرد کہ میراث بردن را از پیغامبر ﷺ و بودن ایں قری مملوک وے ﷺ ہر دو مقدمہ را منع نمود و با حضرت فاطمہ و سائر اہل بیت آں قدر ملاطفت فرمود کہ جبر نقصان آن آزردگیہا شد [2]"

حضرت فاطمہ زہرا کا طرزِ عمل | اب سوال یہ ہے کہ کیا حضرت ابوبکر کے اس سب کچھ کرنے کروانے کے بعد بھی سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہرا کا دل ان کی طرف سے صاف ہوا؟ اگرچہ متعدد روایات میں مذکور ہے کہ حضرت فاطمہ نے آخر عمر تک حضرت ابوبکر سے کلام نہیں کیا، لیکن اول تو جن راویوں نے یہ نقل کیا ہے صرف ان کا ایک اندازہ اور قیاس ہے۔ پھر ان روایات کے جو راوی ہیں ان میں بعض وہ بھی ہیں جن میں تشیع پایا جاتا تھا۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں۔

ولعلہ روی بمعنی ما فہمہ بعض الرواۃ وفیہم من فیہ تشیع

اور شاید بعض راویوں نے جیسا سمجھا اسکو ہی بالمعنی روایت کر دیا اور یہ بھی معلوم رہنا

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۰ — [2] ازالۃ الخفاء حصہ دوم ص ۲۹

فلیعلموا ذالک [1] چاہئیے کہ ان راویوں میں بعض وہ بھی ہیں جن میں تشیع تھا۔

جن راویوں نے حضرت فاطمہ کی تا وقت وفات ناراضگی بیان کی ہے وہ حضرت فاطمہ کا کوئی فقرہ ایسا نقل نہیں کرتے جو انہوں نے حضرت ابوبکر سے گفتگو کے بعد کہا ہو اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حدیث نبوی کا سننے کے بعد بھی ان کا ملالِ خاطر دور نہیں ہوا۔ اس بنا پر قیاس یہی ہو سکتا ہے کہ یہ محض راوی کا اپنا احساس ہے لیکن اس کے مقابلہ میں ایک اور روایت ہے جس میں صاف طور پر مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر کی زبان سے حدیث نبوی سننے کے بعد حضرت فاطمہ نے فرمایا۔

فانت وما سمعت من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اعلم [1] تو پھر آپ نے رسول اللہ ﷺ سے جو سنا ہے آپ اس کو زیادہ جانتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ کو کوئی ملال نہیں رہا تھا اور قرین قیاس و مقتضائے روایت بھی یہی ہے، حضرت ابوبکر کی زبان سے ارشاد نبوی سننے کے بعد حضرت فاطمہ کے سامنے صرف دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ اس حدیث کا انکار کرتیں اور یا اس کو صحیح تسلیم کرتیں، پہلی صورت ناممکن تھی اسلئے کہ اول تو خود حضرت ابوبکر کا کسی حدیث کو بیان کرنا اس کی صحت کی سب سے بڑی دلیل تھا، اور پھر یہاں تو حضرت صدیق تنہا نہیں تھے، بلکہ ازواج مطہرات، حضرت علی، عباس، عثمان، عمر فاروق، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحۃ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، سعد ابن ابی وقاص، ابوہریرہ اور حضرت عائشہ یہ سب حدیث کی صحت کے گواہ تھے، جیسا کہ بخاری کتاب الفرائض کی روایت سے ظاہر ہے، اس بنا پر حضرت فاطمہ کے لئے حدیث کی عدم صحت کا تصور کرنا بھی ناممکن تھا۔ اب لامحالہ دوسری صورت باقی رہتی ہے تو کیا ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت فاطمہ کی نسبت باور کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی صحت تسلیم کرنے کے باوجود ان کا تکدرِ طبع دور نہیں ہوا اور انہوں نے اپنا مطالبہ بخوشی

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۸۹

واپس نہیں لے لیا، صاف و صریح ارشاد نبوی سننے کے بعد اپنے مطالبہ پر اصرار ایک ادنیٰ درجہ کے مسلمان سے متوقع نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ سیدۃ النساء حضرت زہرا بتول سے جو معدن الفقر فخری کا گوہر تابندہ اور ملکِ درویشی و بے نفسی کا مادہ درخشندہ تھیں، سرور عالم ﷺ کی جس لخت جگر نے چکی پیس پیس کر اپنے ہاتھوں پر گٹے ڈال لیے ہوں اور کبھی اُف نہ کی، کبھی دولت و ثروت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا ہو کہ یہی استغنا اور یہی شانِ فقر اس خانوادۂ قدس کا طغرائے امتیاز تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ چند قرصہائے سیم و زر کی وراثتی ملکیت کے داغ اپنے دامانِ فقر و استغنا پر گوارا کر سکتی تھی؟ فھل من مدکر [1]

حضرت ابوبکر کی مجتہدانہ بالغ نظری

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وقتی طور پر ایک معاملہ پیش آیا اور حضرت ابوبکر نے اس کا جواب دیدیا، بلکہ درحقیقت حضرت ابوبکر کا فیصلہ جو فرمودۂ نبوت کی روشنی میں تھا آنحضرت ﷺ کی پیغمبرانہ عظمت و شان کو قائم رکھنے کا ضامن تھا، حیاتِ انبیا کا جو عقیدہ ہے اس کی رسمی توضیح و تشریح سے قطع نظر یہ مسلم ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات پر وہ تمام احکام جاری نہیں ہوئے جو عام لوگوں کی موت پر طاری ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی ازواج مطہرات عدت میں نہیں بیٹھیں اور آپ کے بعد ان سے کسی اور کا نکاح کرنا جائز نہیں تھا۔ اس بنا پر حضرت

[1] اسکی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو حافظ عماد الدین ابن کثیر نے حافظ ابوبکر البیہقی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر حضرت فاطمہ کی علالت کے دنوں میں عیادت کیلئے تشریف لے گئے تو حضرت فاطمہ نے آپ کو گھر میں بلا لیا اور دونوں میں گفتگو ہوئی اور آخر حضرت فاطمہ حضرت ابوبکر سے خوش ہو گئیں، ابن کثیر نے اس روایت کی سند کو جید قوی کہا ہے (البدایۃ ج ۵ ص ۲۸۹) اس پر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ بہرحال اس روایت سے بھی یہ تو ثابت ہو ہی گیا کہ حضرت فاطمہ ناراض تھیں اگرچہ بعد میں ان کا دل صاف ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ کو کچھ ناگواری ہوئی یا نہیں اس سے قطع نظر حضرت ابوبکر کو اسکا خیال ضرور ہوگا کہ جگر گوشۂ رسول نے ایک مطالبہ کیا اور وہ اسکی تعمیل نہ کر سکے بس صرف یہی خلش تھی جسکی وجہ سے حضرت فاطمہ کے پاس معذرت خواہی کیلئے گئے

ابوبکر کو اس بات کا یقین تھا کہ وراثت بھی جو عام اہل دنیا کے عوائد رسمیہ میں سے ہے ایک پیغمبر آخر الزماں کے شایان شان نہیں۔ آنحضرت صلعم کی شان تو یہ تھی کہ جو کچھ آپ کے پاس تھا اس کو آپ نے صرف اپنی ذات اور اپنی صلبی اولاد کے لئے کبھی مخصوص نہیں رکھا بلکہ اس پر سب مسلمانوں کا حق تھا چنانچہ آپ نے فرمایا۔

انا اولی بالمؤمنین من انفسهم فمن مات وعلیه دین ولم یترک وفاءً فعلینا قضاءه ومن ترک مالا فلورثته [1]

میرے اوپر مسلمانوں کا حق اتنا ہے کہ خود ان پر بھی ان کا نہیں ہے اس لئے جو مسلمان مقروض مرجائے اور کافی ترکہ نہ چھوڑے تو اس قرض کو ادا کرنا ہمارے ذمہ ہے اور جو شخص کچھ مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کیلئے ہوگا۔

اسی بنا پر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فدک کے متعلق ایک مرتبہ ایک جماعت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

فدک رسول اللہ صلعم کے لئے تھا، آپ اس میں سے خرچ کرتے تھے اور اسی میں سے بنو ہاشم کے فقرا پر خرچ کرتے تھے ان کی بن بیاہی لڑکیوں کا نکاح کرتے تھے، حضرت فاطمہ نے ایک مرتبہ درخواست کی کہ آپ فدک ان کے نام ہبہ کر دیں تو آپ نے انکار فرما دیا [2]

پس غور کرو جس رحمت عالم کی یہ شان ہو اور جس نے زکوٰۃ اور صدقہ وخیرات

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹۷ [2] سنن ابی داؤد کتاب الخراج والفئ باب فی صفایا رسول اللہ صلعم حضرت عمر نے حضرت علی وعباس وغیرہ ہما کے سامنے آیت وما افاء اللہ علی رسولہ الآیۃ پڑھی اور اس سے استدلال کیا کہ آنحضرت صلعم کے پاس جو کچھ تھا اسمیں ایک مسلمان بھی ایسا نہیں تھا جس کا حق نہ ہو نیز یہ کہ آنحضرت صلعم اسی خیبر وفدک کی آمدنی سے مسلمانوں کیلئے اسلحہ اور گھوڑے وغیرہ خریدتے تھے اور اپنا اور اپنے متعلقین کا سال بھر کا خرچ پورا کرنے کے بعد قومی وملی مصارف میں خرچ کرتے تھے اصل الفاظ جو بخاری میں بھی ہیں وہ یہ ہیں فیجعل مجعل مال اللہ بخاری ج ۲ ص ۹۹۷ وسنن ابی داؤد کتاب الخراج

کو اپنے خاندان کے لئے ناجائز قرار دیدیا ہو۔ کیونکر ممکن تھا کہ اس کے دنیا سے روپوش ہوتے ہی اس کے ترکہ کے حصے بخرے کر لئے جاتے اور چند افراد خاندان میں اس کو محدود کر کے عام مسلمانوں کو اس کے انتفاع سے محروم کر دیا جاتا، آپ کا ارشاد وماترکنا صدقۃ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں گے وہ سب مسلمانوں کے لئے وقف ہوگا۔ اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی گرہ کشائی خلیفہ کامل کے ناخن اجتہاد نے کی۔

حضرت علی اور حضرت عباس کا اصرار

جہاں تک اس واقعہ کے ساتھ حضرت ابوبکر کی ذات کا تعلق ہے مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے لیکن آخر میں بحث کو مکمل کرنے کی غرض سے مختصراً اس قدر لکھ دینا ضروری ہے کہ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اچھا مانا! حضرت فاطمہ کو حضرت ابوبکر کی زبان سے ارشاد نبوی سننے کے بعد اطمینان ہو گیا لیکن اسکی کیا وجہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس کو پھر بھی اصرار رہا اور ان کی تشفی نہیں ہوئی، اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک وراثت کا معاملہ تھا اس کے متعلق ان دونوں حضرات کو بھی اطمینان اور اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ خیبر وفدک وقف ہیں لیکن وہ اس چیز کو ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ خلیفہ وقت ہی اس کا متولی ہو۔ ان کا ذاتی خیال تھا کہ آنحضرت صلعم کے اہل قرابت کو اس کا متولی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان حضرات کا خیال یہ بھی تھا کہ یہ صرف آنحضرت کے اقربا کے لئے وقف ہیں نہ کہ تمام مسلمانوں کیلئے، حضرت عمر فاروق اور حضرت علی وعباس میں جو طویل مکالمہ اکابر مہاجرین کی موجودگی میں ہوا ہے اور جو صحیح بخاری میں متعدد ابواب کے ماتحت مذکور ہے اس کو دیکھو تو صاف نظر آئیگا کہ مکالمہ کا موضوع وراثت نہیں بلکہ دراصل یہی دو چیزیں ہیں ان میں سے پہلی چیز یعنی وقف کا متولی ہونا تو چونکہ خلیفہ کا حق تھی اور ایک صاحب حق اگر چاہے تو وہ کسی دوسرے کے حق میں اس سے دست بردار ہو سکتا ہے اس بنا پر اہل بیت اطہار کی دلجوئی کی خاطر حضرت عمر نے خیبر فدک کی تولیت اور اس کا انتظام والفرام حضرت علی اور حضرت عباس

کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ لیکن دوسری چیز یعنی مصارف وقف فدک تو چونکہ ماترکنا صدقة کے ارشاد نبوی کے ماتحت منصوص تھی اسلئے حضرت عمر یا کسی اور شخص کو اس میں تغیر و تبدیل کرنے کا حق نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت عمر نے مذکورۂ بالا دونوں حضرات کو جب فدک کی ولایت سپرد کی تو ان سے صاف لفظوں میں اس بات کا عہد کرا لیا کہ وہ اس کی آمدنی ان تمام مصارف کے لئے کھلی رکھیں گے جن میں آنحضرت ؐ اس کو صرف کرتے تھے اس کے بعد بتاکید فرمایا۔

فان عجزتما فادفعاها الی فانی اکفیکماها۔ — اگر تم دونوں اس شرط کو پورا نہ کر سکو گے تو تم یہ مجھے واپس کر دو۔ تمہاری طرف سے میں اس کا انتظام کر دوں گا[لہ]۔

ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ حضرت علی کے عہد میں بھی[لہ] فدک مسلمانوں کیلئے صدقہ ہی تھا۔

کلالہ کی بحث

حضرت ابوبکر صدیق کے مجتہدات و قیاسات میں ایک مشہور مسئلہ دادا کی وراثت کا بھی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ قرآن مجید میں ایک آیت ہے

یستفتونك ـ قل اللہ یفتیکم فی الکلالة ان امرؤ هلك لیس له ولد وله اخت فلها نصف ماترك وهو یرثها ان لم یکن لها ولد (نساء) — اے محمد! لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ کلالہ کے بارہ میں تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی مرد لاولد مرے اور اسکی بہن مرجائے اور اسکی اولاد نہ ہو تو یہ بھائی اس کا وارث ہوگا۔

اس آیت میں جو لفظ کلالہ آیا ہے اس میں اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کلالہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی وفات پر نہ اس کے باپ ہو اور نہ بیٹا۔ لیکن آگے چل کر اختلاف اس میں ہو گیا کہ کلالہ کے مفہوم میں دادا کا نہ ہونا

لہ صحیح بخاری جز اول ص۴۳۶ و ج۲ ص۹۹۶ بعض محدثین کا خیال ہے کہ حضرت عمر نے حضرت علی اور عباس کو جس کا متولی بنایا تھا وہ خیبر و فدک نہیں بلکہ مدینہ میں آنحضرت ؐ کا جو خالصہ تھا وہ تھا لیکن بخاری کی روایات سے ایسی کوئی تخصیص ظاہر نہیں ہوتی۔

بھی داخل ہے یا نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبداللہ بن عباس کی رائے یہی تھی کہ داخل ہے یعنی دادا کا حکم وہی ہے جو باپ کا ہے۔ حضرت ابوبکر کے عہد میں تو کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی[لہ] لیکن بعد میں متعدد صحابہ کی رائے اس کے خلاف ہو گئی۔

اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرض کرو ایک شخص کا انتقال ہوا اور اس نے اپنے بعد ایک دادا اور بہن، بھائی چھوڑے تو اب سوال یہ ہے کہ دادا کے ہوتے ہوئے بہن بھائی کو ورثہ ملیگا یا نہیں۔ حضرت ابوبکر کی رائے کے مطابق جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ دادا کا حکم وہی ہے جو باپ کا ہے۔ پس جس طرح باپ کی موجودگی سے بہن بھائی محجوب الارث ہو جاتے اسی طرح دادا کی موجودگی سے بھی ہو جائینگے۔

اس مسئلہ میں حضرت ابوبکر کا استدلال یہ تھا کہ۔

(۱) قرآن مجید میں ایک اور آیت ہے جس میں کلالہ کا لفظ آیا ہے۔

وان کان رجل یورث کلالة او امرأة وله اخ او اخت فلکل واحد منهما السدس ط — اگر ایک مرد کلالہ ہونے کی حالت میں مر جائے یا کوئی عورت اور اس کے ماں شریک بہن بھائی ہوں تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

اس آیت میں کلالہ سے مراد سب کے نزدیک وہ شخص ہے جس کے نہ باپ ہو اور نہ دادا، چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر دادا ہوگا تو پھر علاتی بہن بھائی محجوب الارث ہو جائیں گے۔ اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ جب یہاں کلالہ کے معنی میں دادا کو باپ کے برابر رکھا گیا ہے تو یہی تشریح پہلی آیت میں ملحوظ نہ رکھی جائے۔

(۲) جہاں تک حاجب ہونے کا تعلق ہے ابن الابن یعنی پوتے کا وہی حکم ہے جو ابن کا ہے۔ پس جب فروع میں یہ حال ہے تو کیا وجہ ہے کہ اب الاب یعنی دادا کا حکم باپ کا سا اصول میں نہ ہو۔

لہ بخاری ج ۲ کتاب الفرائض

اس جد باپ کی طرح اصل نسب ہے اس لئے جو حکم باپ کا ہوگا وہی دادا کا ہونا چاہیے۔[1]

غرض کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اجتہاد کیلئے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے۔ آج تک مسلمانوں کا عمل انہیں ضوابط پر ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔

"اہم مہمات نزدیک حضرت صدیق آن بود کہ برائے امت آنحضرت ؐ قاعدہ مرتب فرماید تا در مسائل اجتہادیہ بکدام راہ سلوک نمائند و ترتیب ادلۂ شرعیہ بچہ اسلوب عمل آرند الی یومنا ہذا۔ ہمہ مجتہدین بر ہمیں قاعدہ عمل می کنند و وے رضی اللہ عنہ شیخ و استاذ جمیع مجتہدین شد" [2]

بچہ کس کو دیا جائے | کسی بچہ کے ماں باپ میں اگر جدائی ہو جائے تو بچہ کس کے سپرد کیا جائے۔ اس بارہ میں حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ یہ تھا کہ ماں کے سپرد کیا جائے چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک انصاریہ عورت سے شادی کی تھی اور اس کے بطن سے ایک بچہ جس کا نام عاصم تھا پیدا بھی ہو چکا تھا۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے بیوی کو طلاق بھی دے دی۔ اس کے بعد ایک دن حضرت عمرؓ قبا تشریف لے گئے تو دیکھا کہ عاصم مسجد کے صحن میں کھیل رہے ہیں۔ شفقت پدری نے جوش مارا۔ حضرت عمرؓ نے بچہ کا بازو پکڑ کر اپنے پاس سواری پر بٹھا لیا۔ اتنے میں بچہ کی نانی آگئی اور اب دونوں میں کشمکش ہونے لگی آخر اسی حالت میں دونوں حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں پہونچے اور ہر ایک نے کہا کہ بچہ میرا بیٹا ہے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ بچہ نانی کے حوالہ کردیں۔ حضرت عمرؓ نے اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور پلٹ کر کوئی بات نہیں کہی۔ امام مالک اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں "اس مسئلہ میں اس روایت کی وجہ سے میرا فتویٰ بھی یہی ہے"[3]

فراستِ ایمانی | کسی معاملہ یا قضیہ کا صحیح فیصلہ کرنے کے لئے بیرونی شہادتوں کے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے احکام القرآن ابوبکر جصاص از صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۵ [2] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۱۳ [3] مؤطا امام مالک کتاب الاقضیہ باب من احق بالولد

علاوہ خود قاضی کی اپنی ذہانت اور فراست کی بھی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ حدیث میں عام مومنین کی فراست کے متعلق کہا گیا ہے کہ تم اس سے بچو۔ کیونکہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے چونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سب سے زیادہ قوی الایمان تھے اسلئے ان کے نورِ فراست کا یہ عالم تھا کہ مرض وفات میں حضرت عائشہؓ سے فرمایا۔ کہ بیٹی! میں نے تم کو جو جائیداد دی ہے میرے بعد تم کتاب اللہ کے قانون کے مطابق اس کو اپنے بھائیوں اور بہنوں میں تقسیم کر لینا۔ تو حضرت عائشہؓ بولیں "اباجان! میری بہن تو ایک ہی یعنی اسماء ہیں۔ پھر آپ نے "بہنوں" کیسے فرمادیا" اس وقت صدیق اکبر کی بیوی حبیبہ بنت خارجہ حمل سے تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اُرَاهَا جَارِيَةً میرا خیال ہے کہ بچی پیدا ہوگی [1] چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

عِلمی مفاخر و کمالات[2]

اسلام سے پہلے عرب میں اگرچہ روحانیت کا فقدان تھا لیکن ان کا اپنا ایک ضابطۂ اخلاق تھا جو المرؤۃ کہلاتا تھا، جو لوگ اس ضابطۂ اخلاق میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے تھے وہ نہایت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اس کے علاوہ شاعری اور قوتِ تقریر وخطابت اور اعلیٰ النسبی میں جو لوگ ممتاز ہوتے تھے وہ قوم کے سردار مانے جاتے تھے حضرت ابوبکرؓ ان تمام اوصاف وکمالات کے جامع تھے۔

---

[1] مؤطا امام مالک باب ما لا یجوز من النحل [2] کتاب میں حتی المقدور کوشش کی ہے کہ واقعات کی تکرار نہ ہونے پائے لیکن اس باب میں بعض اوقات جو ضمنی طور پر پہلے گزر چکے ہیں مکرر آگئے ہیں اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ کیونکہ جس واقعہ کا جس عنوان سے خاص تعلق ہے۔ اگر اسکے ماتحت اسکو صرف اس بنا پر ذکر نہ کیا جاتا کہ اسکا ذکر اجمالی طور پر پہلے آچکا ہے تو یہ عنوان بے ربط اور نامکمل ہوتا۔

علم الانساب میں مہارت علم الانساب حضرت ابوبکرؓ کا خاص فن تھا حضرت علیؓ فرماتے ہیں

وکان ابوبکر مقدمًا فی کل خیرٍ — ابوبکرؓ اچھے کام میں آگے آگے رہتے تھے
کان رجلاً نسابۃً [1] — اور علم الانساب میں بڑے ماہر تھے۔

اس سلسلہ میں حضرت علیؓ ہی اپنا ایک چشم دید واقعہ سناتے ہیں کہ جب آنحضرتؐ کو حکم ہوا کہ قبائل میں جا کر اسلام کی تبلیغ کریں تو ایک دن آپؐ، ابوبکرؓ اور میں ہم تینوں عربوں کے ایک اجتماع میں پہونچے، حضرت ابوبکرؓ نے ان سے پوچھا "آپ لوگ کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں؟" وہ بولے "ربیعہ" سے اسکے بعد حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

ابوبکر:- ربیعہ کے اونچے طبقہ سے یا ادنیٰ طبقہ سے؟
اہل قبائل:- اونچے طبقہ سے۔
ابوبکر:- اونچا طبقہ کونسا؟ ذہل الاکبر یا ذہل الاصغر؟
اہل قبائل:- ذہل الاکبر۔

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے چند نامورانِ عرب کے الگ الگ نام لے کر پوچھا کہ کیا یہ شخص تمہارے ہی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا؟ یہ لوگ ہر ایک کا جواب نفی میں دیتے رہے آخر حضرت ابوبکرؓ نے کہا "تو پھر تم لوگ ذہل الاکبر سے نہیں، بلکہ ذہل الاصغر سے تعلق رکھتے ہو۔"
ان لوگوں میں ایک سبزہ آغاز نوجوان تھا، اب وہ آگے بڑھا اور بولا "آپ نے تو ہم سے سوالات کر لیے لیکن اب ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم بھی آپ سے کچھ پوچھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا شوق سے لیکن اب اس نوجوان نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا وہ کہیں جا کر رکتا ہی نہیں تھا۔ آخر حضرت ابوبکرؓ تنگ آ کر اونٹنی پر بیٹھ چل دیئے۔ اس پر نوجوان نے ایک شعر پڑھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ کبھی چت اور کبھی پٹ۔ آنحضرتؐ کو یہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی [2]
جبیر بن مطعم نسب دانی میں تمام عرب میں ممتاز تھے مگر وہ بھی کہتے تھے کہ میں نے یہ فن حضرت ابوبکرؓ سے سیکھا [3]

[1] العقد الفرید ج ۲ ص ۲ [2] ایضاً ج ۲ ص ۴۰ [3] سیرت ابن ہشام باب سیاقۃ النسب من ولد اسماعیل

حضرت ابوبکرؓ کی یہ نسب دانی اسلام کے بھی کام آئی۔ قریش کے مشرکین میں سے بعض لوگ آنحضرتؐ کی ہجو میں اشعار کہتے تھے۔ دربار نبوت کے خاص شاعر حضرت حسان بن ثابت نے اجازت چاہی کہ وہ بھی قریش کی ہجو کریں۔ آنحضرتؐ نے پوچھا "جب میں خود قریش میں سے ہوں تو تم ان کی ہجو کیسے کرو گے" حسان بولے "میں آپ کو ان سے اس طرح الگ کر لوں گا جس طرح بال کو آٹے میں سے نکال لیتے ہیں" اس پر آنحضرتؐ نے ان کو مشورہ دیا کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس جائیں کیونکہ وہ ان (حسان) سے زیادہ قریش کے انساب سے واقف ہیں چنانچہ حسان حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر باقاعدہ درس لیتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ قریش حضرت حسانؓ کے اشعار سنتے تھے تو فوراً پہچان جاتے تھے کہ انکی تصنیف ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کا مشورہ شامل ہے۔ [1]

ایام العرب علم الانساب کی طرح ایام العرب یعنی عربوں کی خانہ جنگی کی تاریخ کے بھی بہت بڑے عالم تھے حضرت عائشہؓ جو اپنے زمانہ میں اعلم بحدیث العرب والنسب سمجھی جاتی تھیں انکا یہ علم و فضل بھی درحقیقت حضرت ابوبکرؓ کا ہی فیضان تعلیم و تربیت تھا، چنانچہ حضرت ہشام بن عروہ روایت کرتے ہیں۔

کان عروۃ یقول لعائشۃ یا امتاہ لا اعجب من فہمک، اقول زوجۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و بنت ابی بکر ولا اعجب من علمک بالشعر وایام الناس اقول ابنۃ ابی بکر کان اعلم الناس ولکن اعجب من علمک بالطب کیف ہو ومن این ہو؟ قال فضربت علی منکبہ

عروہ حضرت عائشہؓ سے پوچھا کرتے تھے کہ اماں! مجھ کو آپ کی سمجھ پر تو حیرت نہیں ہوتی کیونکہ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلعم کی بیوی اور ابوبکرؓ کی بیٹی ہیں، اور نہ مجھ کو آپکے علم شعر و تاریخ پر تعجب ہوتا ہے میں کہتا ہوں کہ آپ ابوبکرؓ کی بیٹی ہیں جو ان چیزوں کے سب سے بڑے عالم تھے مگر ہاں مجھ کو آپکے علم طب پر بڑی حیرت ہے کہ یہ علم آپکو کیونکر حاصل ہوا! راوی کا

[1] استیعاب ابن عبد البر باب حسان

وقالت ای عروۃ ان رسول اللہ کان یسقم عند آخر عمرہ فکانت تقدم علیہ وفود العرب من کل وجہ فتنعت لہ الانعات فکنت اعالجہا لہ فمن ثم [1]

بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہ نے عروہ سے کہا کہ اے بیٹے اور فرمایا کہ سنو! رسول اللہ آخر عمر میں بیمار تھے اور آپ کے پاس عرب کے وفد آیا کرتے تھے وہ طرح طرح کی دوائیں اور انکے اوصاف بیان کرتے تھے اور میں ان دواؤں کو تیار کرتی تھی پس میرا علم طب اسی وجہ سے ہے۔

ذوقِ شعر وسخن | شعر وشاعری کا ذوق عرب کے بچہ بچہ کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا جو انکے لطافت وجودتِ طبع کی دلیل تھا حضرت ابوبکر بھی اس سے بہرۂ وافر رکھتے تھے خود بھی شعر کہتے تھے چنانچہ ابن سعد نے آپ کے وہ اشعار نقل کئے ہیں جو آپ نے رسول اللہ کی وفات پر کہے تھے۔ ابن رشیق نے پندرہ اشعار کی ایک نظم نقل [2] کی ہے جو آپ کی طرف منسوب ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ عہدِ جاہلیت میں شعر کہتے ہونگے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے کوئی شعر نہیں کہا اور حق یہ ہے کہ جس رسول برحق کیلئے قرآن میں ہے:

وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ — ہم نے اس پیغمبر کو شعر نہیں سکھایا اور یہ انکے لئے موزوں بھی نہیں

کہا گیا ہو اسکے خلیفۂ اولین کی شان سے یہ بعید بھی تھا، چنانچہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں

ان ابا بکر ما قال بیت شعر فی الاسلام حتی مات [3] — بے شبہ ابوبکر نے اسلام کے زمانہ میں اپنی وفات تک کبھی ایک شعر بھی نہیں کہا۔

ابن رشیق نے جو اشعار نقل کئے ہیں ان کے متعلق ابن ہشام اور سہیلی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ اکثر اہل علم حضرت ابوبکر کی طرف ان کا انتساب صحیح نہیں مانتے۔ البتہ کبھی کبھی شعر پڑھنا ثابت ہے۔ چنانچہ آپ اکثر یہ شعر پڑھتے تھے جو خود آپ کے حسب حال تھا۔

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۶ ص ۶۷ [2] کتاب العمدہ ج ا ص ۱۹ [3] استیعاب حرف العین [4] الروض الانف ج ۲ ص ۵۵

اذا اردت شریف الناس کلہم — فانظر الی ملک فی زی مسکین [1]

اگر تم لوگوں میں سب سے شریف انسان کو دیکھنا چاہو تو اس بادشاہ کو دیکھو جو فقیر کی گدڑی میں ہے۔

تقریر وخطابت | شاعری کی طرح تقریر وخطابت کا فن بھی عربوں کا خاص فن تھا جس میں وہ دوسری قوموں سے ممتاز تھے۔ قرآن نے ایک خاص اسلوب بیان ایک نیا اندازِ فکر، ایک وسیع مگر ٹھوس نقطۂ نظر دیا تھا اس لئے اسلام کے بعد عربوں کے اس فن کو غیر معمولی ترقی ہوئی اور انکی فطری صلاحیت خطابت اسلام کی سان پر جلا پاکر شمشیر دو دم بن گئی۔ تاہم شاعری کی طرح تقریر وخطابت کا فن بھی کسبی سے زیادہ وہبی اور ایک ملکۂ خداداد ہے جو فطری استعداد و مناسبت کے بغیر محض مشق و تمرین سے حاصل نہیں ہوتا۔ اور اس میں امتیاز و کمال پیدا نہیں ہو سکتا حضرت ابوبکر صدیق میں بھی یہ ملکہ خداداد تھا، اس سلسلہ میں عہد جاہلیت کا تو کوئی ایسا واقعہ نظر سے نہیں گزرا جس میں انہوں نے اپنی اس قابلیت کا مظاہرہ کیا ہو۔ البتہ زندگی کے اسلامی دور میں انہوں نے جو تقریریں کیں اور خطبے دئیے وہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے بلند پایہ اور نہایت ممتاز خطیب تھے۔

ایک تقریر یا خطابت کا سب سے بڑا معیار کامیابی یہ ہے کہ مقرر کی زبان سے جو لفظ نکلے سامعین کے دلوں میں گھر کرتا چلا جائے اور بڑے سے بڑا مخالف بھی اسکو سننے کے بعد محسوس کرے کہ مقرر نے جو کچھ کہا ہے وہ گویا خود اسکے اپنے دل کی بات تھی، چنانچہ قرآن مجید میں آنحضرت صلعم کو خطاب کرکے فرمایا گیا۔

وقل لہم فی انفسہم قولا بلیغا ۵ — اے پیغمبر! آپ ان لوگوں کے دل میں اتر کر ان سے بلیغ کلام میں خطاب کیجئے۔

اسی مضمون کو غالب نے اس طرح ادا کیا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

---

[1] کنز العمال بر حاشیہ مسند امام احمد ج ۲ ص ۱۴۳

ایک تقریر میں یہ بات اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ حسب ذیل چیزیں پائی جائیں

(۱) مقرر جو کچھ کہے اس کو خود پہلے اس کا کمال یقین اور اذعان ہو اور اس کے متعلق وہ کسی شک و شبہ میں مبتلا نہ ہو۔

(۲) سامعین کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہو کہ انکو کونسی چیز زیادہ اپیل کر سکتی ہے۔

(۳) تقریر فصیح و بلیغ ہو یعنی کلام مقتضائے حال کے مطابق اور الفاظ بھی عام فہم دلنشین اور موثر ہوں۔

(۴) آواز میں عزم و اعتماد اور ذمہ داری کا پورا احساس پایا جائے۔

حضرت ابوبکرؓ کی خطابت میں یہ تمام اوصاف تمام و کمال پائے جاتے تھے اور اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس کو سننے کے بعد کوئی شخص ان کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا سامعین کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اب تک ان کی فہم و بصیرت پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ تقریر سنکر وہ سب پردے اٹھ گئے ہیں۔

صحابہ کرام کیلئے وفات نبوی سے بڑھ کر اور کونسا حادثہ ہو سکتا تھا حضرت عمر فاروق جیسے شیر دل انسان کے ہوش و حواس بجا نہیں رہے تھے۔ اس عالم میں بے ربط باتیں عموماً زبان سے نکل جاتی ہیں۔ اور شدت غم کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ اچھی سے اچھی تقریر کا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن صدیق اکبر کی تقریر سنتے ہی بادل چھٹ گئے اور مطلع یک قلم صاف ہو گیا۔ جس کا اعتراف خود حضرت عمر نے کیا ہے۔ سقیفہ بنو ساعدہ کا معرکہ کس قدر سخت تھا۔ حضرت عمر اس کے لئے پہلے سے تقریر سوچکر اور اسکو دماغ میں جما کر گئے تھے۔ لیکن حضرت ابوبکر نے فی البدیہہ جو تقریر کی وہ اس درجہ موثر اور دلنشین تھی کہ حضرت عمر کو محسوس ہوا کہ جو باتیں سوچ کر وہ آئے تھے۔ حضرت ابوبکر نے وہ سب نہایت خوبی اور بلاغت سے ادا کر دی ہیں۔

حضرت ابوبکر کے بعض خطبوں کے ٹکڑے اپنے مواقع پر ہم پہلے نقل کر آئے ہیں ذیل میں چند خطبوں کے اقتباسات اور نقل کرتے ہیں ان سے زور کلام فصاحت

و بلاغت اور حکیمانہ اسلوب بیان کا اندازہ ہوگا۔ ایک موقع پر آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا۔

اوصیکم بتقوی اللہ وان تثنوا علیہ بما ھو اھلہ وان تخلطوا الرغبۃ بالرھبۃ وتجمعوا الالحاف بالمسألۃ فان اللہ اثنی علی زکریا وعلی اھل بیتہ فقال انھم کانوا یسارعون فی الخیرات ویدعوننا رغباً ورھباً وکانوا لنا خاشعین ثم اعلموا عباد اللہ ان اللہ قد ارتھن بحقہ انفسکم واخذ علی ذالک مواثیقکم وعوض بالقلیل الفانی الکثیر الباقی وھذا کتاب اللہ فیکم لا تفنی عجائبہ ولا یطفأ نورہ فصدقوا بقولہ وانتصحوا بکتابہ فانہ خلقکم لعبادتہ ووکل بکم الکرام الکاتبین یعلمون ما تفعلون ثم اعلموا عباد اللہ انکم تغدون وتروحون فی اجل قد غیب عنکم علمہ۔ فان استطعتم ان تنقضی الآجال وانتم فی عمل اللہ ولن تستطیعوا ذالک الا باللہ۔ فسابقوا فی مھل باعمالکم فان اقواماً جعلوا آجالھم لغیرھم فانھاکم ان تکونوا امثالھم فالوحا

میں تم لوگوں کو وصیت کرتا ہوں اللہ تعالی سے ڈرتے رہنے کی۔ اور اس بات کی کہ تمہیں اسکی شایان شان تعریف کرنی چاہئے اور اس کی طرف رغبت کے ساتھ تمہارے دلوں میں اسکا ڈر بھی موجود ہے۔ اور اس سے سوال کرنے میں خوب الحاح و زاری کیا کرو۔ اسلئے کہ اللہ تعالی حضرت زکریا اور انکے اہل بیت کی تعریف میں فرماتا ہے۔ یہ لوگ نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکل جایا کرتے تھے اور ہم سے اپنی حاجت چاہتے تھے گڑگڑا کر اور عجز و انکسار سے اور یہ لوگ ہمارے حضور میں فروتنی کرنے والے تھے۔ بندگان خدا۔ تمہیں یہ بھی جاننا چاہئے کہ اللہ تعالی نے اپنے حق کے عوض تمہاری جانیں گرو رکھی ہیں۔ اور اس معاملہ کا تم سے پختہ عہد لیا ہے اور کمتر فانی چیز کا عوض کثیر باقی سے دیا ہے۔ اور یہ کتاب اللہ تمہارے درمیان ہے جس کے عجائب ختم ہونے والے نہیں اور جسکی روشنی بجھا نہیں پڑے گی۔ پس اللہ کے فرمان پر ایمان رکھو اور اسکی کتاب سے نصیحت اٹھاتے رہو۔ اس نے تمہیں بندگی کیلئے پیدا کیا ہے۔ اور تم پر کاتب فرشتے مقرر کر دیا ہے۔ جو تمہارے افعال کو جانتے ہیں

الوحا ثم النجا النجاءَ فان وراءکم طالبا حثیثا امره سریعا میره [1]

خدا کے بندو تم یقین مانو کہ تمہاری صبح و شام اس مقررہ وقت میں ہو رہی ہے کہ جس کی حد تمہیں معلوم نہیں پس اگر تم سے یہ ہو سکے کہ اللہ کی اطاعت میں رہتے ہوئے تمہارا وقت پورا ہو جائے (اور ایسا ہونا توفیق الٰہی کے بغیر ممکن نہیں) تو زندگی کی فرصت میں سے عمل میں پیش قدمی کرو اسلئے کہ بہت سی قومیں فرصت کے لمحات دوسروں کی نذر کر چکی ہیں تمہیں انکی مانند نہ ہونا چاہئے پس تمہاری رفتار تیز ہونی چاہئے بہت ہی تیز اسلئے کہ تمہارا پیچھا کرنے والا بڑا ہی تیز رفتار ہے۔

ایک مرتبہ خطبہ دیا تو حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا۔

انی اوصیکم بتقوی اللہ العظیم فی کل امرو علی کل حال ولزوم الحق فیما احببتم وکرهتم فانه لیس فیما دون الصدق من الحدیث خیر من یکذب یفجر ومن یفجر یهلک وایاکم والفخر وما فخر من خلق من تراب والی التراب یعود، هو الیوم حی وغداً میت فاعملوا وعدوا انفسکم فی الموتی وما اشکل علیکم فردوا علمه الی اللہ وقدموا لانفسکم خیراً تجدوه محضراً۔ فانه قال عزوجل

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ بزرگ و برتر کا ڈر ہر کام میں اور ہر حال میں تمہارے پیش نظر رہے۔ اور اپنی پسند یا ناپسندیدگی کے بارے میں حق کا التزام رہے۔ سچائی سے بڑھکر خیر نہیں۔ دروغ گو حق سے انحراف کرتا ہے اور حق سے انحراف کرنیوالا (انجام کار) ہلاک ہو جاتا ہے۔ خبردار! اپنی بڑائی نہ کرنا، خاک کی مخلوق جو پھر خاک میں ملجائیگا اسے بڑائی کب زیب دیتی ہے جو آج زندہ ہے اور کل مردہ۔ عمل جاری رکھو اور اپنا شمار مرجانے والوں میں کرتے رہو۔ جو بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے اسے اللہ کے حوالے کرو

[1] العقد الفرید ج ۴ ص ۱۴۶

یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا وما عملت من سوء تود لو ان بینها وبینه امدا بعیدا [1]

اپنے فائدے کیلئے اچھے اعمال پہلے سے کر رکھو کل یہی ذخیرہ تمہارے پاس ہوگا۔ خدائے برتر فرماتا ہے "جس دن ہر شخص اپنے اچھے اعمال کو سامنے پائے گا اور اپنے برے اعمال کا سامنا کرتے وقت یہی چاہیگا کہ کاش اسکی بدی اس سے کوسوں دور ہوتی۔

حضرت ابوبکرؓ چونکہ فطرۃً خطیب تھے اس لئے آپ کی معمولی گفتگو بھی فصاحت و بلاغت کی حامل ہوتی اور خطبہ سے کم نہیں ہوتی تھی عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا بیان ہے کہ میں ایکدن حضرت ابوبکرؓ کے مرض وفات میں عیادت کیلئے حاضر ہوا اور کہا اے خلیفۂ رسول اللہؐ اب تو آپ بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ تو فرمایا۔

انی علی ذالک لشدید الوجع ولما لقیت منکم یا معشر المهاجرین اشد علی من وجعی انی ولیت خیرکم فی نفسی فکلکم ورم انفه ان یکون له الامر من دونه واللہ لتتخذن نضائد الدیباج وستور الحریر ولتألمن النوم علی الصوف الاذربی کما یألم احدکم علی حسک السعدان والذی نفسی بیده لان یقدم احدکم فتضرب عنقه فی غیر حد خیر له من ان یخوض غمرات الدنیا یا هادی الطریق جرت انما هو واللہ الفجر او البحر۔ [2]

سنو! میں اسکے باوجود شدید درد میں مبتلا ہوں اور جو کچھ اے گروہ مہاجرین میں نے تمہارا برتاؤ دیکھا ہے وہ میرے درد سے زیادہ میرے لئے تکلیف دہ ہے میں نے اپنے نزدیک جو تم میں سب سے زیادہ بہتر تھے (حضرت عمرؓ) انکو تمہارا ولی بنایا لیکن تم میں سے ہر ایک کی ناک پھول گئی کہ خلافت اسکے علاوہ کسی اور کو کیوں ملے۔ بخدا تم لوگ دیباج کے گدے اور ریشمیں پردے پسند کروگے اور آذربائی جانی اون سے تمکو تکلیف ہوگی جیسے کسی کو چراگاہ سعدان کے کانٹوں سے ہوتی ہے جسکے قبضہ میں میری جان ہے اسکی قسم! تم میں سے کسی شخص کی گردن بغیر کسی جرم کے اڑادیجائے یہ اسکے لئے اس سے بہتر ہے کہ وہ دنیا کی گہرائیوں میں گھسے۔ اے رہنما!

[1] العقد الفرید ج ۴ ص ۱۴۶ [2] الکامل للمبرد ج ۱ ص ۵۔

تونے عمدہ تجاوز کیا ہے پس اب سوچیں صرف دو ہی ہیں یا صبح کے وقت روشنی میں چلو یا اندھیرے میں چل کر مصیبت میں پڑو۔

تحریر و کتابت جو رنگ تقریر و خطابت کا تھا وہی تحریر و کتابت کا تھا حضرت خالد العراق کی مہم سے فارغ ہو کر حضرت ابوبکر کی اجازت کے بغیر چپ چپاتے حج کر آئے تھے حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی تو حضرت خالد کے نام ایک عتاب نامہ لکھا۔

سر حتى تاتي جموع المسلمين باليرموك فانهم قد شجوا فاشجوا وإياك ان تعود لمثل ما فعلت فانه لم يشج الجموع من الناس بعون الله شجاك ولم ينزع الشجي من الناس نزعك فليهنك ابا سليمان النية والحظوة فاتمم يتمم الله لك ولا يدخلنك عجب فتخسر وتخذل وإياك ان تدل بعمل فان الله عز وجل له المن وهو ولي الجزاء -

تم چل پڑو یہاں تک کہ یرموک میں مسلمانوں کے لشکروں سے مل جاؤ کیونکہ وہ پریشان ہیں غمزدہ ہیں اور مشکلات میں پھنس گئے ہیں اور خبردار پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا (یرموک جانے کا حکم اس لئے دیا جا رہا ہے) کہ دشمن کی فوجوں کو تم زیادہ زک پہنچا سکتے ہو (اگر اللہ کی مدد شامل رہی) اور لوگوں کی مشکلات کا ازالہ تم سے بہتر کسی اور سے ممکن نہیں پس اے ابوسلیمان تمہاری نیت اور منزلت باعث برکت ہو۔ تم پوری خدمت انجام دو۔ اللہ تمہیں پوری جزا دیگا۔ تمہارے عمل میں پندار پیدا ہو تو درنگ گھاٹے میں رہو گے اور تائید الٰہی سے محروم ہو جاؤ گے۔ اور اپنے کسی کارنامہ پر خبردار نہ اترانا اسلئے کہ احسان جتانا صرف اللہ تعالیٰ کو شایاں ہے اور وہی بدلہ دینے والا ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب کو اپنا جانشین نامزد کیا تو پروانہ نیابت کی عبارت یہ تھی۔

هذا ما عهد به ابوبكر خليفة محمد رسول الله ﷺ عند آخر عهده بالدنيا

یہ وہ پروانہ ہے جو ابوبکر محمد رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ اس وقت لکھ رہا ہے جب کہ دنیا کا ساتھ

واول عهده بالآخرة في الحال التي يؤمن فيها الكافر ويتقي فيها الفاجر اني استعملت عليكم عمر بن الخطاب فان بر وعدل فذالك علمي به ورأيي فيه - وان جار وبدل فلا علم لي بالغيب والخير اردت ولكل امرئ ما اكتسب وسيعلم الذين ظلموا اي منقلب ينقلبون ٥

اس کے تعلق کی آخری گھڑی اور آخرت کے ساتھ اسکے تعلق کی پہلی گھڑی شروع ہو رہی ہے اور یہ تحریر ایسے عالم میں لکھائی جا رہی ہے جب کہ کافر بھی مؤمن ہو جاتا ہے اور گنہگار فاجر بھی ڈرنے لگتا ہے۔ میں نے عمر کو تم پر حاکم بنایا ہے اگر انہوں نے نیکی کی راہ اختیار کی اور عدل کیا تو یہ وہی بات ہوگی جو میں انکے متعلق جانتا ہوں اور جو میری رائے انکے بارہ میں ہے لیکن اگر انہوں نے ظلم کیا اور وہ بدل گئے تو مجھے غیب کا علم نہیں ہے اور میں نے تو خیر خواہی کا ارادہ کیا ہے۔ بہر حال ہر انسان جیسا کریگا ویسا پائیگا۔ اور جو لوگ ظالم ہیں انکو عنقریب پتہ چل جائیگا کہ وہ کیسی پلٹی کھاتے ہیں

اہل ارتداد و بغاوت کے نام جنگ شروع کرنے سے قبل جو ایک طویل تحریر بھیجی تھی جس کی حیثیت چیلنج کی تھی اس میں ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

واني اوصيكم بتقوى الله وحظكم ونصيبكم من الله وما جاء به نبيكم وان تهتدوا بهديه وان تعتصموا بدين الله عز وجل فانه من لم يهد الله ضل - وكل من لم يعافه مبتلى وكل من لم ينصره مخذول فمن هداه الله كان مهتديا ومن اضله الله كان ضالا ولم يقبل منه في الدنيا عمل حتى يقر به فلم يقبل له في الآخرة صرف ولا عدل فمن امن فهو خير له ومن تركه فلن يعجز الله -

میں تم لوگوں کو سمجھاتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو اور اللہ کی طرف سے جو تمہارا حصہ مقرر ہوا ہے اور تمہارے نبی تمہارے پاس جو چیز لائے ہیں اسکو قبول کرو اور نبی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلو اور اللہ کے دین کی رسی کو مضبوط پکڑو کیونکہ جس شخص کو اللہ ہدایت نہیں دیتا وہ گمراہ ہو جاتا ہے اور ہر وہ آدمی جسکو اللہ تندرست نہیں رکھتا وہ بیمار ہو جاتا ہے اور جس کی مدد اللہ نہیں کرتا وہ رسوا ہو جاتا ہے جس کو اللہ ہدایت دیتا ہے۔ وہ ہدایت

یافتہ ہوتا ہے اور جس کو اللہ گمراہ کر دیتا ہے وہ
گمراہ ہو جاتا ہے اور (پھر) دنیا میں اس کا کوئی کامل
متکفل نہیں ہوتا جو اسکو خدا سے قریب کر دے
اور آخرت میں اسکی طرف سے کوئی فدیہ یا بدلہ نہیں لیا
جاتا پس جو شخص ایمان لائیگا وہ اس کیلئے بہتر
ہوگا اور جو اسکو چھوڑ دیگا تو اسکو معلوم رہنا چاہئے کہ
وہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتا۔

فن کتابت | اسلام سے پہلے عرب میں چند ہی لوگ تھے جو لکھنا جانتے تھے اور اس
وجہ سے وہ سب میں ممتاز تھے، انہیں چند لوگوں میں سے حضرت ابوبکر صدیق بھی تھے چنانچہ
آپ کا شمار خود کاتبین وحی کے زمرہ میں بھی ہے [1]

علم القرآن | اب تک جن کمالات کا ذکر ہوا وہ تھے جن کی استعداد حضرت ابوبکر میں فطری
اور طبعی طور پر تھی، اب ہم ان علوم و کمالات کا ذکر کرتے ہیں جو آپ میں اسلام کے بعد پیدا ہوئے
حضرت ابوبکر چونکہ آنحضرت ﷺ کی صحبت و معیت میں آغاز بعثت سے لیکر آخری لمحہ
حیات تک جلوت میں اور خلوت میں، سفر میں حضر میں، رزم اور بزم میں، ہر جگہ اور ہر موقع
پر برابر ساتھ رہے تھے، اس بنا پر آپ کا سینہ درحقیقت علوم و کمالات نبویہ کا گنجینہ
بن گیا تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صلح حدیبیہ کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں

"ازیں جا دانستہ شد کہ حضرت صدیق را با پیغامبر چہ نسبت بود و علوم پیغامبر
در نفس وے رضی اللہ عنہ چگونہ منطبع می شد" [2]

اسی خصوصیت کے باعث صحابہ عام طور پر کہا کرتے تھے کہ "ھو (ابوبکر الصدیق)
اعلمنا برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" [3] ظاہر ہے کہ ان علوم و کمالات میں سب سے
اول نمبر علوم قرآنی کا ہے۔ حضرت ابوبکر ایک آیت کو سننے کے بعد اس کی اصل روح
اور اسپرٹ کو معلوم کر لیتے تھے اور اس سلسلہ میں ان کا ذہن ان نکات و رموز تک پہنچ جاتا تھا

[1] استیعاب ابن عبدالبر تذکرہ حضرت ابوبکر [2] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۳ [3] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۲۰

جہاں تک دوسروں کی رسائی نہیں ہوتی تھی، حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ
جب آنحضرت ﷺ کو مکہ کے لوگوں نے ہجرت پر مجبور کر دیا تو حضرت ابوبکر صدیق نے کہا انا
للہ وانا الیہ راجعون۔ ان لوگوں نے اپنے نبی کو ترک وطن پر مجبور کیا ہے۔
یہ ضرور ہلاک ہوں گے، اس پر یہ آیت اتری۔

اُذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر۔ | جو لوگ قتال کرنا چاہتے ہیں اسلئے کہ وہ مظلوم ہیں انکو اسکی اجازت دی جاتی ہے۔ اور اللہ انکی مدد کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔

حضرت ابوبکر اس کو سننے کے بعد ہی سمجھ گئے کہ جہاد کا حکم نازل ہوگا [1]
وفات نبوی کے وقت ایک کہرام برپا تھا۔ بعض کی سمجھ میں تو آ ہی نہیں رہا تھا
کہ پیغمبر کی بھی وفات ہو سکتی ہے۔ لیکن جونہی حضرت ابوبکر نے قرآن کی آیت انک
میت وانھم میتون پڑھی سب کی آنکھیں کھل گئیں اور حضرت عمر تک کو یہ محسوس
ہوا کہ گویا انہوں نے یہ آیت اس سے پہلے سنی ہی نہیں تھی [2]
ہر وقت کی معیت کی وجہ سے حضرت ابوبکر کو یہ موقع تھا کہ جس آیت کے متعلق ان کو
کچھ پوچھنا ہوتا تھا بے تکلف پوچھ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ
اس آیت کے بعد اب کیا چارہ ہے۔ کیا ہم کو ہر برے کام کا بدلہ دیا جائے گا؟

لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوءً یجز بہ | (نجات) نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر، جو شخص برا کام کریگا اسکو اسکا بدلہ ملیگا

آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اے ابوبکر! خدا تمہاری مغفرت کرے۔ کیا تم بیمار نہیں ہوتے؟ کیا
تم کو کوئی رنج اور صدمہ نہیں ہوتا؟ کیا تم کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی؟ یہ سب انہیں
اعمال بد کا نتیجہ اور بدلہ ہے [3]
ایک مرتبہ کشتی قسم کھا کر اس کو توڑ دینا بزدلی اور غیر مستقل مزاجی کی دلیل ہے [illegible]

[1] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۲ [2] حضرت عبداللہ بن عمر کے الفاظ یہ ہیں فوالذی نفسی بیدہ فکانما کانت علی وجوھنا اغطیۃ فکشفت یہ روایت طبری کے حوالہ سے پہلے گذر چکی ہے [3] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۱

حضرت ابوبکرؓ بھی قسم کھا کر توڑتے نہیں تھے۔ لیکن جب قرآن میں کفارۂ یمین کی آیت نازل ہو گئی تو وہ فوراً سمجھ گئے کہ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس سے بہتر کوئی دوسری چیز ہو تو قسم توڑ دی جائے۔ محض بات کی پیچ کی وجہ سے اپنی قسم پر قائم رہنا کوئی چیز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

ان ابابکر لم یکن یحنث فی یمین قط حتی انزل اللہ کفارۃ الیمین فرأیت غیرھا خیراً منھا الا اتیت الذی ھو خیر وکفرت عن یمینی [1]

ابوبکرؓ قسم کھا اس کو توڑتے نہیں تھے لیکن جب کفارۂ قسم کا حکم نازل ہوا تو کہا کہ اب میں قسم کھانے کے بعد اس سے بہتر کوئی چیز پاؤنگا تو میں اس کو اختیار کرلوں گا اور قسم کا کفارہ ادا کردونگا

حضرت ابوبکرؓ کے اس ارشاد سے فقہا نے استدلال کیا ہے کہ صورتِ مذکورہ میں حنث بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں اگرچہ کفارہ ادا کرنا بہرحال ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ ہے جس کا ذکر کرنا بے محل نہیں ہوگا۔ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰنؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہمارے گھر چند مہمان آئے ہوئے تھے۔ رات ہوئی تو میرے والد ابوبکر صدیقؓ نے مجھ سے کہا کہ میں اس وقت رسول اللہؐ کی خدمت میں جا رہا ہوں واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ تم مہمانوں کو کھانا کھلا دینا۔ عبدالرحمٰن کہتے ہیں میں نے اس حکم کی تعمیل میں مہمانوں سے درخواست کی کہ کھانا کھالیں۔ لیکن انہوں نے کہا کہ جب تک صاحبِ خانہ نہیں آئیں گے ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔ اس میں رات زیادہ ہو گئی، اب حضرت ابوبکرؓ گھر آئے۔ اور معلوم ہوا کہ مہمانوں نے اب تک کھانا نہیں کھایا ہے تو سخت برہم ہوئے اور اسی برہمی میں قسم کھالی کہ اب اس رات کھانا ہی نہیں کھائیں گے۔ یہ دیکھ کر مہمانوں نے بھی قسم کھالی کہ جب تک آپ کھانا نہیں کھالیں گے ہم بھی نہیں کھائیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ فوراً کھانا طلب کیا اور قسم توڑ کر پہلے خود دو چار نوالے تناول فرمائے اور پھر مہمانوں کو شریک کیا [1]

قرآن فہمی میں حضرت ابوبکرؓ کو جو مقام رفیع حاصل تھا اسکی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ اگر

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۸۰

قرآن کے کسی ایک لفظ کی مراد متعین کر دیتے تھے تو اکابر صحابہ تک کو اسکی مخالفت کی جرأت نہیں ہوتی تھی، چنانچہ کلالہ کے لفظ کی مراد اور اسکے صحیح مفہوم و معنی کا مسئلہ نہایت پیچیدہ تھا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے سے جب اسکے ایک معنی متعین کر دیئے اور اسکے بعد حضرت عمر فاروقؓ سے ان کے عہد خلافت میں اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو فرمایا۔

انی لاستحیی اللہ ان ارد شیئاً قالہ ابوبکر [1]

مجھ کو اللہ سے اس بات میں شرم آتی ہے کہ جو ابوبکرؓ نے کہا ہے میں اس کو رد کروں

صحیح بخاری کے حوالہ سے پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں کلالہ کی تفسیر کے بارہ میں کسی نے حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت نہیں کی۔

حدیث | علوم نبوت میں قرآن کے بعد حدیث کا مرتبہ ہے۔ ظاہر ہے نبوت کی صبح و شام کے تمام جلوے حضرت ابوبکرؓ کی نگاہ میں بسے ہوئے تھے اس بنا پر آنحضرتؐ کے اعمال و اقوال کا جو خزانہ ان کے سینہ میں محفوظ ہوگا کوئی دوسرا مشکل سے ہی اس میں ان کا حریف ہو سکتا تھا۔ لیکن اس باب میں وہ حد درجہ محتاط تھے۔ علامہ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ "تم لوگ رسول اللہؐ سے احادیث روایت کرتے ہو اور پھر ان میں اختلاف کرتے ہو جب تمہارا یہ حال ہے تو تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ تم سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے۔ اس لئے تم رسول اللہؐ سے کوئی چیز نقل مت کرو مگر ہاں جب تم سے لوگ کچھ دریافت کریں اس وقت بیشک تم کچھ ضرور کہو اور دیکھو تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے، پس جو چیز کتاب اللہ میں حلال ہے اس کو حلال سمجھو اور جو چیز اس میں حرام ہے اس کو حرام سمجھو [2]

غور کرو خلیفۂ رسول نے اس ارشاد میں کس بلاغت کے ساتھ حدیث کا مرتبہ اور اسکے نقد کا معیار بیان کر دیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ چونکہ آنحضرتؐ نے کسی وقت کسی ضرورت سے کوئی حکم دیا ہے اور کسی وقت کسی ضرورت سے کوئی اور پھر سننے والے اعرابی اور غیر اعرابی ذہین اور غیر ذہین، قریب التعلق اور بعید التعلق ہر قسم کے لوگ تھے کسی نے کوئی بات پوری

[1] سنن الدارمی ج ۱ ص ۳۶۲ — [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲

سنی اور کسی نے ادھوری، کسی نے کسی جملہ کا مطلب لیا اور کسی نے کچھ اور، پھر آنحضرتؐ
کے الفاظ عین بعین کس کو یاد رہے ہوں گے اس لئے جو ثابت ہوگی وہ عموماً روایت
بالمعنی ہوگی اور اس میں ایک دو لفظوں کا ادھر ادھر ہو جانا مستبعد نہیں ہے لیکن
ان دو ایک لفظوں کے الٹ پھیر سے معنی کچھ سے کچھ ہو سکتے ہیں ان وجوہ کی بنا
پر حضرت ابوبکر یہ سمجھتے تھے اور بالکل صحیح سمجھتے تھے کہ اگر روایات کی کثرت شروع
ہو گئی اور جس کسی نے آنحضرتؐ سے تھوڑا بہت جو کچھ بھی سنا ہے اس کو وہ
بغیر حزم واحتیاط کے نقل کرنے لگا تو اس سے طرح طرح کے اختلاف پیدا
ہوں گے۔ اور ان کا اثر اصل دین اور شریعت کے استحکام پر پڑے گا، اس صورت
حال کا انسداد کرنے کی غرض سے ہی آپ نے ایک طرف تو اس کی تاکید کی کہ وقت
ضرورت ہی روایت کریں اور دوسری جانب اسکی تصریح فرمادی کہ کسی حدیث
کی صحت وسقم کو پرکھنے کی اصل کسوٹی قرآن مجید ہے۔ جو روایت قرآن کی نص صریح
کے خلاف ہوگی مقبول نہیں ہوگی۔

حافظ ذہبی نے حضرت عائشہ کی ایک اور روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر نے پانچ سو
احادیث جمع کی تھیں، لیکن ایک شب دیکھا کہ وہ بہت مضطرب اور بے چین تھے۔ آخر
صبح ہوتے ہوتے اس ذخیرہ کو نذر آتش کر دیا۔ ان سے وجہ پوچھی گئی تو فرمایا
"مجھ کو اس کا اندیشہ تھا کہ میں مر جاؤں اور اس ذخیرہ کو اس حالت میں چھوڑ جاؤں
کہ اس میں کچھ احادیث ایسی بھی ہوں جن کو میں نے ایک ایسے شخص سے لیا ہو جس
کو میں ایماندار اور معتبر سمجھتا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ روایت ایسی نہیں تھی جیسی کہ
اس نے مجھ سے بیان کی تھی، تو اب ایسی صورت میں اس روایت کو بیان کرنے کی ذمہ
داری درحقیقت میرے سر ہوگی۔[1]

اگرچہ حافظ صاحب نے اس روایت کو غیر صحیح کہا ہے لیکن حضرت ابوبکر کا جو
مزاج اور نقطہ نظر تھا اس کے پیش نظر اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو درایت

۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳

کے خلاف ہو خود آنحضرتؐ نے قرآن جو کہ اصل واساس شریعت ہے اس کو حرف
غلط واوہام بننے اور التباس مع الغیر سے بچانے کے لئے ایک مرتبہ حکم دیا
تھا کہ "لا تکتبوا عنی غیر القرآن" قرآن کے علاوہ تم مجھ سے کوئی روایت مت
لکھو، حق یہ ہے کہ حدیث کی روایت کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کا یہ غایت حزم واحتیاط
اسی ارشاد نبوی کی اصل روح اور اسپرٹ کی آئینہ دار تھی اور بس ورنہ ان کا
منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ روایت حدیث کا باب ہی سرے سے بند کر دیا جائے بلکہ
مقصد یہ تھا کہ جس طرح بے ضرورت روایت حدیث سے اجتناب کرنا چاہئے اسی
طرح عند الضرورت خاموش بھی نہیں رہنا چاہئے۔

چنانچہ خود حضرت ابوبکر کا اپنا عمل بھی یہی تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ ان سے
جو مرفوع احادیث مروی ہیں وہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں[1] کیونکہ بلاضرورت وہ
روایت بیان ہی نہیں کرتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ ضرورت پڑتی تھی
تو پھر خاموش بھی نہیں رہتے تھے اور فوراً حدیث بیان کرتے تھے تم پڑھ آئے ہو
کہ سقیفۂ بنو ساعدہ میں جب انصار ومہاجرین کے درمیان ہنگامہ برپا ہوا تو
آپ نے حدیث "الائمۃ من قریش" سنا کر اسپر قابو پایا، وفات نبوی کے وقت اسپر گفتگو
ہوئی کہ جسد اطہر کو دفن کہاں کیا جائے تو آپ نے ہی ارشاد نبوی سنا کر اسکا قطعی
فیصلہ کیا۔ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علی وعباس کیجانب سے فدک وخیبر کا مطالبہ ہوا تو آپنے
حدیث نبوی پر ہی اپنے جواب کی بنیاد رکھی، عمال ومحصلین صدقات کے نام نصاب
ومقدار زکوٰۃ کے متعلق مفصل ہدایات روانہ کیں تو انکی اساس احادیث نبویہ ہی تھیں۔

۱ شاہ ولی اللہ صاحب نے ازالۃ الخفا میں حضرت ابوبکر کی قلت روایت کے وجوہ یہ لکھے ہیں کہ (۱) رسول اللہؐ کے
بعد بہت کم زندہ رہے (۲) وہ مختصر مدت بھی مہمات امور کے نظم ونسق میں گذر گئی (۳) انکے ہم عصر سب صحابہ تھے
اور وہ خود حاملین روایات تھے اس لئے صدیق اکبر کو استغنا تھا ہم کہتے ہیں کہ اس سے انکار نہیں کہ حضرت ابوبکر کی قلت روایت
میں ان ہر سہ امور کا دخل ہے لیکن اس کا اصل سبب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا اور درحقیقت یہ حضرت
ابوبکر کی نہایت ژرف نگاہی اور دقیقہ سنجی شریعت کی دلیل ہے بعد میں مسلمانوں میں جو فتنے کھڑے ہوئے طرح
طرح کے فرقے پیدا ہوئے اور ان میں تحزب وتشتت عام ہوا غور کرو تو اسکی تہ میں یہی کثرت روایت اور بے احتیاطی کار فرما تھی

خبر واحد کے متعلق اصول اس سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کا ایک بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے خبر واحد کے متعلق ایک یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ ایسی روایت اسوقت تک قابلِ قبول نہیں ہوگی جبتک کہ اُس روای کیلئے کوئی دوسرا شخص گواہ نہ ہو یعنی اس روایت کی تائید کسی اور طریق سے نہ ہوتی ہو۔ چنانچہ تم پڑھ آئے ہو کہ میراثِ جدہ کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت سننے کے بعد ان سے گواہ طلب کیا اور جب انہوں نے محمد بن مسلمہ کو بطور گواہ پیش کر دیا تو وہ روایت قبول کی اسی طرح جمع قرآن کے سلسلہ میں کوئی آیت اگر کسی ایک صحابی کے پاس ملتی تھی تو آپ بغیر شہادت کے اسے قبول نہیں کرتے تھے اسکے علاوہ ابھی گزر چکا ہے کہ خبر واحد سے قرآن پر زیادتی یا اس میں کمی کرنے کو وہ جائز نہیں سمجھتے تھے [1]

حضرت ابوبکرؓ کی روایات کی تعداد علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں ایک سو بیالیس ۱۴۲ روایتیں یکجا جمع کی ہیں جو حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہیں۔ مسند امام احمد بن حنبل میں بھی روایات حضرت ابوبکرؓ کی روایت کردہ ہیں۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں صحابہ میں حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ابن عمرؓ، ابن عمروؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ، حذیفہؓ، معقل بن یسارؓ، عقبہ بن عامرؓ، انسؓ، ابوہریرہؓ، ابوامامہؓ، ابو برزہؓ، ابوموسیٰؓ اور آپ کی دونوں صاحبزادیاں حضرت عائشہؓ اور اسماءؓ اور کبار تابعین میں الصنابحی، مرۃ بن شراحیل، واسط البجلی، قیس ابن ابی حازم اور سوید بن غفلہ کے اسمائے گرامی لکھے ہیں جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے حدیث کی روایت کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اصل رواۃ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے مگر منکبار صحابہ و تابعین کے نام ہیں۔

---

[1] استنباطِ احکام کے اصولِ اربعہ کی طرح خبر واحد کے قبول سے متعلق اس قاعدہ کی تاسیس و ایجاد بھی مولانا شبلی نے الفاروق میں حضرت عمر فاروقؓ کی ہی طرف منسوب کی ہے حالانکہ حدیث اور فقہ کے باب میں قواعد و ضوابط کی تعیین کا جہاں تک تعلق ہے وہ سب حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے لئے ہیں اور اس معاملہ میں وہ انہیں کے نقشِ قدم پر چلے ہیں ہاں البتہ حضرت عمرؓ نے انکی توسیع اسطرح ضرور کی ہے کہ بعد میں وہی چیزیں فقہ کی بنیاد بن گئیں

فقہ استنباطِ احکام فقہیہ کے اصول چار ہی ہیں۔ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماع اور قیاس ان چاروں اصولوں کی تشخیص و تعیین سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے کی اور آج تک مسلمانوں کا اسی پر عمل ہے چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ اصولِ اربعہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں

وکانت هذه الاصول مستخرجة عن صنیع الاوائل وتصریحاتهم [2]

اور یہ اصول اوائل صحابہ کے عمل اور ان کی تصریحات سے مستنبط ہیں۔

یہ اوائل کا عمل اور ان کی تصریحات کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے تعامل کے متعلق میمون بن مہران کی وہ روایت نقل کی ہے جو ہم اجتہاد و قیاس کے باب میں سنن الدارمی کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں حضرت عمر فاروقؓ نے اس بارہ میں جو کچھ کیا اور ولاۃ و قضاۃ کو جو ہدایات بھیجیں وہ سب درحقیقت اسی متن کی شرح تھیں جو حضرت ابوبکرؓ نے تیار کیا تھا۔ وکفی بہ فخراً۔

فقیہ کے لئے سب سے ضروری وصف تفقہ ہے جو محض ایک وصفِ خداداد ہے۔ حضرت ابوبکرؓ میں یہ وصف کس درجۂ کمال کا تھا کتاب میں جگہ جگہ عموماً اور اجتہاد و قیاس کے زیرِ عنوان خصوصاً اس کی مثالیں گزر چکی ہیں یہاں انکے اعادہ کی ضرورت نہیں

تعبیر رویا علوم نبوت میں ایک علم تعبیر رویا بھی ہے۔ خود رویائے صالحہ کو صحیح حدیث میں نبوت کا چالیسواں حصہ اور بعض میں سترواں جزء کہا گیا ہے تعبیر رویا میں یوسفؑ کو جو کمال حاصل تھا اسکا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ چونکہ اس فن کا تعلق عالم مادیات کے بجائے عالم روحانیت سے زیادہ ہے۔ اس لئے جس شخص میں روحانی لطافت و نظافت زیادہ ہوگی اسی قدر اس کو اس فن میں دستگاہ ہوگی حضرت ابوبکرؓ کو اس میں بھی کمال حاصل تھا فنِ تعبیر کے امام ابن سیرین کا قول ہے

کان ابوبکر اعبر هذه الامة بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

ابوبکر رسول اللہؐ کے بعد تعبیر رویا کے فن کے سب سے بڑے عالم تھے۔

---

[2] حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص ۹ باب الفرق بین اہل الحدیث و اصحاب الرائی۔

آنحضرت ؐ جب کبھی کوئی اہم خواب دیکھتے تھے تو حضرت ابوبکرؓ سے اسکا تذکرہ کرتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ اس خواب کی جو تعبیر بیان کرتے تھے آپ اسکی توثیق و تصدیق فرماتے تھے چنانچہ غزوۂ طائف کے موقع پر جبکہ صحابۂ کرام شہر کا محاصرہ کئے پڑے تھے آپ نے ایک خواب دیکھا کہ آپکو ایک پیالہ بھرا ہوا ہدیہ کیا گیا ہے لیکن ایک مرغ نے اسمیں ٹھونگ ماردی اور اسکی وجہ سے پیالہ میں جو کچھ تھا گر پڑا۔ حضرت ابوبکرؓ نے سنتے ہی عرض کیا "یا رسول اللہ! میں نہیں سمجھتا کہ اس موقع پر آپ کو کامیابی ہوگی" ارشاد ہوا "ہاں میرا خیال بھی یہی ہے" [1]

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے خواب میں دیکھا کہ ان کے حجرہ میں تین چاند گر پڑے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ سے اس کا ذکر آیا اور پھر جب آنحضرت ؐ کی وفات ہوئی اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں آپ دفن ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا بیٹی! ایک چاند تو رسول اللہ ؐ ہی ہیں جو تمہارے حجرہ میں مدفون استراحت ہیں [2] شاہ ولی اللہؒ نے اور بھی اسی طرح کے متعدد واقعات لکھے ہیں جن حضرات کو اسکا ذوق ہو وہ مراجعت کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں شاہ صاحب کا یہ فقرہ بہت اہم ہے لکھتے ہیں:-

"تعبیر دیدن صدیق اکبر خوابہائے مردم را و اصابت عجیبہ در آن تا آنکہ آنحضرت ؐ خوابہائے خود را بہ صدیق اکبر عرض می فرمود و در خواست تعبیر می نمود" [3]

تصوف | دین کے دو پہلو ہیں ایک صوری دوسرا معنوی صوری پہلو کا نام شریعت ہے جس کا تعلق احکام ظاہری کے اتباع و امتثال سے ہے اور معنوی پہلو کا نام طریقت یا تصوف ہے جس کا تعلق قلبی سوز و گداز روحانی لطافت و طہارت سے ہے اور جسکا مقصد یہ ہے کہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ذریعہ ایک انسان اپنے جذبات اور میلان و عواطف کو مرضیات خداوندی کے اسطرح تابع کر دے کہ احکام الٰہی خود اسکا جذبہ اور داعیۂ نفس بن جائیں اور وہ سراپا محبت و بندگی ہو جائے۔ شریعت اور طریقت دونوں میں جسم اور روح کا تعلق ہے اور ایک دوسرے کے بغیر جہاں تک دین کی اصل روح کا تعلق ہے بے معنی ہے اگر صرف ظاہری اور رسمی طریقہ پر نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج ہو لیکن دل حب الٰہی اور عشق ربانی کی نعمت سے محروم ہو تو وہ اس پھول کی مانند ہے جو خوش رنگ اور موزوں ہونے کے باوجود بغیر خوشبو کے ہو اور اگر محض حب الٰہی ہو تو اسکی مثال اس نغمہ کی ہے جو بے آہنگ اور بے سُرا ہو۔ اس بنا پر دینی نقطۂ نظر

[1] طبری ج ۳ ص ۵۵ [2] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۲۰ بحوالہ موطا امام مالک دوسرے اور تیسرے چاند حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہیں۔ جو اسی حجرہ میں آنحضرت ؐ کے پہلو میں مدفون ہیں [3] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۲۰

سے جب کبھی اسلام کی کسی بڑی شخصیت کا جائزہ لینا ہو تو لازمی طور پر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ تصوف اور طریقت کے اعتبار سے اس کا کیا مقام اور مرتبہ تھا ورنہ اس کی اصل شخصیت کا مرقع مکمل نہیں ہو سکتا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تصوف صدیقی پر ایک طویل بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ کمالِ طریقت کیلئے جن اوصاف و ملکات نفسانی کی ضرورت ہے مثلاً توکل، احتیاط، کف لسان، تواضع، شفقت بر خلق خدا، رضا، نفی ارادہ، خشیت، عجز و انکسار، رقت قلب، تحمل، فقر و درویشی یہ سب حضرت ابوبکرؓ میں بتمام و کمال پائے جاتے تھے اور اسی بنا پر آپ بالعموم اصفیاء و اہل طریقت کے سرخیل و امام تھے۔ علامہ ہجویری کشف المحجوب میں لکھتے ہیں "تصوف کی جڑ اور بنیاد صفا ہے اس صفت کی ایک اصل ہے اور ایک فرع، اصل انقطاع عن الاغیار ہے اور فرع دنیا سے دل کا خالی ہونا ہے اور چونکہ صفا صدیقیت کی صفت لازمہ ہے۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکر صدیقؓ "امام اہل این طریقہ" ہیں" [1]

حضرت ابو العباس بن عطاء جو اکابر و مشائخ صوفیہ میں سے ہیں ان سے کسی نے پوچھا کہ کوئی فرمایا "نہیں" کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا "اس سے مراد یہ ہے کہ ابوبکر صدیقؓ کی طرح ہو جاؤ کیونکہ وہ بانی درحقیقت وہی شخص ہے کہ دونوں جہان زیر و زبر ہو جائیں لیکن اسمیں کوئی تشویش اور اضطراب پیدا نہ ہو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان یہی تھی چنانچہ آنحضرت ؐ کی وفات کے وقت تمام صحابہؓ ہی مضطرب اور پریشان تھے لیکن صدیق اکبرؓ میں کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوا انہوں نے نہایت جرأت اور دلیری سے فرمایا "لوگو تم میں جو شخص محمد ؐ کی پوجا کرتا تھا اسکو معلوم ہونا چاہئے کہ محمد ؐ کا انتقال ہو گیا ہے لیکن ہاں البتہ جو شخص اللہ کی پوجا کرتا ہے تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ حی ہے اور اسکو کبھی موت نہیں آئے گی"

غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنا تمام اثاثہ سرور عالم کے قدموں پر لاکر ڈالدیا تھا جب آنحضرت ؐ نے پوچھا کہ ابوبکر! تم نے اپنے بال بچوں کیلئے کیا چھوڑا ہے؟ تو بولے "اللہ اور اسکے رسول کو چھوڑا ہے" حضرت ابوبکر الواسطی فرماتے ہیں کہ صدیق اکبرؓ کا یہ فقرہ طریقت و معرفت کی دنیا میں وہ پہلا فقرہ ہے جس سے صوفیائے کرام نے بڑے اہم لطائف و رموز تصوف کا استخراج کیا ہے [2]

حضرت بکر بن عبداللہ المزنی سے روایت ہے کہ ابوبکر صدیقؓ جو تمام صحابۂ کرام سے افضل تھے تو نماز روزہ کی وجہ سے نہیں تھے بلکہ اس ایک چیز کی وجہ سے تھے جو ان کے قلب میں تھی اور وہ تھی اللہ کی محبت اور اس کیلئے جینا اور مرنا [3] حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ توحید سے متعلق سب سے زیادہ بلند وہ قول ہے جو ابوبکرؓ کی زبان سے ادا ہوا تھا۔ اور وہ یہ ہے

[1] بحوالہ ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۲۱ [2] کتاب اللمع فی التصوف مطبوعہ لیڈن ص ۱۲۱
[3] کتاب اللمع فی التصوف مطبوعہ لندن ص ۱۲۱ [4] کتاب اللمع فی التصوف مطبوعہ لیڈن ص ۱۲۴

سبحان من لم یجعل للخلق طریقا الی معرفتہ الا العجز عن معرفتہ [1] | پاک ہے وہ ذات جس نے مخلوق کیلئے اپنی پہچان کا راستہ اسکے سوا اور کچھ بتایا ہی نہیں کہ لوگ اسکی معرفت سے عاجز ہیں

معرفت و طریقت میں حضرت ابوبکر صدیق کا یہی وہ مرتبہ و مقام اعلیٰ ہے جس کی وجہ سے وہ ارباب تصوف کے امام و پیشوا ہیں اور صوفیا کے اکثر بڑے بڑے سلسلوں مثلاً چشتیہ اور نقشبندیہ وغیرہ کی انتہا خلفائے راشدین میں حضرت ابوبکر اور حضرت علی انہی دو پہ ہوتی ہے۔

عشق نبوی | بایں ہمہ اوصاف و کمالات حضرت ابوبکر صدیق کا اصل سرمایۂ فخر و ناز بس وہ عشق تھا جو آپ کو محبوب رب العالمین کی ذات ستودہ صفات کیساتھ تھا۔ اور جو در حقیقت رگ رگ میں جان کے عوض ہر وقت ساری رہتا تھا۔ یہ عشق ہی درحقیقت وہ سرچشمہ تھا جس سے دوسرے کمالات پیدا ہوئے تھے۔ جب تک رسالت و نبوت کا آفتاب جہاں تاب اس عالم ناسوت میں ضوفگن رہا اس سے ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں ہوئے۔ وفات کے بعد حالت یہ ہو گئی تھی کہ زبان پر نام مبارک آیا اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ حضرت عروہ بیان کرتے ہیں کہ وفات نبوی کے دوسرے برس حضرت ابوبکر ایک مرتبہ خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو ابھی اتنا ہی کہا تھا۔

قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام الاول | رسول اللہ پہلے سال جب خطبہ دینے کھڑے ہوئے

کہ حضور کی وفات کا سانحہ یاد آگیا اور بلک بلک کر رونے لگے سنبھل کر پھر خطبہ شروع کیا۔ لیکن پھر ہچکی بندھ گئی۔ آخر تیسری بار ضبط سے کام لے کر خطبہ تمام کیا [2]

حضرت ام ایمن نے آنحضرت کو گود کھلایا تھا۔ اس رشتہ سے آپ ان کے گھر آتے جاتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر نے بھی یہ وضع قائم رکھی۔ چنانچہ ایک دن وہ اور حضرت عمر وہاں پہونچے تو ام ایمن ان کو دیکھتے ہی رونے لگیں، یہ دونوں بولے، "رو تی کیوں ہو؟ اللہ کے رسول کیلئے بہتر یہی تھا کہ اللہ سے تقرب ہو جائے" حضرت ام ایمن نے کہا۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن رونا اس بات کا ہے کہ اب وحی کا آنا بند ہو گیا۔ یہ سن کر

---

[1] کتاب اللمع فی التصوف ص ۱۲۴ دیکھو اسی مضمون کو اکبر الٰہ آبادی نے کس بلاغت سے ادا کیا ہے شعر۔
تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا — بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے [2] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۸

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں پر یہ اثر ہوا بے ساختہ رونے لگے [1]

طبری اور ابن اثیر میں ایک روایت ہے کہ دراصل حضرت ابوبکر کی وفات کا باعث ہی یہ ہوا کہ آنحضرت کی جدائی کا غم برداشت نہ ہو سکا۔ وہ سوز درد دل سے اندر ہی اندر پگھلتے رہے اور آخر اپنے محبوب سے جا ملے۔

ایک مرتبہ آنحضرت ابوبکر کے کاشانۂ قدس میں داخل ہو رہے تھے کہ حضرت عائشہ کو دیکھا بلند آواز سے بول رہی ہیں۔ چونکہ آنحضرت کے سامنے رفع صوت خلاف ادب تھا اس لئے غصہ آگیا اور حضرت عائشہ کو مارنے کیلئے طمانچہ اٹھایا [2]

واقعۂ افک میں حضرت ابوبکر کو اپنی بیٹی کی بے گناہی کا یقین تھا۔ بایں ہمہ جب آنحضرت حضرت ابوبکر کے مکان پر تشریف لائے۔ اور حضرت عائشہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ "اگر تم اس تہمت سے بری ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری برأت کا اعلان کر دے گا۔ اور اگر تم سے کوئی لغزش ہو گئی ہے تو تم اللہ سے استغفار کرو اور توبہ کرو۔ کیونکہ بندہ جب توبہ کر لیتا ہے تو اس کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں، آنحضرت کی یہ تقریر سننے کے بعد حضرت عائشہ نے اپنے پدر بزرگوار سے درخواست کی کہ میری طرف سے رسول اللہ کو جواب دیجئے لیکن فرط ادب و احترام کے باعث حضرت ابوبکر کی زبان نہ کھلی اور بولے" میں نہیں جانتا کہ کیا کہوں [3]! واقعۂ ایلا میں ازواج مطہرات نے نان نفقہ کا مطالبہ کیا تھا۔ اور آنحضرت نے ناراض ہو کر ایلا کر لیا تھا اس سے تمام صحابہ سخت پریشان تھے خاص طور پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر جن کی صاحبزادیاں ازواج مطہرات میں شامل تھیں زیادہ پریشان تھے آخر دونوں بزرگ در دولت پر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ فرمائیں تو دونوں (عائشہ حفصہ) کی گردن اڑا دیں [4]

حضرت حفصہ بنت عمر پہلے شوہر سے بیوہ ہو گئیں تو حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۷۵
[2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۹۶
[3] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۱۵
[4] صحیح مسلم کتاب الایلا

پیش کش کی کہ وہ ان سے نکاح کر لیں حضرت ابو بکرؓ سنکر خاموش رہے حضرت
عمرؓ کو اس پر ناگواری ہوئی تو جب آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہؓ سے نکاح کر لیا ایک
مرتبہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تم نے مجھ کو حفصہؓ کی جو پیش کش کی تھی میں
نے اسے صرف اس لئے قبول نہ کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی ایک گفتگو سے مجھ کو یہ محسوس ہوا
تھا کہ حضور خود ان سے نکاح کرنا چاہتے تھے اسوقت میں نہیں چاہتا تھا کہ رسول اللہ کا بھید ظاہر کروں[1]
ایک مرتبہ عید کے دن حضرت ابو بکرؓ آنحضرت ﷺ کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا
کہ حضرت عائشہؓ کے پاس دو لڑکیاں بیٹھی ہیں جو گانا نہیں جانتی تھیں لیکن لشتم پشتم
ایک گیت گا رہی تھیں، حضرت ابو بکرؓ سے یہ چپ نہ رہا گیا بولے "ارے رسول اللہ ﷺ کے گھر
میں یہ گانے" آنحضرت ﷺ منہ پھیرے لیٹے تھے حضرت ابو بکرؓ کو یہ کہتے سنا تو فرمایا "اے ابو بکرؓ!
ہر قوم کی عید ہوتی ہے۔ آج یہ ہماری عید ہے"[2] بعض مصنفین نے اس واقعہ کو حضرت
ابو بکرؓ کے تقویٰ کے واقعات کے ماتحت درج کیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ اگر تقویٰ کی
بات ہوتی تو اس کا خیال آنحضرت ﷺ سے زیادہ کسی اور کو نہیں ہو سکتا تھا، اصل یہ ہے کہ
حضرت ابو بکرؓ اس چیز کو ادب و احترام نبوی کے خلاف سمجھتے تھے اور اسی لئے انہوں
نے اسپر سخت الفاظ میں اپنی ناگواری خاطر کا اظہار کیا تھا۔

ناموس نبوی کی حفاظت و رعایت

اس غایت تعلق کی بنا پر آپ کے علم میں اگر کوئی ایسا
واقعہ آتا جس کا اثر آنحضرت ﷺ کی عزت و ناموس پر پڑتا تو سخت غضب ناک ہو جاتے
تھے قتیلہ بنت قیس بن معدیکرب ایک خاتون تھی جو اشعث بن قیس کی بہن تھیں۔
آنحضرت ﷺ نے مرض وفات میں یا اس سے دو ماہ پہلے (علی اختلاف الروایات) نکاح
کیا تھا لیکن ابھی باقاعدہ حرم نبوی میں داخل نہیں ہوئی تھیں کہ حضور ﷺ دنیا سے رخصت
ہو گئے، اس کے بعد انہوں نے عکرمہ بن ابی جہل سے نکاح کر لیا۔ حضرت ابو بکرؓ کو
اسکا علم ہوا تو غصہ سے برہم ہو گئے اور ارادہ کیا کہ دونوں کو نذر آتش کر دیں لیکن عمرؓ مزاحم
ہوئے انہوں نے کہا کہ قتیلہ امہات المومنین میں داخل نہیں ہیں، وہ حرم نبوی میں شامل

[1] بخاری ج ۲ ص ۵۷۱ [2] بخاری ج ۱ ص ۱۳۰ [3] الاستیعاب ابن عبد البر باب القاف۔

نہیں ہوئیں اور نہ ان کے لئے حجاب کا حکم ہوا[1]

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قرض کی ادائیگی

حضرت ابو بکرؓ خلیفہ رسول بھی تھے اور عاشق رسول بھی اس بنا
پر آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد اعلان کرا دیا تھا کہ جس شخص سے
آنحضرت ﷺ نے کوئی وعدہ کیا ہو یا جس کسی کا آپ کے ذمہ کوئی قرض ہو وہ میرے پاس آئے[2]

اہل بیت کے ساتھ محبت

آنحضرت ﷺ کی ذات قدسی کیساتھ غیر معمولی عشق و محبت کا
نتیجہ یہ تھا کہ آپ کو اہل بیت اطہار کے ساتھ بھی بڑی محبت تھی اور ان کا خود
اپنے متعلقین سے زیادہ خیال رکھتے تھے، فدک و خیبر کی بحث میں ان کا یہ قول گزر
چکا ہے کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے رسول اللہ ﷺ کے اہل
قرابت مجھ کو اس سے زیادہ محبوب ہیں کہ میں اپنے اہل قرابت کیساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کروں[3]
خلیفہ ہونے کے بعد جب حضرت ابو بکرؓ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں
علیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اپنا تعلق بیان کرنا شروع کیا تو حال یہ تھا کہ حضرت علیؓ اور
بعض روایات کے مطابق حضرت فاطمہؓ ایک ایک بات کرتے جاتے تھے اور ادھر
حضرت ابو بکرؓ اسے سن سن کر روتے جاتے تھے[4]
وفات نبوی ﷺ کے چند ہی روز بعد کا ذکر ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نماز عصر سے فارغ
ہو کر مسجد سے نکل رہے تھے کہ حضرت حسن بن علیؓ نظر آگئے جو محلے کے بچوں کیساتھ
کھیل رہے تھے حضرت ابو بکرؓ نے جگر گوشۂ بتول کو دوش پر اٹھا لیا[5]
فتوحات عراق کے سلسلہ میں ایک مرتبہ حضرت خالدؓ نے جو مال غنیمت مدینہ بھیجا
اس کے ساتھ ایک قیمتی طیلسان بھی تھا جو حضرت ابو بکرؓ کے پاس بطور تحفہ بھیجا گیا تھا۔
حضرت ابو بکرؓ نے وہ طیلسان امام حسین ابن علیؓ کی نذر کر دیا[6]
حضرت ابو بکرؓ اہل بیت اطہار کیساتھ لطف و مدارات کا معاملہ خود تنہا نہیں کرتے تھے
بلکہ مسلمانوں کو بھی عام طور پر اسکی تاکید کرتے تھے کہ ان کا خاص طور پر خیال رکھیں

[1] الاستیعاب ابن عبد البر باب القاف [2] بخاری ج ۱ ص ۳۰۹ و ج ۲ ص ۶۲۹ [3] طبری ج ۳ ص ۲۴۹ [4] بخاری ج ۱ ص ۵۳۰ [5] والبدایہ ج ۵ ص ۲۸۶ [6] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۴

ان کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ "ارقبوا محمداً فی اہل بیتہ" ؎۱

عام روایت ہے کہ حضرت فاطمہ کی وفات ہوئی تو حضرت علی نے راتوں رات انکی تجہیز وتکفین کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کو دفن کردیا۔ لیکن جعفر بن محمد نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ جب حضرت فاطمہ کی وفات ہوئی تو حضرت ابوبکر وعمر مکان پر حاضر ہوئے جنازہ تیار ہوکر آیا تو صدیق اکبر نے ہی حضرت علی سے کہا چلئے نماز جنازہ پڑھائیے۔ انہوں نے انکار کیا اور فرمایا "آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں آپ آگے بڑھئے اور نماز پڑھائیے" چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت ابوبکر نے امامت کی۔ ؎۲

یہی روایت قرین قیاس اور مقتضائے درایت ہے، ہم صفحات گزشتہ میں ثابت کرچکے ہیں کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے بیعت عامہ کے دن ہی بیعت کی تھی اور حضرت علی برابر حضرت ابوبکر کے رفیق اور انکے معاون بنے رہے۔ حضرت فاطمہ بھی ناراض نہیں رہی تھیں اور خلیفۂ رسول کے تعلقات خانوادہ نبوت سے ہرگز کشیدہ نہیں تھے، بلکہ خوشگوار تھے ان سب امور کے پیش نظر یہ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ جگر پارۂ رسول کی وفات ہوجائے اور جانشین رسول کو اسکی خبر بھی نہ ہو اور وہ ان کے جنازہ تک میں نہ شریک ہوں اصل یہ ہے کہ بنو امیہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جن کا آئینۂ قلب گرد کدورت سے صاف نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے وہ لگائی بجھائی کی باتیں کرتے رہتے تھے، عام مجلسوں میں اسکا تذکرہ ہوتا ہوگا اور اس سے بدگمانیاں پھیلتی ہوں گی، یہی وہ بدگمانیاں ہیں جنکا اثر روایات میں ظاہر ہے ایک نکتہ شناس نفسیات معلوم کرسکتا ہے کہ ان روایات میں کتنی بات واقعی ہے۔ اور کتنی وہ ہے جو اس طرح کی عام بدگمانیوں کے ذریعہ راویوں کا اپنا اضافہ اور خود اسکے اپنے احساس یا قیاس کا نتیجہ ہے۔

؎۱ بخاری ج ۱ ص ۵۲۰ ؎۲ کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۳ ص ۲۵۵

مکارم اخلاق

اسلام کا اصل مقصد تزکیۂ نفس اور تطہیر باطن کے ذریعہ اعلیٰ اخلاق وصفات سے متصف کرنا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی غرض بعثت ہی مکارم اخلاق کی تکمیل وتتمیم بیان فرمائی ہے

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

حضرت ابوبکرؓ کی فطرت چونکہ سعید تھی اسلئے آپ عہد جاہلیت میں بھی اخلاق حمیدہ سے متصف تھے اس زمانہ میں بھی کبھی آپ نے ام الخبائث کو منہ نہیں لگایا۔ قمار کی مجلس میں کبھی شریک نہیں ہوئے کسی بت کے آگے سر کبھی خمیدہ نہیں ہوا حالانکہ یہ تینوں چیزیں عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں اس کے علاوہ غریبوں کی خبرگیری بے کسوں اور اپاہجوں کی مدد۔ مسافر نوازی اور مہمان داری آپکے خاص اوصاف تھے، پھر شرف اسلام سے مشرف ہوئے تو ان اوصاف پر اور جلا ہوئی اور آپ مکارم ومحامد اخلاق کے پیکر اتم بن گئے۔

تقویٰ وطہارت | آپ کے صحیفۂ اخلاق میں سرفہرست تقویٰ وطہارت کا وصف تھا جسطرح ایک تندرست معدہ مکھی یا اسی طرح کی کوئی اور نجس چیز کو برداشت نہیں کرسکتا یہ حضرت ابوبکر کا معدہ کسی ایسی چیز کو برداشت ہی نہیں کرسکتا تھا۔ جو معنوی نجاست وگندگی رکھتی ہو چنانچہ حضرت ابوبکر کا ایک غلام تھا اس نے ایک مرتبہ کوئی چیز لاکر دی حضرت ابوبکر نے جب اسکو کھا لیا تو غلام بولا "آپ جانتے ہیں وہ کیا چیز تھی؟ پوچھا کیا تھی؟" اس نے جواب دیا کہ میں عہد جاہلیت میں جھوٹ موٹ کہانت کا کام کرتا تھا یہ چیز اسی کا معاوضہ تھی۔ حضرت ابوبکر نے یہ سنتے ہی قے کردی اور جو کچھ پیٹ میں تھا سب نکال دیا ؎۱

ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صحابہ کیساتھ سفر کر رہے تھے، دوران میں ایک جگہ پڑاؤ ہوا سب حضرات مختلف لوگوں کے ہاں ٹھہر گئے، حضرت ابوبکرؓ، ابوسعید الخدری وغیرہ کیساتھ ایک اعرابی کے گھر میں فروکش ہوئے انکے ساتھ ایک اعرابی دوست تھا، میزبان کی بیوی حاملہ تھی، اس اعرابی نے میزبان کی بیوی سے شرط کی کہ اگر وہ ان سب کو بکری

؎۱ صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۲۔

کھلائیگی تو اس کے لڑکا پیدا ہوگا، عورت نے یہ شرط منظور کرلی اللہ کی مرضی کہ لڑکی پیدا ہوئی چنانچہ اعرابی نے قسم قسم کی چیزیں کچھ مسجع جملے پڑھ کر بکری کا گوشت کھلانے کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ کو پورا قصہ معلوم ہوا تو ان سے برداشت نہ ہو سکا اور قے کر دی[1]

غایتِ تقویٰ و طہارت کے باعث جسطرح صدیق اکبرؓ کا معدہ کسی نامشروع چیز کو گوارا نہیں کر سکتا تھا اسی طرح انکے قدم اس راہ میں بھی نہیں اٹھ سکتے تھے جس میں فساق و فجار رہتے ہوں، ایک مرتبہ ایک شخص آپکو ایک راستہ سے اپنے گھر لے جا رہا تھا حضرت ابوبکرؓ اس سے واقف نہیں تھے پوچھا یہ کونسا راستہ ہے؟ اس شخص نے کہا اس راستہ میں ایسے لوگ رہتے ہیں جنکے پاس سے گزرتے ہوئے بھی ہمکو شرم آتی ہے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کیا خوب، اگر تم کو گزرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے تو پھر بھی اسی راہ سے جا رہے ہو۔ تم جاؤ میں نہیں جاؤں گا[2]

حضرت ابوبکرؓ کے تقویٰ کا یہ اثر تھا کہ انکے گھر کی مستورات تک اسی رنگ میں رنگ گئی تھیں آپکی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کی ماں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا اسلئے حضرت ابوبکرؓ نے ان کو طلاق دیدی تھی، ایک مرتبہ ان کی ماں نے جوش پیار تو بیٹی کے لئے کھانے کی چیزیں بطور تحفہ لائیں چونکہ اسلام قبول نہ کرنیکے باعث ان کا تحفہ مشکوک تھا اس لئے حضرت اسماءؓ نے اسکے قبول کرنے سے انکار کیا لیکن بعد میں جب حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے قبول کرنیکی اجازت دیدی[3]

خوفِ خدا: الحکم راس الحکمۃ مخافۃ اللہ تقویٰ و طہارت اور تمام دوسری نیکیوں کی جڑ خوفِ خدا ہے حضرت ابوبکرؓ پر خوفِ خدا کا اس درجہ غلبہ تھا کہ ایکمرتبہ ایک چڑیا کو درخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو مخاطب کر کے کہنے لگے واہ واہ اے چڑیا تو کتنی خوش نصیب ہے اے کاش میں بھی تیرے جیسا ہوتا تو درخت پر بیٹھتی ہے پھل کھاتی ہے۔ اور پھر اڑ جاتی ہے تجھ سے نہ کوئی حساب ہے اور نہ کتاب۔ آہ اے کاش میں ایک سرسبز راہ کا ایک درخت ہوتا اونٹ وہاں سے گزرتا مجھکو پکڑ کر اپنا منہ مجھ میں مارتا۔ مجھکو چباتا اور اسطرح میری تحقیر کرتا اور پھر مینگنی کی شکل میں مجھکو نکال دیتا۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر میں بشر نہ ہوتا[4]

ندامت اور پشیمانی: اس خوفِ خدا کا یہ اثر تھا کہ اگر کبھی کوئی معمولی بھول چوک بھی ہو جاتی تھی تو بعد میں سخت ندامت اور پشیمانی ہوتی تھی اور جبتک وہ اسکی تلافی نہیں کر لیتے تھے انہیں چین نہیں آتا تھا ایکمرتبہ حضرت ابوبکرؓ اور ربیعہ بن کعب الاسلمیؓ میں زمین کے ایک ٹکڑہ

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۳ ص ۱۱ [2] کنز العمال بر مسند احمد ج ۲ ص ۳۴۴ [3] منتخب کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۴ ص ۳۴۱

کے بارے میں کچھ جھگڑا ہوگیا، حضرت ابوبکرؓ نے غصہ میں کوئی سخت بات کہہ دی۔ بعد میں ان کو خود احساس ہوا تو ربیعہ سے بولے کہ تم بھی مجھ کو ایسی ہی سخت بات کہہ کر مجھ سے بدلہ لے لو لیکن ربیعہ نے انکار کیا۔ آخر حضرت ابوبکرؓ بولے "اگر تم مجھ سے اپنا بدلہ نہیں لوگے تو میں رسول اللہ ﷺ سے جا کر تمہاری شکایت کرونگا" ربیعہ نے کہا "میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا" اور مزید برآں یہ کہ زمین جس کی تھی اس سے بھی دست برداری دیدی، حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونیکے لئے چل پڑے، آگے آگے تو وہ تھے پیچھے ربیعہ آ رہے تھے، ربیعہ کے قبیلہ والوں نے یہ دیکھا تو وہ بھی ربیعہ کی حمایت کیلئے اکٹھے ہو گئے اور کہنے لگے کیا خوب! ایک تو ابوبکر نے تم کو ایسی ناسزا بات کہہ دی اور پھر الٹے وہی رسول اللہ ﷺ سے شکایت کرنے جا رہے ہیں؟ ربیعہ نے کہا چپ رہو تم کو دیکھ لیا تو غضبناک ہو جائیں گے انکے غضب کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو غصہ آئیگا اور ان دونوں کے غصہ کی وجہ سے اللہ غضبناک ہو جائیگا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ربیعہ تباہ و برباد ہو جائیگا، چنانچہ یہ سب لوگ واپس ہو گئے، اب حضرت ابوبکرؓ نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر پورا ماجرا سنایا۔ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت ربیعہ کا بیان بھی سن لیا تو فرمایا "ربیعہ! تم نے اچھا کیا کہ ابوبکر کو وہی بات پلٹ کر نہیں کہی جو انہوں نے تم سے کہی تھی، لیکن ہاں اب یہ کہو کہ اے ابوبکر اللہ آپ کی غلطی معاف کرے"

حضرت ربیعہ نے تعمیل ارشاد کی تو حضرت ابوبکرؓ رو پڑے اور اسی حالت میں واپس ہو گئے[1]

اسی طرح ایکمرتبہ حضرت عمرؓ کیساتھ کسی بات پر تیز کلامی ہو گئی اور انہیں سخت سست کہہ گزرے بعد میں اس کا احساس ہوا تو سخت ندامت ہوئی حضرت عمرؓ سے بولے تم مجھ کو معاف کر دو، حضرت عمرؓ نے انکار کیا تو تہبند کا ایک کونہ پکڑے ہوئے جس سے آپ کے گھٹنے ظاہر ہو رہے تھے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور پوری روئیداد کہہ سنائی۔ آنحضرت ﷺ نے تین دفعہ فرمایا "ابوبکر خدا تمہاری خطا معاف فرمائے"۔ اب حضرت عمرؓ کو بھی افسوس ہوا اور ڈھونڈتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر آئے تو وہ وہاں تھے نہیں، سیدھے خدمتِ نبوی میں پہنچے، حضرت عمرؓ کو دیکھتے ہی سرورِ عالم ﷺ کے چہرۂ مبارک کے تیور بگڑنے لگے حضرت ابوبکرؓ کو

[1] مسند امام احمد ج ۴ ص ۵۹

اندیشہ ہوا کہیں حضرت عمرؓ پر عتاب نہ ہو اسلئے فوراً دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور بڑی لجاجت سے
عرض کیا کہ اے رسول اللہ ﷺ خدا کی قسم! ظلم تو میں نے کیا تھا۔ [1]

ایک مرتبہ کسی اپنے غلام سے کسی بات پر خفا ہو کر اس کو لعن طعن کر دیا۔ آنحضرت ﷺ اسوقت
موجود تھے، دو یا تین بار فرمایا کہ ابوبکر صدیقین اور لعانین دونوں ہرگز ایک جگہ جمع نہیں ہو
سکتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ سنتے ہی بطور کفارہ چند غلام آزاد کر دیئے اور عرض کیا اب میں کبھی
ایسا نہیں کروں گا۔ [2]

حضرت ابوبکرؓ سے بر بنائے بشریت زبان سے کبھی کبھی اسطرح کی لغزش ہو جاتی تو آپ
بہت نادم ہوتے تھے چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ آپکے پاس آئے تو دیکھا کہ اپنی زبان پکڑ کر کھینچ
رہے تھے بولے خدا آپکو معاف کرے ایسا نہ کیجئے، حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا اسی زبان نے مجھ کو تباہ کیا ہے [3]

زہد و ورع: خدا کے خوف اور تقویٰ و طہارت کی وجہ سے انسان کے دل پر دنیا کی بے ثباتی کا نقش جم جاتا ہے اور لازمی
طور پر زہد و ورع کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہی دنیا نے اپنا سر مسلمانوں کے قدموں میں جھکا دینا شروع
کر دیا تھا لیکن آپکے زہد و ورع کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے پینے کیلئے پانی مانگا لوگوں نے پانی اور شہد ملا کر پیش کیا۔ آپ نے
پیالہ منہ سے لگا کر ہٹا لیا اور رونے لگے جو لوگ پاس بیٹھے تھے ان پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ بھی رونے لگے آپ تھوڑی دیر کیلئے
چپ ہو گئے اور پھر رونا شروع کیا۔ لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ میں ایک دن آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھا میں نے دیکھا کہ
آپ کسی کو دور دور کہہ رہے ہیں لیکن میں نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپ کس چیز کو دور دور کہہ رہے ہیں میں تو یہاں کوئی چیز نہیں دیکھتا
آپ نے ارشاد ہوا "دنیا میرے سامنے مجسم ہو کر آگئی تھی میں نے اس سے کہا کہ میرے سامنے سے ہٹ جا وہ ہٹ گئی مگر پھر
دوبارہ آئی اور کہا کہ آپ مجھ سے بچ کر نکل جائیں تو نکل جائیں لیکن آپکے بعد جو لوگ آئیں گے وہ مجھ سے نہیں بچ سکتے یہ واقعہ
بیان کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اس وقت مجھ کو یہی بات یاد آگئی اور مجھ کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں مجھ سے چمٹ نہ جائے۔

حضرت رافع بن ابی رافع سے روایت ہے ایک مرتبہ میں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ سفر کر رہا تھا انکے پاس ایک فدکی چادر تھی
جب وہ پڑاؤ ڈالتے تھے تو ہم دونوں اسکو [4] استعمال کرتے تھے ایک مرتبہ حضرت خالد بن الولید کو نصیحت فرمائی
فر عن الشرف يتبعك الشرف واحرص بڑائی سے بھاگو تو بڑائی تمہارے پیچھے آئیگی اور موت کی

---

[1] الادب المفرد باب من لعن عبده فاعتقه [2] مؤطا امام مالک باب ما جاء فیما یخاف من اللسان [3] اسد الغابہ
ج ۳ ص ۲۲۰ [4] منتخب کنز العمال ج ۴ ص ۳۳ بحوالہ مسند ابن ابی شیبہ [5] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶

علی الموت توھب لک الحیاۃ [1] آرزو کرو تو تم کو زندگی بخشی جائیگی۔

تواضع اور سادگی: حضرت ابوبکرؓ اگرچہ نہایت جلیل القدر خلیفہ تھے لیکن غریبوں اور ضرورتمند
لوگوں کا معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی ان کو دریغ نہیں ہوتا تھا اور نہایت خاموشی
سے وہ ایسے کام کرنے میں بڑی مسرت محسوس کرتے تھے، مدینہ میں ایک نابینا عورت تھی جس کا
کام کاج حضرت عمرؓ آکر کر دیتے تھے لیکن چند روز کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ ان سے پہلے کوئی اور شخص
آکر اس عورت کے تمام کام کاج کر جاتا ہے ان کو اب یہ معلوم کرنے کا شوق ہوا کہ یہ کون شخص ہے ایک شب
وہ اسکی گھات میں کہیں چھپ کر بیٹھ رہے تو یہ دیکھ کر انکی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ شخص حضرت ابوبکرؓ تھے
جو خلیفہ ہونے کے باوجود پوشیدہ طور پر اس نابینا عورت کے گھر آتے تھے اور اسکے تمام گھریلو کام کر جاتے تھے [2]

مسند خلافت پر جلوہ فروز ہونے سے پہلے محلے کی لڑکیوں کی بکریوں کا دودھ دوہ دیتے تھے
خلیفہ ہونے کے بعد سب سے زیادہ ایک بھولی بھالی لڑکی کو فکر ہوئی کہ اب ہماری بکریوں کا کیا ہوگا؟
حضرت ابوبکرؓ نے سنا تو فرمایا خدا کی قسم! میں اب بھی بکریاں دوہوں گا خلافت مجھ کو خدمت خلق سے باز نہ رکھ سکے گی [3]

خلافت سے قبل آپ کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ انتخاب کے کچھ دنوں بعد تک بھی اسکو قائم رکھا
ایک دن حسب معمول کندھے پر کپڑوں کے کچھ تھان رکھے ہوئے بازار جا رہے تھے کہ راہ میں حضرت عمرؓ اور
حضرت ابوعبیدہؓ مل گئے انہوں نے کہا اے خلیفہ رسول! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ بولے بازار، انہوں نے
کہا اب آپ مسلمانوں کے والی ہیں چلئے ہم آپکے لئے وظیفہ مقرر کر دیں گے [4] لیکن ایک روایت ہے کہ
حضرت ابوبکرؓ نے کچھ روز تک تجارت کا مشغلہ جاری رکھا لیکن جب آپ کو یہ محسوس ہوا کہ اس سے فرائض
خلافت کی انجام دہی میں یکسوئی باقی نہیں رہتی اور اس میں خلل پڑتا ہے تو آپنے خود صحابہ کرام
کے مشورہ سے بقدر ضرورت اپنا وظیفہ مقرر کر لیا۔ [5]

انکسار و تواضع اور فروتنی کی انتہا یہ تھی کہ لوگ خلیفہ رسول ہونیکی حیثیت سے تعظیم و تکریم کے
آداب بجا لاتے تھے تو دل میں شرمساری محسوس کرتے تھے اور فرماتے تھے۔ تم لوگوں نے مجھ کو بہت
بڑا چڑھا دیا ہے۔ اگر کسی سے مدح و ستائش کے الفاظ سن لیتے تو دل میں کہتے کہ اے خدا تو

---

[1] مختصر العقد الفرید ص ۳ [2] ابن اثیر جلد ۲ ص ۲۹۰ [3] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکرؓ و ابن اثیر ج ۲
ص ۲۹۱ [4] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکرؓ [5] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۱

مجھ کو ان لوگوں کے حسنِ ظن کے مطابق بنا میرے گناہوں کو معاف کر دے اور ان لوگوں کی بیجا تعریف پر میری پکڑ نہ کر [1]

غیر طبعی طور پر اگر تکبر کی کوئی علامت آپ میں پائی جاتی تھی تو آپ پریشان ہو جاتے تھے ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے کپڑے از راہِ تکبر گھسیٹے ہوئے چلتا ہے اللہ قیامت کے دن اسکی طرف نظر نہیں کریگا۔ صدیق اکبر رض نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! میرے کپڑوں کا ایک پہلو کبھی کبھی لٹک جاتا ہے اور مجھ کو اس کا خیال نہیں رہتا۔ ارشاد ہوا "تم تو از راہِ تکبر ایسا نہیں کرتے۔" [2]

خودداری | اگرچہ دوسروں کا معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی آپ کو عار نہیں آتی تھی لیکن خودداری کی وجہ سے دوسروں سے اپنا ذرا سا کام لینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے ابن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ بسا اوقات چلتے چلتے حضرت ابوبکر کے ہاتھ سے اونٹ کی نکیل چھوٹ کر گر پڑتی تھی تو اونٹ کو بٹھا کر نکیل اٹھاتے تھے ایک مرتبہ لوگوں نے عرض کیا آپ اتنی زحمت کیوں اٹھاتے ہیں ہم کو حکم کیا کیجئے ہم اٹھا دیں گے" فرمایا "میرے حبیب رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کروں [3]

فقر و درویشی | حضرت ابوبکر بیت المال سے اپنے لئے وظیفہ لیتے تھے لیکن اسکی مقدار کتنی تھی اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایکمرتبہ انکی بیوی کا جی چاہا کہ حلوہ کھائیں شوہر سے فرمائش کی تو انہوں نے جواب دیا کہ گنجائش نہیں ہے بیوی نے کہا "کہ اچھا! آپ روزمرہ کے خرچ کیلئے جو مجھے دیتے ہیں اب میں اسی میں سے پس انداز کرونگی یہاں تک کہ حلوہ کی قیمت کے برابر ہو جائے۔ حضرت ابوبکر نے کہا "اچھا کرو" چند روز میں اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ حلوہ خریدا جا سکے اب خلیفۂ رسول کو اس کا علم ہوا تو فرمایا "معلوم ہوا کہ روزمرہ کا خرچ ان چند پیسوں کو کم کر دینے کے بعد بھی پورا ہو سکتا ہے جو تم نے پس انداز کی تھیں، اس لئے اب آئندہ تم کو گھر کا خرچ اسی قدر کم کر دیا جائیگا اور جو رقم حلوہ کے نام سے پس انداز ہوئی تھی وہ بیت المال میں داخل کردی [4]

انفاق فی سبیل اللہ | پہلے گزر چکا ہے اسلام قبول کرنے کے وقت آپکے پاس چالیس ہزار درہم تھے مدینہ پہنچتے پہنچتے کل پانچ ہزار رہ گئے وہ بھی سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دیئے، یہاں حضرت

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۱۷ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۷ [3] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۱ [4] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۱

خارجہ کی شرکت میں تجارت پھر شروع کی، اس سے بھی جو کچھ آمدنی ہوئی غزوۂ تبوک میں سب حضور ﷺ کے قدموں میں لا کر رکھدی "اور بال بچوں کے لئے صرف اللہ اور اسکے رسول کو چھوڑ دیا" یہ ذرائع تو خلافت سے پہلے کے تھے خلیفہ ہوئے تو تجارت ختم کردی اور بہت معمولی طور پر گزر بسر کرنے لگے مرض وفات میں حضرت عائشہ سے فرماتے ہیں "جب سے میں خلیفہ ہوا ہوں میں نے مسلمانوں کا کوئی ایک درہم کھایا نہ دینار، موٹا جھوٹا وہ جو کھاتے اور پہنتے ہیں وہی میں نے کھایا اور پہنا ہے اور اس وقت لے دے کے میرا جو کچھ اثاثہ ہے وہ یہ ایک اونٹ ایک غلام اور یہ ایک چادر ہے" خود تنگی ترشی سے گزر کرتے تھے لیکن غریبوں اور محتاجوں کا اتنا خیال تھا کہ موسم سرما میں ان کو کپڑے تقسیم کرتے تھے [1]

شجاعت | شجاعت ایک ایسا وصف ہے جو عجز و مسکنت اور تواضع و بے نفسی کیساتھ بہت کم جمع ہوتا ہے لیکن اصلاح و تزکیۂ نفس کے ذریعہ اخلاق و ملکات کے اعتدال کا نام ہے اس کی تعلیمات اور آنحضرت ﷺ کے خاص فیضِ تربیت کا یہ اثر تھا کہ صحابۂ کرام اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی تصویر تھے شبنم کی لطافت کیساتھ سورج کی حرارت اور شیشہ کی نزاکت کے ساتھ پتھر کی سختی رکھتے تھے حضرت ابوبکر اس وصفِ خاص میں بھی سب سے نمایاں تھے۔ محمد ابن عقیل کی روایت ہے کہ ایکمرتبہ حضرت علی بن ابی طالب نے خطبہ دیتے دیتے پوچھا کہ بتاؤ" دنیا کا سب سے بڑا بہادر کون ہے؟ ہم نے کہا "آپ" فرمایا "نہیں" اس کے بعد ارشاد ہوا" اشجع الناس حضرت ابوبکر تھے غزوۂ بدر کے موقع پر ہم نے آنحضرت ﷺ کیلئے ایک کیمپ بنا دیا تھا جسمیں آپ قیام فرمائیں پھر ہم نے پوچھا کہ اس کیمپ میں حضور ﷺ کی چوکیداری کی خدمت کون انجام دیگا تو کسی نے پیش قدمی نہیں کی۔ البتہ حضرت ابوبکر نے سبقت فرمائی اور شمشیر بدست آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس مستعدی اور آمادگی کے ساتھ پہرہ دیتے رہے کہ جہاں کسی نابکار نے ادھر کا رخ کیا اور ابوبکر اس پر جھپٹ پڑے۔ اسی طرح مکہ میں ایک مرتبہ قریش نے حبیب رسول اللہ ﷺ کو اپنے نرغہ میں لیکر طرح طرح کی اذیتیں دینی شروع کیں تو اس وقت بھی تنہا یہی

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۰ [2] ایضاً

ابوبکر تھے، جو اس ہجوم میں گھسے چلے گئے کسی کو دھکا دیا کسی کے تھپڑ رسید کیا۔ کسی کو لات ماری اور کسی کو پیٹا اور مارا اور آخر یہ کہتے ہوئے کہ ارے ظالمو! کیا تم اس شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، رسول اللہ کو نرغہ میں سے نکال لائے۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہیں تک کہہ پائے تھے کہ جی بھر آیا اور آنسوؤں کا دریا اُمنڈ پڑا جس سے ریش مبارک تر بتر ہوگئی۔ ؎۱

حلم اور بردباری

اعلیٰ کمال شجاعت کیساتھ حلم اور بردباری کا ہونا بھی ضروری ہے ایک مرتبہ کسی شخص نے آنحضرتؐ اور بعض صحابۂ کرام کی موجودگی میں حضرت ابوبکر کو سب و شتم کیا۔ آپ سن کر چپکے ہو رہے اس شخص نے دوبارہ پھر وہی بدتمیزی کی۔ آپ اس مرتبہ بھی خاموش رہے لیکن جب تیسری بار اسنے پھر یہی حرکت کی تو آپنے اس کا جواب دیا تاہم آپکو رسول اللہؐ کی رضا طلبی کا اتنا خیال تھا کہ حضرت ابوبکر کا جواب سنتے ہی آپ کھڑے ہو گئے تو معاً خیال آیا کہ آپ کہیں ناراض تو نہیں ہو گئے عرض کیا "وجدت علی یا رسول اللہ" - اے رسول اللہ! کیا آپ کو مجھ پر غصہ آگیا۔ ارشاد ہوا "یہ شخص تمکو جو کچھ کہہ رہا تھا۔ آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہو کر خود اسکی تکذیب کر رہا تھا لیکن جب تمنے اس سے بدلہ لے لیا تو بیچ میں شیطان آ دھمکا پھر میرے لیے مناسب نہ تھا کہ میں وہاں بیٹھا رہوں جہاں شیطان ہو۔ ؎۲

حضرت ابو برزہ کی روایت سے یہ واقعہ پہلے ہی گزر چکا ہے کہ عہد خلافت میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر کو انکے منہ پر برا بھلا کہا اس پر ایک صحابی نے اس شخص کی گردن اڑا دینے کی اجازت طلب کی تو آپنے سختی سے منع کیا اور فرمایا رسول اللہؐ کی شان میں گستاخی کرنے والے کے علاوہ اور کسی کی گردن اڑانا جائز نہیں ہے۔

حسن خلق

حسن خلق اسلامی اخلاق کا اصل عنوان ہے آنحضرتؐ کا ارشاد ہے، "میزان قیامت میں حسن خلق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں ہے" نیز فرمایا "تم میں سب سے زیادہ بہتر وہی ہے جو اخلاق میں سب سے بہتر ہے" حسن خلق کا مظاہرہ سب سے پہلے ملاقات کے وقت علیک سلیک میں ہوتا ہے اس بارہ میں حضرت ابوبکر کا طریقہ یہ تھا کہ سلام کرنے میں پہل

؎۱ کنز العمال بر مسند امام احمد جز۴ ص ۳۵۹ ؎۲ سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی الانتصار

کرتے تھے اور اگر کسی اس سلام کا جواب بڑھ چڑھ کر دیتا تھا تو آپ اس میں مزید اضافہ کرکے پھر سلام کی تکرار کرتے تھے، حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابوبکر کے ساتھ ایک ہی سواری پر بیٹھا جا رہا تھا کہ راستہ میں کچھ لوگ ملے حضرت ابوبکرؓ نے کہا "السلام علیکم" ان لوگوں نے جواب دیا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" اب حضرت ابوبکر نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" تو ان لوگوں نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آخر حضرت ابوبکر نے فرمایا "آج یہ لوگ ہم سے بازی لے گئے۔" ؎۱

حضرت عبداللہ بن عمرؓ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ ایک جھگڑا چکانے کیلئے آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو میرے ساتھ روانہ کیا تو راستہ میں جو لوگ ملتے تھے وہ مجھ کو سلام کرنے میں پہل کرتے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ دیکھ کر مجھ سے کہا "کیا تم نہیں دیکھتے کہ لوگ تمکو سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں تو ثواب کے مستحق وہی ہوتے ہیں تم خود سبقت کرو تاکہ تم کو ثواب ملے۔" ؎۲

حسن خلق کی دوسری علامت یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے درد و غم میں شریک ہو حضرت ابوبکر اسکا اسقدر اہتمام کرتے تھے کہ عبداللہ بن سہیل ایک قریشی تھے غزوۂ بدر کے موقع پر کفار کے ساتھ آئے تھے لیکن یہاں توفیق ایزدی نے دستگیری کی اور مسلمانوں کیساتھ آملے یہاں تک کہ آخر کار جام شہادت بھی نوش کیا۔ حج کے موقع پر حضرت ابوبکر کی انکے والد سہیل بن عمرو سے ملاقات ہوئی تو آپنے بیٹے کی تعزیت کی۔ ؎۳

حسن خلق میں یہ بھی داخل ہے کہ دوسروں کے عیب سے چشم پوشی کیجائے اس وصف میں حضرت ابوبکر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ فرمایا "اگر میں چور کو پکڑتا تو میری سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی کہ خدا اس کے جرم کی پردہ پوشی کرے۔" ؎۴

لیکن جہاں امر بالمعروف کا موقع ہو وہاں لین و ملاطفت کے کوئی معنی نہیں ایسے موقع پر تشدد برتنے کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ ایکمرتبہ صحابۂ کرام کسی جنازہ کیساتھ آہستہ آہستہ جا رہے تھے حضرت ابوبکر وہاں آ نکلے تو کوڑا اٹھا کر فرمایا "ہم لوگ آنحضرتؐ کیساتھ تیز رفتاری سے جایا

؎۱ الادب المفرد ص ۱۴۵ باب فضل السلام ؎۲ الادب المفرد باب من بدأ بالسلام
؎۳ فتوح البلدان بلاذری ص ۹۲ ؎۴ ابن سعد تذکرہ زبید بن الصلت

کرتے تھے[1]

مزاح مزاح یعنی لطیف قسم کا مذاق شگفتہ مزاجی اور جودتِ طبع کی دلیل ہے خود آنحضرت کے مزاح کے متعدد واقعات حدیث و سیر کی کتابوں میں مذکور ہیں پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ خلیفۂ رسول میں یہ وصف نہ ہوتا چنانچہ ایک مرتبہ آپ مسجد نبوی سے نماز پڑھ کر نکل رہے تھے کہ امام حسن جو اس وقت کم سن تھے محلہ کے بچوں کیساتھ کھیلتے ہوئے نظر آئے حضرت ابوبکر نے جگر گوشۂ رسول کو فرطِ محبت سے گود میں اٹھا لیا اور حضرت علی جو ہمراہ تھے انکی طرف اشارہ کرکے فرمایا

یا بابی شبه النبی لیس شبیها بعلی[2] ـــ وہ جو کہ نبی کے مشابہ ہے اور علی کے مشابہ نہیں تجھ پر میرا باپ قربان

حضرت علی نے یہ سنا تو ہنسنے لگے۔

احتسابِ نفس جو کچھ کرتے تھے ایک نقاد کی حیثیت سے خود ہی اس کا جائزہ بھی لیتے رہتے تھے چنانچہ مرض الوفات میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے بولے کہ "مجھ کو کسی بات کا غم نہیں ہے البتہ تین کام ایسے ہیں جو میں نے کئے ہیں کاش کہ نہ کئے ہوتے، تین کام ایسے ہیں جو میں نے نہیں کئے کاش میں نے کئے ہوتے اور تین باتیں ایسی ہیں کہ کاش وہ میں نے رسول اللہ سے پوچھی ہوتیں پہلی تین باتوں میں سے ابوعبیدہ نے ایک کا ذکر نہیں کیا باقی دو باتوں کے متعلق فرمایا " میری تمنا ہے کہ سقیفۂ بنو ساعدہ کے روز میں نے ایک عمر یا ابوعبیدہ بن الجراح کو خلیفہ بنا دیا ہوتا اور میں ان کا وزیر ہوتا دوسری بات یہ ہے کہ جب میں نے خالد بن الولید کو مرتدین سے جنگ کرنے کیلئے بھیجا تھا تو میں خود ذوالقصہ میں قیام کرتا ۔ دوسری قسم کی تین باتیں یہ ہیں کہ اے کاش اشعث بن قیس جب گرفتار ہو کر آیا تھا تو میں نے اس کی گردن اڑا دی ہوتی ۔ الفجاءۃ کو میں نے زندہ آگ میں جلوا دیا تھا کاش ایسا نہ کرتا اور قتل کر دیتا یا رہا کر دیتا اور خالد کو جب میں نے شام روانہ کیا تھا تو عمر کو میں عراق بھیجتا اس طرح اللہ کی راہ میں میں نے اپنے داہنے اور بائیں دونوں ہاتھ دراز کر دیئے ہوتے رہی وہ تین باتیں جو کہ کاش میں نے رسول اللہ صلعم سے دریافت کی ہوتیں تو ان میں سے ایک تو خلافت کا معاملہ ہے ۔ دوسری یہ کہ کیا انصار کا اس میں کوئی حصہ ہے تیسری یہ کہ پھوپھی اور بھتیجی میں کتنا حصہ ہے ؟[3]

---

[1] ابوداؤد کتاب الجنائز باب الاسراع بالجنائز [2] صحیح بخاری جلد ا ص ۵۰۳ [3] (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

فضائل و مناقب

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کے ماٰخذ حسب ذیل ہیں۔

(۱) قرآن مجید۔

(۲) آنحضرت صلعم کے ارشادات جو خاص حضرت ابوبکر کے متعلق ہیں یا حضرت ابوبکر کیساتھ حضرت عمر یا کسی اور صحابی کیساتھ مشترکاً یا عمومی طور پر مہاجرین سے متعلق ہیں۔

(۳) صحابہ کرام کے وہ اقوال و ارشادات جو حضرت ابوبکر سے متعلق ہیں۔

استحقاقِ خلافت کے زیر عنوان ہمنے جو بحث کی ہے اسکے ضمن میں بہت کچھ فضائل و مناقب کا ذکر آچکا ہے جو مذکورۂ بالا تینوں ماٰخذ سے ثابت ہیں اس موقع پر عنوان بالکل مناسبت سے صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہوگا کہ حضرت ابوبکر کی فضیلت کی سب سے بڑی دلیلیں دو ہیں (۱) ایک یہ کہ قرآن میں جس کثرت اور تکرار سے حضرت ابوبکر کے بعض خاص خاص اعمال مثلاً تصدیق بما جاء به النبی علیه الصلوٰۃ والسلام انفاق فی سبیل اللہ اور رفاقت نبوی کا ذکر آیا ہے کسی اور کا نہیں (۲) اور دوسری دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کو جو محبت تعلقِ خاطر آپکے ساتھ تھا اور جس درجہ کا اعتماد آپ پر تھا وہ کسی پر نہیں تھا۔ صحیح بخاری اور ترمذی کے کتاب المناقب میں اس مضمون کی ایک دو نہیں متعدد روایات موجود ہیں لیکن دراصل حضرت ابوبکر کی سب سے بڑی فضیلت اور منقبت جس پر دوسرے تمام فضائل و مناقب متفرع ہوتے ہیں یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے آپ کو صدیق کا لقب دیا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

مقامِ صدیقیت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے متعدد مکتوبات میں مقامِ صدیقیت پر بحث کرکے بتایا ہے کہ سلوک و معرفت کے بہت سے مدارج ہیں مثلاً ولایت شہادت لیکن ان میں سب سے اعلیٰ مقام صدیقیت کا ہے اور اس مقام میں اور نبوت میں کوئی واسطہ نہیں چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) [3] کتاب الاموال ابوعبید ص ۱۳۱ یہی روایت ابن جریر طبری جلد ۴ ص ۵۲ (یورپ ایڈیشن) میں بھی ہے لیکن الفاظ میں کافی اختلاف ہے ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں۔

و فرق آن (صدیقیت) مقامے نیست الا النبوۃ علی اہلہا الصلوات والتسلیمات
ونشاید کہ میان صدیقیت و نبوت مقامی بودہ باشد بلکہ محالست و این حکم بمحالیت او بکشف صحیح معلوم گشتہ

بعض ارباب معرفت کا خیال تھا کہ صدیقیت سے بھی اوپر ایک اور مقام ہے جس کا نام قربت ہے اور
فرماتے ہیں کہ جیسا کہ خواجہ بزرگ (خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی) نے فرمایا ہے درحقیقت دو ہی علوم و
معارف ہیں جن کا علم اگر نظری اور استدلالی ہو تو وہ علوم شریعت ہیں اور اگر انکا علم کشفی اور بدیہی
طریقہ پر ہو تو وہ علوم سلوک و معرفت ہیں اسطرح سلوک اور شریعت میں جو فرق ہے وہ صرف اجمال
و تفصیل کا یا نظر و ضرورت کا اور یا استدلال و کشف کا ہے لیکن سلوک کا مرتبہ جو بداہت و ضرورت
کا ہے یہ سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے اور اسی کا نام صدیقیت ہے اسکے بعد جو مقام ہے وہ صرف نبوت کا ہے
ایک پیغمبر کو وحی کے ذریعہ جن حقائق کا علم ہوتا ہے اور وہ اسکو دوسروں تک پہونچاتا
ہے۔ ایک صدیق اسکی تصدیق بے چون و چرا کرتا ہے پیغمبر کی بیان کی ہوئی حقیقت کیسی ہی
مابعد الطبیعی اور بالائے فہم و قیاس ہو بہرحال صدیق کیلئے وہ بدیہی سی چیز ہوتی ہے۔ اور وہ
اسکو سنتے ہی قبول کر لیتا ہے [2]

مجدد صاحب نے جو لکھا ہے کہ نبوت اور صدیقیت کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے اسکی
تائید خود قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔

ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا (المائدہ)

اور جو لوگ اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرتے ہیں وہ نبیوں، صدیقوں اور شہداء و صالحین جنپر اللہ نے انعام کیا ہے ان کیساتھ ہونگے اور کیا خوب ہونگے یہ سب لوگ ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی

اسکے علاوہ بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان کے
ساتھ جبل احد پر چڑھے تو پہاڑ پر زلزلہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی، یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا۔

اسکن احد فلیس علیک الا نبی وصدیق — اے احد ٹھہر کیونکہ تیرے اوپر ایک نبی ایک صدیق

[1] مکتوب مجدد الف ثانی حصہ اول دفتر اول مکتوب ۲۳۔ [2] حضرت مجدد صاحب مکتوب ۲۳ دفتر اول و مکتوب چہل و یک حصہ دوم دفتر اول میں مقام صدیقیت کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے یہ اسکا خلاصہ اپنے الفاظ میں دیا گیا ہے

وشہیدان [1] — اور دو شہید ہی تو ہیں۔

دیکھو اس حدیث میں بھی نبی صدیق اور شہید میں ترتیب وہی ہے جو قرآن مجید کی آیت سے
معلوم ہوتا ہے کہ نبی کے بعد جو مرتبہ ہے وہ صدیق کا ہی ہے اور درمیان میں کوئی اور مقام حائل نہیں ہے۔
حضرت مجدد صاحب نے اسی حقیقت کی توضیح کرتے ہوئے صاف صاف یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ایک
نبی اور ایک صدیق کے علوم میں فرق صرف اسقدر ہے کہ نبی کے علم کا سرچشمہ وحی ہوتا ہے جس میں شک و
شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن برخلاف صدیق کا علم الہامی ہوتا ہے اس بنا پر ظاہر ہے کہ وہ ظنی
اور غیر قطعی ہوتا ہے۔ [2]

چونکہ فرق صرف ذریعۂ علم کا ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ جہاں تک قولاً
عملاً اور اخلاق و ملکات کا تعلق ہے ایک صدیق بہت کچھ نبی کے مشابہ اور مماثل ہوتا ہے۔
شاہ ولی اللہ صاحب نے مقام صدیقیت پر بڑی عمدہ اور بسیط بحث کی ہے چونکہ یہ مقام بڑا
نازک اور ذرا سی تبدیلی سے غلط فہمی کا امکان ہے اسلئے ہم اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر شاہ صاحب کی تقریر
کا خلاصہ نقل کرتے ہیں [3]

تصوف کے مقامات و احوال کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ اس سلسلہ میں شاہ صاحب لکھتے ہیں
جب کوئی شخص اللہ کی کتاب اور اسکے رسولوں پر اسطرح ایمان لاتا ہے کہ اسکے تمام قوائے قلبیہ و نفسیہ کی رگ رگ
میں وہ سرایت کر جاتا ہے اسکے بعد ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے اور اعضاء و جوارح کیساتھ حق عبودیت ادا کرتا ہے اور
ان اعمال کو برابر بجا لاتا رہتا ہے تو ان تینوں لطیفوں (عقل، قلب، نفس) میں عبودیت کی روح حلول کر جاتی ہے اب
یہ تینوں لطیفے عبودیت میں غرق ہو کر اصل فطرت ہی بن جاتے ہیں اور چونکہ فطرت انسانی کے غلبہ کی حالت میں عقل کا
مقتضیٰ یہ ہے کہ جس چیز کے مناسبات اسکے سامنے آئیں وہ اس کی تصدیق کرے اس بنا پر عقل کی تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ
احکام شرعیہ پر اسطرح یقین کرے کہ گویا وہ اسکو صاف صاف نظر آ رہے ہیں جو مقامات اور احوال عقل سے تعلق رکھتے ہیں
ان میں اصل چیز یقین ہے اور یقین سے ہی مختلف مقامات مثلاً توحید، توکل، شکر، انس، ہیبت، تفرید، صدیقیت اور محدثیت
وغیرہ پیدا ہوتے ہیں

[1] بخاری ا ص ۵۲۳ باب مناقب عثمانؓ [2] مکتوبات حصہ دوم دفتر اول مکتوب چہل و یک [3] شاہ صاحب کی تقریر کا یہ خلاصہ حجۃ اللہ البالغہ جزو دوم باب بقیۃ مباحث الاحسان سے ماخوذ ہے شاہ صاحب نے یہ باتیں ازالۃ الخفا مقصد دوم میں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت لکھی ہیں لیکن وہ منتشر ہیں اور حجۃ اللہ البالغہ میں سب ایک جگہ جمع ہیں اسلئے ہمارا ماخذ یہی ہے۔

اسکے بعد شاہ صاحب نے یقین کے مختلف مراتب پر گفتگو کی ہے اور اس ذیل میں لکھتے ہیں

"یقین کی تیسری شاخ صدیقیت اور محدثیت ہے اور ان دونوں کی حقیقت یہ ہے کہ امت میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خلقتاً پیغمبروں کے مشابہ ہوتے ہیں اب اگر یہ مشابہت قوائے عقلیہ میں ہو تو اس شخص کو صدیق اور محدث کہتے ہیں۔ اور اگر قوائے عملیہ میں ہو تو وہ شہید یا حواری کہلاتا ہے۔

لیکن پھر صدیق اور محدث میں فرق یہ ہے کہ صدیق کی روح پیغمبر کا اثر بڑی تیزی سے قبول کرتی ہے جیسے گندھک آگ سے بہت جلد اثر پذیر ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر ایک صدیق جب پیغمبر کی زبان سے کوئی بات سنتا ہے تو وہ فوراً اسکے دل میں اتر جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس چیز کا علم اسکو خود بخود بغیر کسی کی تقلید کے حاصل ہو گیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق کی نسبت یہ جو روایت ہے کہ جب آنحضرت ؐ پر وحی نازل ہوتی تھی تو وہ جبرئیل امین کی آواز کی گنگناہٹ سنتے تھے تو اس سے بھی دراصل اسی بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔

اسکے علاوہ صدیق کے چند اور خصائص بھی ہیں مثلاً وہ اس حق کی جو نبی پر نازل ہوتا ہے محبت میں اپنی جان و مال تک قربان کر دیتا ہے۔ حق سے محبت کیوجہ سے کسی امر میں اسکی مخالفت نہیں کرتا۔ چنانچہ آنحضرت ؐ نے ابوبکر کی ان تمام فداکاریوں کا اظہار فرمایا ہے۔ حضرت ابوبکر کی یہ خصوصیت اسکے لئے تھی کہ وحی کے انوار آنحضرت ؐ کی روح مبارک سے چھن چھن کر ابوبکر صدیق کی روح پر عکس فگن ہوتے تھے اور اس بنا پر جب تاثیر و تأثر اور فعل و انفعال کے اس عمل میں شدت و تکرار پیدا ہوئی تو اس سے فنا اور فدا کا مقام حاصل ہو گیا۔

صدیق کی علامتیں متعدد ہیں مثلاً اسکا عالم بالرؤیا ہونا، بغیر معجزہ کے سب سے پہلے ایمان لانا، حب الٰہی میں غرق رہنا، خوف و خشیت سے مغلوب رہنا۔ ظاہر ہے یہ تمام صفات بکمال و تمام حضرت ابوبکر میں پائے جاتے تھے اس بنا پر آنحضرت ؐ کی براہ راست خلافت کا مستحق آپکے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔" [1]

اسکے بعد شاہ صاحب نے تجلیات کی بحث چھیڑ دی ہے اور اس سلسلہ میں بتایا ہے کہ حضرت ابوبکر کا کیا مقام تھا لیکن چونکہ یہ بحث بہت غامض اور دقیق ہے جسکے عام قارئین متحمل نہیں

[1] حجۃ اللہ البالغہ حصہ دوم از صفحہ ۶۸ تا [illegible]

ہو سکتے اسلئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں بہرحال اس تمام بحث سے اندازہ ہوا ہوگا کہ حضرت ابوبکر کا مقام صدیق ہونے کی حیثیت سے کس قدر اونچا تھا اور درحقیقت انکی سب سے بڑی فضیلت سب سے بڑی منقبت اور سب سے بڑی تعریف ان کا صدیق ہونا ہی ہے۔ اور یہ ایک ایسا بڑا وصف کمال ہے جسمیں حضرت ابوبکر اپنی نظیر آپ تھے۔ چنانچہ جب حضرت حسان بن ثابت نے آپ کی شان میں یہ شعر آنحضرت ؐ کی فرمائش پر سنائے۔

وثانی اثنین فی الغار المنیف وقد — طاف العدو به اذ صعد الجبلا

وکان حبّ رسول اللہ قد علموا — من البریۃ لم یعدل بہ رجلا

ترجمہ :- اور ابوبکر بلند غار (ثور) میں دو میں کے ایک تھے۔ حالانکہ جب دشمن پہاڑ پر چڑھا تو اسنے ان کا محاصرہ کر لیا تھا اور آپ رسول اللہ ؐ کے محبوب تھے۔ تمام صحابہ اس بات کو جانتے تھے کہ اس خصوصیت میں دنیا کا کوئی ایک شخص بھی آپ کا حریف نہیں ہے۔

تو سرورِ عالم کو فرطِ مسرت سے ہنسی اسطرح آگئی کہ دندانِ مبارک نظر آنے لگے اور ارشاد ہوا "ہاں حسان! تم نے سچ کہا۔ بیشک ابوبکر ایسے ہی ہیں" [1]

آپ کی یہ فضیلت بھی کچھ کم نہیں ہے کہ آپ کی چار نسلوں کو آنحضرت صلعم کی صحبت و معیت کا شرف حاصل ہوا۔ ان چاروں کی ترتیب یہ ہے۔

(۱) حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ۔ (۲) خود حضرت ابوبکر۔ (۳) حضرت ابوبکر کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن۔ (۴) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے صاحبزادہ حضرت محمد بن عبدالرحمٰن [2]

اولیات

محدثین و مورخین نے حضرت ابوبکر صدیق کے ان کارناموں کا الگ الگ ذکر کیا ہے جنہیں کرنے میں سب سے پہلے سبقت کی۔ ہم ذیل میں ان کی فہرست یکجا دیتے ہیں۔

(۱) مردوں میں سب سے پہلے اسلام آپ نے قبول کیا۔

(۲) قرآن مجید کا نام سب سے پہلے آپ نے مصحف رکھا۔

(۳) قرآن مجید کو سب سے پہلے آپ نے جمع کرایا۔

[1] ابن سعد جز ۳ القسم الاول ص ۷ — [2] الاستیعاب تذکرہ محمد بن عبدالرحمٰن

(۴) سب سے پہلا شخص جس نے کفار قریش کیساتھ آنحضرت ؐ کی حمایت میں جنگ لڑی اور ضربات شدیدہ برداشت کیں حضرت ابوبکرؓ ہیں۔

(۵) اسلام میں سب سے پہلے جس نے مسجد بنائی وہ حضرت ابوبکرؓ ہی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں "حضرت صدیق اول کسے است کہ مسجد بنا کرد و اعلام اسلام نمود" [1]

(۶) آنحضرت ؐ کی حیات میں جسکو سب سے پہلے حج کی امامت کا شرف حاصل ہوا وہ آپ ہی ہیں۔

(۷) آنحضرت ؐ نے جسکو باصرار نماز کی امامت کا حکم فرمایا اور خود بھی اسکے پیچھے اقتداء کی وہ حضرت ابوبکرؓ ہی ہیں۔

(۸) سب سے پہلے خلیفہ راشد ہیں اور سب سے پہلے شخص ہیں جو اس لقب سے پکارے گئے۔

(۹) سب سے پہلے خلیفہ ہیں جن کو باپ کی زندگی میں خلافت ملی۔

(۱۰) سب سے پہلے خلیفہ ہیں جس کا نفقہ رعایا نے مقرر کیا [2]

(۱۱) سب سے پہلے بیت المال آپ نے قائم کیا۔

(۱۲) سب سے پہلے اجتہاد و استنباط احکام کے اصول اربعہ آپ نے مقرر کیے۔

(۱۳) سب سے پہلے دوزخ سے نجات کی خوش خبری آنحضرت ؐ نے آپ کو ہی دی اور عتیق کے لقب سے مشرف فرمایا۔

(۱۴) سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے بارگاہ نبوت سے کوئی لقب حاصل کیا۔

(۱۵) سب سے پہلے آپ نے ہی فرمایا "البلاء موکل بالمنطق"۔

ذاتی حالات وسوانح

حلیہ: حضرت عائشہؓ سے بعض لوگوں نے پوچھا کہ حضرت ابوبکرؓ کا حلیہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا۔ وہ گورے چٹے دبلے پتلے آدمی تھے۔ دونوں رخسارے ستے ہوئے تھے کمر ذرا خمیدہ تھی تہمد کمر پر رک نہیں سکتا تھا۔ نیچے کھسک جاتا تھا۔ چہرہ ہڈیاں نکلا ہوا تھا۔ آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئی تھیں، پیشانی بلند۔ انگلیوں کے جوڑ گوشت سے خالی تھے پنڈلیاں اور

[1] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۱۱ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۱

رانیں پر گوشت نہیں تھیں۔ قد موزوں تھا مہندی کا خضاب لگاتے تھے [1]

لباس و غذا: نہایت سادگی پسند تھے کپڑے بھی موٹے جھوٹے پہنتے اور کھانا بھی سادہ کھاتے تھے۔ بعض اوقات فاقہ کی نوبت بھی آجاتی تھی چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت ؐ نے انہیں اور حضرت عمرؓ کو مسجد میں دیکھا کہ بھوک سے بیقرار ہیں ارشاد ہوا "میں بھی تمہاری طرح سخت بھوکا ہوں" حضرت ابو الہیثم انصاری کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے کھانے کا انتظام کیا۔

ذریعہ معاش: آپکا اصل ذریعہ معاش تجارت تھا اس کے علاوہ آنحضرت ؐ نے ان کو خیبر میں ایک جاگیر بھی عنایت فرمائی تھی، بحرین میں بھی آپکو جاگیر ملی تھی اور اطراف مدینہ میں عوالی بنی النضیر میں ایک بیر مجر تھا جو آنحضرت ؐ نے آپکو عطا فرمایا تھا۔ آپنے اس کی اصلاح کی اسمیں کھجور کے درخت لگائے اور پھر حضرت عائشہؓ کو دیدیا۔ اسطرح بحرین کی جاگیر بھی حضرت عائشہؓ کو ہبہ کر دی تھی لیکن وفات کے وقت ان سے واپس لے لی تھی تاکہ بہن بھائیوں کی حق تلفی نہ ہو۔ [2]

روزینۂ خلافت: خلیفہ ہونے کے بعد قوم نے آپ کیلئے وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ لیکن اس کی مقدار کتنی تھی اسمیں اختلاف ہے۔ ابن سعد نے یہ تمام روایتیں نقل کر دی ہیں ہماری رائے میں ان روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کا وظیفہ دو ہزار درہم سالانہ مقرر ہوا تھا لیکن جب دیکھا کہ گذر نہیں ہوتی تو اسمیں اضافہ ہونے لگا اور ادھر فتوحات کے باعث اسلامی ریاست کی مالی حالت بھی بہتر ہوتی جارہی تھی اس بنا پر شدہ شدہ آپکا وظیفہ چھ ہزار درہم سالانہ ہو گیا اور اسکے علاوہ پہننے کیلئے آپکو دو چادریں دی جاتی تھیں جب وہ پرانی ہوجاتی تھیں تو انکی جگہ دو اور چادریں دیدیتے تھے۔ اور وہ پرانی واپس لے لیتے تھے۔ سفر کرتے تھے تو سواری اور اہل وعیال کیلئے اتنا ہی خرچ ان کو ملتا تھا جو خلیفہ ہونے سے پہلے انکو اس کام کیلئے کافی ہوتا تھا۔ [3]

خلیفہ ہونے کے بعد کے معمولات: جب آپ خلیفہ منتخب ہوئے تو اس زمانہ میں مدینہ کے قریب ایک مقام "سنح" میں اپنی بیوی حبیبہ بنت خارجہ کیساتھ رہتے تھے۔ بیعت کے بعد بھی چھ مہینے تک آپ کا قیام وہیں رہا۔ اس مدت میں صبح کیوقت کبھی پیادہ اور اکثر گھوڑے پر بیٹھ کر مدینہ آتے تھے، جسم پر تہمد اور چادر ہوتی تھی جو گیرو رنگ کی ہوتی تھی پہلا دن آپ مدینہ میں گزارتے

[1] طبری ج ۴ ص ۲۱۱۵ [2] طبقات ابن سعد سیرت خلفاء راشدین [3] ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکر صدیق

اور نمازوں میں امامت کرتے تھے، جب آپ نہیں ہوتے تھے تو حضرت عمرؓ نماز پڑھاتے تھے [1] چھ مہینوں تک یہی معمول رہا۔ اس کے بعد مدینہ میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی۔

عبادت | جب نماز پڑھتے تھے تو خشوع و خضوع کا اس درجہ غلبہ ہوتا تھا کہ ایک لکڑی کی طرح سیدھے کھڑے رہتے تھے۔ [2]

حقوق العباد کا خیال | حق اللہ کے سوا حقوق العباد کا بھی اس درجہ خیال رکھتے تھے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام سے دریافت فرمایا کہ آج تم میں سے روزہ دار کون ہے؟ حضرت ابوبکرؓ بولے "میں یا رسول اللہ"۔ پھر پوچھا "تم میں سے آج کس نے جنازہ کی مشایعت کی ہے؟ تم میں سے کسی نے مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟ کسی نے مریض کی عیادت کی ہے؟" جس شخص نے ان سب سوالات کا جواب اثبات میں دیا وہ صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ذات تھی، آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا "جس نے ایک دن اتنی نیکیاں کی ہیں وہ یقیناً جنت میں جائیگا" [3]

رقت قلب | قلب نہایت رقیق تھا۔ قرآن مجید جب پڑھتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی اور اسطرح بلک بلک کر روتے تھے کہ جو لوگ اس وقت موجود ہوتے ان کا بھی جی بھر آتا اور رونے لگتے تھے۔ سنہ ۱۱ھ میں جب حج کیلئے تشریف لے گئے تھے تو مکہ میں حضرت عکرمہ بن ابی جہل اور کچھ دوسرے لوگ آنحضرت ﷺ کی تعزیت کیلئے آپ کے پاس آئے تو آپ کا حال یہ تھا کہ یہ حضرات تعزیت کرتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ روتے جاتے تھے، بات بات پر سرد آہ کھینچنے کی وجہ سے آپ کا لقب ہی "اَوَّاہٌ مُّنِیْبٌ" ہو گیا تھا۔

قسم کسطرح کھاتے تھے | آپ کی بعض خاص خاص عادتیں تھیں جو صحابۂ کرام میں مشہور تھیں، مثلاً اگر کچھ قسم کھا کر یہ کہنا ہوتا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا، تو فرماتے تھے "لا واللہ"

ازواج | طبری میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے کل چار نکاح کئے ہیں، دو اسلام سے قبل اور دو اسلام کے بعد، اسلام سے پہلے آپ نے جن خواتین سے عقد کیا تھا انکے نام (۱) قتیلہ بنت عبد العزیٰ اور (۲) ام رومان بنت عامر بن عمیرہ ہیں اور اسلام قبول کرنیکے بعد جن خواتین سے شادی کی

[1] ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکر صدیقؓ [2] کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۴ ص ۳۶۰
[3] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۴ [4] ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکرؓ [5] بخاری ج ۱ ص ۵۵۸

انکے نام (۱) حضرت اسماء بنت عمیس اور (۲) حبیبہ بنت خارجہ ہیں [1] یہ سب ملکر چار بیویاں ہوئیں لیکن بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے بنو کلب کی ایک عورت سے بھی جس کا نام ام بکر تھا شادی کی تھی اور ہجرت کے وقت انکو طلاق دے دی تھی [2]

ام رومان | قتیلہ بنت عبد العزیٰ کا اسلام مشکوک ہے۔ حافظ ابن حجر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر وہ فتح مکہ تک زندہ رہیں تو غالب یہی ہے کہ مسلمان ہو گئی ہونگی۔ البتہ ام رومان کو یہ شرف حاصل تھا۔ ام رومان پہلے عبداللہ بن الحارث نامی ایک شخص کی بیوی تھیں، عہد جاہلیت میں مکہ آکر اس شخص نے حضرت ابوبکرؓ سے محالفت کر لی تھی چنانچہ جب اسکا انتقال ہو گیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ام رومان کیساتھ شادی کر لی، ہجرت کے وقت حضرت ابوبکرؓ ان کو مکہ میں چھوڑ گئے تھے بعد میں عبداللہ بن اریقط کو بھیجکر ان کو بھی مدینہ بلوا لیا۔ حضرت ام رومان کے سال وفات میں بڑا اختلاف ہے، ابن سعد ماہ ذی الحجہ سنہ ۶ھ لکھتے ہیں، بعض محدثین سنہ ۴ھ یا سنہ ۵ھ کو ان کا سال وفات بتاتے ہیں [3] لیکن صحیح ابن سعد کی ہی روایت ہے کیونکہ حدیث افک میں حضرت ام رومان کا نام آتا ہے۔ اور یہ واقعہ بے شبہ ہجرت سے پانچ سال بعد کا ہے۔ حضرت ام رومان کی فضیلت اس سے بڑھکر کیا ہوگی کہ جب آنحضرت ﷺ نے انکی نعش کو قبر میں اتارا تو ان کیلئے دعائے مغفرت کی اور فرمایا "اے خدا! تجھ پر پوشیدہ نہیں ہے کہ ام رومان نے تیرے لئے اور تیرے

اسماء بنت عمیس | قبیلۂ خثعم سے تعلق رکھتی تھیں، آنحضرت ﷺ کی زوجہ حضرت میمونہؓ کی ماں شریک بہن تھیں، انہوں نے شروع میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفرؓ سے ان کا پہلا نکاح ہوا تھا۔ جب حبش کی ہجرت کا حکم ہوا تو میاں بیوی بھی دونوں حبش ہجرت کر گئے تھے۔ جعفرؓ کی شہادت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے نکاح کر لیا۔ ایک مرتبہ حضرت اسماءؓ نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ! لوگ ہمارے مقابلہ میں اپنی بڑی فضیلت جتاتے ہیں، آپ نے فرمایا "اب اگر کوئی تم سے ایسی بات کہے تو تم کہنا کہ "تم لوگوں نے تو ایک مرتبہ ہجرت کی ہے مجھ کو دو مرتبہ ہجرت کرنے کا شرف حاصل ہے"، غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ بھی انکی فضیلت اور بزرگی کے قائل تھے، چنانچہ آپ نے وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ ان کو غسل جنازہ حضرت اسماءؓ دیں، [4] حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت اسماءؓ نے حضرت علیؓ سے نکاح کر لیا تھا۔

[1] طبری ج ۴ ص ۲۱۱ ابن حجر میں بھی یہی ہے [2] بخاری ج ۱ ص ۵۵۵ [3] اصابہ ج ۸ تذکرہ ام رومان [4] ایضاً [5] الاصابہ ج ۸ ص ۱۱۵، ۲۲۶

حبیبہ بنت خارجہ | ان کے حالات کچھ زیادہ نہیں ملتے، صرف اس قدر معلوم ہے کہ مدینہ کی ہجرت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جن حضرت خارجہ کے ساتھ مواخات کی تھی حضرت حبیبہ انہیں کی بیٹی تھیں اور حضرت ابوبکرؓ انکے ساتھ شادی کے بعد سنح میں انہیں کے ساتھ رہتے تھے، حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد انہوں نے اساف بن عتبہ بن عمرو سے نکاح کر لیا تھا۔ [1]

اولاد | حضرت ابوبکرؓ کی اولاد چھ تھیں۔ تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ لڑکوں کے نام یہ ہیں۔ عبدالرحمن، عبداللہ، محمد۔ اسماء، عائشہ اور ام کلثوم صاحبزادیوں کے نام ہیں

عبدالرحمن | حضرت ابوبکرؓ کے سب سے بڑے صاحبزادہ ہیں، حضرت ام رومان کے بطن سے پیدا ہوئے غزوہ بدر کے موقع پر کفار قریش کے ساتھ آئے تھے، میدان جنگ میں یہ آگے بڑھے اور مبارز طلب ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے مقابلہ پر جانے کی اجازت طلب کی لیکن آنحضرت ﷺ نے اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد غزوہ احد میں بھی یہ مشرکین کے ہمراہ تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر اسلام سے مشرف ہوئے اور مدینہ آکر اپنے والد کے ساتھ رہنے لگے۔ شجاعت اور تیر اندازی میں تمام قریش میں ممتاز تھے اسلام قبول کرنے کے بعد انکے یہ جوہر دین حق کی حمایت و نصرت میں صرف ہونے لگے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد عہد نبوت میں جو غزوات پیش آئے ان میں برابر شریک رہے لیکن جنگ یمامہ میں تو انہوں نے کمال ہی کر دکھایا۔ دشمن کے سات بڑے بڑے جنگی افسروں کو تنہا انہوں نے اپنے تیر کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا تھا اسی طرح قلعۂ یمامہ کی دیوار میں ایک شگاف تھا، مسلمان اسکے ذریعہ اندر داخل ہونا چاہتے تھے لیکن محکم بن طفیل نام کا ایک سردار اسکی حفاظت کر رہا تھا حضرت عبدالرحمنؓ نے تاک کر اسکے سینہ پر ایسا تیر مارا کہ تڑپ کر خاک کا ڈھیر تھا۔ اور مسلمان قلعہ میں داخل ہو گئے [2] حضرت عائشہ اور یہ دونوں سگے بہن بھائی تھے اور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ چنانچہ ۵۳ھ میں انکا انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ کو بڑی حسرت تھی [3]

[1] الاستیعاب تذکرہ اسماء بنت عمیس [2] الاصابہ جز ۴ ص ۲۶۱ [3] الاستیعاب برالاصابہ ج ۲ ص ۳۹۲۔ [4] الاستیعاب برالاصابہ ج ۲ ص ۳۹۳۔ یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی ہیں۔

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ — من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کانی ومالکا — لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معا [1]

عبداللہ | یہ قتیلہ کے بطن سے تھے اور حضرت اسماء کے حقیقی بھائی تھے، حضرت ابوبکرؓ نے جب اسلام قبول کیا تو عبداللہ نے بھی قبول کر لیا تھا۔ ہجرت مدینہ کے سلسلہ میں جب آنحضرت ﷺ اپنے رفیق کے ساتھ غار ثور میں مقیم تھے تو یہ خدمت حضرت عبداللہؓ ہی کے سپرد تھی کہ دن بھر کی قریش کی جو خبریں ہوتی تھیں وہ شام کو یہاں پہنچا دیتے تھے عبداللہ بن اریقط جس نے ہجرت مدینہ کے وقت رہبری کی خدمت انجام دی تھی انہوں نے جب مکہ واپس ہو کر اطلاع دی کہ حضور بخیر و عافیت مدینہ پہنچ گئے ہیں۔ تو اب حضرت عبداللہؓ بن ابی بکر بھی حضرت ام رومان حضرت عائشہ اور حضرت اسماء کو لے کر مدینہ کیلئے روانہ ہو گئے۔ فتح مکہ اور حنین و طائف کے غزوات میں شریک رہے ہیں۔ اس آخری معرکہ (طائف) میں ہی ان کو ایک تیر آکر لگا جس سے شدید زخم ہو گیا علاج معالجہ کے بعد زخم مندمل ہو گیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے چالیس روز بعد پھر پھوٹ پڑا اور وہ اس سے جانبر نہ ہو سکے [2]

محمد بن ابی بکر | یہ اولاد ذکور میں سب سے چھوٹے تھے۔ حجۃ الوداع کے سال ماہ ذی قعدہ کے اواخر میں بمقام ذوالحلیفہ حضرت اسماء کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ان کے ایک بیٹے کا نام قاسم تھا۔ اسی نسبت سے حضرت عائشہؓ نے انکی کنیت ابوالقاسم رکھدی تھی حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد جب انکی والدہ نے حضرت علیؓ سے شادی کر لی تھی تو اس تقریب سے محمد بن ابی بکر کو آغوش مرتضوی میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کے خون ناحق کے دھبوں سے محمد بن ابی بکر کا دامن بھی پاک نہیں تھا، لیکن حافظ ابن عبدالبر نے اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے لم ینل محمد بن ابی بکر من دم عثمان بشیء [3] حضرت عثمانؓ کے خون سے محمد بن ابی بکر کا دامن ذرا بھی تر نہیں ہوا حضرت عثمانؓ نے جب یہ کہا کہ محمد اگر تیرا باپ تجھ کو اس حالت میں دیکھتا تو ہرگز نہ پسند

[1] الاستیعاب برالاصابہ ج ۲ ص ۳۲۳ و ۳۲۴ یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی ہیں۔ [2] الاصابہ ج ۴ ص ۲۹۵ [3] ایضاً۔ [4] الاستیعاب ج ۲ ص ۳۲۹

نہیں کرتا"، تو محمد بن ابی بکر فوراً باہر نکل گئے۔

وفات نہایت اندوہناک طریقہ پر ہوئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ۳۸ھ میں مصر کا والی بنا کر بھیجا تھا۔ جب یہ مصر پہونچے تو امیر معاویہ نے عمرو بن العاص کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کر دیا دونوں میں جنگ ہوئی۔ محمد بن ابی بکر شکست کھا گئے اور سپرد تیغ کر دیئے گئے۔ حضرت عائشہ کو خبر ہوئی تو بیحد ملال ہوا اور انکے بیٹے قاسم کو اپنی تربیت میں لے لیا[1] حضرت عائشہ کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ حضرت قاسم کا شمار اپنے عہد کے فقہائے سبعہ میں ہوتا ہے۔

اسماء بنت ابی بکر حضرت اسماء بہنوں میں سب سے بڑی تھیں انکی والدہ کا نام قتیلہ یا قتیلہ تھا حضرت ابوبکر کے ساتھ یہ بھی اسلام لے آئی تھیں، حافظ ابن عبدالبر کی روایت کے مطابق اسلام لانے والوں میں انکا نمبر اٹھارواں تھا۔ حضرت زبیر بن عوام سے شادی ہوئی تھی ہجرت کے سلسلہ میں جب یہ مدینہ روانہ ہوئی ہیں تو عبداللہ بن زبیر سے حاملہ تھیں قبا پہونچ کر ان کی ولادت ہوئی۔ آپ کا لقب "ذات النطاقین" کیوں تھا؟ اس کا ذکر ہجرت کے باب میں گزر چکا ہے

خلیفۂ رسول کی صاحبزادی ہونے کے باوجود بڑی محنت اور جفاکشی کی زندگی بسر کرتی تھیں اپنے شوہر حضرت زبیر کے گھوڑے کیلئے دانہ دلتی تھیں اور اسے سر پر رکھ کر دو دو میل پیدل چلتی تھیں[2] حضرت ابوبکر کو اسکی اطلاع ہوئی تو ایک غلام عطا کر دیا۔

حجاج ثقفی نے حضرت اسماء کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن زبیر کو شہید کر کے انکی لاش تختۂ دار پر لٹکی رہنے دی تھی۔ جب تین دن گزر گئے تو حضرت اسماء ادھر سے گزریں اور بیٹے کی لاش کو دیکھ کر بولیں کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ دولہا تختۂ عروسی پر سے اتر آئے۔ حجاج نے یہ سنکر اگرچہ گستاخی کی لیکن بہرحال لاش اتروا لی، اسکے چند روز بعد ہی حضرت اسماء نے کم و بیش سو برس کی عمر میں ۷۳ھ میں مکہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئیں[3]

ام المومنین حضرت عائشہ حضرت عائشہ حضرت ام رومان کے بطن سے بعثت نبوی کے چار پانچ برس بعد پیدا ہوئیں، حضرت ابوبکر کی سب سے زیادہ چہیتی بیٹی اور آنحضرت ﷺ کی محبوب

[1] الاصابہ ج۴ ص ۲۵۱ [2] صحیح مسلم ج۲ ص ۲۱۸ [3] الاستیعاب برالاصابہ ج۴ ص ۲۲۸، ۲۲۹

ترین بیوی تھیں۔ حضرت عطاء بن ابی رباح کا قول ہے کہ

كانت عائشة افقه الناس واعلم الناس واحسن الناس رأيا في العامة[1]

حضرت عائشہ تمام لوگوں سے زیادہ فقیہ صاحب علم اور صاحب الرائے تھیں۔

امام زہری کا قول ہے کہ اگر تمام ازواج مطہرات اور سب عورتوں کے علم کا موازنہ حضرت عائشہ کے علم کے ساتھ کیا جائے تو حضرت عائشہ کا علم ان سب کے علم سے افضل ثابت ہوگا۔ آپ کی کس کس خوبی اور کمال اور کس کس فضیلت و منقبت کو بیان کیا جائے۔

اردو میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے ایک مستقل اور مستند کتاب "سیرت عائشہ" کے نام سے موجود ہے۔ اس کی مراجعت کرنی چاہئے۔ فقہی اور اجتہادی مسائل میں مرجع انام تھیں۔ اور علوم کے علاوہ طب اور شعر کا بھی بہت صاف ستھرا ذوق رکھتی تھیں اپنے عہد کی بلند پایہ خطیبہ تھیں جب تقریر کرتی تھیں تو سننے والوں پر سحر کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ۵۸ھ میں دوشنبہ کے دن ۱۷ رمضان کو وفات حسرت آیات ہوئی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں[3] رضی اللہ عنہا

ام کلثوم حضرت حبیبہ بنت خارجہ کے بطن سے حضرت ابوبکر کی بیٹی تھیں ایک مطابق آپ کی وفات کے بعد پیدا ہوئی تھیں، اسلئے حضرت ابوبکر صدیق کی اولاد امجاد میں صرف یہی ایک ایسی تھیں جو تابعیہ تھیں۔ ان سے متعدد روایات مروی ہیں۔ جابر بن حبیب طلحہ بن یحییٰ اور مغیرہ ابن حکیم وغیرہم نے ان سب سے روایت کی ہے۔[4]

انگوٹھی حضرت ابوبکر ایک انگوٹھی بھی رکھتے تھے جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔

"نعم القادر اللہ"[5]

[1] الاصابہ ج۴ ص ۳۴۹ [2] ایضاً [3] الاصابہ ج۴ ص ۳۵۰ [4] الاصابہ ج۴ ص ۴۶۹ [5] طبری ج۲ ص ۶۱۷

تبصرہ

رسول اللہ ﷺ کے خلیفۂ اول کی حیاتِ طیبہ کا پورا مرقع اب تمہارے سامنے ہے، اسکو غور سے دیکھو تو تمکو اس آئینہ میں ایک ایسے انسان کی شکل و صورت نظر آئیگی جو ہر حیثیت سے مکمل ہے جس میں انسانی کمالات و اوصاف بیک وقت سمٹ کر جمع ہو گئے ہیں، ایک انسان کی تکمیل کا دار و مدار اسکی ان باطنی قوتوں کی اعلیٰ تربیت و تہذیب پر موقوف ہے جو قدرت نے اسکے اندر ودیعت رکھدی ہیں یہ قوتیں اصولی طور پر دو ہیں ایک قوت نظری اور دوسری قوت عملی۔ پہلی قوت کے اعتدال سے جو ملکات پیدا ہوتے ہیں وہ ذکاوت، حسنِ فہم، اعتدالِ فکر، شہامت وغیرہ ہیں اور قوتِ عمل کے استعمال سے جو اوصاف و کمالات پیدا ہوتے ہیں وہ شجاعت، سخاوت، عفت، غیرت و حلم، خودداری وغیرہ ہیں کسی شخص میں ان تمام اوصاف و کمالات کا بیک وقت جمع ہو جانا انسانی سعادت و خوش نصیبی کی معراجِ کمال ہے، اور قرآن مجید میں اسی کو خیر کہا گیا ہے اور فرمایا گیا "ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً" اگرچہ عمومی طور پر اس وصفِ خاص میں دوسرے صحابۂ کرام بھی حضرت ابوبکرؓ کے شریک ہیں لیکن جسطرح نیکی اور حسن میں فرقِ مراتب ہوتا ہے اسی طرح حکمت میں بھی مدارج و منازل کا بڑا فرق و امتیاز ہے اسی فرق کے اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کا مقام سب سے اونچا تھا اور وہ حکمت و سعادت کے اس نقطۂ عروج پر فائز تھے جو نبوت سے نیچے اور سب سے اونچا ہوتا ہے۔

خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروقؓ کو وسعتِ فتوحات، تدوین دواوین، نظم و نسق اور حکومت کے داخلی و خارجی انتظامات کی وجہ سے تاریخ اسلام میں جو اہمیت و عظمت حاصل ہے وہ ظاہر ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی مدت خلافت دس سال ہے اور حضرت ابوبکرؓ کی کل سوا دو برس اور اس سوا دو برس میں آپنے جو خدمات انجام دی ہیں وہ فاروقی کارناموں کیلئے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

فتوحات کی وسعت اور حکومت کا نظم و نسق اسوقت تک ناممکن ہے جب تک کہ قوم کے اندر وحدت نہ پیدا ہو اسمیں کسی قسم کا داخلی انتشار اور طوائف الملوکی نہ ہو، یہ قومی وحدت کس نے پیدا کی؟ پورے عرب کو متحد کس نے کیا؟ اور قومی یکجہتی کا صور کس نے پھونکا؟ آنحضرت ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ارتداد و بغاوت کا سیلاب چاروں طرف سے جس زور شور سے اٹھا تھا اسکے مقابلہ میں مادی اسباب و حالات کے ماتحت ان صحابۂ کرام کی جو مدینہ میں محصور ہو کر رہ گئے تھے کیا بساط تھی؟ اکابر صحابہ یہاں تک کہ خود حضرت عمرؓ کی جبلی استقلال و پامردی پر اضطراب و تشویش کی شکن پیدا ہو گئی تھی چنانچہ انھوں نے مشورہ دیا کہ جیش اسامہ کو شام کے سرحدی قبائل کی طرف بھیجنا ملتوی کر دیا جائے۔ مانعین زکوٰۃ سے جہاد و قتال نہ کیا جائے۔ لیکن خلیفۂ رسول نے جس ہمت و استقلال سے عزم و عالی حوصلگی کیساتھ ان سب حالات و حوادث کا مقابلہ کیا وہ انسانی تدبر و عزم کی تاریخ کا ایک بلند ترین شاہکار ہے، تدبر کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے مغربی مصنفین تسلیم کرتے ہیں کہ ان حالات میں جیش اسامہ کا روانہ کرنا ایک عظیم الشان سیاسی حربہ تھا جس نے قبائل عرب کو اور ایران اور روم کی طاقتوں کو نفسیاتی طور پر مرعوب کر دیا، عزم و استقلال اور ہمت و پامردی کی یہ کیفیت ہے کہ وہی رقیق القلب اور منکسر مقدس انسان جو آنحضرت ﷺ کا نام آتے ہی رو پڑتا تھا، حضرت عمرؓ جیسے انسان کو طعنہ دیتا ہے کہ تم عہدِ جاہلیت میں تو بڑے مضبوط تھے مگر اب تم کمزور ہو گئے، غرض کہ صحابۂ کرام کی اکثریت کے برخلاف وہ جیش اسامہ کی مہم بھی سر کرتا ہے۔ مانعین زکوٰۃ سے جنگ بھی کرتا ہے اور پھر اس سے فارغ ہو کر مرتد اور باغی قبائل کی سرکوبی کیلئے اپنے گیارہ لشکر پورے جزیرۃ العرب میں پھیلا دیتا ہے جسکا چند مہینوں کے اندر ہی اندر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارتداد و بغاوت کے تمام تیرہ و تار بادل یک قلم چھٹ جاتے ہیں اور پورا جزیرۃ العرب ایک دینِ حق کے علم کے نیچے آ کر جمع ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ —

"عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا۔"

پھر خود اعتمادی، اولو العزمی اور عالی حوصلگی کی مثال اس سے بڑھکر اور کیا ہو گی کہ ابھی مرتد قبائل کی مہم سے پورے طور پر فراغت بھی نہیں ہوتی ہے کہ عرب کے خارجی استحکام و حفاظت کی مصلحت کے تقاضے سے ایران و روم کو جو اسوقت دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں تھیں چیلنج کر دیا

اور یہ سب کچھ یونہی دفعتہً و بغتۃً نہیں ہو جاتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے نہایت منظم اور منضبط طریقہ پر کرتا ہے۔ خود خلیفہ رسول عراق و شام کے محاذ جنگ سے سیکڑوں میل دور مدینہ میں اپنے ایک چھوٹے سے اور غیر آراستہ مکان میں بیٹھا ہے اور وہیں سے اسلامی فوجوں کی کمانڈ کر رہا ہے۔ ان کو راستوں کے نشیب و فراز سمجھا رہا ہے۔ فریق محارب کے مورچوں کی خصوصیات بتا رہا ہے اور ان کے پیش نظر خود عساکر اسلام میں ترتیب و تہذیب قائم کر رہا ہے۔ گویا جنگ ایک ایک جزئیہ پر اسکی کڑی نگاہ ہے۔ اور اس کے لئے حسب موقع و مصلحت وہ احکام و ہدایات نافذ کر رہا ہے۔ شام کے محاذ پر جب جمود و تعطل پیدا ہوا تو فوراً حضرت خالد کو حکم ہوتا ہے۔ کہ عراق سے شام پہونچیں اور وہاں جو اسلامی فوجیں ہیں انکی کمانڈ اپنے ہاتھوں میں لیں۔ اس حکم کی فوراً تعمیل ہوتی ہے۔ اور صورت حال یک بیک بدل جاتی ہے۔ غرض کہ اگر عرب میں یہ اتحاد نہ پیدا ہوتا اور حیرہ کے میدان جنگ میں ایرانی فوج کو شکست فاش نہ ہوتی تو عہد فاروقی میں جو فتوحات ہوئیں کیا وہ پھر بھی ہو سکتی تھیں؟ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر کی نسبت فرمایا گیا کہ وہ حَسَنَۃٌ مِّنْ حَسَنَاتِ اَبِی بَکْرٍ تھے اور خود حضرت عمر نے اقرار کیا کہ وہ حضرت ابوبکر کے سینہ کے ایک بال ہیں۔"

تاریخ کا ایک طالب علم کہہ سکتا ہے کہ دنیا میں سکندر اعظم، ہنی بال، چنگیز خاں اور تیمور اور بھی بڑے بڑے فاتح گزرے ہیں جنہوں نے نہایت عظیم الشان فوجی کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی عظیم الشان فاتح ایسا بھی گزرا ہے جس نے دنیا کی تاریخ کا ورق الٹ دیا ہو۔ لیکن اسکے باوجود نہ اس کے سر پر تاج زر فشاں ہو اور نہ اندر سلطانی، معمولی سے معمولی آدمیوں کی طرح رہتا سہتا ہو اس میں اور دوسرے لوگوں میں شان و شوکت اور وجاہت و سطوت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ ہو، وہ محلہ کی بکریوں کا دودھ بھی دوہ دیتا ہو۔ رات کے وقت چھپ چھپ کر نابینا عورت کے گھر کا سارا کام بھی کر آتا ہو۔ معمولی کپڑے پہنتا ہو۔ موٹا جھوٹا کھاتا ہو۔ اسکے پاس نہ خدم و حشم ہوں۔ اور نہ محلات و قصور نہ خزانے ہوں۔ اور نہ زر و سیم کے انبار، نہ چوبدار نہ دربان نہ باڈی گارڈ اور نہ پولیس کا کوئی دستہ۔ ایک معمولی سے معمولی انسان بھی برملا اسکو سر راہ ٹوک سکتا ہو۔ ایک ادنیٰ حیثیت شخص

بھی بھرے مجمع میں اس سے باز پرس کر سکتا ہو اور جب وہ اپنی فوج کو کسی مہم پر روانہ کرنے کے لئے کچھ دور تک مشایعت کے لئے جائے تو اس شان سے کہ وہ خود پیادہ ہو اور اسکا نوعمر و نوجوان امیر فوج گھوڑے پر سوار ہو اسکی بیٹی اپنے شوہر کے گھوڑے کا دلیہ خود دلتی ہو اور پھر دو دو تین تین میل لے سر پر رکھ کر پیدل چلتی ہو۔ اور خود اسکا اپنا حال یہ ہو کہ وہ کپڑوں کا گٹھر اپنے سر پر رکھ کر بازار میں پھرتا ہو، بتاؤ تمہی وہ رعایا کا ملگاری کے ساتھ یہ جمہوریت اور یہ مساوات و برابری۔ یہ تواضع و فروتنی پوری پوری تاریخ عالم میں کہیں اور بھی نظر آتی ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ جمہوریت اور مساوات کی جو مثال حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں قائم کی وہ اپنی جگہ بے نظیر ہے لیکن حضرت ابوبکر صدیق کی اس بے نفسی اور انتہائی سادگی کو دیکھ کر حضرت عمر بھی کہہ اٹھے کہ "اے ابوبکر! تم نے اپنے بعد میں آنے والوں کیلئے بڑی مشکلات پیدا کر دیں" یعنی تمہارے نقش قدم پر چلنا کسی کے لئے آسان بات نہیں۔ پھر فاتحین و کشور کشایان عالم میں کتنے ہیں جن کے لشکروں نے شہروں کو تباہ و برباد نہ کر ڈالا ہو۔ آبادیوں کو ویرانہ میں تبدیل نہ کر دیا ہو۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ترس کھایا ہو کھیتوں کو آگ نہ لگائی اور درختوں کو نہ کاٹا ہو۔ لیکن یہاں کیا عالم تھا۔ فوج روانہ ہوتی تھی تو بڑی تاکید سے ان امور کی نسبت ہدایات دی جاتی تھیں اور کسی کی مجال نہ تھی کہ فرمان خلافت سے ذرا سرتابی کر سکے۔ ان سب چیزوں کا اثر یہ تھا کہ جو لوگ میدان جنگ میں شمشیر آزمائی کرتے تھے جب ہوا کا رخ پلٹتا تھا تو انہیں کی زبانیں فاتحین کیلئے دعائیں کرتی تھیں، جنگ کے ختم ہونے کے بعد جنگ کی ہولناکیوں کا نام و نشان بھی میدان جنگ سے باہر کہیں نظر نہیں آتا تھا اور ملک میں پہلے سے زیادہ خوش حالی اور آسودگی پیدا ہو جاتی تھی۔

یہ جو کچھ لکھا گیا حضرت ابوبکر صدیق کے کارناموں کا صرف ظاہری اور مادی پہلو تھا اگر خالص شرعی و دینی اور معنوی و باطنی پہلو کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو صاف نظر آئیگا کہ جو کام آنحضرت ﷺ کی زندگی میں تکمیل کردہ ہو چکا تھا۔ خلیفۂ اول کے ہاتھوں اسکی تکمیل ہوئی۔ پھر یہی عرب قوم کو متحد کرنے کے علاوہ قرآن مجید کو جمع کرنا اور اسکو ضیاع سے بچا لینا یہ

ایک پیغمبرانہ کارنامہ ہے۔ جس کی وجہ سے خود اللہ تعالیٰ کا وعدہ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ پورا ہوا۔ قرآن جس پر اسلامی شریعت کی اساس قائم ہے اسکو جمع کر کے ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دینا۔ زکوٰۃ وصدقات کے احکام کی تبلیغ واشاعت اور انکی تفصیل وتشریح جیش اسامہ کی روانگی، مرتدوں اور باغیوں کی سرکوبی، مدعیان نبوت کا استیصال ایران اور روم کی ان کے اسلام دشمن منصوبوں کی بنا پر گوشمالی۔ اسلام کی تبلیغ واشاعت قبائل عرب کا باہمی اتحاد واتفاق پر لگا دینا۔ یہ سارے اہم کام جو کل سوا دو برس کی مدت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئے اور کن ناساعد وناموافق حالات میں ہوئے اور کس طرح ہوئے؟ ان سب کو سامنے رکھو اور بتاؤ کہ کیا ان سے صاف طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکرؓ پیغمبر نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے لیکن انکے یہ تمام کارنامے پیغمبرانہ تھے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے ایک مرتبہ فرمایا "اگر ابوبکر نہ ہوتے تو خدا کی عبادت نہ کی جاتی" گویا قرآن نے ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ کہہ کر پیغمبر آخر الزمان کے ساتھ جس کی جسمانی معیت ورفاقت پر مہر تصدیق ثبت کی تھی ازل میں اس کے لئے یہ سعادت بھی مقدر کر دی گئی تھی کہ جسمانی رفاقت کے ساتھ معنوی اشتراک عمل اور باطنی رفاقت کا بھی اس سے مظاہرہ ہو۔

اسی خصوصیت کی بنا پر شاہ ولی اللہ دہلوی حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت کو صرف خلافت نہیں بلکہ خلافت خاصہ کا عہد کہتے ہیں، یہ مقام چونکہ بہت نازک ہے اسلئے ہم خود اپنی طرف سے اس کی کوئی تفصیل نہیں کریں گے۔ بلکہ شاہ صاحب کی تقریر کے متفرق اقتباسات نقل کر کے انہیں پر کتاب بھی ختم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

از میان امت جمعے ہستند کہ جوہر نفس ایشان قریب بجوہر نفوس انبیا مخلوق شدہ واین جماعہ در اصل فطرت خلفائے انبیا اند در امت بمثال آنکہ آئینہ آہنی از آفتاب اثرے قبول می کند کہ خاک وچوب وسنگ را نیست الخ

امت میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے نفس کا جوہر انبیا کے جوہر نفوس کے قریب ہی مخلوق ہوتا ہے۔ یہ لوگ پوری امت میں فطرتاً انبیا کے خلیفہ ہوتے ہیں اور ان کی مثال اس آئینہ جیسی ہوتی ہے جو آفتاب سے براہ راست اثر قبول کرتا

فرق کہ خلاصۂ امت اند از نفس قدسیہ پیغامبر بوجہے متاثر می شوند کہ دیگران را میسر نمی آید و آنچہ از آنحضرتؐ فرا گرفتہ اند بشہادت دل فرا گرفتہ اند۔ گویا دل ایشان آن چیزہا را اجمالاً ادراک کردہ بود و کلام آنحضرتؐ شرح وتفصیل آن معانی اجمالی بود۔۔۔ پس خلافت خاصہ آنست کہ این شخص چنانکہ در ظاہر حال رئیس مسلمین شود بحسب وضع طبیعی کہ مراتب استعدادات افراد بنی آدم در منضبط علو فطرت الامثل فالامثل نیز رئیس امت باشد تا ریاست ظاہر جمع شود با ریاست باطن کردند

(ازالۃ الخفا مقصد اول ص ۹)

ہے وہ ان حالانکہ دوسرے لوگوں کو یہ بات میسر نہیں۔ ایسے لوگ امت کا حاصل ہوتے ہیں اور وہ آنحضرتؐ سے اخذ کیا ہے خود اپنے دل کی شہادت سے اخذ کیا ہے۔ گویا ان حضرات کے دل نے اجمالاً ان چیزوں کو پہلے ہی دریافت کر لیا تھا۔ آنحضرتؐ نے تو بس اس کی شرح وتفصیل بیان فرما دی۔۔۔ پس خلافت خاصہ یہ ہے کہ یہ شخص جس طرح ظاہری طور پر مسلمانوں کا رئیس ہوتا ہے۔ وضع طبیعی کی مراتب استعداد میں افراد بنو آدم کے اختلافات وتفاوت کے اعتبار سے فطرت کی صفائی اور بلندی میں بھی رئیس امت ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی ریاست ظاہر جمع ہو کر ریاست باطن ہوتی ہے۔

جب ایک خلیفہ اس مرتبۂ عالی پر متمکن ہوتا ہے تو اگرچہ وہ خود پیغمبر نہیں ہوتا لیکن پیغمبر کا دست وبازو ہوتا ہے، اس کے اعضا وجوارح ہوتا ہے اور اس بنا پر اسکے تمام کارنامے خود گویا پیغمبر کے کارنامے ہوتے ہیں۔ یہ خلیفہ تو صرف ایک واسطہ اور ذریعہ ہوتا ہے جیسے نغمہ سرائی وزمزمہ آفرینی دراصل نے نواز کا کمال ہے اگرچہ نغمہ نکلتا نے سے ہی ہے۔ چنانچہ اسی بحث میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

آنچہ از تقاسیم رحمت الہی نصیب پیغامبر گشتہ وپیغامبرؐ قبل از مباشرت آن برفیق اعلیٰ پیوستہ بود بجہتے از وجوہ سببیہ وانابۃ آن معانی را بدست خلفا اتمام ساختہ اند وبحقیقت آن ہمہ راجع ست بہ پیغامبر ایشان

رحمت خداوندی کی تقسیم سے جو کچھ بھی آنحضرتؐ کے حصہ میں لکھ دیا گیا تھا اور آپ اسکو سرانجام دینے سے پہلے ہی دنیا سے تشریف لے گئے تو اب ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انعام الہیہ ان چیزوں کو خلفا کے ہاتھ سے پورا کرایا ہے۔

بمنزلہ جوارح پیغامبر شدہ اند لاجرم پس
خلافت خاصہ آنست کہ از خلیفہ کارہائے
کہ نصیب آنحضرت ﷺ و منسوب بایشان است
در قرآن عظیم و حدیث قدسی بدست وے سر انجام
شود و آنحضرت ﷺ اثبات امر را تصریحاً و تلویحاً
مرات کثیرہ اظہار فرمودہ باشند تا آن ہمہ کارہا
در جریدۂ اعمال حضرت پیغامبر ﷺ مرقوم گردد۔
و ایشان شرف وساطت حاصل نمودہ باشند
لاجرم۔ (ص ۱۰)

اور درحقیقت یہ تمام کارنامے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی
کارنامے کہلائیں گے اور خلفا پیغمبر کے اعضا کی طرح ہونگے اور
بس پس خلافت خاصہ کے معنی یہ ہیں کہ جو کام
قرآن مجید یا حدیث قدسی میں آنحضرت ﷺ کے حصہ
میں لکھے ہوئے ہیں وہ خلیفہ کے ہاتھوں سرانجام
ہوں اور آنحضرت ﷺ نے صراحتاً و اشارۃً اس
کی خلافت کا اظہار بار بار کر بھی دیا ہو۔ اس
کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خلیفہ کے یہ تمام کارنامے
حضرت پیغامبر ﷺ کے دفتر اعمال میں درج کر لئے
جاتے اور خلیفہ کو بس وساطت کا شرف حاصل ہوتا ہے

دو سو عقلی دلائل سے قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت
اپنے موضوع پر منفرد کتاب، جو ایک عرصہ سے نایاب تھی

حضرت مولانا محمد مسلم عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
استاذ دار العلوم دیوبند

ادارہ اسلامیات
۱۹۰۔ انارکلی ○ لاہور